

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینئر ڈائجسٹ

ماہنامہ

جنوری 2017

گلزار علی
معراج الاول



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

Happy
New Year 2017



08 مدیر اعلیٰ

آپ کے خط

سینس کی مجلس مشاورت وقت زمین کی تباہ
شیریں باتیں لگتے شکوے اور پرستاشوں مشورے

07 حسن الیاس

انشائیہ

سرسبز زندگی اور انداز فکر پر
آپ صاحب غلط فہمی کا شکار

59 طاہر جاوید منٹو

میری باتوں سنو!

ایک کمزور انسان کی مظلومیت
اور انہوں نے کارروائی کی۔ تقاضا کی کا احوال

16 عبدالکلام سیٹا پوری

آخری حرکت

مباحثی کا آئینہ رہا اختیار اور بے اختیار
انسانیت کے سنی آموز اور عزت کا مسیخہ زوال

76 اسلم نادری

شیش محل

اسلامی تحریک کے پیروں میں ملفوف ہر طرف
برقی واردات تھی ان کا کس دلچسپ داستان

67 سلیم الدین

سکون قلب

ہشتوں سے چھڑکارا پانے
والے شوہر کی کاوشوں کا حال

120 مرزا امجد بیگ

نظر فریب

پُر خلوص حبذ بوں کی تذلیل کرنے
والے ایک فریق کا سب سے اثر انجام

109 تنویر ریاض

پلاٹ

حقائق کے منافی مفاد کی بنیاد پر خبر شائع
کرنے والے بے خبروں سے انتقا

جلد 47 • سیرہ 01 جنوری 2017 • روزانہ 800 روپے • ایسٹرن میڈیا پبلیکیشنز 60 روپے

عہدہ نگار: ایس ایس بیس 215 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 • فیکس (021) 35802551 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com

149 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اپریل

۱۱ مسیحا پچاس بن کر اتر جائے
والی ماووں کا دغریہ احاطے

شماره ۱۶۷

میں کیا کروں؟

ایک ہی طریقہ واردات پر ایک وقت دو مختلف جرائم کا ارتکاب

225 **شمر عباس**

خوش خیالی

ہاں یہ کام مظاہرہ کرنے والے ایک
بے وقوف کی وجہ سے ہو گیا ہے

243 ڈاکٹر شیر شاہ سید

ڈونگ ڈیلنگ فونگ

ضمیمہ کے کتب خانے میں کتب خانے
ایک اذیت پسند فوجی کا ماحبرا

PAKSOCIETY

نیا سال

نئے سال اور پرانے سال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ زمانے میں نہ لمحے ہیں، نہ ساعتیں، نہ دن ہیں، نہ ہفتے، نہ مہینے ہیں اور نہ سال۔ زمانہ، ایک لمحہ بھی ہے اور لمحے کا ہزارواں حصہ بھی۔ زمانہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ زمانہ ہی وہ سب کچھ ہے، جو ہے۔ زمانہ وجود اور عدم کا ایک سمندر ہے۔ ایک بے کنار اور بے کراں سمندر، جس میں ہم بہہ رہے ہیں، ڈوب رہے ہیں اور ابھر رہے ہیں پھر بھی ہمارا جسم ہے کہ نہیں بھگتا۔ ہمارے کپڑے ہیں کہ خشک رہتے ہیں۔

زمانہ ہمارے دائیں بھی ہے اور بائیں بھی۔ زمانہ ہمارے سامنے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ زمانہ ہمارے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی۔ زمانہ ہمارے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ ہمارا بدن اور ہماری روح زمانے کے سوا اور کیا ہیں؟ وہ جوں رہے ہیں اور وہ جو بچھڑ گئے ہیں۔ وہ کون ہیں، وہ کون تھے؟ میں اور تم، جو ایک دوسرے میں سانس لے رہے ہیں اور تم جو ایک دوسرے کا سکھ بھی ہیں اور دکھ بھی۔ آخر ہم کون ہیں؟ وہ جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں، وہ جو ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے تھے، وہ جو ایک دوسرے کی جدائی میں مر جاتے تھے اور رسائی میں جی اٹھتے تھے، وہ کون تھے؟ کیا وہ زمانے کے سوا کچھ اور تھے؟ زمانہ ہی تو ہے جو ہمیں مارتا ہے اور ہمیں جلاتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو گزرتا ہے تو بھی لوٹ کر نہیں آتا اور زمانہ ہی تو ہے جو کبھی نہیں گزرتا۔ ہاں، زمانہ کبھی نہیں گزرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستارے ہیں اور ہیں۔ کہکشاں ہیں اور ہیں۔ پہاڑ ہیں اور ہیں اور سمندر ہے اور ہے۔ کیا تم کائنات کو بدلتے ہوئے دیکھتے ہو؟ کیا سورج کبھی لکھتا ہے اور کبھی نہیں لکھتا؟ کیا چاند کبھی ڈوبتا ہے اور کبھی نہیں ڈوبتا؟ یہی تو زمانہ ہے جو ہے اور سب کچھ ہے۔ یہی تو زمانہ ہے جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جب تم سب کچھ کہنا چاہو اور بس ایک ہی لفظ کہہ سکو تو کہہ دو، زمانہ اور جب تم کچھ بھی نہ کہنا چاہو اور سب کچھ کہہ سکو تو بس ایک لفظ کہہ دو، زمانہ۔ ہماری اور تمہاری ساری زبانیں اور نکتہ سامانی، اس ایک لفظ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے؟ ہم جو لمحہ بھی گزار رہے ہیں وہ آخری لمحہ ہے۔ زندگی اور آرزو مندی کا آخری لمحہ اور یوں تو لمحوں کا حساب اور شمار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم گزرتے رہیں گے اور گزر جائیں گے اور لمحہ پھر بھی باقی رہے گا۔ کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے، تمہارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ سوچو اور سوچ کر جواب دو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ حقیقت کیا ہے جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے؟

تمہارے دانش مندانہ سکوت نے میرے سوال کا جواب دے دیا اور اس کے سوا اس سوال کا کوئی اور جواب تھا بھی نہیں۔ ہے بھی نہیں۔ وہ سب سے بڑی حقیقت گزرتا، گزرتے رہتا اور گزر جاتا ہے۔ کیا ہمارے دکھوں میں سب سے بڑا دکھ یہ نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں، گزرتے جا رہے ہیں اور گزر چکے ہیں؟

ہمارے پاس دن، رات، ہفتے، مہینے اور برس نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس تو بس ایک لمحہ ہوتا ہے اور یہی ایک لمحہ ہمارے لیے دن، رات، ہفتے، مہینے اور برس ہوتا ہے۔ ہم زمانے ہی میں ہوتے ہیں اور زمانے ہی میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایک ہی توپوچی ہے اور وہ خود ہم ہیں۔ اس گھڑی، اس لمحے اور اس پل کے ہم۔

اس گھڑی، اس لمحے اور اس پل کے ہم، نیا سال منانے والے ہیں۔ وہ دن اور پہلے کے وہ ہم، گزر گئے ہیں۔ اب ہم اپنے ہونے کا نیا پن بسر کرنا چاہتے ہیں۔ نئی خواہشوں، نئے خیالوں اور نئے خوابوں کے ساتھ گزر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھو، خواہش کے بعد نئی خواہش، خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر کرنا ہی زندگی ہے۔

اور اب تو پہلے سے زیادہ اچھا موسم ہے۔ اب تو پہلے سے زیادہ اچھے دن ہیں۔ ہم نے تو بہت بُرے دن گزارے ہیں۔ کیا نہیں گزارے؟ ہم نے تو ان بُرے دنوں میں بھی اپنی امیدیں نہیں ہاریں۔ وہ ساری امیدیں ہمارے وجود میں مہک رہی ہیں۔ وہ ساری تمناں ہماری نمود میں دمک رہی ہیں۔ اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے گنگنا چاہئیں تاکہ جمہوریت زندہ رہے، پاکستان تابندہ رہے۔



محترم قارئین!
السلام علیکم!

جنوری 2017ء..... نئے سال کا پہلا شمارہ دیرینہ ساتھ کا احساس لیے حاضر ہے۔ گزشتہ ماہ تعلیم اور تعلیمی درس گاہوں کے ماحول اور معیار کے حوالے سے انتہائی صحیح حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے ماہ اسی حوالے سے ایک اور واقعہ دلی صدمہ پہنچائے گا۔ لاڑکانہ کے کینڈٹ کالج میں ایک ذہین بچے کے ساتھ استاد کا اتنا جارحانہ رویہ کہ ہنسی کھلتی زندگی ویران ہوگئی۔ آخر کیوں؟ ایک یہی نہیں بلکہ آئے روز ایسی کتنی ہی درس گاہوں میں اساتذہ کا رویہ طالب علموں کے ساتھ اتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ بچے پڑھنے سے گھبرانے لگے ہیں۔ ذرا سوچئے..... یہ کونسا فکریہ ہے اور وقت کی ضرورت بھی کہ اساتذہ کی تربیت کس قدر اہم نقطہ ہے۔ اس سلسلے میں باقاعدہ اصول اور قوانین مرتب کر کے ان پر کاربند ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بچتی ہے..... آج ہم نئی پود کے ساتھ جو کر رہے ہیں کیا آنے والے کل میں ان کے مزاج اور مضبوط کردار کی کوئی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ بات معمولی سی ہے مگر اس کے اثرات انتہائی غیر معمولی لہذا وقت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے ہمیں تنہائی سے اس طرف سوچنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف عوام کو بلکہ سیاسی اور بااختیار طبقے کو بھی عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ کیا اس میدان میں بھی عسکری قیادت کے تعاون کی ضرورت ہوگی؟ عسکری قیادت جو بغیر خوبی تبدیلی کے ایک خوشگوار ماحول میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جانے والے کو خوش دلی کے ساتھ الوداع کہتے ہوئے نئے سربراہ کو ہم گرجوٹی سے خوش آمدید کہتے ہیں..... کہ آنے والے سنہری کل کے لیے ہم سب کو اپنے آج پر محنت کرنا ہوگی لہذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ نئی نسل، یہ طالب علم، تعلیمی درس گاہ ہیں اور اساتذہ ہمارا قیمتی خزانہ ہیں اور خزانے کی دل و جان سے حفاظت کی جاتی ہے اسے بے دردی سے ختم نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ 2017ء ہم سب کے لیے خوشی، امن اور ترقی کا سال ثابت ہو (المی آئین) اتنی صحیح باتوں اور دعاؤں کے بعد اب ہم چلتے ہیں اپنی میٹھی میٹھی محفل کی جانب۔

✽ رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور، ضلع رحیم یار خان سے شریک محفل ہیں۔ سسٹمز کے اس شمارے کے لیے 14 تاریخ سے ہی ایک اسٹال پر یلغار شروع کر دی۔ اس یلغار کا مقصد حکام اعلیٰ یعنی ابا حضور کا از خود نوٹس تھا کیونکہ غلام بادشاہ کی اگلی قسط کا انتظار شدت سے جاری تھا۔ تین دن کے مسلسل انتظار کے بعد 17 کو سسٹمز موصول ہو گیا۔ سال کے آخر میں نائل گرل شاید جاتے دہر کے لیے اداس تھی۔ درخت پہ ایک عدد تیرہ بیوستہ شدہ دل کو بڑی بے تابی سے چومتے ہوئے آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ ویری نائٹس۔ اشتہاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے نہرست کا بغور جائزہ لینے کے بعد انٹائیپ میں جون ایلیا کے پاس پہنچے جو ہمہ رخ پر لپکھ رہے تھے۔ بہت ہی عمدہ انٹائیپ یہاں اس دفعہ۔ خاص طور پر مغربی دانشور کا وہ قول "اگر کسی کو بولنا نہیں آتا تو اسے بولنا سکھاؤ۔ اس تو بیچ کے ساتھ کہ سب سے پہلے وہ تمہیں گالی دے گا۔" اپنی محفل میں دستک دی تو محمد صفدر معاویہ کو کرسی صدارت کا بوجھ اٹھاتے پایا۔ مبارک! جی۔ مگر ان کے والد صاحب کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ کو صحت کے ساتھ صبر جمیل عطا فرمائے۔ اشفاق شاہین مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ مرحا گل کا تبصرہ بہت کیوٹ اور سویت رہا۔ بینش صدیقی بھی ٹاپ پوزیشن حاصل کرنے پر خوش نظر آئیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اچھا تبصرہ کیا اور مسز صدیقی کے کیا کہنے۔ حسب معمول ابتدائیش محفل سے کی۔ ربین دادا نے علاقے کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کر کے انہیں اپنے حق میں گواہ بنالیا تو فاروق کو بھلا بھالیہ نے اغوا کر لیا۔ جو لیٹ نہ صرف حویلی میں بلکہ نواب اسد اللہ کے دل میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔ عشرت جہاں سے اس کی بالکل نہیں بن رہی اور عالیہ بیگم کی اس پر محبتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ شاید نواب زادی عالیہ اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ آصف خان کے پروپوزل کو جو لیٹ نے سکون سے سن کر مسترد کر دیا ہے۔ فاروق کی بازیابی کے لیے ربین دادا سرگرم ہے اور انسپکٹر وکرم کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ بھالیہ سینٹھ کے پٹ سن کے گودام کو جلانے کے باوجود بھی فاروق نہیں مل سکا ہے۔ ادھر بھلا نے عجیب صورت حال پیدا کر دی ہے۔ علی اختر تصویر لے کر آئے۔ اچھی تحریر تھی۔ واصل ہاشمی کا چھوٹے بھائی سے پیارا چھاگا۔ مگر علی اختر صاحب کہانی کا اینڈ کچھ خاص نہیں کر سکے۔ کہانی کا اینڈ کچھ فیرواح تھا۔ غلام بادشاہ الیاس بیٹا پوری کے قلم کا شاہکار۔ رکن الدین جبرس شجاعت و دلیری کے پیکر کے طور پر سامنے آیا۔ سلطان سیف الدین انتہائی سست اور بزدل نکلا۔ جبرس نے منگول سردار قپو غا کو انتہائی عبرت ناک شکست سے دو چار کیا۔ منگولوں کو منگول طریقہ جنگ سے وھول چٹا دی۔ اس کو کہتے ہیں ان کو ان ہی کے سکون میں ادا ہو گئی۔ ملک صفدر حیات پشت پناہ میں ڈاکوؤں اور مجرموں کے پشت پناہ کی کمر توڑتے نظر آئے۔ ملک صاحب کو ڈانچ دینے کے لیے سلطانہ عرف شادو آئی اور فائل اڑا کر لے گئی۔ ہمیں پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ دات کے اس وقت آنے اور ٹھنڈے شہار موسم میں پانی کا گلاس منگوانا خالی از مقصد نہیں ہے۔ کاشمیل اشتیاق نے مجھے سے غداری کی اور اس کا صلہ بھی پایا۔ سلطانہ چودھری رب نواز کا کام کرنے کے باوجود بھی بے موت ماری گئی۔ چودھری بھی آخر ملک صاحب کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔ شرعباس کی سچتا بھی خوب رہی۔ ڈاکٹر ولیم نے این سے بالکل غیر محسوس انداز میں بدل لیا۔ این کو ڈاکٹر ایما موس میڈسن کی جگہ تعلیمی دوا دیتا رہا اور آکسیجن سلنڈر کا دالیم بالکل کم رکھا اور طوفان کی آمد کی غلط اطلاع دے کر اونچائی کی جانب سفر جاری رکھنے پر مجبور کیا لیکن سودن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ آخر میں ڈاکٹر کی گرل فرینڈ جینی سارے راز سے آگاہ ہو گئی اور پولیس کو ڈاکٹر صاحب کے کمر توڑوں سے آگاہ کر دیا۔ شوق میں پروفیسر تھامسن کے عجیب و غریب شوق پڑھنے کو ملے۔

جنوری 2017ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھامس سارے شوق چھوڑ کر آخر میں سائب پالنے لگا۔ مارٹن کی ساری بلائیں گزریں اور دست چھٹی گزریں اور فیسر کے موجودہ شوق سے ناواقفیت اس کی جان لینے کا سبب بن گئی۔ منظر امام کی مشعل کہانی شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی نظم ماں کا خواب سے ماخوذ تھی۔ گڑیا جو سب کی آنکھ کا تار تھی سب کو روٹا چھوڑ کر چلی گئی۔ اچھی کہانی تھی۔ ماروی میں نئے کرداروں کی آمد اچھی تھی۔ افریقی جادوگر زوہبی کا نانا آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح چلا گیا۔ کالا ماروی کے ہاتھوں جنم واصل ہوا۔ چلو خس کم جہاں پاک۔ عالی کے تیز و تند حملے جاری ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ مستقبل کا مصور نسیم اقبال کے قلم سے ایک بہترین اور شاندار تحریر۔ فوسٹر دنیا بھر کے دھندے کرنے کے بعد نفسیات کی اسٹڈنٹ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو قحطی کا مظاہرہ کر کے سلطانی گواہ بن گیا۔ حیران کن طور پر تصویروں کے ذریعے جو بھی پیش گوئی اس نے کی، وہ بالکل درست ثابت ہوئی۔ کہانی کو اگر اسٹوری آف دی ملٹھ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شاہ دولہ، اللہ کے پیارے انسان کی داستان حیات۔ لودھی خاندان سے تعلق اور پرورش کس انداز میں ہوئی۔ کافی عرصہ ہندو میاں بیوی کی خدمت کرتے رہے اور آخر کار ولایت عطا ہوئی تو ایک جہان ان کا مرید ہو گیا۔ سچ ہے اللہ پاک اپنے بندوں کو ایسے ہی نوازتا ہے۔ شاہ نے تباہی میں نریندر نے قلم اور زندگی کی انتہا کر دی۔ بعد میں اسے فریجہ کے ساتھ کی گئی زیادتی کا خیال آیا تو ہر ممکن طریقے سے اس کا دوا کرنے کی کوشش کی اور اپنی زمینوں اور جائیداد سے بھی دستبردار ہو گیا۔ فریجہ نے جو بدلہ نریندر سے لیا، وہ اس کی سوچ سے بھی دور تھا۔ سچ کو اپنے ہاتھ سے مار کر فریجہ جیت کر بھی ہار گئی۔ وادی کشمیر کے تناظر میں لکھی گئی کہانی دل کو چھو لینے والی تھی۔ اکیلی عورت میں ناہید سلطانہ اختر عورت کے دکھ اور مسائل سے پردہ اٹھاتی نظر آئیں۔ شمیم کا شوہر کھٹوا اور آوارہ ثابت ہوا اور شمیم نے ساتھ ٹکینے اور آئینہ کی زندگی کو بھی جنم بنائے رکھا۔ مرید کی طرح شمیم بھی خاموشی سے اگلے جہان سدھار گئی۔ شمیم نے ساری زندگی تنہا گزار دی۔ آئینہ شادی کر کے انگلینڈ چلی گئی تو مصنفہ بے یار و مددگار کرائے کے گھر میں ہی مر گئی۔ اچھی اور فصیح آموز کہانی رہی۔ محفل شعر و سخن میں اس دفعہ سارے ہی اشعار بہترین تھے لیکن مرزا گل، زوہیب احمد، عالیہ خان، مدحت، کمال انور، زرین آفریدی اور عبدالجبار رومی کا انتخاب سپر ہٹ رہا۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ سال کا آخری شمارہ بالکل پرفیکٹ رہا۔ (بہت شکریہ، اتنی دلچسپی اور محبت سے رسالے کا مطالعہ آپ نے کیا اور اپنی رائے سے آگاہ کیا)

حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ بخاری، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے تو "سب سے پہلے خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملک کے سیاسی اور سرحدی حالات بہتر ہوں۔ انڈیا مقبوضہ کشمیر میں قلم بند کرے۔ برادریم بابر عباس کھاریاں نے پرانے محفل کے ساتھیوں کو یاد کیا اور خاص کر خاکسار کو یاد فرمایا، مہربانی۔ جو غیر حاضر ہیں ان سب کی خدمت میں عرض ہے کہ محفل سسٹمز ڈائجسٹ میں واپس آئیں۔ نئے لکھاریوں کے خطوط بھی بہتر ہیں۔ کہانیوں میں غلام بادشاہ الیاس جیتار پوری کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ مصری جرنل جبرس کے شاندار کارناموں پر محیط ہے۔ اس کا دوری کی شیش گل ایک خوش رنگ تحریر ہے۔ حیدر آباد (انڈیا) کے لوہا جین کے مخصوص ماحول سمیٹی کے دادا پر سیر حاصل تحریر۔ اب اس صاحب سے کہیں کہ جولیٹ صاحب اور فاروق صاحب کو ملا دیں اور ان کی علیحدگی اور تنہائی کو ختم کریں۔ ملک مصنفہ حیات کی پشت پناہ ایک اچھی تحریر ہے اور غلط لوگوں کے قانون کے شکنجے میں آنے کے لیے ملک صاحب نے بہترین کاوش کی ہے۔ محی الدین ثواب کی ماروی ایک مخصوص ذکر کی کہانی، جس میں دیوتا کا ٹکس نظر آتا ہے۔ وہی نیلی شیش کی کرشمہ سازیاں اور نیکی اور بدی کی جنگ کو مصنف نے خوب اجاگر کیا ہے۔ نیا نسیم بلگرامی کی شاہ دولہ بھی نیک اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے کمالات پر محیط تحریر ہے اور اب آخری کہانی اکیلی عورت جس کو ناہید سلطانہ اختر نے تحریر کیا ہے۔ عورت کی مجبوریوں کو اجاگر کیا۔ ناہید سلطانہ اختر ایک معاشرتی مسئلے کو زیر بحث لائی ہیں۔ عورت کے لیے مرد کا سامنا ضروری ہے۔ جو عورتیں مرد کے بغیر زندگی کا تصور رکھتی ہیں، شمیم کی طرح دھکی زندگی گزارتی ہیں۔ ہاں ایک معاشرتی قیامت ضرور موجود ہے کہ مرد حضرات بھی عورت کو جو کہ ان کی زندگی کی ساسھی بن جاتی ہیں۔ نکاح کے بعد ان سے بعض اوقات برا سلوک کرنا شروع کر دیتے ہیں اور انہیں اپنا ساسھی بنانے کے بجائے اپنا محکوم سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کو جسمانی اور ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں۔ ایسا کرنے کی ہمیں اسلام اجازت نہیں دیتا۔ میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کے دوران کافی واقعات دیکھے ہیں کہ جن پر دل کڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا عقل سلیم دے اور صنف نازک اور خاص کر اپنی بیویوں سے اچھا حسن سلوک رکھنے کی توفیق دے۔ آمین۔"

رمضان یا شاہ بخش اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "سب سے پہلے ماروی پڑھنا شروع کی، اس میں حالات و واقعات ایسے تھے کہ ہنسنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ جائے پڑی پڑی آنس کریم بن گئی۔ یہ ہے ماروی کی اس قدر کی تعریف۔ شیش گل نے بھی کچھ ایسے ہی سماں یاد دیے۔ غیر ملکی کہانیوں میں سب سے بہتر مجھے شوق پسند آئی۔ مارٹن کی ساری محنت اور جان اکارت گئی۔ منظر امام نے ہمیشہ ہنسایا ہی ہے مگر اس بار لا دیا۔ مستقبل کا مصور نسیم کی دلچسپی کے لیے کافی مواد موجود تھا۔ رقیہ خاصا اچھی ہوئی اور گنگل کہانی تھی، تبصرہ کیا کروں؟ پسند بہت پسند آئی۔ پشت پناہ ملک صاحب اپنی روایت سے سرمو نہیں بنے۔ یہ کہانی بھی شاندار تھی۔ شاہ دولہ کے بارے میں پہلے کچھ حالات سنے تھے، جو کہ غیر عقلی تھے۔ اب یہ مضمون پڑھ کر سچی اور حقیقی باتیں معلوم ہوئیں۔ نیا نسیم بلگرامی صاحبہ کا شکر یہ۔ تصویر اچھی نہیں تھی، ابھی ابھی سی۔ فکسٹ فاکس ہاں یہ دوسرے سے کوئی کہانی ہی نہ تھی۔ یہ تو ایک حقیقی واقعہ ہے جسے کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے (جناب واقعات ہی کہانی کا روپ دھارتے ہیں) اکیلی عورت اس ماہ کی بہترین کہانی۔ اشعار کی محفل میں ماہین فاطمہ، ریاض بٹ، محمد خواجہ، زرین آفریدی کے اشعار قابل داد تھے۔ زوہیب احمد ملک کا قطعہ بھی دل کو بھایا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے مصنفہ بھائی کو مبارکباد۔ موصوف کا طویل و عریض تبصرہ شاندار تھا۔ اشفاق شاہین آپ کا شکر یہ کہ آپ نے اپنے تبصرے میں میرا بھی ذکر کیا۔ بیش صدیقی صاحب آپ کے مشورے کا شکر یہ۔"

عبدالجبار رومی، انصاری، چوہنگ نی لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں "خوب صورت و شیر کا انداز اور دروہا سے مجھ اسروق بہت اچھا



لگا۔ فہرست میں شیش محل، مشعل اور شکست فاطمہ کہانیوں کے نام زبردست لگے۔ انسانیت زمانوں میں زندہ تھی ہے یا ہوگی؟ جون ایلیا نے ہمدردی میں موجود حالات کا بہت عمدہ آئینہ دکھایا ہے اور آنے والے نئے سال میں اچھے کی امید رکھنے کو فرما رہے ہیں اور ہمارے ملک میں جو ہر نیا سال آتا ہے، وہ سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ کتنی اچھائیاں لے کے آتا ہے۔ بہر حال جون ایلیا کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو آنے والے دور کی باتیں پیش کر گئے ہیں۔ میری طرف سے تمام قارئین کو نیا سال بہت مبارک ہو۔ تعلیمی اداروں میں غشیات جیسی چیزوں کا آنا یقیناً خطرناک بات ہے اور اس پر اب اختیار کا وجود پتلا لڑی ہے تاکہ ہمارا مستقبل کا طبقہ صحت مند اور روشن دماغ ہو۔ محمد صفدر معاویہ اللہ تعالیٰ آپ کے ابو کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ہم آپ کے گم میں برابر کے شریک ہیں۔ محبوب سومرو حاضری لگ گئی؟ مبارک ہو، رانا بشیر احمد ایاز بھرپور تبصرے کے ساتھ عمدہ، اشفاق شاہین کی شرکت بھی لا جواب۔ 22 سالہ ساتھ دوست محمد ویلڈن۔ مرزا طاہر الدین، کچھ بعید نہیں، سوچنا کیا؟ بس عبرت حاصل کریں۔ شکر یہ بینش صدیقی آپ کی باتیں قابل تعریف ہیں۔ بے شک جو دیکھتے ہیں وہ آگے بھی بڑھتے ہیں۔ لیجیے وکرم کی شامت بھی آخر آئی مٹی۔ بے جا رد و مہی توڑ گیا۔ یہ آصف خان تو جو لیٹ کے پیچھے ہی پڑ گیا اور جو لیٹ کا پہلو تھپی کرنا اچھا ہے۔ سلا نے چاقو کو حرکت دی، لگتا ہے؟ چتا نہیں اگلی قسط میں دیکھیں گے، شیش محل میں کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی اسی ای۔ درد تو خود ایک تصویر ہے۔ محبت سے گندمی چھوٹے اور بڑے بھائی نما دوستوں کی کہانی بہت اچھی لگی۔ اسی طرح مصوویت سے بھرپور گزیا کی کہانی مشعل کی صورت میں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے بہت عمدہ لگی۔ پشت پناہ جو خود تو پیچھے رہتا ہے مگر جرم کو آگے ہی آگے پھیلاتا ہے اور وہی اصل مجرم ہوتا ہے جو اپنے آلہ کاروں سے جرم کرواتا ہے۔ ملک صاحب نے بہت اچھے طریقے سے ہاتھ ڈالا رب نواز جنجوعہ پر۔ وقت تو ظالم ہے اگر صرف مٹی پہلو کو دیکھیں تو تب دکھ درد ہی ملیں گے۔ اکیلی عورت نگینہ بندہ علی کی طرح اگر اس نے مثبت پہلو پہ بھی غور کیا ہوتا کہ تمام مرد صفدر کی طرح کے نہیں ہوتے، اچھے بھی ہوتے ہیں تو آخر دم تک اسے بھی کسی کا سہارا میسر ہوتا۔ شکست فاطمہ فریجہ نے بدلہ تو ضرور لے لیا مگر انسانیت کے آگے ہار گئی۔ اگر بچے کو نوادہ پیٹ میں رکھ لیا تھا تو اسے دنیا میں بھی جینے کا حق دیتی، بس حالات کی ستم ظریفی کے آگے بھی بے بس ہوتے ہیں، چاہے وہ کشمیر کی سلتی وادی ہو یا کوئی اور خطہ۔ جب تک اندھیروں کا راج ہوگا تو وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ”میں ہلا کو خان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا بہادروں اور املاہ تدبیر سے خالی نہیں ہو گئی۔“ سلطان رکن الدین ظاہر بھرس واقعی مددگار سلطان کے عہدے کا اہل شخص تھا جو جیسے بدل کر محلوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا جس نے عام لوگوں کو اکٹھا کر کے سپاہ گری سکھائی اور منگولوں کو تیغ کر کے زبردست فتح حاصل کی۔ غلام بادشاہ نے اس دفعہ بہت محظوظ کیا۔ شاہ دولہ نے پیر فقیر ہو کر لوگوں کے لیے عظیم کام کیے۔ جب تک ہندو کے گھر میں رہے تو ان کی ہر بات پہ سر جھکائے رکھا اور جب ولایت کو پہنچے تو حق بات کے لیے ڈٹ گئے اور لوگوں کی راہنمائی میں پیش پیش رہے۔ محفل شعرو سخن میں زویب احمد ملک، سائرہ خزل اور بلقیس خان کے شعر اچھے لگے۔

✽ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تعریف لائے ہیں ”دسمبر کا شمار بہترین سرورق کے ساتھ۔ ایک حینہ کا عالم بے خودی۔ بہت پر اثر انداز۔ انشائیہ، بڑا دلوسوز اور پُر مغز کالم۔ لفظ بے لفظ سچے موتی۔ یہ سال تو رد و محو کر گزرنے والا ہے۔ خون آشام، کبھی ہم دھماکے، گولیاں، ایک طرف ہماری مضبوط فوج۔ ایشی طاقت رکھنے والا ملک، فوج، رینجرز اور ساری فورسز ہمہ تن مشغول ہیں۔ لیکن کیا دہشت گرد ختم ہی نہیں ہو رہے اور اپنے عزائم میں کامیاب بھی۔ ہم کب تک دل تمام کے آؤزاری کریں۔ ہم مذہبی رسومات پر خوف سے کانپ رہے ہیں۔ نورانی کا واقعہ کیا کم اندھ ہنا۔ ہر نئے سال پر ہماری آنکھیں امید سے امن اور زندگی کی راہ دیکھتی ہیں۔ روح تک تھک گئی ہے۔ وعدے سب جھوٹ، اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے پڑوسی ملک کی مہمان نوازی کی لیکن جون ایلیا نے سچ لکھا کہ انہوں نے ہمارے سینوں میں خراج اتار کر اسی کبل میں لپیٹ دیا جو ہم نے ان کو سردی سے بچنے کے لیے اوڑھ لیا تھا۔ اس سال مہنگائی بڑھی، بلوں میں اضافہ، قرض بڑھ رہا۔ بینک بے فائدہ ہم عوام کے لیے حکومت کے لیے فائدہ مند۔ اپنی عمر میں ہر سال تباہی کو بڑھتے دیکھا، اب اگلے سال کی کیا آس لگا میں۔ خطوط کی محفل، یہ محفل کھکشاں کی طرح جگمگاتی ہے۔ پیارے دوست دل کھول کر لکھتے ہیں۔ مٹی چٹھی چاٹ۔ ہر خط میں کوئی نہ کوئی خاص جملہ یا لائن اتنی لا جواب ہوتی ہے جو پورے خط پر چھائی ہوتی ہے۔ محمد صفدر معاویہ نے میدان مار لیا اور صدارت پر براجمان ہیں۔ بہت مبارک۔ ادارے کا کمال ہے کہ اچھے خطوط کو چھاننا اور فیصلہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بینش صدیقی بیٹا آپ نے میرے نام کے ساتھ اور تمام کے ساتھ ”سر“ لکھ کر ہماری عزت افزائی کی، آپ اچھا لکھتے ہیں اللہ آپ کے قلم میں اور طاقت اور جلا بخشنے۔ آئین۔ غلام بادشاہ، بہت بہترین تاریخی کہانی۔ بادشاہ بزدل لیکن ایک سپاہ سالار کی دور نظری شجاعت اور عزم نے خونی منگولوں کو انہی کی جنگی حکمت عملی کو اپنا کر شکست دی اور مسلمان امیر کی شان بڑھائی۔ شیش محل، ایک دلچسپ کہانی۔ واقعات کی سنسنی خیزی۔ کہانی میں مختلف کردار و واقعات کو یکجا کرنا، کہانی کی دلچسپی اور تسلسل کو برقرار رکھنا، یہ لکھاری کا کمال فن ہے۔ تصویر، ایک چھوٹی سی کہانی صرف دو کرداروں پر مشتمل۔ بچوں کی نفسیات اور خواہشات نامکمل کیا کیا اثر دکھاتی ہے۔ پشت پناہ، ایک ایماندار تھانے دار کی حشر سامانی لیے ہوئے بڑی گیمبر کہانی۔ قاتل کی انتہائی مکمل منصوبہ بندی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تھانے دار کی شبیہ دہی اور واردات کا سرا آخر ہاتھ آ گیا۔ پھندا، جرم و سزا کی ایک کہانی جس میں ڈاکٹر کی اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کا غلط استعمال اور جرم کی کوشش ایک لڑکی کی سمجھ بوجھ نے ساری قلمی کھول دی۔ شوق، ایک تنہا شخص اپنی دلچسپی اور زندگی کا سہارا کچھ عجیب عجیب شوق سے پورا کرتا ہے۔ یہی شوق اس کو نقصان پہنچانے والے کی موت کا سامان بن جاتا ہے۔ محفل شعرو سخن، ایک رنگارنگ اور مختلف اشعار کو یکجا کیے ہوئے۔ سارے اشعار اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ لیکن کچھ خاص، رانا بشیر، رمضان پاشا، مرزا گل، ظفر اقبال، احمد علی، زویب احمد ملک، ادیس احمد خان۔ مشعل، ایک چھوٹے سے خاندان کی بڑی دکھ بھری کہانی۔ یہ کیسا دکھ ملا تھا ان کو کہہ دینے پر بھی پابندی۔ مستقبل کا مصور، اس کو ایک فلسفاتی یا تصوراتی کہانی کہا جاتا ہے۔ ایک تصویر کے لیے ایک شخص قاتلانہ حملہ کر کے قتل جاتا ہے لیکن تصویر کا حصول اس کی زندگی بن جاتا ہے۔ لیکن وہ مصور تھا، چادوگر تھا یا کوئی آفت کہ وہ مستقبل کو اپنے کیوں پر

مخل کر تار ہوتا ہے۔ شاہ دولہ کے متعلق سنا بھی اور شاہ دولہ کے چوہے بھی دیکھے۔ لیکن یہ قصہ بہت ہی معلوماتی ہے اور یہ بھی علم میں آیا کہ وہ ولی مظہر دور میں تھے لیکن ان کی کرامات کا ذکر بھی بڑا مفصل ہے۔ فکست فاتحانہ، کشمیر کے اس علاقے کی داستان جہاں ہندوستان کی جارحیت کا روز احوال سننے اور دیکھتے ہیں لیکن ایک ہندو فوجی کا اپنی فطرتی پریشانی ہونا اور کشمیری لڑکی کا قصہ اور خندی طبیعت بڑی عجیب کہانی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اکیلی عورت، ایک مہذب معاشرے اور بھری پری دنیا میں رہنے والی دو بہنوں کی انتہائی الم ناک داستان۔ ایک کوشا دی نے برباد کر دیا۔ دوسری کوشا دی نہ ہونے نے برباد کر دیا۔ گلینہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر ملازمت کے باوجود کوئی مرد نہ مل سکا۔ اس کو اپنی بہن کی دردناک زندگی کے خوف نے کسی بھی مرد کے نزدیک نہ ہونے دیا۔ بہر حال کہانی بہت عمدگی سے تحریر کی گئی۔

سپنس کا دیوانہ محمد شہباز ناز، سبکداری، سرگودھا سے محفل میں حاضر ہیں۔ میری طرف سے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ اس دفعہ نائل گرل نے میرے دل کو خوش کر دیا۔ کیا حسین چہرہ، سنہری بال، فیروزہ کی پزیرے۔ اسے دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی کہ کاش! یہ مجھے مل جاتی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا جس میں ہمیشہ کی طرح اچھی اچھی باتیں کہیں۔ سب سے پہلے منظر امام کی کہانی مشعل پڑھی۔ زندگی اور موت رب کے ہاتھ میں ہے۔ انسان لاکھ کوشش بھی کرے مگر کسی کو نہیں بچا سکتا جس طرح باؤ اور اس کے شوہر نے بہت علاج کروایا لیکن نہیں بچا سکے۔ اچھی کہانی تھی۔ تاہید سلطانہ اختر کی کہانی اکیلی عورت پڑھی۔ جب انسان کے اوپر سے ماں، باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو اس وقت ان کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے گلینہ تمیزہ دونوں بہنوں کی زندگی کو ایک ہی انسان نے جہنم بنا دیا۔ کہانی پڑھتے ہوئے مجھے بہت غصہ آیا صفدر پر۔ اگر ان دونوں بہنوں کی جگہ میں ہوتا تو اس کی ایسی درگت بنا تا کہ زندگی بھر لڑائی جھگڑے کے قابل نہ رہتا۔ ایک سبق آموز کہانی تھی۔ شرعاً اس کی کہانی چند امداد تحریر تھی۔ اس کا قاری صاحبہ کی کہانی شیش محل پڑھی۔ دلچسپ کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی کہانی رقابت پڑھی۔ ایک کچھ نہ آنے والی تحریر تھی۔ الیاس سیٹا پوری کی کہانی غلام بادشاہ کا کوئی جواب ہی نہیں کیا۔ عمدہ لکھتے ہیں۔ زرین قمر کی کہانی فکست فاتحانہ پڑھی جس میں ثریا نے ایک گناہ کے بدلے میں دوسرا گناہ بھی کر ڈالا۔ ہمارے نبی ﷺ فرماتے ہیں جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔ جب سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا تو ثریا کو چاہیے تھا میری زندگی تو برباد ہو گئی تو بچے کو نہ مارتی۔ اسے ایک شرط پر مسلمان کر کے اسی کے ساتھ نکاح کر لیتی تو وہ دونوں کا ازالہ ہو جاتا یعنی اپنی بربادی کے بدلے میں اسے مسلمان کر کے راہ راست پر لاتی، بیٹ کہانی تھی۔ اشفاق شاہین، رمضان پاشا، مرزا گل، بینش صدیقی اور تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ محمد صفدر معاویہ کے والد کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ دعا گو ہوں کہ اللہ اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔

محمد صفدر معاویہ، تحصیل و ضلع خانیوال سے تشریف لائے ہیں۔ اس سال کا آخری شمارہ سرور میں میں 17 نومبر کو ملا۔ سرور کو ایک ماڈل جو اجڑے ہوئے درخت کے ساتھ موجود ہے، ساتھ ہی کسی کے دل میں تیر بھی کہا ہوا ہے۔ محترم جون ایلیا تک پہنچے۔ ہمدردی سال کا بدلنا یا نہ بدلنا ہمارے جیسی قوموں کے لیے ایک جیسا ہے کیونکہ ہم نے بھی اپنا آپ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کا ادارہ یہ پڑھا بجا فرمایا۔ اچھے طالب علم ہی اس ملک کو امداد حیروں سے نکال سکتے ہیں، اس کے لیے ساتھ ساتھ کارول بھی بہت بڑا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ایسا نظام دیں کہ وہ آئندہ اپنے ملک کے لیے روشن ستارے ثابت ہوں۔ اس منشیات کی لت نے تو بڑے لوگوں کو تباہ کر دیا۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے کہ حکومت کو تو فرصت ہی نہیں کہ وہ عوام کی خبر لے۔ وہ تو خود ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں مصروف ہیں۔ ان کو کیا خبر کتنے بوڑھے ہیں جن کو چھت میسر نہیں، اولاد ماں باپ کے ساتھ کیا کر رہی ہے، کون بھوک سے مر رہا ہے، کون پیاس سے مر رہا ہے، ان کو کیا۔ کاش میرا دل بھی پتھر ہوتا کہ میں بھی جب کسی بوڑھے کو 80 سال کی عمر میں بھی مزدوری کرتے دیکھتا تو آنکھیں پھیر کے چلا جاتا پر کیا کروں دل ہر بے انصافی پر خون کے آنسو روتا ہے۔ حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ جب 60 سال کی عمر کو کر اس کرتے تو ان کے لیے معقول و عفیہ دیتی کہ جن کی کوئی اولاد نہیں، وہ اس عمر میں ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں کیا لکھ رہا تھا اور کہاں پہنچ گیا۔ اپنی محفل میں آئے تو خود کو صدارت پر براجمان پایا۔ محبوب مصور اتنی مختصر حاضری۔ اشفاق شاہین، رانا بشیر احمد ایاز کے بہترین تبصرے۔ دوست محمد ویکم کرتے ہیں آپ کو سپنس کی دنیا میں۔ کہانیوں میں ابتدا کی غلام بادشاہ سے۔ رکن الدین بھروس نے کیا خوب مزہ دیا منگولوں کو اب وہ اپنی طاقت دوبارہ حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اب تو بلا کو خان بھی کچھ نہ کر سکے گا۔ شیش محل تک پہنچے۔ فاروق پر اب شاید حملہ کے قتل کا مقدمہ درج کرائے جائیے۔ بہر حال ہر صورت میں بھائیہ اور ربین دادا میں شرم گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ربین بھی پہلے کوئی چال چل جائے۔ ماروی کی طرف آئے تو اب ماروی کی چالوں نے ایک کہانی میں سسٹی پیدا کر دی ہے۔ اب تو دشمن ہر طرف سے گھیرے میں ہیں۔ بھی مراد بھی عالی تو اب ماروی بھی بھاری پڑنے لگی دشمنوں پر، کافی انٹرٹیننگ قسط تھی۔ آخر میں تاہید سلطانہ اختر کی اکیلی عورت بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ سچ ہے کہ اگر عورت اکیلی ہو اور پھر جوان ہو اور اس نے شادی نہ کی ہو تو زمانہ اس پر الزام دھرنے سے باز نہیں آتا۔ اپنے عیب کسی کو نظر نہیں آتے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورت کی زندگی مرد کے بغیر نامکمل ہے اور مرد کی عورت کے بغیر۔ باقی اچھے برے انسان دونوں صنف میں ہوتے ہیں۔ زرین قمر کی فکست فاتحانہ فریڈ کو بچے کو مار کر کیا ملا۔ ایک ظلم تو سہہ چلی تھی پھر بچے کو مار کر بھی خود پر ظلم کیا۔ مارتا ہی تھا تو نریندر کو مارتی۔ فیاض نسیم بلگرامی کے ظلم سے شاہ دولہ کے بارے میں جانا۔ پہلے ہم جب چھوٹے سروالا کوئی بچہ دیکھتے تو بڑے کہتے تھے، یہ شاہ دولہ کا چوہا ہے۔ اب مکمل تفصیل معلوم ہو گئی۔ ملک صفدر حیات کی پشت پناہ پڑھی۔ اس دفعہ ملک صاحب کے ساتھ ساتھ کیا دشمنوں نے کہ اشتیاق کی خبری سے وہ فائل نکلوا لی پھر شادو یا سلطانہ کو بھی مروا دیا پر ملک صاحب نے جو دھری رب نواز کی گردن ناپ لی۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی خصوصاً صاعمہ غزل کا شعر بہت اچھا لگا۔ باقی کہانیوں میں تنویر ریاض کی رقابت، علی اختر کی تصویر، شرعاً اس کی پھندا، شاکر لطیف کی شوق اور نسیم اقبال کی مستقبل کا مصور بھی اچھی رہی۔ سچ میں جو تھوڑی بہت کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں وہ بھی اچھی رہیں۔ (پسندیدگی کا بے حد شکر یہ جناب)

اسحاق انجم، نیشنل پور، قصور سے تشریف لائے ہیں۔ دسمبر 2015ء، جنوری 2016ء اور پھر دسمبر 2016ء تک ہم بہت سے محبت بھرے دوستوں، پیارے پیارے احباب سے محروم ہو گئے۔ سب ہی روتا ہوا چھوڑ گئے۔ نواب صاحب اور کاشف زبیر، اچھے بھلے کام کرتے ہوئے دوستوں سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر دوسرے دہس جا بے ہیں۔ تعلیمی نظام، آپ نے بجا فرمایا۔ اب کیا کیا جائے۔ حکمران اپنے بچوں کو وہاں سے تعلیم حاصل کرنے نہیں بھیجتے جہاں یہ "لوگو" ہے کہ مفت تعلیم۔ ان کے تو بچے ایک قدم بھی ایسے اسکولوں میں نہیں جاتے۔ ٹیکسیز کا قول، ان کو اس نہیں آتا۔ ان لوگوں کا کیا کیا جائے جنہوں نے بانی پاکستان کے کسی قول پر عمل نہیں کیا۔ خدا ضرور ان لوگوں سے انتقام لے گا۔ سرورق دسمبر میں جہاں پتے شاخوں کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں بے وفادار دوستوں کو کیا کہیں۔ انشاء یہی آپ کے خط، سے پہلے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ غلام بادشاہ بھی ہوتے ہیں جو رقابت میں شیش محل، میں لگی ایک تصویر کی خاطر پشت پناہ، پسند، شوق سے قبول کر لیتے ہیں۔ محفل شعر و سخن کی بات ہی کیا ہے۔ ماروی کو مشعل، راہ دکھا دیتی ہے اور یہ دیکھی دلوں کی جان ہے۔ مستقبل کا مصور بھی اچھی گئی۔ شکست فاتحانہ میں تبدیل ہو جانی چاہیے۔ اکیلی عورت کا کیوں نہ ساتھ ہو۔ نئے سال تک اگر زندگی نے وفا کی تو پھر حاضری ہوگی۔ شمارہ دسمبر خوب صورت کاوش ہے۔ ولی مبارک باد۔"

✽ وارث علی، سندھیلیانوالی سے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں "سال 2016ء کا الوداعی یا اختتامی شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ماہ نومبر کی 21 تاریخ میں ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ نائل سرورق بہت زبردست تھا۔ دو تیزہ کسی کے پیار میں مست کھڑی تھی۔ بہرہیں منظر والا منظر دلوں کو بہت بھایا۔ کہانیوں کی فہرست سے ہو کر انشائیہ پڑھا۔ جون ایلیا کی دانائی اور حکمت سے بھری باتوں سے دل کو انسان کے برے رویے سے باہر ہونے سے بچایا کیونکہ بقول ایلیا جی انسانیت زندہ ہے اور زندہ رہے گی، چاہے جتنے زمانے بیت جائیں۔ ادارہ میں مدیر صاحب بھی سال کے تم ہونے پر کافی ڈسٹرب نظر آئے کیونکہ سال نو گزرتے جا رہے ہیں لیکن ہم لوگ ہر لحاظ سے اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں پچھلے دسمبر میں تھے۔ تعلیمی میدان میں پیش رفت کی باتیں جو آپ نے کیں، وہ داد و تحسین ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے لیکن شاید یہاں ایسے لوگوں کی اجارہ داری ہے جو صرف اپنے نقطہ نظر کو ترجیح دیتے ہیں۔ معاشرے کا بڑا غرق ہو تو ہو، ان لوگوں کو اس بات سے کیا۔ خیر اپنے رب کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ ہمارے لیے 2017ء کو نہایت ہی خوشیوں والا بناوے اور ہم پاکستانیوں کو اور پورے عالم اسلام کو کفر و الحاد کے شر سے بچائے، آمین۔ ابھی خط لکھتے ہوئے خبریں آ رہی ہیں کہ بھارت کی طرف سے کنٹرول لائن پر فائرنگ کا سلسلہ بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ماک فوج کے جوانوں سمیت عام شہری بھی بڑی تعداد میں نشانہ بن رہے ہیں لیکن ان ڈھیسوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایک طرف کشمیر میں خون کی ہولی پھیل رہا ہے تو دوسری طرف ایل او سی پر بلا اشتعال فائرنگ۔ یا خدا ہمارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے جو ہمارے ملک کی ذرا سی ترقی پر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ بہر حال ابھی تو ایسا سورج طلوع ہو گا جس دن ہمارے ملک کو اور کشمیر یوں کو انخصوص کوئی تو اچھی خبر بھی ملے گی، انشاء اللہ۔ تمام تبصروں پر سرسری نظر ڈالی۔ کرسی صدارت پر ہمارے پیارے بھائی محمد صفدر معاویہ اپنی شان سے محکمت تھے مبارک ہو صفدر بھائی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کے ابو کو خیر حق رحمت فرمائے۔ والدین کا دکھ تو ہم سب کا سا بھجایا ہوتا ہے۔ وزارت تعلیمی پر محبوب اپنے بہت "بڑے" تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ کیا بات ہے بھئی سومرو کی۔ اشتقاق شاہین میرے پیارے لاہور سے شامل تھے۔ ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ طاہرہ نگار جی اس دفعہ کہاں چلی گئی ہو۔ کہانیوں کی ابتدا اپنی موست فیورٹ گرداب، ادہ سوری شیش محل سے کی۔ اسما قادری بہت اچھی طرح تحریر کو بڑھا رہی ہیں۔ جولیث کو دشمنی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اب تو مذہب کے نام پر بھی ناقدین اسے کافی تنگ کر رہے ہیں۔ آصف خان بدستور اس سے شادی پر خواہاں ہے۔ پلیز اسما جی! آصف خان کو تو وہاں بھیج دیں، فاروق بے چارہ ہنوز جولیث سے بہت دور ہے۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ کی اکیلی عورت آخری صفحات کا حق ادا کر گئی تھیں اور ٹھیک آخر دم تک ایک مرد سے جو چھان چھڑا کیں۔ چھڑاؤ میں بھی تو کیسے؟ مرد کا سہارا آخر "سہارا" ہی ہوتا ہے۔ بتا مرد کے ایک عورت کب تک حالات کا سامنا کر سکتی ہے۔ آئینہ کو باپ سے نفرت ہوئی تو باپ کے کرکوتوں کی وجہ سے۔۔۔۔۔ صرف ایک مرد ہونے کی وجہ سے وہ عورتوں پر حکمرانی کرتا رہا اور آخر میں بے موت مرا۔ بہت سے کالہوں اور ایسے مردوں کے لیے ایک تازیانہ تھی جو عورت کو گھر سے نکال کر ان کی کمائی سے عیش کرتے ہوں۔ نگینہ بے چاری کو کس بات کی سزا ملی؟ آخری وقت تک حکومت کے فرائض کو ادا کین ذمہ داری سمجھ کر ادا کرتی رہی لیکن سرکار نے اس بے چاری کو ایک محبت تک نہ دی۔ ناہید سلطانہ جی! آپ کی بہت گہری نظر سے معاشرے پر۔ آپ سے انتہا ہے کہ پلیز طلبا پر بھی کہانی لکھیں جو کالج اور یونیورسٹی لائف میں اپنی سرگرمیوں میں پتا نہیں کیا کیا گل کھلاتے ہیں یا جو فنی معاملات ہیں ان پر ایک بھر پور تحریر لکھیں۔ ملک صفدر حیات کی پشت پناہ پڑھی۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے ملک صاحب کے کمرے سے فائل لے کر یوں گئی کہ انہیں احساس تک نہ ہوا۔ ملک بھی پھر ایماندار آدمی تھے کہ حالات ان کے ہاتھ آتے گئے اور کڑی سے کڑی پٹی گئی۔ وادی کشمیر کے پس منظر اور کشمیر کے حالات و واقعات کو اجاگر کرتی شکست فاتحانہ بہت اچھی کہانی تھی۔ کام کی مصروفیت کے باعث ابھی اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ آخری صفحات پر طاہرہ جاوید مغل کو بھی لے آئیں۔"

✽ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں "آپ اور آپ کے پورے اسٹاف کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سسٹنس اور اس کے اسٹاف کو ہزاروں برس لمبی عمر دے اور ترقی اور کامیابی دے۔ کئی ماہ بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سسٹنس کو بھول گیا ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم سسٹنس سے محبت کرتے ہیں (بہت شکریہ) دسمبر کا سسٹنس ہاتھوں میں ہے۔ خوب صورت نائل دکش حسین ہر ماہ کی طرح سلسلے وار کہانیاں ماروی اور شیش محل سسٹنس اور ایکشن سے بھر پور ہیں اور کچھ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ ان کہانیوں کی وجہ سے سسٹنس ڈائجسٹ بلند یوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اور بلند یاں عطا کرے۔ سسٹنس ڈائجسٹ کی یہ خاص خوبی ہے کہ اس میں آپ کو ہر نمونہ پر کہانی ملے گی۔ نئی نئی کہانیاں اور نئے موضوع بہت ہی معیاری رسالہ ہے اسی لیے تو ہم اس کے بہت پرانے قاری ہیں۔ میری پیاری آبی! یہ میرا چھوٹا سا خط ہے پلیز میرے بانی فرما کر یہ

خط جنوری کے شمارے بس ضرور شائع کیے گا۔" (جی جناب! آپ کا چھوٹا سا خط حاضر ہے)



✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ناؤن، خانپوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "احباب محفل سے چند ماہ کی غیر حاضری

کے بعد حاضر خدمت ہوں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شمارہ بروقت خرید لیا ہے اس لیے سوچا کہ اپنی محفل میں حاضری دی جائے۔ سروق پر حینہ لڑکھن کے مشہور شغل "دل میں تیر" پر سر لکائے خزاں کا استقبال کرتی نظر آئی۔ ادارہ میں گزشتہ برس پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کی نصیحت کے ساتھ ہی دو محبوب مصنفین کی جدائی کا ذکر پڑھا تو اب صاحب اور کاشف زہیر کی جدائی کا زخم تازہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ آپ نے تعلیمی حالت زار کا درست نقشہ پیش کیا ہے۔ اصل کو چھوڑ کر فردی مسائل میں اساتذہ کو اس قدر الجھا دیا گیا ہے کہ تعلیمی ترقی محض خواب بن کر رہ گئی ہے۔ کرسی صدارت پر محترم صفدر معاذ یہ کو موجود پایا جو اپنے ایوکی رحلت کے بارے میں ساتھیوں کو آگاہ کر رہے تھے۔ اللہ پاک آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ بے شک عظیم سانحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سسٹنس کی تاریخ کا طویل ترین تبصرہ موجود تھا جو محبوب مصور سومرونے لاڈکانہ سے ارسال کیا۔ یہ طویل ترین تبصرہ پوری دو لائنوں پر مشتمل تھا۔ مبارک ہو سومرو صاحب۔ (زبردست) اشفاق شاہین سابقہ ماہ کے شریک محفل دوستوں کی فہرست بتاتے نظر آئے۔ دانا بشیر! بانس پر نہ چڑھا کیس معزز خواتین کو، انہوں نے پھر اترنا ہی نہیں جبکہ محفل کی صدارت صرف ایک ماہ کے لیے ہوتی ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ بھر پور رہا۔ آپ کی تجویز کی ہم بھی تائید کرتے ہیں۔ دوست محمد چارسدہ! بھئی ناٹل میں اس بار کیا خاص بات تھی کہ آپ کو تبصرہ پر آمادہ کر گئی؟ مرحا گل! مٹھا کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟ البتہ یہ بات درست ہے کہ سسٹنس نے اس جدید دور میں بھی اپنا معیار قائم رکھا ہوا ہے اور کئی نئے نئے پڑھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ رمضان پاشا! تبصرہ تھوڑا جارحانہ ہونا چاہیے، اتنی عاجزی اور وہ بھی عورتوں کے سامنے؟ ناک ٹوا دی یاد آپ نے تو۔ محمد شہباز گجر! ماروی کی آخری قسط کا تو بہت سے قارئین کو شدید انتظار ہے، آپ بھی انتظار کرو۔ محترمہ بینش صدیقی صاحب! قلم سے آڑے تر جو مجھے بھیچے گئے الفاظ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پچھلے ماہ کی کرسی صدارت کا مبارک نامہ بھی قبول کریں۔ محمد خواجہ! آپ کے الیاس سیٹاپوری کے بارے میں تجزیے سے اتفاق ہے۔ ان کی تحریر پڑھنے والے کو بے خود کر دیتی ہے اور انسان اپنے آپ کو اسی تحریر کے ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ بقیس خان! ہم بھی ابتدا شیش محل سے ہی کرتے ہیں اور برملا اقرار بھی کرتے ہیں! خوش؟ مسافر بے خانماں! آپ نے گزشتہ کئی شماروں کا "چینی تبصرہ" پیش کر دیا۔ سز صدیقی! آپ ہم سب کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ محفل سے فرصت پا کر اس قدری کے محل "شیش محل" میں جا گئے۔ رہن اور رامو وغیرہ کو اس بار فاروق کی تلاش میں خوب دوڑایا گیا۔ بملا کی فاروق سے محبت بھی عجیب ڈھنگ کی ثابت ہوئی۔ فاروق کے انہماک ہم نے بملا کی طرف سے انتقامی فعل کر داتا۔ تاہم اینڈر پر بملا کے فاروق کے انکار پر کیے جانے والے رد عمل نے حیران کر ڈالا۔ واقعی محبت چیز ہے سمجھنے کی نہ سمجھانے کی۔ شہزادہ کمال کی طرف سے روارکھا جانے والا ظلم

قارئین اور ایجنٹ حضرات

کے لیے

اہم اعلان

جنوری 2017ء کے شماروں سے ادارے کے رسائل ہر ماہ مندرجہ ذیل ترتیب سے تاریخ وار دستیاب ہوں گے

سسٹنس ڈائجسٹ : 15 تاریخ

ماہنامہ سرگزشت : 20 تاریخ

جاسوسی ڈائجسٹ : 26 تاریخ

ماہنامہ پاکیزہ : 30 تاریخ

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز۔۔۔ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM سسٹنس ڈائجسٹ جنوری 2017ء



آخر کار اس کی موت پر ختم ہوا۔ نواب سلیم اللہ محض رفاقت کی وجہ سے نزدیکی میں آئے۔ آصف خان کچھ زیادہ ہی تیز و زور رہا ہے۔ ذرا سانس لے لے بھائی۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانی کی تمناک تحریر "اکیلی عورت" پڑھ کر اس ہو گئے۔ مصنف نے اکیلی عورت کے مسائل اور پریشانیوں کو بہت پراثر انداز میں بیان کیا۔ تاہم دونوں بہنوں کا مصدقہ سے اس قدر بلیک میل ہونا مجھ سے بالاتر لگا (مگر اس کے باوجود یہ سب ہمارے ارد گرد ہی ہوتا ہے) ابتدا کی صفحات پر الیاس سیتا پوری مرحوم بھروسہ کا ذکر کرتے نظر آئے۔ بھروسہ وہ عظیم سپہ سالار جس نے ثابت کیا کہ سنگولوں کو بھی شکست دی جاسکتی ہے۔ سلطان قطز کو اس کی بد عہدی نے ڈوبی۔ ڈاکر کا قصہ چلا تو در داغ کا ماضی یاد آگیا جس میں وہ بالکل ڈاکر کی طرح علیہ کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہو چلا تھا۔ مصنف نے تمام واقعات کو ترتیب سے تحریر کا حصہ بنایا اور کہیں بھی وہ فطرتی محسوس نہ ہوئی جو اکثر تاریخی کتب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ملک مصدقہ حیات کی روداد "پشت پناہ" بھی کافی پر تجسس اور دلچسپ رہی۔ چودھری اور کاشمیل اشتیاق کا گٹھ جوڑ ملک صاحب کے لیے کافی پریشانی کا باعث بنا رہا۔ گاما گانی والا کا کردار بھی دلچسپ رہا۔ سب سے پر اسرار کردار شاو کا تھا۔ علی اختر کی تصویر میں بڑے میاں اور چھوٹا کانگلی مائے کا انداز بچپن کی یاد دلا گیا۔ آخر میں ہونے والا مکمل دل دہلا گیا۔ اللہ سب کے والدین کا سایہ بچوں پر قائم رکھے، آمین۔ شرماس کا چند اتنا سخت تو نہ تھا کہ اس سے نہ نکل سکی۔ جب اسے پتا چل گیا تھا کہ ڈاکٹر اس سے ساہوکار انتقام لے رہا ہے تو اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ منظر امام کی مشعل ایک اصلاحی تحریر ثابت ہوئی۔ کم عمری میں وفات پا جانے والے بچے یقیناً جنت میں جاتے ہیں البتہ والدین کے لیے مبرک کرنا ایک جاں کسل کام ہوتا ہے۔ اللہ سب کو آزمائش سے بچائے۔ شوق اور مستقبل کا مصور گزارے لائق تھیں۔" (طویل اور دلچسپ تبصرے کا شکریہ)

بابر عباس، ماہین بابر، نگینہ روڈ، کھاریاں سے تبصرہ کر رہے ہیں "سرسئی اسپنس کا نیا شمارہ اٹھارہ نومبر کو شام چھ بجے تک اسٹال سے ایسے ملا جیسے اندھے کو آنکھیں ملتی ہیں اور سرورق کو دیکھ کر جھٹکا ایسے لگا جیسے غریب آدمی کو بجلی کا بل دیکھ کر لگتا ہے۔ سرورق کی سوسالہ بوڑھی حیدر میک اپ زور چہرہ لیے شاید گزرے وقت کو یاد کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ درخت پر بنے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر گارہی ہے۔ دل چیز ہے کیا جانناں یہ جان بھی تمہاری ہے۔ فہرست کو دیکھ کر ایلیا صاحب کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں سیدھا بیچا اپنی پیاری مشعل میں۔ دل کو ایک زبردست دھچکا سا لگا۔ سرسئی! آپ نے میرے خط کے ساتھ وہ حشر کر دیا ہے جیسے کہ آج کل انڈین آری پارڈ پر نئے شہریوں کے ساتھ کر رہی ہے (یہ زیادتی ہے بھی ہمارے ساتھ) مجھے امید ہے کہ میرے اس خط کا بھی برا حال ہوگا۔ سرسئی اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی تمام باتیں سچ اور حقائق سے بھرپور ہوتی ہیں میں آئینہ دکھلاتی ہیں مگر انہوں صد انہوں ہم لوگ بے حس ہو چکے ہیں۔ کرسی صدارت پر محمد مصدقہ صاحب موجود تھے۔ مصدقہ صاحب! خدا آپ کے والد صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ کو مہر جیل عطا فرمائے (آمین) محبوب مصدقہ صاحب کیا مختصری حاضر ہی لگوائی ہے دل خوش کر دیا۔ اشتیاق شاہین صاحب تو شاہین ہے پرواز کر ادھی چٹانوں پر۔ ایلیا صاحب کی باتوں کو سمجھنے کے لیے دماغ چاہیے ہوتا ہے۔ سرزا طاہر الدین بیگ صاحب جناب خیر تو ہے بھی آپ تو سب کی تعریف کیے جا رہے ہیں۔ کچھ تعریف مجھ چیز کے لیے بھی بچا کر رکھیں۔ اور بس بھائی کیا کہنے، کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ قربان جاؤں میں آپ کے انداز بیان پر۔ کیا مختصر اور پراثر خط لکھا ہے آپ نے لگتا ہی نہیں آپ وہی اور بس احمد خان ہیں۔ مجھ خواجہ صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ سسپنس ایک معیاری اور خوب صورت ڈائجسٹ ہے۔ یہ ہر ماہ ہمیں خوب صورت اور پیاری سی کہانیاں پڑھنے کو دیتا ہے۔ یہ معراج رسول صاحب کا لگا یا ہوا وہ پورا ہے جس کی آبیاری سسپنس کے اراکین کرتے ہیں۔ بعد میں ہم اپنی اپنی ذہنی بساط کے مطابق رائے دیتے ہیں، کوئی نئی بات کریں۔ واہتی واہ! عبدالباقی رومی انصاری میرے سسرالی شہر اور تاریخی شہر لاہور سے آئے ہیں۔ تم وہی کرو جو روم والے کرتے ہیں، آپ وہ کریں جو لاہور سے کرتے ہیں۔ رومی صاحب چھارے ہیں آپ! فقیر خان صاحب ہر رات کھانا پانا انداز اور ہر انداز جدا گانہ محی الدین نواب صاحب اپنی طرز کے ایک منفرد رائٹر تھے۔ اسی طرح کاشف زبیر بھیا کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔ سسپنس ڈائجسٹ نے اور جاسوسی ڈائجسٹ نے ہمیں بہت سے انمول ہیرے دیے ہیں جن میں محی الدین نواب، عبد القیوم شاہ، اقبال کاظمی، کاشف زبیر، محی الدین نواب، الیاس سیتا پوری، ابوشیخا اقبال شامل ہیں۔ خدا ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ حسب معمول سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر محی الدین نواب کی طلسمی الف ایڈ ماروی پڑھی۔ نواب صاحب وہ رائٹر تھے جن کے آگے الفاظ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔ ماروی زبردست جاری ہے۔ دوسرے نمبر پر اسما قادری صاحبہ کی شیش محل پڑھی۔ سرسئی! یقین کریں شیش محل پر آہستہ آہستہ جمود طاری ہوتا جا رہا ہے۔ اس بار پھر حسب معمول ایک خوب صورت تحریر اکیلی عورت ناہید سلطانی اختر صاحبہ کے قلم سے اکیلی عورت نے وہی مزہ دیا جو کہ اکثر ناہید سلطانی اختر کی تحریریں دیتی ہیں۔ ویل ڈن ناہیدتی۔ ملک صاحب کا کس تو زبردست تھا مگر لمحاتی توفیق کے ساتھ تحریر بڑی کمزور۔ حسام صاحب کچھ توجہ دیں۔ الیاس سیتا پوری صاحب کے کیا ہی کہنے، تاریخ کے بادشاہ تھے اب بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ غلام بادشاہ بھی ان کی ایک خوب صورت تحریر ہے۔ زرین قمر کی شکست فاطمانہ کشمیر کے موضوع پر ایک اچھی اور معیاری تحریر۔ کشمیر کے موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ دیگر رائٹرز نے بھی اپنے اپنے انداز میں سسپنس کی خدمت کی اور اپنی اپنی کہانیوں سے سسپنس کا پیٹ بھرا۔ آنے والا شمارہ نئے سال کا پہلا شمارہ ہے۔ سرسئی! خدا سے یہی دعا ہے آنے والا سال ہمارے لیے امن کا گہوارہ ثابت ہو اور ہر طرف سکون ہی سکون اور امن و شانتی ہو اور ہمارے پیارے جاسوسی، سسپنس، سرگزشت وغیرہ یونہی دن دوئی رات چوٹی ترقی کرتے رہیں۔ آپ سب کو اور محفل کے تمام دوستوں کو میری طرف سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔"

انعم کمال، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں "سسپنس ڈائجسٹ یوں تو 15 کو حاصل کر لیا تھا مگر تازہ سازی طبیعت کے باعث تھوڑا دیر سے مطالعہ کیا لیکن یقیناً جانیں طبیعت کی گرانی کہانیوں کے انتخاب اور لاجواب ہونے کے باعث دور ہو گئی۔ سب سے پہلے خطوط کی محفل دیکھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ ایسا لگا کہ ایک پوری ٹیلی ہے اتنا پیار و محبت تو آج کل کے رشتوں میں نہیں۔ صحیح کہتے ہیں کہ اچھا بھائی ابھی باقی ہے اسی لیے یہ دنیا قائم و دائم ہے۔ اب آتے ہیں

کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی غلام بادشاہ پڑھی۔ انتہائی خوب صورت کہانی ہے۔ لگتا نہیں کہ تاریخی کہانی پڑھ رہے ہیں کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے کہیں بوریٹ کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ ایسا سیتا پوری صاحب کا کمال تھا کہ وہ اس پیرائے میں لکھتے کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب سا جاتا ہے۔ اس کے بعد شیش ٹل پر پہنچے۔ اساقاوری صاحبہ نے کہانی کا ٹیپوٹھوڑا تیز کیا ہے مگر پھر بھی اس میں وہ بات نہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لے۔ کہانی اچھی ہے مگر جملوں کی غیر ضروری طوالت کے باعث بعض دفعہ بوریٹ ہی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ متعدد لوگ اس سے اتفاق نہ کریں۔ بہر حال ہر کسی کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کی آزادی ہے۔ ماری پڑھی۔ تیز تر کہانی ہے مگر حالات و واقعات حقیقت سے کافی دور ہیں۔ ملک صفدر حیات پشت پناہ لے کر آئے۔ ہمیں بس ٹھیک لگی۔ شرعاً اس کی پسند اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر نے انتہائی ہوشیاری سے نقل کیا مگر پھر بھی ثبوت باقی رہ گیا۔ شوق بس گزارے لائق رہی۔ منظر امام صاحب کے کیا کہنے! بہت حساس تحریر تھی۔ پڑھ کے دل اداس ہو گیا۔ بہت بہترین کہانی تھی۔ مستقبل کا مصور بھی بہترین کہانی تھی۔ مصور کا کردار نہایت ہی جاندار تھا۔ جو جو پیشگوئی کی وہ ٹھیک ثابت ہوئی۔ شاہ دولہ کی داستان حیات پڑھی۔ دل ایمان کی، روشنی سے منور ہو گیا۔ ویلڈن ضیا تنسیم بلگرامی۔ شکست فاتحانہ کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اسٹوری آف دی منٹھ ناہید سلطانہ اختر کی اکیلی عورت تھی۔ کہانی نے ہمارے معاشرے کی بہت سی تلخ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھایا۔ حقیقت سے انتہائی قریب تر کہانی نے دل کو چھو لیا۔ نہایت ہی صحت آموز کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اشعار شامل کیے گئے۔ نئے سال کا شمارہ بہترین تھا۔

✽ رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے محفل میں شریک ہیں "محمد صفدر معاویہ محفل پر نظر ڈالتے ہی کرسی صدارت پر آپ کا نام دیکھا تو بہت خوش ہوئی ہے۔ جیسے ہی آگے بڑھے افسوس ناک خبر پڑھنے کو ملی۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ رب کا نجات آپ کے والد کے درجات بلند کرے گا۔ بیماری بھی جسم کا ایک صدقہ ہوتی ہے اور اچھی اولاد صدقہ جارہے ہوتی ہے۔ آپ آج جس اعلیٰ مقام پر ہیں آپ کے والدین آپ کے ساتھ ہیں۔ میلاد النبی کے موقع پر آپ کے والد کے لیے ضرور خصوصی دعا کروائی جائے گی۔ ویسے تو آپ فوجی بھائی جہاں کھڑے ہوتے ہیں وہی جگہ ہم بن جاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ کے صدارتی خط میں میرے نام کا تبصرہ بھی ہے۔ آپ کی بیماری کا پڑھ کر سب کو بہت دکھ ہوا۔ پشت پناہ، ملک صاحب کی سبھی کہانیاں پڑھنے کے لائق ہوتی ہیں۔ وہ بہت ہی محنت سے کیس حل کرتے ہیں لیکن یہ کہانی انہی کی پرانی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ بس تھوڑا بہت رد و بدل ہے۔ تصویر میں مصنف نے مصور کو اس احساس سے روشناس کرایا جو ہمارے پاس ہوتا ہے مگر ہم تب بھی اس کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ مصوروں کو چیلنج کیا گیا ہے، ایسا شاہکار بنا کر دکھائیں۔ پسند امیں ڈاکٹر نے اپنا جرم چھپانے کے لیے خود کو اتنا مصروف کر لیا کہ ثبوت مٹانا ہی بھول گیا۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں اس میں خود گر جاتے ہیں۔ کاش امیں اس کا انجام دیکھ سکتی۔ شوق جس کا ہر لفظ سانس سے بھرا تھا، کہانی ختم کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ کہانی کے انجام نے دل بھی کر دیا اور چونکا بھی دیا۔ بہترین کہانی۔ محفل، مصنف نے کہانی میں دینی اور مذہبی اہم بات بتائی ہے کہ مرنے والے کے لیے قرآن اور سنت پر عمل کریں۔ ان کو یاد کرنے، ثواب پہنچانے کا بہترین راستہ قرآن ہے۔ جب بھی ان کی یاد آئے، غم ستائے قرآن پاک کے ذریعے اللہ سے باتیں کریں، دل کو سکون ملے گا۔ مستقبل کا مصور میں مصور نے دوسرے کے مستقبل کی پیش گوئی کر کے اس کو طرح طرح کی تکلیفوں سے گزارا۔ بن حاتم معذور بھی ہو گیا اور تصویر جیسا بن گیا۔ مستقبل نے ایک اچھے بھلے انسان کا مستقبل تباہ کر دیا۔ نہ مصور کو کچھ ملا۔ کاش مصور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی معلوم کر لیتا۔ شکست فاتحانہ میں مصنف نے صرف دو کرداروں کے ذریعے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی بے بسی، لا چاری اور مجبوری کو ظاہر کیا جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ فریجہ نے اپنے بچے کو ایک برا انسان اور غیر مسلم ہونے سے بچالیا۔ اکیلی عورت میں ثمنیہ اور ثمنیہ کی سمجھ نہیں آئی، یہ کس قسم کی عورتیں تھیں۔ اپنی دل بھر کے بے عزتی کرواتی تھیں۔ اس کی بہن ثمنیہ بہن کو چھوڑتی نہیں تھی جبکہ ثمنیہ کے میاں میں کوئی برائی نہیں تھی اور پھر بھی اسے اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ گھرانہ کا اپنا تھا، ثمنیہ الگ گھر بھی نزدیک لے سکتی تھی۔ ثمنیہ مردوں کو برا بھی کہتی تھی اور ساتھ بھی رکھا ہوا تھا۔ بڑی ہمت تھی۔ آخر میں مصنف نے عورت کو کہانی کے کردار کی عورت کو اتنا گرا دیا (رضوانہ صاحبہ! اچھی آپ نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ عورت زندگی کے کس کس مقام پر کس کس آزمائش سے گزر رہی ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کو کس طرح بلیک میل کیا جاتا ہے۔ مصنف کی نظر یقیناً معاشرے کے اس گھناؤنے پہلو پر بہت گہری ہے۔ بہت سی جگہوں پر عورت کو انتہائی غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہے) دوست محمد، مرزا طاہر الدین بیگ، ادریس احمد خان، عبدالباقی رومی اور زرین آفریدی کا تبصرہ خوب تھا۔ تاریخی کہانی میں ہم واقعی اسی دور میں پہنچ جاتے ہیں اور اسلامی کہانی پڑھ کر دل اور ذہن کو پاکیزگی ملتی ہے اور خطاؤں سے دور ہوتے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں جاوید صدیقی نند والہ یار، مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ اور زرین آفریدی، حیدر آباد کے شعر خوب تھے۔ اس سال کے آخر اور نئے سال کی آمد میں پیارے نئی تخلیق کی آمد بھی شامل ہے حضرت محمد ﷺ کی محبت میں ایک شعر ہے۔

امت کے مقدر میں جو تھے، وہ دکھ تو نے اٹھائے

اسلام ہمیں بڑی سہولت سے ملا ہے

دعا ہے کہ سب مسلمان قرآن اور سنت کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کر لیں۔ اگر مسلمان چلا پھر تا قرآن کی تصویر بن جائے تو وہ حافظ بھی ہے۔ زندہ ہے تو غازی ہے، فوت ہو گیا تو شہید ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

پائندہ خان، سلیمان خیل، شیخوپورہ، عالیہ ملک، نامعلوم مقام، محمد اقبال، کراچی، ظہیر احمد، لاڈکانہ، ناہید یوسف، اسلام آباد، مبش، حیدر آباد۔ نازیہ علی، کوئٹہ، رمشا کنول، لاہور، ثاقب خان، کراچی، نسیم اختر، بہاولپور، یاسمین خان، پشاور، شاہین اقبال، سکس، صابھر، پٹنہ

سپینس ڈائجسٹ جنوری 2017ء

دور کوئی بھی ہو جب بھی تاریخ کا حصہ بنتا ہے تو کوئی نہ کئی انفرادیت لیے ہوئے ہوتا ہے... جیسے منگولوں کا طویل ترین عہد... وہ جو دنیا کے بیشتر حصوں کو فتح کر چکے تھے مگر ایک مقام پر حلیفوں کی تلاش پر مجبور ہو گئے... ان وحشیوں کا سیلاب جو ہر بلند و پست کو خس و خاشاک کے مانند بہاتا چلا آ رہا تھا وہاں اپنی تندی و تیزی کھو بیٹھا اور جب ایک غلام نے دو بڑی طاقتوں کو آپس میں ٹکرایا تو ہلاکو خان کو ادراک ہوا کہ اصل جنگ کسے کہتے ہیں۔ وہ جو حقیقی بازی گرتھا مصر میں بیٹھا ڈور ہلا رہا تھا۔ بڑی بڑی قوموں کو پیروں تلے کچل کر خوش ہو جانے اور آزاد ممالک کو خاک و خون میں نہلا دینے والوں کو دریائے تیریک کے شمالی ساحل پر تاریخ کی فیصلہ کن شکست دے دی گئی۔ وحشی منگول سب کو ہرا سکتے تھے مگر مشیت ایزدی کو نہیں جس نے ایک سفاک فاتح کے غرور کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا اور آنے والی اقوام کے لیے عبرت کا سامان پیدا کر دیا کہ ان کے عروج اور فتح کے راز کو یہی نہیں بلکہ ان کی الم ناک شکستگی کی وجوہات کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے آنے والے کل کے بارے میں لائحہ عمل طے کرنے میں ہی عافیت اور اطمینان ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

**آخری
معرکہ**
الیا س سیتا پوری

**Downloaded From
Paksociety.com**



تردی اپنے نسب نامے کی رو سے گندریا تھا لیکن جب منگولوں نے ایشیا اور ایشیائے کوچک کے سبزہ زاروں کو اپنے مویشیوں کے جہنم میں اتار دیا تو دوسرے ہم پیشہ خاندانوں کی طرح یہ بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے دادا کے پاس دو ہزار جانور تھے لیکن اس کی زندگی ہی میں یہ گھٹ کر آٹھ سو رہ گئے۔ پھر جب دادا کا انتقال ہوا تو تردی کا باپ اس کا جائیں قرار پایا۔ کچھ عرصے بعد تردی کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا اور خاندان کی کفالت کا سارا بوجھ تردی پر آن پڑا۔ تردی کا کنہہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک بیوی، دو بیٹے، ایک دس سال کا ہوا دوسرا بارہ سال کا، ایک بیٹی آٹھ سال کی۔ پانچواں خود تردی۔ بڑے لڑکے کا نام جوزی، چھوٹے کا نام صارو تھا۔ لڑکی کا نام سلو قیہ تھا۔ تردی کے آٹھ سو مویشی آہستہ آہستہ ان سپاہیوں کی نذر ہوتے چلے گئے جو اکثر و بیشتر اس کے گاؤں کے سامنے سے گزرتے رہتے تھے کیونکہ اس کا گاؤں فوجوں کی گزرگاہ میں واقع تھا۔

جب چنگیز خان کے بڑے بیٹے جو جی اور اس کی اولاد نے حکومت شروع کی تو اس علاقے میں امن وامان قائم ہو گیا لیکن اب تردی بالکل برباد ہو چکا تھا۔ وہ گندریا تھا اور گندریا ہی رہتا چاہتا تھا لیکن قدرت اور قسمت اس سے اس کا آبائی پیشہ چھین لینے پر مصر تھیں۔ بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اس نے لکڑہارے کا پیشہ اختیار کیا لیکن خانوں کی حکومت نے جنگلات کو سرکاری املاک قرار دے دیا اور تردی بد قسمتی سے لکڑہارا بھی نہ بن سکا۔

یہ برقاقی خان کا زمانہ تھا۔ چنگیز خان کے پوتے برقاقی خان کا زمانہ جو مسلمان ہو چکا تھا۔ تردی نے برقاقی خان تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کی آنکھیں فن سپاہ گری کے ماہرین کو قدر و منزلت کی بلند یوں پر قائم دیکھ رہی تھیں اس لیے اب وہ خود بھی برقاقی کی فوج میں ملازمت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی جید و جہد اور کوششوں کے آگے آگے اس کی تقدیر سفر کر رہی تھی۔ برقاقی کے آدمیوں نے اس کو برقاقی تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔

پتھر کا ایک مکان جس میں دو کمرے اور ایک صحن تھا۔ کمروں پر شہتیر اور گھاس پھوس بچھا کر چھتیں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ پرندے چھتوں کے گھاس پھوس کو اٹھا اٹھا کر لے جاتے اور ان سے اپنے گھونسلے بناتے۔ جہاں جہاں سے گھاس پھوس کم ہوا تھا، وہاں سے کمرے میں بیٹھ کر آسمان کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ تردی زمین پر چادر

بچھائے لیٹا ہوا تھا اور چھت کے روزنوں سے وہ نیلے آسمان کا نظارہ کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر چند چوٹیوں پر پڑی۔ یہ چوٹیاں قالے جتنی کوئی چیز اوپر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھیں لیکن وہ دیوار پر زیادہ دور جانے سے پہلے ہی قالے جتنی چیز سمیت لڑھک کر نیچے فرش پر آ جاتیں۔ چوٹیاں ایک بار پھر اس جنگلی کروندے کو اپنی گرفت میں لیتیں اور اوپر چڑھنا شروع کر دیتیں اور دوبارہ پھسل کر نیچے آ جاتیں اور ایک بار پھر اپنی سابقہ کوشش میں مشغول ہو جاتیں۔

تردی سوچتا، آدمی اور حیوان میں کتنا فرق ہے۔ کم از کم انسان ان چوٹیوں جیسی حماقت نہیں کر سکتا۔ چوٹیوں کے فضول اور یکساں طرز عمل نے اس کو بد مزہ کر دیا تھا۔ اس نے چوٹیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچنے لگا وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی پوری داستان تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک چوٹیوں کا خیال اسے پھر آ گیا اور اس نے دیوار پر انہیں تلاش کیا، دیوار کے نچلے اور نصف حصے تک چوٹیوں کا کہیں پتا نہ تھا پھر اس نے انہیں زمین پر تلاش کیا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھیں۔ اس نے سوچا پھر یہ چلی کہاں گئیں؟ اچانک اس کی نظریں چھت اور دیوار کے سنگم پر جا پڑیں۔ چوٹیاں اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ گھاس پھوس کی چھت بالکل ان کے قریب تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھاس پھوس میں کہیں غائب ہو گئیں۔ تردی کے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ جید و جہد، لگاتار جید و جہد، سعی، مسلسل سعی۔ کوشش، متواتر کوشش، عمل پیہم عمل، کامیابی کا راز اسی میں ہے۔

تردی نئی امنگوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صحن میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اوپر فضا میں باز کسی پرند پر جھپٹ رہا تھا۔ سہا ہوا بدحواس پرند باز کو چپک بھیریاں دے رہا تھا، وہ بھی اوپر چلا جاتا اور بھی نیچے آ جاتا۔ کبھی آگے بڑھ جاتا، کبھی پیچھے ہٹ آتا۔ باز بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ آخر پرند تھک سا گیا اور باز نے اسے دبوچ لیا۔

تردی نے اسے بھی اپنے حق میں تائید غیبی سمجھا اور وہ قدرت کے اشاروں کے معانی و مطالب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیوی اور بچے دور کھڑے اس کی اصل کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تردی کسی مفہوم تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور

ماں کو روتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔

☆☆☆

تردی باہر نکلا اور اس شاہراہ پر چل پڑا جس پر سے بے شمار لشکر گزر چکے تھے اور اسی راستے پر مشرق میں شاہراہ سے ملحق وہ مشہور چراگاہ تھی جس میں شاہی مویشی چرا کرتے تھے۔ تردی نے سوچا۔ اگر ان مویشیوں کو کسی طرح یہاں سے ہٹا کر جنگل میں چھپا دیا جائے تو؟

تردی کو اس خیال نے بہت زیادہ خوش کر دیا۔ وہ چلتے چلتے اور دوڑتے بھاگتے دوپہر تک اس چراگاہ میں داخل ہو گیا جہاں برقائی خان کے مویشی گھاس کھانے میں مشغول تھے۔ تردی گزرگاہ اور چراگاہ کی حد فاصل پر بیٹھ گیا۔ چراگاہ کے اندر، دور جہاں بڑے بڑے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا، وہاں دو آدمی چادر اوڑھے سوئے ہوئے تھے۔ ان مویشیوں میں گائے، بکریاں، دنبے، بھیڑیں اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ تردی کی رال بٹھنے لگی، وہ سوچتا۔ اے کاش یہ سارے مویشی مجھے مل جاتے تو کیا سحر آتا۔

تردی سوچ رہا تھا کہ وہ ان مویشیوں میں سے کسی کی چوری کرے کہ پکڑا نہ جائے اور چپ چاپ لے کر فرار ہو جائے۔ اس کی نظر انتخاب گھوڑے پر پڑی کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر وہ فرار ہو سکتا تھا لیکن دوسرے مویشیوں کو چرا کر وہ بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے چراگاہ میں داخل ہو گیا اور چوری کے لیے ایک چنگیرے گھوڑے کو پسند کیا۔ وہ یہ آہستگی اس کے پاس گیا اور اس کے پاس کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ اس کا پیٹ سہلانے لگا۔ اب اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ گیا تھا۔ وہ گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر سوار ہو کر بغیر لگام کے فرار ہو سکتا تھا جو بظاہر مشکل اور خطرناک تھا۔ وہ پکڑا بھی جاسکتا تھا اور فرار ہوتے ہوئے پیچھا کرنے والوں کے تیروں سے زخمی یا ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے انجام کی پروا کیے بغیر اچھل کر گھوڑے پر قبضہ کیا اور پھر ایال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دونوں رانوں سے گھوڑے کو دبا کر بھاگنے کا اشارہ کیا۔ گھوڑا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑے کی ٹاپوں نے دونوں سونے والوں کو بیدار کر دیا۔ انہوں نے نیم غنودگی میں تردی کو گھوڑے پر سوار بھاگتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنی چادریں تو پھینکیں ایک طرف اور دوسرے گھوڑوں پر بیٹھ کر تردی کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

راستے میں چنگیرے گھوڑے نے اکڑنا اور الف ہونا

اس نے غیر ارادی طور پر خود سے کہا۔ ”وہ مارا..... میں سمجھ گیا تیرا مطلب۔“

بیوی بچوں کو شب گزرا کہ شاید تردی یا گل ہو گیا ہے۔ بیوی ناصیہ آگے بڑھی اور تردی کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ”کیا مارا؟ کس کا مطلب سمجھ گئے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟“

تردی نے خود کو بیوی کے سامنے جوابدہ جو دیکھا تو گھبرا گیا۔ بولا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، میرا دماغ بھی درست ہے۔ تو کیوں خواجخواہ پریشان ہو رہی ہے؟“ بیوی نے اصرار کیا۔ ”نہیں! اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے تم سے جو پوچھا ہے تم اس کا جواب دو پہلے۔“

تردی نے بیوی ناصیہ کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا اور جواب دیا۔ ”میں نے دو حیرت انگیز مناظر دیکھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں ان دونوں مناظر میں انسان اور خصوصاً میرے لیے بڑی عبرت اور حکمت کا سامان ہے۔“ بیوی کی نظریں تردی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ”یعنی کون سے دو مناظر؟ کیسی عبرت اور کہاں کی حکمت؟ بات ذرا صاف صاف کرو۔“

تردی نے جب یہ دیکھا کہ اب جان نہیں چھوٹے گی تو اس نے دونوں مناظر کی تفصیل بھی بتادی، بولا۔ ”جیوتھیوں کی جدوجہد میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ ہر جاندار کو جیتے جی تھکنا اور ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور باز کے منظر میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ شکار کرو تو شکار ملے گا ورنہ کچھ نہیں۔“ بیوی نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ارادے ہیں؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”بیوی! ابھی تک میں معمولی پرند تھا چنانچہ فوجی باز میرے سارے مویشی چٹ کر گئے، اب میں باز بنوں گا اور شاہی اور سرکاری مویشیوں پر ہاتھ صاف کروں گا۔“

بیوی نے کہا۔ ”نہیں! خبردار ایسا نہ کرنا ورنہ وہ عقاب، باز کو بھی چٹ کر جائیں گے۔“

تردی کو اپنی سوچ اور اس کے خوشگوار نتائج پر پورا یقین تھا جواب دیا۔ ”اگر وہ عقاب بن گئے تو میں بھی عقاب بن کر دکھا دوں گا کیونکہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔“

بات ختم ہو گئی مگر بیوی کو تردی کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ تردی باہر نکل گیا۔ بچوں نے اپنی ماں کو کھیر لیا۔ ماں نے انہیں چٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”بچو! مجھے تو تمہارے باپ سے باتیں کر کے ایسا لگا، گویا وہ پاگل ہو چکے ہیں۔ اب اس گھر کا کیا ہوگا؟“

شروع کر دیا۔ تردی اس کو ڈانٹ رہا تھا۔ "ارے حق! تو یہ کیا کر رہا ہے؟" پھر معلوم نہیں کس طرح گھوڑا سیدھا ہو گیا اور سر پٹ بھاگنے لگا۔ دونوں پیچھا کرنے والے بھی بمبشٹ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے تردی نے اپنا راستہ بدل دیا۔ وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ وہ اس جنگل کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا مگر اس کا پیچھا کرنے والے اس جنگل کے بارے میں تردی جتنا علم نہیں رکھتے تھے۔ دونوں نے تردی کو جنگل میں داخل ہوتے جو دیکھا تو ذرا سہم گئے کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ اس گھنے جنگل میں درندے ہو سکتے ہیں۔ وہ جنگل کے پاس رک گئے اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے اور اپنے آئندہ کے طرز عمل پر سوچنے لگے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "اب کیا کیا جائے؟" دوسرے نے جواب دیا۔ "واپس چلا جائے اور اس واردات کی خبر خان کے فوجیوں کو دے دی جائے۔" پہلے نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ "اور ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "کچھ پتا نہیں، خدا ہی جانے کیا حشر ہوگا ہم دونوں کا۔" دونوں کچھ دیر یوں ہی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد واپس چلے گئے۔

تردی کچھ دیر تو جنگل میں ہی رہا، اس کے بعد دوسرے کنارے پر باہر نکلا اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھا۔ انہوں نے تردی کو ایک چنگبرے گھوڑے پر سوار جو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ بیوی گھوڑے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پوچھا۔ "یہ گھوڑا کہاں سے لے آئے؟"

تردی نے کہا۔ "میرے پاس تیرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

بچے بھی باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بیوی نے پوچھا۔ "یہ کہاں سے چرلائے؟" تردی نے تیوریاں چڑھائیں، بولا۔ "خبردار جو بے نیکی باتیں کہیں مجھ سے۔ جب تک میرے مویشیوں پر ڈاکا پڑتا رہا تو، تو نے اس قسم کی زبان استعمال نہیں کی اور اب میں جو ایک گھوڑا نکال لایا تو، تو اسے چوری قرار دے رہی ہے۔"

بیوی نے کہا۔ "خدا خیر کرے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں؟"

تردی نے کہا۔ "بیوی! میں نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مویشیوں کی چوری کا پیشہ اختیار کروں۔ خدا مجھے معاف کرے، میرے ساتھ بڑی زیادتی ہو چکی ہے۔ میں اپنے مویشیوں کے خسارے کو پورا کر کے یہ پیشہ ترک کر دوں گا۔"

بیوی نے بددلی سے کہا۔ "اس معاملے میں، میں تم سے اتفاق نہیں کروں گی۔ خان کے آدمی اپنے گھوڑے کے چور کا پیچھا کریں گے اور جب یہ چور پکڑا جائے گا تو پتا نہیں اس چھوٹے سے کنبے کا کیا حشر ہو۔"

تردی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "میں اس جگہ کو بھی چھوڑ دوں گا اور کسی پہاڑی کھوہ کو اپنا مسکن بنالوں گا۔ کسی ایسی کھوہ میں جہاں تک دوسروں کا پہنچنا دشوار ہو۔" بیوی نے کہا۔ "جو چاہو کرو۔ میں کیا کر سکتی ہوں لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔"

تردی نے سب کو یکجا کیا اور انہیں جنگل میں چھپا دیا اور خود گھوڑے پر بیٹھ کر دوسرے شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ وہ خان کی دسترس سے دور نکل جانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چند دن اس کام کو تنہا کرے گا پھر اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لے گا اور جب جمعیت بڑی ہو جائے گی تو وہ اپنے اس پیشے کو دلیری سے انجام دے گا اور گروہ بنا کے ادھر ادھر کی بستیوں پر تاخت و تاراج کیا کرے گا اور اسی تنگ دود میں ہو سکتا ہے وہ کسی علاقے کا حکمران بن جائے۔

وہ گھوڑے پر سوار البرز کی پہاڑیوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ ایک پہاڑی کے نیچے چراگاہ میں اس نے بہت سارے گھوڑوں کو چرتے دیکھا۔ اس نے ان کے رکھوالوں کو نظروں سے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کو بھی اسی چراگاہ میں لے گیا۔ یہاں اس نے اونچی اونچی گھاس کے کنارے ایک آدمی کو چادر میں منہ چھپائے لیٹا ہوا دیکھا۔ یہ کچھ دیر دور ہی سے اس بات کا اندازہ لگاتا رہا کہ یہ آدمی سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔ سویا ہوا شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ تردی اپنے گھوڑے کو بالکل اس کے قریب لے گیا اور اسے آہستہ سے آواز دی۔ "برادر عزیز! کیا اپنے کو پانی مل جائے گا؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، بلکہ اس کے خراٹوں نے تردی کو خوش کر دیا۔ وہ چراگاہ کے گھوڑوں میں گیا اور ایک گھوڑے کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر اپنی

تردی غصے میں جھینٹنے لگا۔ "جاؤ، جاؤ تم سب مجھ کو چھوڑ دو حالانکہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تم سب کے لیے کر رہا ہوں۔ میں تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہوں اور میں تمہارے بغیر رہ کر دکھاؤں گا۔"

ناصر نے اپنے بچوں کو ساتھ لیا اور اپنے گھر واپس چلی گئی۔

جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچی تو اس نے اپنے گھر کو خان کے آدمیوں سے گھرا ہوا پایا۔ باہر تین آدمی کھڑے ہوئے تھے اور اندر بھی کچھ موجود تھے۔

ایک سپاہی نے ناصر کو اپنے بچوں کے ساتھ آتا دیکھ لیا اور دوڑ کر اس کو پکڑ لیا۔ "عورت! تو کہاں رہتی ہے؟"

ناصر نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔۔ میرا اپنا گھر، کیوں؟"

سپاہی نے جواب دیا۔ "ہم خان کے چور کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ اسی چور کا گھر ہے۔"

ناصر نے شرم سے سر جھکا لیا۔

سپاہی نے شور کر کے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا۔ "دوستو! ہمیں جس چور کی تلاش ہے اس کے بیوی بچے ہمارے قبضے میں ہیں، اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دس سپاہی اور آگے اور انہوں نے ناصر اور اس کے بچوں کو حراست میں لے لیا۔

ناصر نے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہمارا قصور؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "تیرا شوہر چور ہے۔ وہ خان کا گھوڑا چروا لیا ہے، اس کا پتا بتا ورنہ تم سب کو قید کر دیا جائے گا۔"

ناصر نے جواب دیا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ میرا شوہر کہاں چلا گیا۔ میں خود اس کی تلاش میں گئی تھی اور مایوس ہو کر تمہارے سامنے واپس آئی ہوں۔"

ایک پُر رعب اور وجیہ سپاہی جوان سب کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ ناصر کے قریب گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا۔ "عورت! ذرا میری طرف دیکھ اور بتا کہ تیرا شوہر کہاں ہے؟"

ناصر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جواب دیا۔ "میں نے اس سوال کا جو جواب دیا، وہی ہزار بار دوں گی۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔"

سردار نے کہا۔ "عورت! اگر تیرے پاس ہر سوال کا یہی جواب ہے تو میں بھی اس بات پر مجبور ہوں کہ تم سب کو اس وقت تک قید میں ڈال دوں جب تک تیرا شوہر ہمیں نہ

طرف گھسیٹا۔ جب یہ گھوڑا اس کے گھوڑے کے برابر آگیا تو اس نے اپنے گھوڑے کو بھگانا شروع کر دیا۔ دوسرا گھوڑا بھی کچھ دور اس کے ساتھ چلا مگر پھر اڑنے لگا۔ تردی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس نے دوسرے گھوڑے پر چابک استعمال کیا اور اس کو آگے آگے بھگانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس نے دونوں گھوڑے درختوں کے ایک جھنڈ میں باندھ دیے اور خود اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ بیوی نے پیدل آتے دیکھا تو پوچھا۔ "وہ گھوڑا کہاں چھوڑ آئے؟"

تردی نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "ایک گھوڑا اور لے آیا اور ان دونوں کو درختوں کے ایک جھنڈ میں باندھ آیا ہوں۔"

بیوی چپ ہو گئی۔ تردی کوئی نیا منصوبہ بنا رہا تھا۔ دونوں لڑکے اور لڑکی اس کے پاس کھڑے اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا وہ اپنے باپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ تردی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تمہیں مجھ سے کچھ پوچھنا ہے؟"

بڑے لڑکے جوزی نے پوچھا۔ "ہم اپنے گھر واپس کب جائیں گے؟"

تردی نے جواب دیا۔ "پتا نہیں۔"

لڑکی سلو قیہ نے پوچھا۔ "پھر کس کو پتا ہے کہ ہم گھر کب جائیں گے؟"

دس سالہ صارو نے کہا۔ "لیکن ہمیں پتا ہے ہم گھر ضرور جائیں گے۔"

تردی نے حیرت سے پوچھا۔ "تجھ کو کیا پتا ہے؟ تو گھر کب واپس جائے گا؟"

جوزی نے جواب دیا۔ "ہم نے ماں سے اپنے گھر واپسی کا سمجھوتا کر لیا ہے۔ آپ جہاں چاہیں رہیں لیکن ہم اپنے گھر واپس جائیں گے۔"

تردی غصے میں بیوی کی طرف بھاگا۔ "ناصر! یہ بچے کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا تو بچوں کے ساتھ گھر واپس جانا چاہتی ہے؟"

ناصر نے جواب دیا۔ "ہاں! صرف میں ہی نہیں، میرے بچے بھی میرے ساتھ واپس جانا چاہتے ہیں۔"

تردی نے پھر کر پوچھا۔ "مگر کیوں؟ آخر کیوں؟"

ناصر نے جواب دیا۔ "میں اور میرے بچے نہ تو اس کھوہ میں رہ سکتے ہیں اور نہ ہی خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کر سکتے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

سپنس ڈائجسٹ جنوری 2017ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مل جائے۔“

ناصیہ بے بس ہو گئی، بولی۔ ”لیکن یہ تو ظلم ہوگا ہم پر۔“
سردار نے جواب دیا۔ ”مگر یہ ظلم ہم نہیں، تیرا شوہر تم سب پر کر رہا ہے۔“

خان کے سپاہیوں نے پورے کنبے کو گرفتار کر لیا اور انہیں گھوڑوں پر لاد کر چلے گئے۔

ان دنوں برقائی خان ہلاکو خان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مشغول تھا۔ یہ تیاریاں دریائے تیریک کے شمالی ساحل پر بحیرہ کیپسین کے کنارے کنارے جاری تھیں۔ خود برقائی خان کا نوجوان بھتیجا نوگائی قفقاز کے جنوبی حصے میں دریائے سمور کے جنوبی ساحل پر یہ دیکھنے آیا ہوا تھا کہ ہلاکو خان کی فوجی سرگرمیوں کا کیا حال ہے کیونکہ اس نے سنا تھا کہ ہلاکو خان، منگو خان کی موت کی خبر سن کر قراقرم واپس جاتے جاتے اچانک رک گیا ہے۔ یہاں سے نوجوان نوگائی نے ہلاکو خان کے منگول دستوں کو ادھر ادھر چھاپے مارتے دیکھا۔ اس نے جگہ جگہ چوکیاں قائم کیں۔ اپنا جاسوسی نظام پھیلا دیا اور ہلاکو خان کو ایک سرسری سا پیغام بھیج دیا۔ ”ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔ تم اپنی افواج کو قفقاز سے دور رکھو۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ ہم دونوں آپس میں خواہ مخواہ دست و گریباں ہو جائیں۔“

ہلاکو خان کو عین جالوت میں اپنے نامور فوجی جنرل قطبوغا کی شکست اور اس کے قتل کی خبریں مل چکی تھیں اور وہ قراقرم کے بجائے مصر واپس جانا چاہتا تھا تاکہ مملوک سلطان بھرس کو اس کی زیادتیوں اور جسارتوں کا عبرتناک جواب دے سکے لیکن اس دوران اچانک اس کے خبروں نے یہ خبر دی کہ برقائی خان اس کے عقب سے ایک بڑا حملہ کرنے والا ہے۔ ہلاکو خان کو مجبوراً آذربائیجان میں ہی رک جانا پڑا اور برقائی اور نوگائی کے مقابلے کی تیاریاں کرنا پڑ گئیں۔

تردی کے کنبے کو گرفتار کرنے والا فوجی دستہ اس کے کنبے کو اپنے ساتھ لے کر نوگائی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس وقت نوگائی اپنے خیمے سے نکل کر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے اس کنبے کو دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ انہیں میرے پاس کیوں لایا گیا؟“

اس بار ناصیہ بڑی دلیری سے بولی۔ ”خان! ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”کیا زیادتی ہوئی ہے تیرے ساتھ؟“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”میرے شوہر نے گھوڑا

چرایا۔ میں اور میرے بچے اس سے لاعلم رہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس نے جو ہم کو میرے شوہر کے بدلے میں گرفتار کیا ہے یہ کس حد تک انصاف کہلائے گا؟“
نوگائی جاتے جاتے رک گیا، بولا۔ ”عورت! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”تو کیا چاہتی ہے عورت؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں اور میرے بچے تردی کے جرم اور گناہوں کی سزا نہیں پاسکتے۔“

نوگائی اس عورت کی بہادری سے متاثر نظر آ رہا تھا، بولا۔ ”بے شک عورت تو ٹھیک کہتی ہے۔ تو اپنے گھر واپس جاسکتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ جب تیرا شوہر تردی پکڑا جائے گا تو تم سب کو ایک بار پھر میرے پاس حاضری دینا ہوگی۔“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”بے شک! لیکن میں اپنے شوہر کے جرائم سے برأت کا اظہار کرتی ہوں اور میں یا میرے بچے سزا میں حصہ بخر نہیں کر سکتے۔“

نوگائی نے ناصیہ اور اس کے بچوں کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

ناصیہ اپنے گھر واپس پہنچی تو بہت تھکی تھکی سی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ تردی جو کچھ کر رہا تھا، وہ بہت خطرناک تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ تردی جس روز بھی پکڑا گیا، وہ خود تو سزا پائے گا ہی لیکن اس سے ناصیہ اور بچے بھی محفوظ نہیں رہیں گے اور تردی کی عدم موجودگی میں گھر کا خرچ چلانا ناصیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ دو دن تک قاتے سے پڑی رہی۔ اس کے دونوں لڑکے جنگل سے پھل توڑ لائے مگر ان پھلوں نے اناج کی جگہ نہ لی اور ان کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ ناصیہ کو اپنی فکر زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے تینوں بچوں کی طرف سے زیادہ فکر مند تھی۔

تیسرے دن آدمی رات کے بعد کسی نے ناصیہ کے کمرے کے در پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ بچے سو چکے تھے لیکن ناصیہ جاگ رہی تھی۔ اس نے دستک کی مخصوص آواز سے آنے والے کو پہچان لیا تھا، بولی۔ ”جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔“

میرے شوہر پر رحم کرو۔ اسے چھوڑ دو، یہ تو بہ کر کے نیک آدمی بن جائے گا۔“

لیکن تردی نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ ”اری تو اپنی زبان بند نہیں رکھے گی۔“ پھر زریں خیل کے آدمیوں سے کہا۔ ”میری بیوی نہیں جانتی کہ میں کتنا برا ہوں۔ میں چھوٹوں گا تو پھر چوری کروں گا۔“

بچوں کو بھی بیدار کر دیا گیا کیونکہ نوگائی کی عائد کی ہوئی شرط کے مطابق تردی کی گرفتاری کے بعد پورے کنبے کو دوسری بار نوگائی کے دربار میں حاضری دینی تھی۔

بچوں نے بیداری کے بعد جو منظر دیکھا، اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ باپ تردی رسیوں سے جکڑا ہوا ان کے سامنے پڑا تھا اور ماں بے بسی اور مجبوری سے ایک ایک کی صورت تک رہی تھی۔

آخر ماں نے بچوں کو حکم دیا۔ ”میرے بچو! جیسا کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ تمہارا باپ پکڑا گیا۔ یہ لوگ اس کو پکڑ کر نوگائی کے دربار میں لے جائیں گے اور ان سب کے پیچھے ہم بھی چلیں گے کیونکہ ہم نے نوگائی سے اس قسم کا ایک معاہدہ کر رکھا ہے۔“

ان لوگوں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور اسی وقت ان سب کو لے کر نوگائی کے دربار کا رخ کیا۔

جب یہ لوگ بحیرہ کسپین کے مغربی ساحل کے سامنے شمال میں سر کر رہے تھے تو انہیں ایک جگہ ہلا کو خان کا ایک ہراول دستہ نظر آیا۔ یہ لوگ خود کو اس دستے کی نظر سے بچاتے ہوئے نوگائی کے قریب پہنچ گئے۔

نوگائی اپنی فوج کے ساتھ خیمے ڈالے ہوئے پڑا تھا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ تردی چار گھوڑوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے اور اب وہ بہت جلد نوگائی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تو اسے بڑا دکھ پہنچا۔ تردی کو خیمے میں اپنے بیوی بچوں کے پاس ہی رکھا گیا تھا۔ ناصیہ محسوس کر رہی تھی کہ رسیوں کی سخت بندش نے تردی کو بہت پریشان کر رکھا ہے مگر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے شوہر کے حال پر رونا آ رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ”کیا تم سخت تکلیف میں ہو؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں، رسی کی سخت بندشیں میری کھال کو ہٹا کر گوشت میں پہوست ہوتی جا رہی ہیں۔“

ناصیہ رونے لگی، آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ مجبوری ہے۔“

باہر سے سرگوشی میں جواب دیا گیا۔ ”ناصیہ! میں چار گھوڑے اور سونا لے کر آیا ہوں۔ دروازہ کھول، تیرے سارے ولد تدرور ہو جائیں گے۔“

ناصیہ نے دروازہ کھول دیا۔ تردی نے کمزور روشنی میں اپنے بچوں کو سوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنے بچوں کی آنکھیں سوتے میں بھی کھلی ہوئی دیکھیں۔ ان کے گال پچک گئے تھے اور ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ تردی نے پوچھا۔ ”کیا میرے بچے بیمار ہیں؟ ان کی صحت کو کیا ہوا؟“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”انہیں کیا ہوگا؟ جن کا باپ ہی نہ ہو، انہیں محرومی کے سوا کیا بیماری ہو سکتی ہے۔“

تردی نے بیزار سے بیوی کو گھورا۔ ”عورت! تو ہوش میں تو ہے، یہ کیا بک رہی ہے؟ ان بچوں کا باپ تو ان کے پاس کھڑا ہے۔“

ناصیہ نے اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دیا۔ ”تمہاری وجہ سے ہمیں زریں خیل کے خان کے بھتیجے نوگائی کے دربار میں قیدی بن کے جانا پڑا۔ اس نے مجھے اور میرے بچوں کو اس شرط پر چھوڑا ہے کہ جب تم گرفتار ہو جاؤ گے تو ہمیں ایک بار پھر اس کے دربار میں حاضری دینا ہوگی۔“

تردی نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میں نے ایران میں اپنا ایک ساٹھی پالیا ہے۔ وہ میرے پیٹے میں حصے دار بن گیا ہے۔ وہ ایران میں رہائش کے لیے ایک گھر بھی فراہم کرے گا، بے صبری عورت! مصیبت کے دن گئے، عیش کے دن آ گئے۔“

لیکن ابھی تردی کی بات صحیح طرح پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے کمرے میں کئی آدمی داخل ہو گئے۔ تردی نے انہیں پہچان لیا۔ یہ زریں خیل کے خان کے آدمی تھے۔ اس نے بیوی کو اس کے حال پر چھوڑا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ آنے والوں میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ”تردی! اب مت بھاگ۔ تیرے سارے راستے بند کیے جا چکے ہیں۔“

تردی نے باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا کیونکہ مکان کے چاروں طرف نوگائی کے آدمی موجود تھے۔

گرفتاری کے بعد اسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ ناصیہ سے یہ دل دوز منظر نہیں دیکھا گیا۔ اس نے نوگائی کے سپاہیوں کی خوشامد کی۔ ”بھائیو! تم میرے دینی بھائی ہو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

تردی نے کہا۔ "اس وقت اس خیمے میں ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو میری بندشیں ڈھیلی کر سکتی ہے۔"

ناصر نے جواب دیا۔ "مگر تم اس ہوا میں بھی نہ رہنا کہ ہمیں ہمارے سوا اور کوئی نہیں دیکھ رہا۔ نوگائی کے آدمی کسی نہ کسی بہانے اندر آ جاتے ہیں اور ہمارا جائزہ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔"

تردی نے کہا۔ "لیکن اس کے باوجود اگر تو چاہے تو میری بندشیں ڈھیلی کر سکتی ہے۔"

ناصر کو اس بے شرم انسان پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ جھنجھلا کر بولی۔ "مگر میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ یہ کام نہ کرو لیکن تم نہیں مانے اور آج میرے سامنے جس حال میں بھی ہو، میری روح کو زخمی کر رہے ہو۔"

تردی نے ڈانٹ کر کہا۔ "باتوئی عورت! یہ کیا محبت جتائے چلی جا رہی ہے۔ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو اس کا عملی ثبوت دے اور میری بندشیں ڈھیلی کر دے اور اگر یہ معمولی سا کام تیرے بس میں نہیں تو یہاں سے دفعان ہو جا اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔"

ناصر ڈرتے ڈرتے اٹھی اور تردی کی بندشیں ڈھیلی کرنے لگی۔ جب وہ ذرا ڈھیلی ہو گئیں تو تردی نے کہا۔ "ذرا اور....."

ناصر نے کہا۔ "اب تو یہ خاصی ڈھیلی ہو چکی ہیں، بس اتنی ہی کافی ہیں۔"

تردی نے پھر غصے کا اظہار کیا۔ "عجیب بے ہودہ اور بے وفا عورت ہے۔ جب اتنی ڈھیلی ہی کر دی ہے رسی تو پھر کھول کیوں نہیں دیتی تاکہ میں ان موذیوں کے چنگل سے نکل بھاگوں۔"

ناصر خوفزدہ ہو گئی، پوچھا۔ "جب تم یہاں سے فرار ہو جاؤ گے تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

تردی نے بے مروتی سے جواب دیا۔ "تو اپنا حشر سوچ رہی ہے اور میں اپنے حشر سے خوفزدہ ہوں مگر یہ طے ہے کہ جب میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا تو باہر نکل کر تجھے بھی رہائی دلانے کی کوشش کروں گا۔"

ناصر نے بڑے کرب سے کہا۔ "تردی! تم چور تو تھے ہی، اب خود غرض بھی ہو گئے ہو۔ میں تمہیں نہیں کھول سکتی۔"

تردی نے دانت اور دونوں پاؤں کی مدد سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی اور ناصر سے کہا۔ "ناصر! میں....."

تجھ کو خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تو اب بھی حسین ہے۔ میرا خیال ہے میری عدم موجودگی میں تو نے خان کے کسی سپاہی یا سردار کو پسند کر لیا ہے اور اب تو مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

ناصر مشتعل ہو کر کھڑی ہو گئی، چیخ کر بولی۔ "تردی! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ کہیں تم نشے میں تو نہیں ہو؟ تم مجھے ایسا سمجھتے ہو۔ افسوس افسوس۔ جی چاہتا ہے کہ میں خود تمہیں ہلاک کر دوں۔ تم بہت زیادہ ذلیل اور گھٹیا ہو چکے ہو۔"

ناصر کی چیخ نے پہرے کے نیم خوابیدہ سپاہیوں کو بیدار کر دیا۔ وہ بھاگ کر اندر پہنچے اور پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کس نے کس کو مارا..... ہمیں بتاؤ تاکہ اس کبخت کی خبر لیں۔"

تردی اندھیرے میں ناصر کو گھور رہا تھا، بولا۔ "ناصر! اب تو خوش ہو جا۔ سپاہی بیدار ہو کر اندر آ چکے ہیں۔ اب میں یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکوں گا اور شاید مجھ پر مقدمہ چلے گا اور میں سزا پا جاؤں گا اور تیری راہ کا ایک پتھر ہٹ جائے گا۔"

ناصر رونے لگی۔ "لوگو! خدا کے لیے اس کی زبان پکڑو۔ یہ مجھے گالیاں دے رہا ہے، مجھ کو ذلیل کر رہا ہے۔"

ایک سپاہی نے تردی سے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

تردی نے جواب دیا۔ "میرے پاس آؤ بھائی! بات مجھ سے پوچھو۔"

وہ سپاہی تردی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ تردی نے ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب والا! اگر آپ لوگ یہاں آنے جاتے تو یہ عورت مجھ کو رہا کر دیتی۔ یہ مجھ سے خوشامدیں کرتی رہی کہ میں جیل سے فرار ہو جاؤں لیکن میں نے یہ کہا کہ میں مقدمے کے فیصلے سے پہلے ہرگز فرار نہیں ہوں گا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے پریشان کرتا رہے گا۔"

ناصر، تردی کے جھوٹ اور الزام تراشی پر حیرت زدہ رہ گئی، بولی۔ "تردی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

تردی نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ میں درست کہہ رہا ہوں اور میں بدرجہ مجبوری کہہ رہا ہوں۔ میں نے چوری جیسا رکیک فعل انجام دے کر خود کو اپنی ہی نظر میں گرا لیا ہے۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اور گھناؤنا کام کروں۔"

ناصر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سپاہیوں سے کہا۔ "میرا شوہر مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔"

لیکن سپاہیوں نے تردی کی بات کا یقین کیا اور ناصر

عبرت حاصل کریں۔“

تردی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”بدترین سزا موت کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے کیا؟ مگر میں موت سے نہیں ڈرتا۔ آپ کو جو سزا دینا ہو دے دیجیے۔ ویسے آپ ایسا کر نہیں سکتے گے۔“

نوگائی نے غصے میں پاؤں پٹخا اور کہا۔ ”میں تجھ کو ایسی سزا دوں گا جو موت سے بھی بدتر ہوگی۔ آخر تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”غصہ کر کے اپنی توانائی کیوں ضائع کر رہے ہیں؟“

نوگائی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”تردی! ہمیں ہمارا گھوڑا واپس کرے اور جرمانے میں مزید نو گھوڑے اور دے۔۔۔۔۔“

تردی ہنسا۔ ”لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں دس گھوڑے دوں گا کہاں سے؟“

نوگائی نے اپنے فیصلے کا بقیہ حصہ سنا دیا۔ ”اگر تردی دس گھوڑے نہیں دے سکتا تو اس کی بیوی بچے سخت سرکار ضبط کر لیے جائیں گے اور سرکار ان بچوں اور اس کی بیوی کو بیچ کر جرمانے کی رقم وصول کر لے گی۔“

تردی کی ساری خوشی اور ساری چالاکی دور ہو گئی، وہ چیخا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہوگا مجھ پر۔“

نوگائی کے فیصلے پر فوراً ہی عملدرآمد ہوا اور تردی کے بیوی بچوں کو نوگائی کے خیمے سے ملحق خیمے میں قید کر دیا گیا۔

تردی نے پوچھا۔ ”کیا میں رہا کر دیا جاؤں گا؟“

نوگائی نے جواب دیا۔ ”تو بھی غلامی میں لے لیا گیا ہے۔ میں تجھ سے بھی کام لوں گا۔ تو میرے چند آدمیوں کے ساتھ ہلا کو خان کے پاس جائے گا۔ یہ لوگ

چند ماہ ہلا کو خان کے مہمان رہیں گے اور تو ان کی خدمت کرے گا اور ہاں، غور سے سن، اگر تو نے ان کے پاس سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو یہ تجھے کسی رو رعایت کے بغیر ہلاک کر دیں گے۔“

تردی نے درخواست کی۔ ”نوگائی بہادر! میں آپ کی زندگی بھر خدمت کروں گا۔ آپ میرے بیوی بچوں کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔“

نوگائی نے جواب دیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔“ اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اس کے پاؤں میں لکڑی کی بیڑی ڈال دی جائے۔“

اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کی گئی کہ کاٹھ کی ایک وزنی موٹی اور لمبی دھنی کے سوراخ میں اس کا پاؤں ڈال دیا

اور اس کے بچوں کو تردی کے خیمے سے نکال دیا۔ جب سپاہی دوبارہ اس کے خیمے میں داخل ہوئے تو تردی نے کہا۔ ”میرے بھائیو! تم سب نے دیکھ لیا کہ مجھ میں شریفانہ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ لوگ نوگائی کے روبرو میری سفارش کریں، شاید کام بن جائے۔“

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”بہر حال کوئی کوشش کرے یا نہ کرے، میں تمہاری کام ضرور کروں گا۔“

تردی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جمابھیاں لینے لگا۔ تین دن اور تین راتیں قید خانے میں گزارنے کے بعد تردی کو نوگائی کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔

نوگائی بہت مصروف معلوم ہوتا تھا۔ اس کے آس پاس اس کے امراء تھے اور بالکل پہلو میں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوگائی کے تخت کے پاس تردی کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔

ناصرہ اور اس کی تینوں اولادوں کو تردی کے دائیں طرف بٹھا دیا گیا تھا۔

نوگائی نے تردی سے پوچھا۔ ”تو نے ہمارا گھوڑا چرایا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے ایک گھوڑا چرایا تھا۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”وہ گھوڑا کہاں ہے؟ واپس دے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں نے اس گھوڑے کو فروخت کر دیا تھا۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”کس کے ہاتھ؟ وہ شخص کہاں ہے تاکہ اس سے گھوڑا واپس لیا جائے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”وہ تاجر تھا جو اسٹھان جا رہا تھا۔ اب میں اس کو کہاں تلاش کروں؟“

نوگائی کو تردی پر غصہ آ رہا تھا، بگڑ کر پوچھا۔ ”کیا تو اس گھوڑے کے عوض کوئی دوسرا گھوڑا دے سکتا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”اس وقت میرے پاس چار گھوڑے ہیں، آپ لوگ اس میں سے ایک گھوڑا لے کر اپنا نقصان پورا کر سکتے ہیں۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”یہ چار گھوڑے تیرے پاس کہاں سے آئے؟“

تردی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”چوری سے۔“

نوگائی غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”تو کتنا بے غیرت اور بے شرم انسان ہے۔ میں تجھ کو بدترین سزا دوں گا۔ ایسی سزا کہ چوری کا پیشہ اختیار کرنے والے تیرے انجام سے

برقائی نے جواب دیا۔ ”میرے آدمی تیری مدد کریں گے۔“
تردی نے کہا۔ ”اور اگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا تو؟“

برقائی نے جواب دیا۔ ”اگر گھوڑوں اور مویشیوں کو ہماری طرف ہٹکا نہ سکو تو انہیں ہلاک تو کر سکو گے۔ میرا مطلب ہے کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار کر بھی تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔“

تردی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، ایسا کر سکتا ہوں۔“

برقائی خان نے اسے اپنے پاس سے رخصت کر دیا۔ اس کو آزادی مل گئی اور وہ اپنے کام کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ برقائی والگا کے کنارے اپنے شہر واپس چلا گیا۔ نوگائی گویا اس کو بھول ہی چکا تھا۔ برقائی کے جانے کے چار دن بعد تک نوگائی نے تردی کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ حالانکہ تردی اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

ایک دن نوگائی نے اچانک اس کو طلب کر لیا، اس وقت نوگائی تقریباً بیس آدمیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے تردی کو ان سب کے سامنے کھڑا کر دیا اور ان بھوکوں سے کہا۔ ”یہ تردی تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔ یہ بظاہر تو تمہاری خدمت کرے گا لیکن در پردہ یہ ہلاکو خان کے گھوڑوں اور مویشیوں کو ادھر ہٹکا لانے کی کوشش کرے گا اور اگر یہ اس میں ناکام رہا تو پھر یہ گھوڑوں اور مویشیوں کو ہلاک کر کے ہلاکو خان کو کمزور کر دے گا۔“ اور تردی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تردی۔ تم ان سب کو اپنے سے برتر اور اعلیٰ سمجھو گے اور ان کی خدمت کرو گے مگر در پردہ تم وہی کرو گے جو چچا برقائی خان کا حکم ہے۔“

تردی کے ذہن پر بیوی بچے چھائے ہوئے تھے مگر وہ ان سے اسی وقت مل سکتا تھا جب وہ مراغہ سے بائیل و مرام واپس آ جاتا۔

وہ اپنے خیمے میں بے خبر سویا ہوا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے خیمے میں دو آدمیوں کے ساتھ اپنی بیوی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ خیمے میں ایک دو شاخہ موم بتی جل رہی تھی۔ تردی کو ایسا لگا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”ناصیہ! یہ تو ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟“

ناصیہ نے جواب دیا۔ ”یہ خواب نہیں... تردی! حقیقت ہے۔ تو مراغہ جا رہا ہے اور میں تجھ سے ملنے آئی

گیا۔ تردی اس دھن کو ہلا جلا بھی نہیں سکتا تھا۔ جہاں بٹھایا گیا تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا۔ یہیں کھانا پانی بھی مل جاتا اور یہیں خیمے کی دیوار سے ٹیک لگا کر نیند مار لیتا۔ خیمے کی نرم اور ملائم دیوار اسے وہ سہارا اور آرام نہیں دے سکتی تھی جو کوئی پتھر کی دیوار دے سکتی تھی۔

اس دوران برقائی خان بھی نوگائی کے پاس آ گیا۔ برقائی خان نے تردی کے عجیب و غریب مقدمے اور فیصلے کی تفصیل سنی اور تردی کو ککڑی کی بیڑی سے نجات دلانی اور اسے حکم دیا۔ ”تو مسلمان ہے تردی اور میں بھی مسلمان ہوں۔ تو نے گھوڑوں کی چوری کی، اسلامی شرع میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے لیکن یہاں ابھی اسلامی شری سزائیں نہیں دی جا رہی ہیں اور ہم لوگ فی الحال وہی سزائیں دے رہے ہیں جو ہمارے یہاں رائج ہیں۔ میں نے تجھ کو رہائی دلا دی، جیسا کہ نوگائی نے کہا۔ تجھ کو میرے ایک وفد کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس جانا پڑے گا۔ جب تو وہاں سے بخیر و خوبی واپس آ جائے گا تو میں خود تیری سزائیں تخفیف اور رعایت کی بابت سوچوں گا۔“

تردی نے عرض کیا۔ ”لیکن خان بابا! میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟“

برقائی نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ جب تو واپس آ جائے گا تو میں اس پر غور کروں گا۔“

تردی نے مایوسی سے کہا۔ ”لیکن اس وقت تک تو میرے بیوی بچے فروخت ہو چکے ہوں گے۔“

برقائی نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔“

تردی نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔ ”تب پھر میں بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میرے ذمے جو کام بھی کریں گے، میں اس کو بڑی جانفشانی اور دیانت داری سے انجام دوں گا۔“

تردی کو ایک خیمے میں رکھا گیا اور کئی دن برقائی نے بطور خاص اس کو سمجھایا۔ ”دیکھو تردی! تم ایک شاطر انسان ہو۔ تم ہلاکو خان کے گھوڑوں اور مویشیوں کو اس نظر سے دیکھنا کہ اگر انہیں ہٹکا کر یہاں لے آیا جائے تو کتنی دشواری یا آسانی پیش آئے گی۔ میں ہلاکو خان کی سوار فوج کو کمزور کر کے اسے تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد ہلاکو خان سے جمنٹا چاہتا ہوں۔“

تردی نے عرض کیا۔ ”اتنا زبردست کام میں اکیلا کس طرح انجام دوں گا؟“

ہوں۔“ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

تردی نے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر یہ دونوں کون ہیں؟“

ناصر نے جواب دیا۔ ”نوگائی کے ملازم۔ ہم دونوں ان کی موجودگی میں ایک نقشہ ملاقات کر سکتے ہیں۔“

تردی نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو دونوں آدمیوں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ”نہیں! تم دونوں درمیان میں فاصلہ رکھ کر مل سکتے ہو، ہاتھیں کر سکتے ہو۔“

تردی نے سرد آہ بھری۔ ”ناصر! یہ کیسا وقت آن پڑا ہے ہم دونوں پر۔“

ناصر نے بھی بڑی اداسی اور مایوسی سے کہا۔ ”کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ مویشی یا گھوڑے چرانے کا پیشہ مت اختیار کرو مگر تم نہیں مانے اور آخر کار اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خان بابا (برقائی خان) نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے اس کا کام اس کی مرضی کے مطابق انجام دیا تو وہ مجھے رہا کر دے گا اور شاید میرے بیوی بچے بھی میرے حوالے کر دیے جائیں۔“

دونوں آدمیوں نے بمشکل آدھ گھنٹا ان دونوں کو یکجا رہنے دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں کی منت سماجت اور خوشامد کی پروا کیے بغیر ناصر کو لے کر چلے گئے۔ اس مرحلے پر

تردی نے سوچا کہ وہ خان بابا کی ہدایت پر عمل نہ کرے اور ہلاکو خان سے مل کر سارا بھانڈا پھوڑ دے لیکن جب اس نے اس کا انجام سوچا تو سرد پڑ گیا۔

ایک دن وہ نوگائی کے وفد کے ساتھ مراغہ روانہ ہو گیا۔ تردی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وفد ہلاکو خان سے کیا بات کرے گا؟

یہ بڑا پریچ کوہستانی راستہ تھا۔ ندی نالوں نے بھی ان کی راہ روکی لیکن یہ لوگ راہ کی ہر دشواری کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ

ہلاکو خان کی حدود میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ برقائی خان کے وفد نے انہیں بتایا کہ وہ ہلاکو خان کے لیے ایک خاص پیغام لے کر مراغہ جا رہے ہیں اس لیے انہیں جانے دیا جائے۔

سرحدوں کی نگہبانی کرنے والوں نے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد انہیں مراغہ جانے دیا۔ مراغہ کے باہر ان لوگوں نے ہلاکو کے عظیم الشان لشکر کے خمیوں کو میلوں میں پھیلے دیکھا۔ یہاں ہر طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فوجی

ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان فوجیوں نے اس وفد کے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا جو انہی جیسے لباسوں میں ملبوس اور انہی جیسے تندرست و توانا تھے لیکن تردی ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ دیووں میں ایک چھوٹا سا انسان یوں لگتا تھا، گویا لمبے چوڑے انسانوں میں ایک بونا پھنس گیا ہو۔

تردی نے گھوڑوں کے اصرار دیکھے اور اس کا دماغ منصوبے بنانے لگا۔

انہی فوجیوں میں سے چند جوان باہر نکلے اور وفد کو اپنے گھیرے میں لے لیا لیکن اس وفد کے سردار نے ان جوانوں کو متنبہ کیا۔ ”ہم برقائی خان کا ایک خاص پیغام لے کر ہلاکو خان کے پاس آئے ہیں اس لیے ہم سے کوئی

ایسا سلوک نہ کرو جو نازیبا اور تکلیف دہ ہو۔ کل تم میں سے کچھ لوگ برقائی کے پاس بھی جاسکتے ہیں اور تم سے بھی ایسا ہی جف آمیز سلوک کیا جاسکتا ہے۔ بس ذرا اس کا

خیال رہے۔“

لیکن جوانوں نے اسی حصار میں انہیں ہلاکو خان کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت ہلاکو خان اپنی چیمپی بیوی دو قوز سے بائیں کر رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیہوش کی فتح سے بہت پریشان تھا اور اب قراقرم واپس جانے کے بجائے مصر جانا چاہتا تھا۔ وہ بیہوش اور مصر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے پوچھ رہا تھا۔ ”سنا ہوں، بیہوش بہت زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

دو قوز نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میرے خیال میں آپ اتنے کمزور بھی نہیں کہ بیہوش کا مقابلہ نہ کر سکیں مگر پھر بھی خود کو اور زیادہ طاقتور بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ مغربی ممالک کی عیسائی دنیا سے دوستی کریں اور انہیں اپنا حلیف بنا کر مدد حاصل کریں۔“

ہلاکو خان خاموشی سے دو قوز کے مشورے پر غور کرنے لگا۔

دو قوز انہی اور خاموشی سے اپنے چوبی چیمپل میں چلی گئی۔ سرخ رنگ کا یہ چیمپل اس کے خیمے سے ملتی تھا۔ ہلاکو خان بھی اٹھا اور اپنی بیوی کے چیمپل کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں کئی نسٹوری مسیچی دو قوز کے قدموں میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ دو قوز نے پوچھا۔ ”مقدس باپ یعقوب کہاں تشریف لے گئے؟“

ایک مسیچی نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں لیکن اگر آپ حکم دیں تو انہیں تلاش کر کے آپ کی خدمت میں حاضر

کر دے گا۔“

یہ بڑا پریچ کوہستانی راستہ تھا۔ ندی نالوں نے بھی ان کی راہ روکی لیکن یہ لوگ راہ کی ہر دشواری کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ

ہلاکو خان کی حدود میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ برقائی خان کے وفد نے انہیں بتایا کہ وہ ہلاکو خان کے لیے ایک خاص پیغام لے کر مراغہ جا رہے ہیں اس لیے انہیں جانے دیا جائے۔

سرحدوں کی نگہبانی کرنے والوں نے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد انہیں مراغہ جانے دیا۔ مراغہ کے باہر ان لوگوں نے ہلاکو کے عظیم الشان لشکر کے خمیوں کو میلوں میں پھیلے دیکھا۔ یہاں ہر طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فوجی

ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان فوجیوں نے اس وفد کے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا جو انہی جیسے لباسوں میں ملبوس اور انہی جیسے تندرست و توانا تھے لیکن تردی ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ دیووں میں ایک چھوٹا سا انسان یوں لگتا تھا، گویا لمبے چوڑے انسانوں میں ایک بونا پھنس گیا ہو۔

تردی نے گھوڑوں کے اصرار دیکھے اور اس کا دماغ منصوبے بنانے لگا۔

انہی فوجیوں میں سے چند جوان باہر نکلے اور وفد کو اپنے گھیرے میں لے لیا لیکن اس وفد کے سردار نے ان جوانوں کو متنبہ کیا۔ ”ہم برقائی خان کا ایک خاص پیغام لے کر ہلاکو خان کے پاس آئے ہیں اس لیے ہم سے کوئی

ایسا سلوک نہ کرو جو نازیبا اور تکلیف دہ ہو۔ کل تم میں سے کچھ لوگ برقائی کے پاس بھی جاسکتے ہیں اور تم سے بھی ایسا ہی جف آمیز سلوک کیا جاسکتا ہے۔ بس ذرا اس کا خیال رہے۔“

لیکن جوانوں نے اسی حصار میں انہیں ہلاکو خان کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت ہلاکو خان اپنی چیمپی بیوی دو قوز سے بائیں کر رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیہوش کی فتح سے بہت پریشان تھا اور اب قراقرم واپس جانے کے بجائے مصر جانا چاہتا تھا۔ وہ بیہوش اور مصر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے پوچھ رہا تھا۔ ”سنا ہوں، بیہوش بہت زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

دو قوز نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میرے خیال میں آپ اتنے کمزور بھی نہیں کہ بیہوش کا مقابلہ نہ کر سکیں مگر پھر بھی خود کو اور زیادہ طاقتور بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ مغربی ممالک کی عیسائی دنیا سے دوستی کریں اور انہیں اپنا حلیف بنا کر مدد حاصل کریں۔“

ایک دن وہ نوگائی کے وفد کے ساتھ مراغہ روانہ ہو گیا۔ تردی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وفد ہلاکو خان سے کیا بات کرے گا؟

یہ بڑا پریچ کوہستانی راستہ تھا۔ ندی نالوں نے بھی ان کی راہ روکی لیکن یہ لوگ راہ کی ہر دشواری کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ

ہلاکو خان کی حدود میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ برقائی خان کے وفد نے انہیں بتایا کہ وہ ہلاکو خان کے لیے ایک خاص پیغام لے کر مراغہ جا رہے ہیں اس لیے انہیں جانے دیا جائے۔

سرحدوں کی نگہبانی کرنے والوں نے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد انہیں مراغہ جانے دیا۔ مراغہ کے باہر ان لوگوں نے ہلاکو کے عظیم الشان لشکر کے خمیوں کو میلوں میں پھیلے دیکھا۔ یہاں ہر طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فوجی

ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان فوجیوں نے اس وفد کے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا جو انہی جیسے لباسوں میں ملبوس اور انہی جیسے تندرست و توانا تھے لیکن تردی ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ دیووں میں ایک چھوٹا سا انسان یوں لگتا تھا، گویا لمبے چوڑے انسانوں میں ایک بونا پھنس گیا ہو۔

تردی نے گھوڑوں کے اصرار دیکھے اور اس کا دماغ منصوبے بنانے لگا۔

انہی فوجیوں میں سے چند جوان باہر نکلے اور وفد کو اپنے گھیرے میں لے لیا لیکن اس وفد کے سردار نے ان جوانوں کو متنبہ کیا۔ ”ہم برقائی خان کا ایک خاص پیغام لے کر ہلاکو خان کے پاس آئے ہیں اس لیے ہم سے کوئی

ایسا سلوک نہ کرو جو نازیبا اور تکلیف دہ ہو۔ کل تم میں سے کچھ لوگ برقائی کے پاس بھی جاسکتے ہیں اور تم سے بھی ایسا ہی جف آمیز سلوک کیا جاسکتا ہے۔ بس ذرا اس کا خیال رہے۔“

لیکن جوانوں نے اسی حصار میں انہیں ہلاکو خان کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت ہلاکو خان اپنی چیمپی بیوی دو قوز سے بائیں کر رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیہوش کی فتح سے بہت پریشان تھا اور اب قراقرم واپس جانے کے بجائے مصر جانا چاہتا تھا۔ وہ بیہوش اور مصر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے پوچھ رہا تھا۔ ”سنا ہوں، بیہوش بہت زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

کردیا جائے؟“
دوقوز نے کہا۔ ”ہاں، انہیں تلاش کر کے میرے پاس لایا جائے۔“
وہ مسیجی اسی وقت کہیں چلا گیا۔ ہلاکو خان نے چند فوجیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے، مجھ سے کوئی کام؟“
ایک فوجی نے عرض کیا۔ ”خان بابا برقائی خان کا ایک وفد آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“
ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ وفد؟“
فوجی نے جواب دیا۔ ”اسے ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا ہے۔“
ہلاکو خان نے مزید پوچھا۔ ”وفد میں کل کتنے آدمی ہوں گے؟“

جواب دیا گیا۔ ”میں یا اکیس۔“
ہلاکو خان برہم ہو گیا۔ ”مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ کسی معمولی سی بات کا جواب شک و شبہ میں دیا جائے۔ میں یا اکیس۔ یہ کوئی بڑی تعداد تو نہیں کہ اس کا گنتا محالات میں سے ہو۔ یہ میرے آدمیوں کو آخر ہو کیا گیا ہے؟“
وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا اور برقائی خان کے وفد کے بارے میں حکم دیا کہ اسے کل صبح پیش کیا جائے۔
ہلاکو خان بیہوش سے ناراض تھا۔ ناراض ہی نہیں برہم، بلکہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ قتل و غارتگی کی شکست اور اس کے افسوس ناک انجام نے ہلاکو خان کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ اس کا بس چلنا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مصر پر فوج کشی کر دیتا۔

دوقوز پادری یعقوب کو لے کر ہلاکو خان کے خیمے میں آگئی اور شوہر کو مشورہ دیا۔ ”میرے آقا! عیسائی دنیا صدیوں سے صلیبی جنگیں لڑتی چلی آرہی ہے اور یہ لوگ یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو اپنا ایک قاصد قسطنطنیہ روانہ کر دیا جائے اور وہ عیسائی دنیا سے آپ کے لیے مدد حاصل کرے۔ اس طرح آپ اور مسیحی مل کر مسلمانوں کی آخری قوت پیرس کو خاک میں ملا کر سرخ رو ہو سکیں گے۔“

ہلاکو خان مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کسی اور کی مدد حاصل کرنے میں اپنی کسرشان سمجھتا تھا۔ اس نے دوقوز کو منع کر دیا کہ فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیرس کے لیے میں ہی کافی ہوں۔ واپسی میں یروشلم کا تیاپانچا کر دوں گا۔

برقائی خان اس کے تایا کا بیٹا تھا۔ برقائی خان یوں تو

ہلاکو خان کی نظر میں قابل تعظیم تھا لیکن جب سے اس نے اسلام قبول کیا تھا، وہ ہلاکو کی نظروں سے گر گیا تھا۔ اس کا وفد کیوں آیا تھا؟ رات بھر یہ معمولی سا سوال اسے تنگ کرتا رہا۔ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے برقائی کا وفد ہلاکو خان کے خیمے کے جنوبی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہاں ان کی خشک میووں اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی گئی۔ ہلاکو خان کے ایک طرف نصیر الدین طوسی بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف شہزادہ ابا قاسم۔ ہلاکو خان نے ان دونوں سے کہا۔ ”ذرا تم دونوں وفد کی باتوں پر غور کرنا۔ میں اس وفد کو لا جواب کر کے واپس کرنا چاہتا ہوں۔“

اس وفد کو ہلاکو خان کے رو برو کھڑا کر دیا گیا۔ اس وقت ہلاکو خان مذاق کرنے کی حالت میں تھا۔ اس نے وفد سے پوچھا۔ ”تم لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟“
وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ”اسی نسل سے جس سے آپ کا تعلق ہے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”خان بابا کا کیا حال ہے؟ وہ دو چوٹیاں اب بھی گوندھتا ہے یا نہیں؟“

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ”ایل خان! (ہلاکو خان) ہم آپ سے خان بابا کی کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے نام خان بابا کا ایک خط لے کر آئے ہیں۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”خط میرے حوالے کر اور مجھے یہ بتا کہ برقائی پر اسلام کا جادو کس نے کیا تھا؟“

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ”اسلام میں اگر واقعی سحر ہے تو وہ منجانب اللہ ہے۔“

ہلاکو خان نے برقائی کا خط نصیر الدین طوسی کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”خط بہ آواز بلند پڑھا جائے۔“

خواجہ نصیر الدین طوسی نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”ہلاکو خان میرے بھائی کو معلوم ہو کہ میں برقائی خان بن جوہی خان ہوں۔ مجھ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم مسلمانوں کی بربادی کا فیصلہ کر کے جو گھر سے نکلے ہو، اسے بند کر دو۔ تم نے مسلمانوں کے خلیفہ.....“

وہ اپنے ذہن اور حافظے پر زور دیتا ہوا بولا۔

”مسلمانوں کا خلیفہ؟ یہ کون ہے؟“

نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ ”مستعصم باللہ۔ جس کو محمد سے میں لپیٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”آگے آگے..... اور کیا لکھا ہے؟“

نصیر الدین نے بقیہ خط پڑھا۔ ”ہلاکو خان! میں جانتا ہوں، تیری بیوی دوقوز مسیحی ہے اور تیری ٹیلی دوقوز کے ہاتھ

میں ہے۔ وہ جدھر گھماتی ہے تو اسی طرف چل پڑتا ہے اور دو قوز کی ٹیکل مسیجی علما کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر گھماتے ہیں دو قوز اسی طرف گھوم جاتی ہے۔ تو نے مسلمانوں کے خلاف مکاری، دغا بازی اور چال بازی سے بھی کام لیا ہے اور سننے میں یہ آیا ہے کہ اب تو بھرس اور مصر کے خلاف منصوبے بنا رہا ہے۔ خبردار! یہ میری تاکید جان..... ادھر کا رخ نہ کرنا۔ میں مسلمانوں کا امین اور محافظ ہوں۔ اگر تو مصر پر حملہ کرے گا تو میں آذربائیجان اور ایران پر حملہ کر دوں گا اور میں یوں بھی تیری فضول فتوحات سے خوش نہیں ہوں۔ تجھ کو جو کچھ مل چکا ہے، اسی پر قانع ہو جا اور مزید فتوحات سے باز آ جا۔ ورنہ اگر میں نے اپنے مرض اور بھوک جوع الارض (زمین کی بھوک) میں سر اٹھایا تو مسیجی دنیا میری زد میں ہوگی اور میں ان کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تو مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے لیکن افسوس کہ اسلام ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔“

اس خط نے ہلاکو خان کو بہت زیادہ فکر مند اور پریشان کر دیا۔ مصر پر حملہ آوری کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وفد کے سردار نے کہا۔ ”محترم ایل خان! ہم اس کا جواب لیے بغیر نہیں جائیں گے۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔ جب تک تمہیں جواب نہیں ملے گا، تم ہمارے مہمان رہو گے۔“

برقائی کے وفد کو ایک خیمے میں ٹھہرا دیا گیا اور ہلاکو خان نے اپنے مشیروں کے سامنے یہ خط رکھ کر ان سے مشورہ طلب کیا..... خواجہ نصیر الدین نے عرض کیا۔ ”اگر محترم ایل خان نے مصر کا رخ کیا تو برقائی کی افواج ان علاقوں کو پس نہس کر کے واپس چلی جائیں گی۔“

شہزادہ ابا قا خان نے مشورہ دیا۔ ”اگر مجھے فوج دے کر حکم دیا جائے تو میں سرائے برقائی خان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس آ سکتا ہوں۔“

اس مجلس مشاورت میں یعقوب پادری اور دو قوز بھی شامل تھے۔ دو قوز نے پادری یعقوب سے پوچھا۔ ”مقدس باپ! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ”جہاد۔ مسلمان کافروں کے خلاف جہاد۔ بھرس اور برقائی خان دونوں کے خلاف جہاد۔“

پادری یعقوب کا مشورہ ہلاکو خان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ دو قوز اپنے شوہر کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس

نے ہلاکو کے بشرے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ پادری یعقوب کا مشورہ اسے پسند نہیں آیا ہے، بولی۔ ”میرے آقا! آپ کو خدا نے عقلمند ترین مشیر دے اور خود آپ کی اپنی عقل ہمیشہ صحیح سمت میں آپ کی راہنمائی کرتی رہی ہے۔ آپ اس سے معلوم کریں کہ اب آپ کو کیا کرنا چاہیے۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”مجھے جو کچھ کرنا ہے، میری عقل نے مجھے بتا دیا ہے اور میں وہی کروں گا، میری عقل جس کا مشورہ دے چکی ہے۔“

اس کی عقل نے اسے کیا مشورہ دیا ہے؟ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہلاکو خان سے یہ پوچھتا۔

پادری یعقوب اور خواجہ نصیر الدین طوسی میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف تلخ کلامیوں پر اتر آیا کرتے تھے۔ خواجہ طوسی کو پادری یعقوب کا یہ مشورہ انتہائی گراں گزرا اس نے کہا۔ ”پادری محترم! آپ جہاد کو اتنا آسان سمجھتے ہیں اگر آپ جہاد کر سکتے ہیں تو مسلمان بھی آپ کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔“

پادری یعقوب نے خواجہ طوسی پر الزام لگایا۔ ”جہاں تک میں سمجھا ہوں، ہم میں مسلمانوں کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ ہمیں ان جاسوس لوگوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“

خواجہ طوسی نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”چور کی ڈاڑھی میں شکا۔ جو جیسا ہے اس کو ہر کوئی اپنے ہی جیسا نظر آتا ہے۔“

ہلاکو خان نے اس نوک جھوک میں مداخلت کی اور ان دونوں کو نرمی سے سمجھایا۔ ”نفاقی اور جھگڑے کی باتیں کم از کم میرے آدمیوں کو نہیں کرنا چاہئیں، اس سے بڑی بڑی حکومتیں اور خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔“

ہلاکو خان اس وقت اداس بھی بہت زیادہ تھا۔

کئی دن بعد ہلاکو خان نے برقائی خان کو اس کے خط کا جواب دے دیا۔ ”برقائی خان کو معلوم ہونا چاہیے کہ تیری ہر بات قابل قبول ہے کیونکہ میں جھگڑے کو بڑھانا پسند نہیں کرتا۔“

ابھی تک تردی بالکل خاموش تھا، بولا۔ ”جب سارے معاملات بخیر و خوبی طے پا گئے تو محترم ایل خان کو چاہیے کہ وہ اپنے سامان اور گھوڑوں کی نمائش تو کرادیں۔ میرے جیسا غریب بار بار ایسے موقعے کہاں پائے گا۔“

ہلاکو خان نے اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ تردی کی چالاک نظریں یہ بھانپ چکی تھیں کہ ہلاکو خان ظاہر پریشانیوں کے علاوہ بھی کسی اور پریشانی میں مبتلا ہے لیکن وہ ازراہ تکلف ابھی اس کا ذکر نہیں کر رہا ہے۔ تردی

سنہری باتیں

☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
☆ آنکھ والا وہ ہے جو اپنے آپ کو دیکھے۔
☆ ایک سیاست دان اگلے انتخاب کے بارے میں سوچتا ہے اور ایک سیاسی مدبر اگلی نسل کے بارے میں۔
☆ کتنے قیمتی ہوتے ہیں وہ آنسو جو کسی مصیبت پر بہائے گئے ہوں۔
☆ ب سے بڑا عیب وہ ہے جو اپنے آپ کو محسوس نہ ہو۔
☆ غلطیوں کا احساس کامیابی کی کنجی ہے۔
☆ جاہل کے لیے سب سے اچھی بات خاموشی ہے۔
☆ سچ بات کہنے کی عادت ڈالو..... چاہے وہ کتنی کڑوی کیوں نہ ہو۔
☆ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے موت۔

☆ مختصر ہر ایک اچھی استاد ہے۔
☆ انتخاب۔ ریاض بٹ، سن ابدال

حقیقی جنگ

☆ سکندر اعظم کی جنگ کے دوران ایک فقیر سے ملاقات ہوئی۔
☆ فقیر۔ ”یہ جنگ جیتنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟“
☆ سکندر اعظم۔ ”ایک اور جنگ لڑوں گا۔“
☆ فقیر۔ ”اس کے بعد.....؟“
☆ سکندر اعظم۔ ”پھر ایک اور جنگ لڑوں گا۔“
☆ فقیر۔ ”آپ پوری دنیا فتح کر لو، اس کے بعد؟“
☆ سکندر اعظم۔ ”پھر آرام سے زندگی گزاروں گا۔“
☆ فقیر۔ ”وہ تو میں بنا جنگ لڑے بھی گزار رہا ہوں، بس ایک جنگ لڑی ہے اپنے نفس سے۔“
☆ مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل پور

نے سوچا، ہلاکو کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔

جانے سے پہلے تردی ہلاکو خان کے در پر کھڑا ہو گیا، اس نے کہا۔ ”محترم ایل خان سے کہہ دو کہ تردی اس وقت تک واپس نہیں جائے گا جب تک کہ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلاکو نہیں کر لے گا۔“

اس وقت ہلاکو خان اندر موجود نہیں تھا مگر دو قوز چند پادریوں اور مسیحی پیشواؤں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے تردی کی باتیں جو سنیں تو اندر بلوایا، پوچھا۔ ”تو واپس نہیں گیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”محترم خاتون! سچی بات تو یہ ہے کہ ہلاکو خان اور برقاقی خان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ میں ان دونوں کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کل ان دونوں میں منہمکت بھی ہو سکتی ہے۔“

دو قوز کسی تمہید سے گھبرا گئی، بولی۔ ”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”برقاقی کا وفد واپس چلا گیا لیکن میں ابھی تک بیٹھیں ہوں۔“

دو قوز نے پوچھا۔ ”مگر تو کیوں نہیں گیا؟ اس کی وجہ؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں نے محترم ایل خان کو پریشان پریشان سا دیکھا ہے۔ جب تک میں اس پریشانی کا سبب نہیں معلوم کر لوں گا میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

دو قوز سنائے میں آگئی۔ وہ مسیحی پیشواؤں کے منہ دیکھنے لگی۔ ایک پادری نے دو قوز کے کان میں کچھ کہا۔ ملکہ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، اس نے پوچھا۔ ”تیرا مذہب کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی مذہب نہیں، کبھی میں مسلمان بن جاتا ہوں اور کبھی مسیحی، کبھی بودھ مت کا پیروں بھی بن جاتا ہوں اور کبھی بالکل دہریہ بن جاتا ہوں۔“

ایک عیسائی پادری نے پوچھا۔ ”آج کل تو کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مسیحی۔“

جملہ مسیحی پیشوا کھڑے ہو گئے اور تردی کو فرط جوش میں باری باری گلے لگایا۔ پادری یعقوب نے کہا۔ ”اے شخص! اب تو مرتے دم تک مسیحی مذہب پر ہی رہے گا۔“

تردی نے مایوسی سے جواب دیا۔ ”لیکن افسوس کہ مسیحی لوگ میری قدر نہیں کرتے۔“

دو قوز اور مسیحی پیشوا جس موضوع پر بات چیت کر رہے تھے

زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں۔ اس پریشانی کا کوئی خاص سبب؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ دو قوز تو خود بھی اتنی زیادہ مصروف ہو گئی ہے کہ عیسائی راہنما تجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ تجھ کو نہیں معلوم کہ میری ماں کی حالت کتنی تشویش ناک ہے۔ وہ کسی وقت بھی آسمان کی وسعتوں میں کسی درہیچے سے داخل ہو کر گم ہو جائے گی۔ میں اس کا علاج کر رہا ہوں لیکن کوئی امید بر نہیں آتی۔“

اس دوران میں ہلاکو خان کو اطلاع ملی کہ پادری یعقوب اور یوشع بھی باریابی کے طالب ہیں۔ چنانچہ دونوں پادریوں کو اسی وقت طلب کر لیا گیا۔ دو قوز پہلے ہی سے موجود تھے۔ دو قوز نے ہلاکو خان سے درخواست کی۔ ”میرے آقا! تردی کو بھی شرف باریابی بخشا جائے کیونکہ وہ ہمارے وفاداروں میں شامل ہونا چاہتا ہے۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”اگر تو کہتی ہے تو اس کو بھی بلوالے ورنہ مجھ کو ان لوگوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔“ دو قوز نے تردی کو بھی وہیں بلوایا۔ تردی نے ہلاکو خان کو بہت قریب سے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ ہلاکو خان نے اس پر ایک اچھٹی نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

تردی نے ادب سے عرض کیا۔ ”محترم ایل خان! دہائی ہے، مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ بر قائی خان نے گھوڑے کی چوری کے جرم میں میرے بیوی بچوں کو یرغمال بنا کے رکھ لیا ہے۔ آپ انہیں یہیں بلوادیں کیونکہ اب میں واپس نہیں جانا چاہتا۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”تو نے گھوڑا چرا یا تھا؟“ تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں، جب میں معاشی طور پر بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا، اس وقت میں نے چوری کی۔“

ہلاکو خان نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”تب پھر میں تیری سفارش نہیں کر سکتا۔ یہ میرے شایان شان بھی نہیں ہے اور پھر کیا تو خود بھی یہ نہیں جانتا کہ ہمارے یہاں چوری ایک بدترین جرم ہے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خان محترم! مجھے ہر بات کا علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چوری ایک بدترین جرم ہے لیکن میں نے یہ جرم ان حالات میں بدرجہ مجبوری کیا ہے جن میں از روئے اسلام حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔“ تردی نے مزید عرض کیا۔ ”محترم خان! میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ خدا کے لیے بھیجے میں عجلت سے کام نہ لیجے۔“

رہے تھے، سر دست وہ منگھورک مٹی تھی۔ آخر ان لوگوں نے جب اس پر یقین کر لیا کہ تردی مسلمان نہیں، سبکی ہے تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے تردی کو اپنا مہمان بنالیا، بولے۔ ”تردی! تیری محبت کا شکریہ..... جب تک ہلاکو خان نہیں آتا تو اس خیمے میں ہمارا مہمان رہے گا۔“ تردی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ پادری یعقوب اور دو قوز بھی باتیں کرنے لگے۔ کبھی ان دونوں کی باتوں میں دوسرے پادری بھی بول دیتے تھے۔

دو قوز نے سرگوشی میں پادری یعقوب کو سمجھایا۔ ”ہلاکو خان کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان کو دفن کر دیا جاتا ہے تو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قبر میں دو فرشتے آتے ہیں مگر اور نکیر۔ یہ دونوں فرشتے مرنے والے سے سوالات کرتے ہیں۔ اگر مرنے والا ان سوالات کے صحیح جواب نہیں دیتا تو ان پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ کوئی پادری یہ ساری باتیں ہلاکو خان کے گوش گزار کر دے پھر آگے کا کام میں خود انجام دے لوں گی۔“

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ”ملکہ عالیہ! آپ نے مسیحیت پر جو احسان فرمایا ہے، وہ عیسائی مذہب رہتی دنیا تک یاد رکھے گا۔ بہر حال یہ کام پادری یوشع انجام دے گا۔“

دو قوز نے تردی کے سامنے خشک میوہ رکھوایا اور اصرار کر کے کھلاتی رہی۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ تردی عیسائی ہو جائے گا، پکا عیسائی اور پھر جب یہ بر قائی کے پاس واپس جائے گا تو یہ شخص ہلاکو کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے سکے گا۔

ہلاکو خان اپنے خیمے میں واپس آیا تو دو قوز نے تردی کا نہایت پراثر تعارف کرایا۔ دو قوز نے کہا۔ ”میرے آقا! تردی زمانے کا ستایا ہوا ایک ذہین اور ہوشیار انسان ہے اور اس کو آپ سے اتنی محبت اور ہمدردی ہو گئی ہے کہ وہ آپ سے ملے بغیر واپس بھی نہیں جائے گا، وہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

ہلاکو خان نے اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ ”وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں کوئی عام اور معمولی آدمی تو نہیں ہوں کہ ہر کسی کو شرف ملاقات بخشا رہوں۔ میں کسی تردی و ردی کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دو قوز نے پوچھا۔ ”خان محترم! آپ کچھ

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”برقائی خان میرا بھائی ہے۔ جب میں اس کے آدمی کو روک کر اپنے ساتھ رکھوں گا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور میں اس کو ناراض نہیں کر سکتا۔“

اچانک ایک شخص گھبرایا ہوا اجازت لیے بغیر اندر داخل ہوا اور عرض کیا۔ ”والدہ محترمہ کی حالت بہت زیادہ نازک ہو چکی ہے۔“

ہلاکو خان فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حاضرین بھی کھڑے ہو گئے۔

ہلاکو خان نے چلتے چلتے حکم دیا۔ ”نصیر الدین طوسی کو حاضر کیا جائے۔“

ایک خدمت گار خواجہ طوسی کی طرف چلا گیا۔ پادری یعقوب اور یوش ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

ہلاکو کی ماں کا خیمہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ہلاکو خان کے خیمے کی پشت پر تھا۔ جب یہ لوگ اس خیمے میں داخل ہوئے تو وہاں دو قوز اور دوسری خواتین پہلے ہی سے پہنچ چکی تھیں۔ ہلاکو خان کو دیکھتے ہی خواتین مریضہ کے پاس سے ہٹ گئیں۔ ہلاکو خان اپنی بوڑھی ماں پر جھک گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”ماں! تو کیسی ہے؟“

ماں نے ٹیٹھ آواز میں جواب دیا۔ ”بیٹے! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تیرے دادا چنگیز خان اور تیرے باپ کو لوٹی کو اپنے سر ہانے کھڑے دیکھا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جاودانی نیلے آسمان کی کھڑکیاں کھل چکی ہیں، ہم دونوں تجھ کو لینے آئے ہیں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”ماں! تو نے ان دونوں کو یہ نہیں بتایا کہ ان کی قوم اور ان کی اولاد میں نفاق پیدا ہو چکا ہے اور اب ہم آپس ہی میں برسر پیکار ہونے والے ہیں۔“

لیکن ماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

پادری یوش نے کہا۔ ”اب شاید یہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہو جائے گی۔“

ہلاکو خان بہت غمزہ ہو رہا تھا۔ پادری یعقوب نے کہا۔ ”جب یہ اپنے آسمانی سفر پر روانہ ہو چکی ہوگی تو اسے ایک نئی دشواری پیش آ جائے گی۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”کون سی نئی دشواری؟“

لیکن اسی لمحے ہلاکو کی ماں بڑبڑانے لگی۔ ”جلدی نہ کرو۔ جب میں نے تمہارے ساتھ چلنے کا وعدہ کر لیا ہے تو میں ضرور چلوں گی مگر جلدی نہ کرو..... اور منگو خسان یہ تو! تو جارہا تھا۔“

یہاں کیوں آیا؟ لیکن یہ ہلاکو کہاں چلا گیا؟ میں اس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔“

ہلاکو خان نے اپنی ماں کو ہلایا، بولا۔ ”ماں! میں موجود ہوں..... آنکھیں کھول اور مجھے پہچان۔“

نصیر الدین طوسی اپنے کاندھوں پر طیلان ڈالے اندر داخل ہوا۔ طیلان کے دونوں سرے سامنے لنگ رہے تھے۔ اس نے بیمار ماں پر نظر ڈالتے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اب وہ جاتے نہیں ہو سکے گی۔

نصیر الدین کے پیچھے کئی طبیب بھی آ گئے اور انہوں نے ہلاکو کی ماں کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اعلان کیا۔ ”نبضیں چھوٹ چکی ہیں اس لیے بچنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے ان سے آخری بار ہم کلام ہونے کی کوشش کی جائے۔“

دو قوز نے ماں سے کوئی بات پوچھی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ہلاکو خان نے ماں سے کہا۔ ”ماں! جب تو آسمانی درپچوں کے اس پار جائے گی تو وہاں خان اعظم چنگیز خان سے کہہ دینا کہ اس کی سولدو (روح) ہمارے پرچوں میں داخل ہو جائے کیونکہ یہ پرچم عنقریب مصر پر یلغار کرنے والے ہیں۔“

بوڑھی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر کار اس کا منکاڈ حلق گیا اور گردن ایک طرف مڑ گئی۔

نصیر الدین طوسی نے انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب کیا ہوا؟“

نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ ”ہم سب اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔“

ہلاکو خان کو بہت دکھ تھا، ماں کی موت نے اس سخت دل شخص کو بھی آبدیدہ کر دیا تھا۔ پادری یوش نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ ”محترم ایل خان! اس موقع پر مجھے ایک بہت ضروری بات گوش گزار کرنی ہے۔“

ہلاکو خان نے اجازت دے دی۔ ”تجھ کو اجازت ہے۔“

پادری یوش نے عرض کیا۔ ”محترم خان! آپ نصیر الدین سے پوچھیے کہ جب انسان مر کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟“

حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نصیر الدین پادری یوش کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اب خیمے کے اندر لوہان سلگایا جا چکا تھا اور اس کی تیز روشنی والا دھواں پورے خیمے میں پھیلنا جا رہا تھا۔

ہلا کو خان کو یہ تجویز بھی بہت پسند آئی، اس نے اعلان کر دیا۔ ”خواجہ نصیر الدین میری قبر میں دفن کیا جائے گا مگر پادری یوشع کو میری ماں کے ساتھ قبر میں داخل ہونا پڑے گا تاکہ میری ماں قبر کے سوال جواب اور عذاب سے بچ جائے۔“

اس خوفناک اعلان نے پادری یوشع، پادری یعقوب اور دو قوز کو حواس باختہ کر دیا۔ یوشع کو پسینا آنے لگا۔ پادری یعقوب آگے بڑھا اور مودبانہ عرض کیا۔ ”محترم ایل خان! پادری یوشع نے جو کچھ کہا تھا ازراہ مذاق کہا تھا۔ حالانکہ جو مر گیا، مر گیا۔ قبروں میں عذاب کس طرح ہو سکتا ہے۔“

ہلا کو خان کو ماں کی موت نے حد درجہ چڑچڑا اور بد دماغ کر دیا تھا، اس نے جھنجھلا کر پادری یعقوب سے پوچھا۔ ”کیا تو بھی مرا ہے؟“ پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تو کبھی بھی نہیں مرا۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”پھر تجھے کیا پتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ پھر اپنے جاں نثاروں سے کہا۔ ”دوستو! میری بات غور سے سنو اور اس پر اسی طرح عمل کرو جس طرح میں بیان کروں۔“

لوگ ہمتن آواز سننے میں مشغول تھے۔ پادری یوشع کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس نے عرض کیا۔ ”محترم خان! میں جانا چاہتا ہوں۔“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”تو بہت جلد اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جائے گا، قبل از مرگ واویلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

تردی اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ شاید اسے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ وحشی منگولوں کے زیر سایہ عیسائیوں کی صلیب بلند ہوتی جا رہی تھی اور اسلام کے مخالف اس کو کس کس طرح نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

ہلا کو خان نے جھک کر اپنی ماں کی پیشانی کو بوسہ دیا اور خیمے سے باہر چلا آیا۔

پادری یعقوب نے نصیر الدین سے درخواست کی۔ ”محترم خواجہ طوسی! پادری یوشع کی جان بچا لیجیے۔“

نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”جان لینے اور دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ دو قوز نے دونوں پادریوں کو نسل دی۔ ”آپ

نصیر الدین طوسی نے پادری یوشع سے پوچھا۔ ”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“

اب ہلا کو خان بھی طوسی سے رجوع ہو چکا تھا، اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ مرنے والے کی قبر میں کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے؟“

نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، قبر میں دو فرشتے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام مگر اور دوسرے کا نکیر ہے۔ یہ دونوں ہر مردے سے چند سوال کرتے ہیں۔ اگر انہیں ان کے سوال کا جواب مل جاتا ہے تو مرنے والا سکھ اور آرام سے رہتا ہے اور اگر جوابات نہیں دے پاتا تو اس کا حشر خراب کر دیا جاتا ہے اور عذاب قبر شروع ہو جاتا ہے۔“

ہلا کو خان نے حیرت سے پوچھا۔ ”قبر میں یہ سب بھی ہوتا ہے؟“ نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ سب قبر میں ہوتا ہے۔“

ہلا کو خان نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ”پھر میری ماں ان فرشتوں کو کس طرح جوابات دے گی؟“

پادری یوشع نے عرض کیا۔ ”خان محترم! اس کا بھی ایک حل موجود ہے، بشرطیکہ آپ اس کو پسند فرمائیں۔“

ہلا کو خان بہت بے چین ہو رہا تھا، بولا۔ ”تو بتا تو سہی، میں اس کو پسند بھی کروں گا اور اس پر عمل بھی کروں گا۔“

پادری یوشع نے نصیر الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر انہیں مادرِ مقدس کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور ماں کو فرشتوں کے سوال جواب سے نجات مل جائے گی۔“

ہلا کو خان کو پادری یوشع کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اس نے نصیر الدین سے پوچھا۔ ”خواجہ طوسی! تیرا کیا خیال ہے؟“

نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”بات تو بہت معقول ہے لیکن اگر مجھ کو ماں کے ساتھ دفن کر دیا گیا تو پھر محترم ایل خان کے ساتھ کون دفن ہوگا؟“

ہلا کو خان اور زیادہ چکرا گیا، پوچھا۔ ”نصیر الدین! تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”ماں کے ساتھ پادری یوشع کو دفن کر دیا جائے کیونکہ قبر کے دونوں فرشتوں کو یہ پادری سنبھال لے گا اور میں آپ کی قبر میں دفن ہو کر آپ کے لیے فرشتوں کو بے بس اور لا جواب کر دوں گا۔“

دونوں ذرا بھی نہ گھبراہیں، ابھی میں ہلاکو خان سے بات کروں گی۔“

پادری یوشع نے دو قوز کی خوشامد کی۔ ”جس طرح بھی بن پڑے، آپ مجھے معافی نامہ ضرور دلوادیں۔“

تردی، نصیر الدین کے ساتھ ہی خیمے سے نکل گیا۔ یہ دونوں ہلاکو کے دربار میں چلے گئے۔ راہ میں تردی نصیر الدین سے بات کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا۔ طوی کا رعب علم اتنا زیادہ تھا کہ اچھے اچھے اس سے مرعوب رہتے تھے۔

دوقوز نے ہلاکو خان سے پادری یوشع کے لیے سفارش کی اور کہا۔ ”قبر میں دفن ہونے کے لیے کئی اور جوان آمادہ ہو چکے ہیں۔ آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں اور جس کو مناسب فرمائیں، اسے قبر میں دفن کر دیا جائے۔“

ہلاکو خان بہت چڑچڑا ہوا رہا تھا۔ جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”دوقوز! کیا میری ماں کی قبر میں تو دفن ہونے کے لیے تیار ہے؟ اگر تو پادری یوشع کی جگہ قبر میں دفن ہونے کے لیے تیار ہے تو میں یوشع کو آزاد کر دوں گا۔“

پادری یوشع کی جس شخص نے بھی سفارش کی، ہلاکو خان نے اس کے سامنے یہی تجویز رکھ دی۔ آخر اس پیشکش سے ہر شخص دستبردار ہو گیا۔ تردی یہ دلچسپ تماشا دیکھ رہا تھا اور خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ خواجہ طوی سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا لیکن کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔

ہلاکو خان کی ماں کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ مرنے والی ماں کی خدمت کے لیے درجن بھر کنیزیں نہلا دھلا اور بنا ستوار کر اس کے پاس کھڑی کر دی گئیں۔ ان کنیزوں کا دل بیٹھا جا رہا تھا کیونکہ ذرا دیر بعد انہیں بھی ہلاکو خان کی ماں کے ساتھ زندہ دفن ہو جانا تھا۔ ان کے پاس ہی پادری یوشع کھڑا رہا تھا۔ ہر کسی کو پادری یوشع پر رحم آ رہا تھا۔

ایک لمبے چوڑے کمرے کی طرح ہلاکو خان کی ماں کی قبر تیار کی گئی۔ اس ہال میں ماں کی لاش کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ یہیں مرنے والی کا سامان بھی رکھ دیا گیا۔ سب سے آخر میں کنیزوں اور پادری یوشع کو حکم دیا گیا کہ وہ ماں کے آس پاس کھڑے ہو جائیں۔

کنیزیں بادل نا خواستہ آہستہ آہستہ قبر میں اتریں اور ماں کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔

پادری یوشع اس طرح چیخ کر رویا جس طرح قصائی کی چھری تلے کوئی بکرا ڈکا رہا تھا۔ اس نے ایک بار

پھر رحم کی درخواست کی ”محترم اہل خان! رحم..... مجھ پر رحم فرمائیں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”عجیب بے وقوف ہے یہ شخص! اگر بات رحم کی ہوتی تو ممکن ہے میں اس پر غور بھی کرتا لیکن یہ بات رحم کی نہیں، میری ماں کے دکھ سکھ کی بات ہے۔ قبر کے فرشتے اس سے سوال جواب کریں گے اور میری ماں اس کے صحیح صحیح جواب نہیں دے سکے گی۔ میں نے اپنی ماں کی مدد اور نجات کی خاطر اس پادری یوشع کو قبر میں اتارا ہے اور یہ مجھ سے خواہ مخواہ رحم کی درخواست کر رہا ہے۔“

آخر پادری یوشع کو ماں کے قریب دھکیل کر قبر کو نہایت پھرتی سے بند کر دیا گیا۔ جب تک قبر پوری طرح بند نہ ہوگئی، پادری یوشع اور کنیزوں کے شور و غل کی آوازیں باہر آتی رہیں۔

ہلاکو خان اپنی ماں کی قبر پر کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

پادری یعقوب نے نصیر الدین طوی سے دل شکستہ آواز میں کہا۔ ”خواجہ! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ آپ چاہتے تو پادری یوشع کی جان بچا سکتی تھی۔“

خواجہ طوی نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں نے کتوں میرے لیے کھودا تھا اور اس میں پادری یوشع گر گیا۔ پھر میں اس کو کیوں بچاتا؟ اس پر کیوں رحم کھاتا؟“

تردی کو اس بھیا تک منظر نے لرزہ بر اندام کر دیا۔ اس نے سوچا کہ اس اندھیر گہری میں کسی دن، کسی نہ کسی معاملے میں اس کی باری بھی آ سکتی ہے اس کو اس کی عقل نے مشورہ دیا کہ چوکنا اور ہوشیار رہو اور بولنے، بات کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لے۔ معلوم نہیں کون سی بات کس مصیبت میں مبتلا کر دے۔

☆☆☆

دوقوز نے بعد میں ہلاکو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میرے آقا! مسلمانوں کے علاوہ قبر کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اگر پادری یوشع کو ماں کے ساتھ دفن نہ کیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔“

ہلاکو خان نے دوقوز کو ڈانٹ دیا۔ ”اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی، کبھی بھی نہیں ہوگی۔ جو ہوا پادری یعقوب اور یوشع کی وجہ سے ہوا اور تجھ کو ان لوگوں کی دکالت کا حق کس نے دیا ہے؟“

جب دوقوز اپنے شوہر ہلاکو خان کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئی تو وہ خاموشی سے اپنی سرخ خانہ میں چلی گئی

ہو سکتا ہے، کوئی دین نہیں۔ ہمارا دین یہ ہے کہ جو ہمارا ساتھ دے، ہماری مدد کرے، ہم اس کی پرستش کرنے لگیں۔“

ہلاکو خان کو تردی کا جواب بہت پسند آیا، پوچھا۔ ”تو میری کیا مدد کر سکتا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مدد تو میری آپ کریں گے، میں تو خود زمانے اور قسمت کا ستایا ہوا مدد حاصل کرنے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ میری مدد تو کر، میں تیری مدد کروں گا۔“

تردی ہلاکو خان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا، بولا۔ ”خان محترم! میں زیادہ عقلمند آدمی نہیں ہوں، آپ کی پراز مغزی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”جتنے دنوں سے تو ہمارے درمیان رہ رہا ہے تو نے دیکھا ہوگا کہ میں مذہبی معاملات میں روادار واقع ہوا ہوں۔ میرے آس پاس مسلمان، عیسائی، بودھ اور یہودی تک ہیں۔ میری بیوی دو تونز مسیحی ہے اور میرا وزیر اور مشیر مسلمان نصیر الدین طوسی۔ میرے عساکر میں مہندس اور ہنرمند چینی بدھ ہیں اور تاجروں کی بیشتر تعداد مسلمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ برقاقی سے جنگ بھی کروں اور سازش بھی۔ سازش میں چند مسلمان میرا ساتھ دیں گے کیونکہ یہ مسلمان مجھ سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔“

تردی نے محسوس کیا کہ ہلاکو خان بہک رہا ہے اور اس کی قوت فیصلہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور منہ سے کچھ نکل جاتا ہے۔ تردی نے جواب دیا۔ ”میں خان محترم کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہوں۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”برقاقی کے آس پاس کس قسم کے مسلمان موجود ہوتے ہیں؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مسلمان عالم اور صوفی۔ یہ دونوں اسلامی تعلیمات کی بنیادی روح برقاقی کو ذہن نشین کراتے رہتے ہیں۔“

ہلاکو خان جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ عاجز آ کر بولا۔ ”اچھا ابھی تو، تو ہماری میزبانی کے مزے لوٹ۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ تو ہمارے کس کام آ سکتا ہے۔“

تردی نے درخواست کی۔ ”خان محترم! یوں تو مجھے ہر قسم کا آرام میسر ہے مگر پھر بھی میں گھومنے پھرنے میں ایک

اور وہاں قربان گاہ مسجد پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

ہلاکو خان کو اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ بیہوش کی سرکوبی کے لیے مصر کا رخ کرے یا برقاقی خان سے جنگ کرے۔

ہلاکو خان کی پوری زندگی جنگ و جدل میں گزری تھی اور اس نے اپنے کسی دشمن کو کبھی بھی اس قابل نہ سمجھا تھا کہ اس کی سرکوبی کے لیے غور و فکر کرے لیکن اب وہ اس پر مجبور ہو چکا تھا۔ اس کے شامانوں (ساحروں) نے اسے یہ باور کرا رکھا تھا کہ خان اعظم کی سولد (روح) منگولوں کے پرچم میں حلول کر چکی ہے، پاک کے نودموں والے پرچم میں.....

لیکن اب جبکہ اس کا مقابلہ برقاقی سے تھا اور مقابلے میں دونوں طرف منگول ہی تھے تو خان اعظم کی روح کس کے پرچم میں ہوگی؟ اس نے برقاقی کے اسلام کو کبھی بھی پسند نہیں کیا تھا اور وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ برقاقی ہلاکو خان کے مقابلے میں مصر کے مملوک حکمران بیہوش کا ساتھ دے۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ برقاقی جیسے کوہ گراں کو پاش پاش کیے بغیر وہ بیہوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور آخر اس نے وہی فیصلہ کیا جو ایک غیر معمولی جنرل ان حالات میں کر سکتا تھا۔ برقاقی کو سزا دے کر مصر کی کوشمالی کرنا۔

ہلاکو خان نے اپنے ارادے کا اظہار کسی پر بھی نہیں کیا۔ اس نے شہزادہ ابا قا خان کو حکم دیا کہ منگول عساکر کو کوچ کے لیے تیار رکھے۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”یہ عساکر کس طرف کوچ کریں گے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”میں منگول شامانوں اور مسلمان منجمتوں سے پوچھوں گا کہ ہمارا اقبال اور فتح مندیوں ہمیں کس طرف لے جائیں گی اور خوش طالعی ہمارا کس جگہ انتظار کر رہی ہے؟“

ابا قا خان اس گول مول جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس کو اپنے باپ پر حیرت تھی کہ وہ پہلی بار تذبذب اور شک و شبہ کا شکار ہوا تھا۔

ہلاکو خان کو اچانک حقیر تردی یاد آ گیا جو اس کی محبت اور احترام میں برقاقی کے پاس واپس نہیں گیا تھا اور جس کی بابت یہ معلوم ہوا تھا کہ برقاقی خان نے اس کے بیوی بچوں کو یرغمالی بنا لیا تھا۔ ہلاکو خان کو اس بات کا تجربہ تھا کہ اس قسم کے دل جلے اور قسمت کے مارے انسان بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے اچانک تردی کو طلب کر لیا۔

جب تردی آ گیا تو اس سے پوچھا۔ ”تیرا دین کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہم آشفہ حالوں کا دین کیا

قسم کا خوف اور جھجکی محسوس کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں یہاں کی ہر حسین شے اور ہر خوب صورت جگہ کا نظارہ کروں۔ میں منگول عساکر کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اتنے بہت سارے گھوڑے کہیں اور نہیں دیکھے۔ میں انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں منگول عساکر کے ایک طرف موجود ان بازاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں تھوک میں ملتی ہیں۔ میں ان مشینوں اور آلات کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں جو قلعوں کی تسخیر میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے یہ ساری پر لطف اور حیرت انگیز چیزیں کہیں اور نہیں دیکھیں۔ کبھی تو میں اس ماحول میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں کسی اور دنیا اور کسی اور ہی مخلوق میں آ گیا ہوں۔ میں ان بستیوں اور آبادیوں میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں جنہیں آپ نے بسایا ہے، آپ نے آباد کیا ہے اور ان میں ہر مذہب و ملت کے لوگ باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں اور شاید..... شاید نہیں، یقیناً دنیا کے یہی وہ محفوظ اور پرسکون معمرے ہیں جہاں کے لوگ کسی خوف اور خطر کے بغیر آرام اور اطمینان سے رہتے ہیں۔ میں ان سب کو قریب سے دیکھ کر خود میں یہ فخر اور احساس پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ میں باہر کی دنیا کا شاید وہ پہلا شخص ہوں جس نے ایل خان اور اس کی دنیا کو بہت قریب سے بلکہ ان میں رہ بس کے آزادی اور اطمینان سے دیکھا ہے۔ محترم ایل خان! آپ یقین کریں، میں اس وقت بھی اپنی بیوی بچوں کی جدائی اور مفارقت کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں بلکہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ بیوی بچوں کی اسی جدائی اور مفارقت نے مجھے آپ تک پہنچایا اور یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے تو میں خوشی سے پاگل ہو جاتا ہوں اور یہ خوشی میرے غم و اندوہ پر حاوی آ جاتی ہے۔“

ہلا کو خان کو اس کے شوق کی فراوانی نے بہت محفوظ کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”تو جس قسم کی آزادی چاہتا ہے۔ میری طرف سے دے دی گئی مگر اس کی ایک معمولی سی قیمت ادا کرنی ہوگی تجھے۔“

تردی نے کہا۔ ”میں اس کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔“ ہلا کو خان نے کہا۔ ”میں سازش اور حیلہ گری کا بالکل قائل نہیں لیکن ایک عظیم مقصد کے لیے میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میں تجھ کو برقائی کی خدمت میں بیش قیمت تحائف کے ساتھ واپس کروں گا اور اس سے تیری سفارش کروں گا

کہ وہ تجھے معاف کر دے اور تیرے بیوی بچے تیرے حوالے کر دے اور تو اس کے صلے میں برقائی خان کو کسی بھی طرح زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھ کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں گا۔“

تردی نے پست ہمتی کا اظہار کیا۔ ”لیکن یہ بہت مشکل کام ہے محترم ایل خان!“

ہلا کو خان نے ٹیش میں کہا۔ ”لیکن ناممکن نہیں ہے۔ میں نے اپنے دل کا راز تجھ پر ظاہر کر دیا ہے۔ اب تو اسے راز میں رکھ کر انجام دے گا، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں جس قسم کی مدد تجھ کو درکار ہوگی میں کروں گا۔“

تردی نے پوچھا۔ ”مجھے واپس کب جانا ہوگا؟“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”میں بتاؤں گا۔“

ہلا کو خان نے تردی کو عام اجازت دے دی کہ وہ جہاں اور جو کچھ دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے۔

تردی نے آزادی سے گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ اس نے منگول سپاہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ منگول شامانوں کو دیکھا جو وحشی منگولوں میں غلط سلط پیش گوئیاں کرتے پھرتے تھے۔ یہیں مسلمان منجھوں سے بھی ملاقات ہوئی جن کی پیش گوئیاں کبھی سچ نکلتیں، کبھی بالکل جھوٹ۔ اس نے وہ آلات بھی دیکھے جن سے فصیل کی دیواریں اور قلعے توڑے پھوڑے جاتے تھے۔ اس نے منگولوں کا شاندار اصطبل بھی دیکھا جس میں عربی اور عراقی گھوڑوں کے علاوہ قراقرم اور چین کے گھوڑے بھی موجود تھے۔ اس نے ان دکانداروں اور ہنرمندوں کو بھی دیکھا جو اپنی بے مثل کاریاری صلاحیت اور ہنرمندی میں لاشائی تھے۔ اس آبادی کو بھی دیکھا جس میں چین، قراقرم، روس، قفقاز، چینی ترکستان، روم، ایران اور عراق و عرب کے لوگ آباد تھے۔ ان میں مسلمان، بودھ، عیسائی اور یہودی سبھی شامل تھے اور انہی میں وہ دہریے اور خدا کی ذات کے منکر بھی تھے جو ہلا کو خان کی مذہبی رواداری کے دل و جان سے قائل اور معتقد تھے۔

شام سے ذرا پہلے جب وہ مخلوط بستی میں سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک گھر سے گانے کی آواز سنی۔ گانے والی کوئی لڑکی تھی اور وہ سرفرد اور بخارا کی فارسی اور ترکی کی آمیزہ زبان میں کچھ گارہی تھی۔ تردی کی زبان بھی یہی تھی۔ اس کی اپنی زبان کے سحر نے اسے روک لیا۔ اس کے پاؤں رک گئے اور وہ گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی لڑکی گارہی تھی۔

بوڑھا، تردی کو اپنی بیٹی روشک کے پاس لے گیا جو ایک قالین پر بیٹھی گا رہی تھی۔ اس نے نیلے لباس پر سرخ رنگ کاشلو کا ساپن رکھا تھا اور سر کے بالی رومال سے باندھ لیے تھے۔ روشک بلاشبہ بہت حسین تھی۔ اس کی ٹھوڑی کے کڑھے پر ایک تل تھا اور بڑی بڑی پلکوں کے اوپر بھوس ہلال کی طرح نصف دائرہ بنا رہی تھیں۔

روشک نے اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھا تو خاموش ہو گئی۔

تردی نے شوشی سے کہا۔ ”گائیے، گائیے..... آپ رک کیوں لگیں؟“

روشک کوئی جواب دیے بغیر دوسرے کمرے میں جانے لگی، تردی نے کہا۔ ”ہم تو آپ کی آواز کے سحر میں یہاں تک آ گئے اور آپ نے اس سحر کو توڑ دیا۔ یہ تو بڑی زیادتی ہوگی ہمارے ساتھ۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”بیٹی روشک! یہ ہلا کو خان کا مہمان تردی ہے۔ خدا کے لیے تو کچھ دیر کے لیے بیٹیں رہ، ورنہ یہ شخص تجھ کو، مجھ کو ہلا کو خان کے دربار میں بلوالے گا۔“

روشک واپس آ گئی، بولی۔ ”یہ چاہتے کیا ہیں؟“

بوڑھے کے بجائے تردی نے جواب دیا۔ ”ہم آپ کا گانا سننا چاہتے ہیں۔ آپ کے بامعنی اشعار جب سوز میں ڈوبی ہوئی آواز میں دل سے نکلے تو ہم تڑپ کر رہ گئے۔ سبحان اللہ۔ مزہ آ گیا۔“

روشک نے کہا۔ ”میں جو کچھ گا رہی تھی، اپنے لیے گا رہی تھی، دل بہلانے کے لیے..... ورنہ اشعار کے مفہوم کا میرے جذبات و احساسات سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔“

تردی نے کہا۔ ”ہمیں ان باتوں سے کیا واسطہ۔ ہم تو آپ کا گیت سننا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔“

روشک نے تردی کو ایک دوسرا گیت سنایا مگر اس میں پہلے جیسا مزہ نہیں آیا، تردی نے کہا۔ ”اس گیت میں چونکہ آپ کے جذبات اور احساسات شامل نہیں تھے، اس لیے مزہ نہیں آیا۔“

دولوں گھبرا گئے، بوڑھے نے کہا۔ ”تردی! غالباً تیرا یہی نام ہے۔ میں ایک مسلمان تاجر ہوں۔ کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں، نیا نیا یہاں آیا ہوں اگر تیری یہ تنقید ایل خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو خدا جانے ہم دولوں کا کیا حشر ہو۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”آپ مطمئن رہیں یہ بات آگے نہیں بڑھے گی لیکن ہمیں اس بات کی اجازت ہونی

”اد غیرت مند قوم کی بے غیرت اولادو! آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“ دشمن تمہیں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے، تمہارا مرکز (بغداد) برباد کر دیا گیا۔

یا رسول اللہ ﷺ! اپنی امت کے نافرمانوں پر رحم فرمائیں۔

اغیار، جو باطل ہیں حق کو نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ سرقد و بخارا خاک میں مل گئے۔

وہ ایران اور عراق کہاں ہیں جہاں اسلام کا پرچم بلند رہتا تھا۔

موصول و بغداد کی شوکت کو کیا ہوا؟

اے اللہ! تیری پسندیدہ قوم کے شہباز کدھر چلے گئے؟“

اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ شخص باہر نکلا۔ اس نے تردی کو دروازے پر کان لگائے بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔ ”تو کون ہے اور یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی مادری زبان میں گانے کی آواز سنی تو بے اختیار کھڑا ہو گیا اور گیت بننے لگا۔“

وہ شخص تردی کو اندر لے گیا اور پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا تو ہے کون؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں ایل خان کا مہمان تردی ہوں۔“

اس شخص کے چہرے کا رنگ بدل گیا، خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ ”میں نے اپنی بیٹی روشک کو منع کیا تھا کہ اس قسم کے گیت نہ گایا کرے مگر وہ باز ہی نہیں آتی۔ میرے محترم مہمان! آپ یقین کریں، روشک جو کچھ گا رہی تھی، اس میں اس کے یا میرے جذبات شامل نہیں تھے، یہ محض ایک گیت تھا۔“

تردی نے کہا۔ ”مجھے اپنی بیٹی روشک سے ملا تو سہی۔ جس کی آواز اتنی خوب صورت ہے، وہ خود کتنی خوب صورت ہوگی۔“

عمر رسیدہ شخص کو ملانے میں تامل ہوا، تردی نے کہا۔ ”خیر، کوئی بات نہیں۔ میں واپس چلا جاؤں گا اور ہلا کو خان سے کہوں گا کہ وہ تجھے اور روشک کو اپنے دربار میں طلب کر کے یہ گیت سنے، اس وقت تو، تو انکار نہیں کر سکے گا۔“

بوڑھا ایک دم راضی ہو گیا، بولا۔ ”لیکن میں نے یہاں کب انکار کیا ہے۔ تو میرے ساتھ آ، میں روشک سے دو چار گیت اور سنوا دوں گا۔“

چاہیے کہ اس گھر میں، گھر کے ایک فرد کی طرح آتے جاتے رہیں۔“
 بوڑھے نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم کس دین سے تعلق رکھتے ہو؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”فی الحال میرا کوئی دین نہیں۔ جو دین میرے آقا کا وہی میرا پناہ دین۔“
 بوڑھے نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”تردی! ذرا باہر آؤ میرے ساتھ۔ میں چند ضروری باتیں کرتا چاہتا ہوں۔“

تردی اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ بوڑھے نے کہا۔ ”تردی! ہم مسلمان ہیں۔ جب تم اس گھر میں آنا جانا شروع کرو گے تو میری بیٹی سے عشق لڑانے کی کوشش کرو گے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ ایسا نہیں ہوگا تو میں گھر میں آنے جانے کی اجازت دے دوں گا۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”پھر بھی آنے جانے میں احتیاط سے کام لینا۔“

تردی دوبارہ اندر چلا گیا اور روشک سے کہا۔ ”اے صبح جیسی صبح اور شام جیسی شام! آئندہ ایسا گیت نہ گانا جیسا تو میری آمد سے پہلے گارہی تھی۔ ہاں، جب میں اس کی فرمائش کروں تو انکار بھی نہ کرنا۔“

دونوں باپ بیٹی کو تردی خاصا دلچسپ آدمی محسوس ہوا۔ وہ دونوں مسکرانے لگے اور تردی انہیں مسکراتا چھوڑ کر چلا آیا۔

☆☆☆

ہلاکو خان کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے تو وہ برقاقی خان سے نمٹنے گا، بعد میں والی مصر بھرس سے۔

برقاقی خان پر حملہ کرنے سے پہلے اس نے ایک عجیب و غریب قدم اٹھایا۔ اس نے والی قسطنطنیہ سے خط کتابت شروع کر دی دراصل وہ اس طرح مغرب اور مسیحی دنیا میں اپنے ساتھی تلاش کر رہا تھا۔ اس نے والی قسطنطنیہ کو خط میں لکھا:

”میں ہلاکو خان، جس نے مشرق کی مسلم قوتوں کا تقریباً خاتمہ کر دیا، اب یروشلم کو ان کی دستبرد سے بچانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قسطنطنیہ کا قیصر ہم سے رشتہ و تعلق پیدا کر لے۔ میری بیوی دو قوز مسیحی ہے اور تمام مسیحیوں کی

طرح اس کی بھی یہی خواہش ہے کہ یروشلم پر صلیب استادہ ہو۔ اس کا بیٹا ابا قاخان میرا جانشین تیری فرزندگی میں آنے کا خواہش مند ہے اور یہ تیرے اور تیری بیٹی کے لیے وجہ افتخار ہوگا کہ تیری بیٹی ماریہ، ابا قاخان کی بیوی اور میری اور دو قوز کی بہو بنے۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“
 دوسری طرف یہ خبر برقاقی خان اور بھرس کو بھی پہنچ گئی۔ بھرس نے برقاقی کو لکھا۔

”زریں خیل کے کوہ گراں! ہلاکو خان سے جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ وہ قیصر سے رشتے داری کے بعد اپنا ایک حلیف حاصل کر لے گا۔ اب آپ بھی وہی کریں جو ہلاکو خان نے کیا ہے۔ آپ قیصر کو لکھیں کہ آپ بھی اس سے رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بہادر بیٹے نوگانی کی شادی قیصر کی دوسری بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ماریہ جو ابا قاخان کی بیوی بننے والی ہے، قیصر کی ناجائز بیٹی ہے مگر نوگانی کی بیوی اپنے باپ کی جائز بیٹی ہوگی۔“

برقاقی نے بھرس کی تجویز پر عمل کیا اور قسطنطنیہ کا قیصر نہ تو ہلاکو کی تجویز کو مسترد کر سکا اور نہ برقاقی خان سے انکار کر سکا۔ وہ بیک وقت ابا قاخان اور نوگانی کا پدر بستی بن گیا۔ ہلاکو خان نے ایسا محسوس کیا گویا وہ ایک معرکہ ہار گیا۔ ایک جنگ ہار گیا۔ اب وہ بھرس سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو چکا تھا کیونکہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ برقاقی کے پیچھے بھی بھرس کی سوجھ بوجھ کارفرما ہے۔

تردی بڑے سکون اور اطمینان سے روشک کے پاس آ جا رہا تھا۔ ہلاکو خان اور قسطنطنیہ کے قیصر کے درمیان جو معاملہ طے پایا تھا، وہ اس سے بھی واقف ہو چکا تھا اور اس کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کی جوابی کارروائی میں بھرس نے کیا کردار ادا کیا۔ جب اس نے یہ ساری باتیں روشک کو بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئی مگر اپنی اس خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

تردی نے کہا۔ ”روشک! کیا بات ہے تو خوش نہیں ہوئی حالانکہ ان واقعات نے ہمیں یہ بتایا کہ اسلام ایک بار پھر ابھر رہا ہے اور وحشی منگول اپنی ترک و تاز اور یلغار کو برقرار رکھنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں۔“

روشک نے جواب دیا۔ ”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“
 تردی نے روشک کو چھیڑا۔ ”اس خبر نے تجھ کو خوش کیا یا نہیں؟“

روشک نے جواب دیا۔ ”تردی! اس وقت ہم سب ہلاکو خان کی رعایا ہیں۔ ہلاکو خان کی ذلت سے ہم کس طرح

لگاتی رہی اور جب کمرے سے نکل کر اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں تردی بیٹھا تھا تو یہ جان کر دکھ محسوس کیا کہ تردی نے شریفانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے سوچا، تردی چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن آدمی شریف ہے۔

اس کے بعد تردی کئی دن غائب رہا۔ اس دوران وہ کئی بار ہلاکو خان کے پاس گیا اور کہا۔ ”محترم ایل خان! میں شب و روز اس پر غور کر رہا ہوں کہ برقائی خان کو کس سازش سے ہلاک کیا جائے۔ جیسے ہی کوئی ترکیب سمجھ میں آئی، میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”لیکن میری سمجھ میں وہ ترکیب آپ کی ہے۔ میں اگر چاہوں کہ برقائی خان کو ہلاک کر دیا جائے تو اس کو ہلاکت سے دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔“

تردی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”عقل و ذہانت میں محترم ایل خان کا کوئی کیا مقابلہ کرے گا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”مجھے ایک حسین ترین لڑکی کی تلاش ہے۔ میں اپنا یہ کام اسی سے لے لوں گا۔“

تردی خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں ہلاکو خان کو روشنگ کا پتا نہ چل جائے۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ کتنی حسین لڑکی چاہتے ہیں؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”بالکل روشنگ جتنی حسین۔“

تردی کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، بہت نحیف آواز میں پوچھا۔ ”کیا آپ روشنگ سے واقف ہیں؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح۔ تردی! میں ایک گلہ بان کی طرح اپنے آدمیوں کا بہترین علم رکھتا ہوں۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”روشنگ کی آواز کے سحر سے بھی آپ واقف ہوں گے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”سحر سے بھی اور آواز کے سوز سے بھی۔ کلام کے جذبات، احساسات اور مفہوم سے بھی۔“

اب تو تردی کا کام تمام ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ جس ہلاکو خان کو روشنگ کی اتنی ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں، وہ خود اس کے بارے میں کیا کچھ نہ جانتا ہوگا۔

ہلاکو خان نے کہا۔ ”تردی! میں ایک روادار حکمران ہوں۔ مسجدوں میں کیا ہوتا ہے، میں اس کی پروا بھی نہیں کرتا۔ یہاں گرجے بھی ہیں اور صومعے بھی..... لیکن میں نہ تو مسجد میں کوئی دخل دیتا ہوں اور نہ چرچ اور صومعے سے کوئی

خوش ہو سکتے ہیں؟“

تردی نے کہا۔ ”لیکن میں تو اس خبر سے بہت خوش ہوا ہوں۔“

روشنگ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تجھ کو سمجھ گئی ہوں تردی! اس طرح تو میرے دل کی بات اگلوانا چاہتا ہے۔“

تردی نے کہا۔ ”نہیں روشنگ! یہ بات نہیں ہے۔ میں اس خبر سے واقعی بہت خوش ہوا ہوں۔“

روشنگ نے دزدیدہ نظروں سے مسکراتے ہوئے تردی کو دیکھا اور خوشی سے کہا۔ ”کیا میں یہ خبر ہلاکو خان تک پہنچا دوں؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”اگر پہنچا سکو تو ضرور پہنچا دو۔“

روشنگ نے کہا۔ ”چونکہ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنا میرے بس میں نہیں تو اجازت دے دی۔“

تردی نے کہا۔ ”روشنگ! تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔“

روشنگ نے کہا۔ ”کوشش کرتا رہی ہوں کچھ کچھ۔ اللہ نے چاہا تو سمجھ بھی لوں گی تمہیں بھی نہ سمجھی۔“

روشنگ کی قربت آہستہ آہستہ محبت میں بدلنے لگی لیکن خود روشنگ اس سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے روشنگ کو یہ بتا رکھا تھا کہ ابھی تک وہ کنوارا ہے لیکن روشنگ نے اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں لیا، بولی۔ ”تم اگر کنوارے ہو تو مجھے کیا۔“

تردی نے پوچھا۔ ”کیا تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا؟“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”میں مطلب سمجھ کے کروں گی کیا۔ تم نے میرے باپ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے۔“

تردی نے کہا۔ ”ہاں، میں نے یہ وعدہ کیا تو تھا لیکن اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔“

روشنگ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ”لیکن مجھے تو ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔“

روشنگ نے بات زیادہ نہیں بڑھنے دی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور کہا۔ ”تردی! اب تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ تمہاری طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ آئندہ اس گھر میں اس وقت آنا جب میرا باپ بھی گھر میں موجود ہو۔“

تردی اسی وقت چلا گیا۔ روشنگ دیر تک اپنے کمرے میں بند تردی کی موجودگی اور عدم موجودگی کا اندازہ

تعلق رکھتا ہوں۔ روشنگ مسلمان ہے اور ایک مسلمان کو اپنے شاندار ماضی پر فخر اور افسوس ناک حال پر نوحہ تو کرنا ہی چاہیے۔“

تردی نے سر جھکالیا اور آہستہ آہستہ کہا۔ ”جی ہاں محترم ایل خان۔“

ہلا کو خان نے تردی کو زیادہ دیر نہیں بٹھایا، یہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا روشنگ کے گھر پہنچا۔ وہ روشنگ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تو جس راز کو چھپائے ہوئے ہے، ہلا کو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔

گھر کے دروازے بند تھے، تردی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے روشنگ نے پوچھا۔ ”کون؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں تردی ہوں روشنگ..... دروازہ کھولو۔“

روشنگ کا دل یہ کہہ رہا تھا کہ دروازہ کھول دے لیکن زبان نے دل کا ساتھ نہیں دیا، کہا۔ ”واپس جاؤ۔ اس وقت باوا جان گھر پر نہیں ہیں۔“

تردی نے کہا۔ ”روشنگ! اتنی ظالم نہ بنو۔ میں تم سے چند باتیں کر کے چلا جاؤں گا، مجھے پراعتبار کرو۔“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ اس وقت باوا جان گھر میں نہیں ہیں۔“

تردی نے اصرار کیا۔ ”لیکن میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔“

دوسری طرف سے روشنگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تردی کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا پھر دوبارہ آواز دی۔ ”روشنگ! میں ایک شریف انسان ہوں، مجھے پر اعتبار کرو۔“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”میں کب کہتی ہوں کہ تم شریف انسان نہیں ہو، مگر تم مسلمان تو نہیں ہو۔“

تردی نے بڑی بے چینی سے کہا۔ ”میری بات تو سنو! میں ہلا کو خان کے پاس سے آ رہا ہوں اور اس وقت میں تمہیں چند ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ میں باوا جان کی عدم موجودگی میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“

تردی نے مایوسی سے کہا۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔“

روشنگ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی سن گئی

لپٹی رہی لیکن اس کے بعد تردی کی آواز نہیں سنائی دی۔ روشنگ نے تردی کے خلاف جو ظالمانہ روش اختیار کی تھی، اس پر بہت زیادہ غصہ تھا لیکن وہ ایسا کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی۔ وہ دیر تک ملول اور افسردہ ادھر ادھر گھر میں پھرتی رہی۔ شام کو جب اس کا باپ واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تردی دروازے سے فیک لگائے سویا ہوا ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور روشنگ نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سویا ہوا تردی لڑھک کر اندر گر گیا۔

روشنگ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا؟“

اب تردی بھی بیدار ہو چکا تھا۔ روشنگ کے باپ نے پوچھا۔ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں آیا تھا۔ روشنگ نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ روشنگ سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا اس لیے میں دروازے سے فیک لگا کر بیٹھ گیا پھر مجھے نیند آ گئی، میں سو گیا۔“

روشنگ تردی کا اثر قبول کرتی جا رہی تھی۔ اس نے تردی کی اس جگہ کو دیکھا جہاں زمین پر بیٹھ کر وہ سو گیا تھا۔ پسینے نے اس جگہ کو نم کر دیا تھا۔ روشنگ نے تردی کو رحم آمیز نظروں سے کچھ دیر دیکھا اور سامنے سے ہٹ گئی۔

روشنگ کا باپ تردی کو اندر لے گیا۔ پوچھا۔ ”کوئی خاص بات تھی جو تجھے خلاف معمول یہاں لے آئی؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ ہلا کو خان آپ دونوں سے بھی واقف ہے۔ خوب اچھی طرح اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ روشنگ مسلمانوں کا دکھ درد براہ راست اپنے دل میں رکھتی ہے۔“

روشنگ کے باپ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو برا ہوا۔“

تردی نے کہا۔ ”لیکن آپ گھبراہٹیں نہیں کیونکہ ہلا کو خان اس میں روشنگ کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ وہ ایک انصاف پسند قاضی ہے۔“

روشنگ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ”کاش ایسا ہی ہوتا۔“

تردی روشنگ سے ملنے اور بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ اس کے باپ کی پروا کیے بغیر روشنگ کے پاس چلا گیا۔ روشنگ ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ سوچ رہی تھی۔ تردی نے اسے آواز دی۔ ”روشنگ! آج میں نے یہ

میرے بھی باپ ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ انصاف سے کام لیں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو، تو یہاں سے چلا جا۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کروں گا۔“

تردی نے بات کو بگڑتے دیکھا تو جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ روشک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”روشک! میں جا رہا ہوں، شاید کل پھر ملاقات ہوگی۔“

جب وہ دروازے سے باہر نکل گیا تو روشک کا باپ تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچا۔ اس نے تردی کو آواز دی۔ ”تردی! ذرا میری بات تو سننا۔“

تردی رک گیا اور مڑ کر روشک کے باپ کی طرف دیکھنے لگا، بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

باپ نے کہا۔ ”اب تم یہاں نہیں آؤ گے اور اگر آؤ گے تو میری موجودگی میں، ورنہ میں تیری شکایت ہلا کو خان تک پہنچا دوں گا۔“

تردی نے بڑی بے بسی سے پوچھا۔ ”کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”اب تو جاسکتا ہے، مجھے بس یہی کہنا تھا۔“

تردی چلا گیا۔ روشک کا باپ جب مکان میں داخل ہوا تو اس نے روشک کو دروازے کی درز سے جھانکتے دیکھا۔ روشک تردی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

باپ نے اسے ملامت کی۔ ”روشک! ہم یہاں کس لیے آئے ہیں۔ اگر تو نے تردی جیسے بے دین میں اسی طرح دلچسپی لی اور مجھ کو ذلیل و خوار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا اور تردی تیری بوتل نہیں پاسکے گا۔“

روشک اس وقت تو خاموش رہی لیکن رات کو کھانے کے دوران اس نے باپ سے پوچھا۔ ”باوا جان! کیا تردی دوبارہ آنے کا وعدہ کر گیا ہے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس نے ایسا کوئی وعدہ تو نہیں کیا مگر تو نے یہ سوال کیوں کیا؟“

روشک نے کہا۔ ”آپ باہر نکل کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں، وہاں کیا باتیں ہوئیں؟“

باپ نے ڈانٹ دیا۔ ”گستاخ لڑکی! اب آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“

روشک خاموش ہو گئی۔

تردی روشک سے جدا ہو کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ روشک کے باپ کی اس دھمکی سے خوفزدہ ہو گیا تھا

فیصلہ کر لیا تھا کہ تجھ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

روشک نے پوچھا۔ ”مگر تم چاہتے کیا ہو؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میری نظریں، میرا طرز عمل،

میرا دلہانہ انداز، یہ سب کیا باور کراتے ہیں؟“

روشک نے کہا۔ ”میں نے ان باتوں پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔“

لیکن تردی نے اپنی بات اسی جذباتی انداز میں جاری رکھی۔ ”روشک! میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا، تو ہی بتا اب میں کیا کروں؟“

روشک کا باپ بھی وہاں پہنچ گیا، بولا۔ ”تردی! میں نے تجھ کو اتنی آزادی یا اجازت نہیں دی کہ تو مجھ کو نظر انداز کر کے میری بیٹی سے باتیں کرتا رہے۔ تو کیا چاہتا ہے، میں خوب جانتا ہوں مگر تو جو چاہتا ہے، وہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

تردی نے پوچھا۔ ”آخر کیوں نہیں ہو سکتا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں اور تو مسلم نہیں کیا ہے۔“

تردی نے کہا۔ ”روشک کے لیے میں مسلمان ہو سکتا ہوں۔“

باپ نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کھوکھلا سا ہتھکڑا لگا دیا۔ ”لڑکی کی خاطر مسلمان ہونے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔“

تردی لا جواب اور بے بس ہو گیا۔ روشک کو باپ کی باتیں اچھی نہیں لگیں، اس نے کہا۔ ”باوا جان! کیا سارے مسئلے اسی وقت ملے پا جائیں گے؟“

تردی نے براہ راست روشک سے بات کی۔ ”اگر تو مجھے منع کر دے گی تو میں کبھی یہاں نہیں آؤں گا لیکن تجھ کو میری تبدیلی مذہب کی پیشکش پر غور ضرور کرنا چاہیے۔“

باپ نے سختی سے کہا۔ ”روشک! ایک مثل ہے، اعتبار کرنا اچھی بات ہے مگر اعتبار نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔ تو جس شخص سے واقف نہیں اس پر اعتبار کس طرح کر سکتی ہے؟“

روشک نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے اس پر اعتبار کہاں کیا؟ میں جو قدم بھی اٹھاؤں گی، سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گی۔“

باپ نے تردی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”تردی! اس وقت تو یہاں سے چلا جا۔ ابھی تک میری بیٹی میرا بڑا احترام کرتی رہی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے تو اس سے ملا ہے وہ کچھ باغی ہوتی جا رہی ہے۔“

تردی نے خوشامدی۔ ”آپ روشک ہی کے نہیں،

سسپنس ڈائجسٹ

کہ اگر وہ نہیں مانا تو وہ اس کی ہلا کو خان سے شکایت کر دے گا اور تردی خوب جانتا تھا کہ شکایت کے بعد اس کے شادی شدہ ہونے کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس موقع پر اس نے دو قوز کی مدد لینا چاہی لیکن یہاں پر اسے یہ مشکل پیش آئی کہ دو قوز نے اسے عیسائی ہو جانے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا۔ ”تردی! میں تیری ہر قسم کی مدد کر سکتی ہوں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تو پہلے عیسائی ہو جا۔ لیکن یہ بتا کہ اس شادی کے بعد تو اپنے بیوی بچوں کو کیا جواب دے گا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ ایک سے زائد شادیاں کر سکتا ہے۔“

دو قوز کو تردی کی باتیں دکھ پہنچا رہی تھیں۔ اس نے تردی کو اپنے پاس سے دور کر دیا، بولی۔ ”اب تو جاسکتا ہے۔ میرا وقت اپنی فضول باتوں میں ضائع نہ کر۔“

تردی نے دو قوز کے پاؤں پکڑ لیے، بولا۔ ”ملکہ عالیہ! مجھے روشنگ کے عشق نے پاگل کر دیا ہے۔ میں آپ کی ہمدردیوں اور مہربانیوں کا مستحق ہوں۔“

دو قوز نے پادری یعقوب کو اپنے قریب بلایا اور اس سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”محترم مقدس باپ! مسلمان تو تبلیغ کا کام ہماری جتنی لگن سے نہیں کرتا پھر یہ لوگ مسلمان کیوں ہو جاتے ہیں؟“

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ”شاید اپنی سادگی کی وجہ سے۔“

دو قوز نے تردی کو سمجھایا۔ ”میں تجھ کو سمجھاتی ہوں کہ اپنے بیوی بچوں میں واپس جا اور مسلمان لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے۔“

تردی کو احساس ہوا کہ اس نے اپنے اس معاملے میں دو قوز کو شامل کر کے بدترین غلطی کی ہے۔ اس نے دو قوز کو بے وقوف بنانا چاہا۔ بولا۔ ”ملکہ عالیہ! میرا خیال ہے مسلمان ساحر ہوتے ہیں اور اس مسلمان لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ روشنگ کے سحر کو توڑ دوں۔“

دو قوز نے پادری یعقوب سے کہا۔ ”مقدس باپ! آپ تردی کے سینے پر صلیب کا نشان بنادیں تاکہ یہ مسلمان لڑکی کے جادو کے اثر سے محفوظ ہو جائے۔“

پادری یعقوب نے تردی کے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور کہا۔ ”تردی! جا خداوند سچ نے چاہا تو، تو مسلمان لڑکی کے سحر سے محفوظ رہے گا۔“

جب وہ دو قوز کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا تو اس نے

ایسا محسوس کیا کہ روشنگ کی محبت اور زیادہ شدت سے اس کے دل و دماغ پر طاری ہو گئی ہے۔ اس کے قدم خود بخود روشنگ کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے ہلا کو خان کو اپنے شیران اور وزراء کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ ہلا کو خان کے ساتھ نصیر الدین طوسی بھی تھا اور چند عیسائی اور بودھ مدبر بھی۔ تردی بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ ہلا کو خان نے تردی کو دیکھ لیا مگر بولا کچھ نہیں۔ نصیر الدین طوسی نے تردی کو کُن انکھیوں سے دیکھا اور یوں بن گیا گویا اس نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ ہلا کو خان نے طوسی سے کہا۔ ”خواجہ! میں شیخ البہال پر رشک کرنے لگا ہوں، میں سوچتا ہوں اے کاش! چند دنوں کے لیے میں شیخ البہال بن جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو، تو جانتا ہے سب سے پہلے کیا کام کرتا؟“

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ”آپ پہلا کام کون سا انجام دیتے؟“ ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”میں اپنے چند قیدیوں کو حکم دیتا کہ وہ سرائے برقائی خان جائیں اور برقائی خان کو قتل کر آئیں۔ ایسا میں اس لیے کرتا کہ میں برقائی خان سے الگ نہیں چاہتا۔ میں اس قتلے کو ایک شخص کی موت سے چل سکتا تھا۔“

خواجہ طوسی نے کہا۔ ”محترم ایل خان! آپ شیخ البہال سے بڑی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کا پورا لشکر، پوری فوج آپ کی قدامت ہے۔ آپ جس کسی کو بھی یہ حکم دیں گے، وہ بخوشی اس کام کو انجام دے گا۔“

ہلا کو خان نے پوچھا۔ ”خواجہ! کیا تو اس جوان تردی سے واقف ہے؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”بس اس حد تک کہ میں نے اس شخص کو خان محترم کے دربار میں فریادی کی حیثیت میں آیا ہوا دیکھا تھا۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”میں نے اس کو ایک خاص مقصد سے روک لیا ہے۔ میں اس سے اسی نوع کا ایک کام لینا چاہتا ہوں۔“

خواجہ نے تذبذب سے عرض کیا۔ ”یہ شخص اتنا بڑا کام خلوص اور عقیدت سے کس طرح انجام دے گا؟“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”میں نے اس جوان میں جو خاص بات دیکھی ہے، وہ یہ ہے کہ.....“

ابھی ہلا کو خان اپنا جملہ بھی پورا نہیں کر پایا تھا کہ ان کے سامنے ایک پہاڑی آگئی۔ یہ نگلی پہاڑی تھی۔ اس پر بڑھ بھی نہیں تھا۔ ہلا کو اس پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



میں پیش کیا تھا۔ عقاب اس کو سفید کو لے کر کہیں غائب ہو گیا تھا اور خان اعظم نے اقوام عالم کو اپنے گھوڑے کے سموں تلے روند ڈالا تھا۔ اسے کاش میرا نذرانہ بھی اسی طرح قبول کر لیا جاتا۔“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”محترم خان! زمانہ بدل چکا ہے اور آپ نے اب تک جو فتوحات حاصل کی ہیں، ان کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔“

ہلاکو خان پہاڑی بلند یوں سے نشیب کی طرف اتر رہا تھا۔ جب وہ سطح میدان میں آ گیا تو اس نے تردی کو اپنے پاس بلایا اور اس کو نصیحتیں کرنے لگا۔ اس نے تردی کو سمجھایا۔ ”روشنک سے عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں، میرے ساتھ چل۔ میں تجھ سے چند ضروری باتیں کروں گا۔“

تردی بہت پریشان ہو چکا تھا۔ ہلاکو خان کو ہر بات کا علم تھا اور یہ بات تردی کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ خواجہ طوسی نے ایک جگہ موقع پا کر تردی کو سمجھایا۔ ”تردی! سچ بتا تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اگر مجھ کو تیرے آنے کی غرض و غایت معلوم ہو جائے تو میں تیرے مفر کی کوئی راہ نکال لوں گا۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خواجہ بزرگ! میں ایک فریادی ہوں۔ برقائی نے مجھ پر ظلم کیا ہے، میں اس ظلم کا ازالہ چاہتا ہوں۔“ خواجہ طوسی نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”تیرا دین؟ کیا تو مسلمان ہے؟“

تردی کو پس و پیش میں دیکھ کر خواجہ بزرگ نے ایک بار پھر سرگوشی میں پوچھا۔ ”تیرا دین؟ کیا تو مسلمان ہے؟ مجھ کو سچ بتا دے تاکہ میں اس کی روشنی میں کچھ انتظام کر دوں۔“

تردی سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتا تھا مگر زبان کھلتے کھلتے بند ہو گئی۔

خواجہ نے غصے میں کہا۔ ”ہلاکو خان سے کام لینے کے لیے عقل بھی بہت زیادہ چاہیے ورنہ خان محترم کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تجھ کو ایک فدائی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے اور اگر تو نے ہلاکو خان کے دباؤ میں آ کر اس کا یہ کام نہ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مجھے صاف صاف اور سچ بتا دے۔“

تردی نے ہلاکو خان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرا ہوا تھا۔ تردی نے آہستہ سے کہا۔

پیچھے اس کے ساتھی بھی چڑھ گئے۔ جملہ ساتھی ایک جگہ پر گھبر گئے اور ہلاکو خان اور اس کا ایک خادم دونوں پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے لگے۔ خادم کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور اس تھیلے میں کسی جانور کا گوشت بھرا ہوا تھا۔

سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے کے بعد ہلاکو خان ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ خادم گوشت کا تھیلا ہلاکو خان کے قدموں میں رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہلاکو خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا۔ ابر کا ایک ٹکڑا تک کہیں نہیں نظر آ رہا تھا۔ ہاں کہیں کہیں چیلوں کی چار چار پانچ پانچ کی ٹکڑیاں مجھ پر واز تھیں۔

ہلاکو خان نے نیلے آسمان کی وسعتوں میں نظریں جما دیں اور آہستہ آہستہ بولا۔ ”اے نیلے جاودانی آسمان! آج میں قربانی پیش کرنے آیا ہوں۔ اگر تو نے میری قربانی قبول کر لی تو میں سمجھوں گا کہ میں نے برقائی کو شکست دے دی اور اگر میری قربانی کو شرف قبولیت سے محروم رکھا گیا تو میں اپنی قسمت پر صبر کر لوں گا، اس قسمت پر جس پر مسلمان یقین رکھتے ہیں اور آج مجھے اس قسمت پر مجبور ایمان لانا پڑ گیا ہے۔“

ہلاکو خان نے تھیلے میں سے گوشت نکالا اور اس کو پہاڑی کی بلند ترین چوٹی پر رکھ کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد چیلیں تو غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک عقاب نمودار ہوا اور اس نے گوشت کو چونچ میں دبایا اور فضا میں بلند ہوتا چلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر واپس آیا اور گوشت کو اس جگہ چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہلاکو خان نے کچھ دیر عقاب کا انتظار کیا لیکن وہ پھر واپس نہیں آیا اور چیلیں دوبارہ نمودار ہو گئیں۔

ہلاکو خان دل شکستہ اور دل برداشتہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر اپنے آدمیوں میں چلا گیا۔ اس نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ”خواجہ! میری قربانی قبول ہونے کے بعد نامقبول ہو گئی۔ بتا اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! آپ اپنے دشمنوں کو مغلوب کر لیں گے مگر انہیں تباہ و برباد نہیں کر سکیں گے۔“

ہلاکو خان نے افسردہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور خواجہ طوسی سے کہا۔ ”جب میرا دادا خان اعظم دنیا کی تسخیر کو نکلا تھا تو اس نے برخان کلدون کی چوٹی پر کھڑے ہو کر چھوٹے سے گوسفند کا نذرانہ جاودانی نیلے آسمان کی خدمت

واپس آجائے گا تو میں روشک کو تیرے حوالے کر دوں گا۔“
تردی کی ساری خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ اس نے
ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”محترم خان! ایک تجویز
میرے ذہن میں ہے۔ اگر اس پر ہوشیاری سے عمل کیا
جائے تو برقائی کو ہلاک بھی کیا جاسکتا ہے اور خود کو محفوظ بھی
رکھا جاسکتا ہے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“
تردی نے جواب دیا۔ ”محترم خان! روشک حسین
ترین لڑکی ہے، اس کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں
اسے برقائی خان کی خدمت میں پیش کر دوں گا، آپ کا
نذرانہ کہہ کر اور روشک کو یہ سمجھا دیا جائے گا کہ وہ خلوت
میں برقائی خان کو زہر دے کر ہلاک کر دے۔ اس طرح
سانپ بھی مر جائے گا اور لاشی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“
لیکن ہلاکو خان نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، بولا۔
”چالاک آدمی! اس طرح تو، تو روشک کو لے کر فرار
ہو جائے گا۔“

تردی نے عرض کیا۔ ”روشک کی جگہ کوئی دوسری خوب
صورت لڑکی بھی یہ کام کر سکتی ہے۔“
ہلاکو خان نے کہا۔ ”نہیں، تو میری تجویز پر عمل کرے گا۔“
تردی نے بے دلی سے کہا۔ ”بہتر ہے، جیسی خان
محترم کی مرضی۔“ پوچھا۔ ”مجھے برقائی خان کی خدمت میں
کب جانا ہے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”قسط طنبیہ کا قیصر اپنی بیٹی
ماریہ کو میرے بیٹے ابا قا خان کی دلہن بنا کر بیچ چکا ہے۔ وہ
اپنے بیٹے قیمت تحائف اور دوسرے قیمتی سامان کے ساتھ
یہاں پہنچنے ہی والی ہے، میں چاہتا ہوں کہ طمطراق اور شان
وشوکت کا یہ عدیم الطیر منظر تو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ
لے، اس کے بعد تو چلا جائے گا۔“

ہلاکو خان نے جب اس کو گھر جانے کی اجازت دی تو
مایوسی اور ابھمن نے اس کے دل و دماغ کو بوجھل کر کے رکھ
دیا تھا۔ اب وہ خواجہ طوسی سے ملنا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ کئی
دن بعد خواجہ بزرگ کی خدمت میں گیا۔ اس وقت خواجہ
طوسی تنہا نہیں تھا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے مگر یہ سب
مسلمان تھے اور وضع قطع سے تاجر معلوم ہوتے تھے۔

خواجہ طوسی نے مسکراتے ہوئے تردی کا استقبال کیا،
پوچھا۔ ”تیرا چہرہ لٹکا ہوا کیوں ہے..... خیریت تو ہے؟“
تردی نے حاضرین مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”آیا ہوں تو کچھ دیر دم لوں گا، اس کے بعد اپنا مدعا بیان

”خواجہ بزرگ! میں مسلمان ہوں اور یہاں گھومنے پھرنے
چلا آیا ہوں.....“
خواجہ نے پوچھا۔ ”اور وہ..... وہ بیوی بچوں والا معاملہ؟“
تردی نے جواب دیا۔ ”وہ واقعہ بھی اپنی جگہ
درست ہے۔“

خواجہ نے کہا۔ ”تم میرے پاس آ جانا، میں اپنے گھر
پر تجھ سے کھل کر باتیں کروں گا۔“
لیکن ہلاکو خان نے تردی کو کہیں اور جانے ہی نہیں
دیا۔ اس نے کہا۔ ”تردی! یہ وقت کی بات ہے جو میں تجھ
جیسے معمولی آدمی سے اس طرح ملتا ہوں۔ میں تجھ سے ایک
کام لینا چاہتا ہوں۔“

تردی نے سرعجز و نیاز جھکا دیا، بولا۔ ”میں خان محترم
کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہوں۔“
ہلاکو خان نے کہا۔ ”تو نے شیخ الجبال کا نام تو سنا
ہوگا۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح۔ میں شیخ
الجبال اور اس کے فدا نیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔“
ہلاکو خان نے کہا۔ ”میں تیرے بیوی بچوں کے سلسلے
میں برقائی کے نام ایک سفارشی خط لکھوں گا۔ تو یہ خط برقائی
کو دے گا اور جب وہ میرے خط کی پڑھائی میں مشغول
ہو جائے تو تو زہر میں بچھا ہوا مخمر اس کے دل میں پیوست
کر دے گا۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”اور پھر برقائی کے
سپاہی میرا کیا حشر کریں گے؟“
ہلاکو خان نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”پھر تیرا کیا حشر
ہوگا؟ تو اگر چالاک سے کام لے گا تو قحط جائے گا اور اگر تو
نے میرا یہ کام مستی سے کیا اور وہاں سے فرار نہ ہو سکا تو
وہیں قتل بھی کر دیا جائے گا۔“

تردی نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ ”محترم
ایل خان! اگر میں قتل کر دیا گیا تو میرے بیوی بچوں کا کیا
بنے گا؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”تیرے بیوی بچوں کا کیا
بنے گا؟ مجھے کیا معلوم۔ یہ سوچنا میرا نہیں تیرا کام ہے۔“
تردی چپ ہو گیا تو ہلاکو خان نے قہقہہ کر پوچھا۔ ”کیا
تو بہرہ ہے، گوٹکا ہے..... تو بولنا کیوں نہیں؟“
تردی نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا یہ کام ضرور
انجام دوں گا۔“

ہلاکو خان خوش ہو گیا۔ ”اور جب تو وہاں سے قحط کر

کروں گا۔“ خواجہ طوسی نے کہا۔ ”یہ سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ ان سے پریشان یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

تردی نے بڑی ہمت کی کہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہی بیان کر دے مگر زبان نہ کھل سکی۔

نصیر الدین طوسی نے حاضرین سے کہا۔ ”صاحبان! اب آپ لوگ جاسکتے ہیں، اللہ نے چاہا تو کل پھر ملاقات ہوگی۔“

جب حاضرین مجلس چلے گئے تو خواجہ طوسی نے اپنی آنکھیں تردی کی طرف کر لیں اور پوچھا۔ ”ہاں، اب بتا کیا بات ہے؟“

تردی نے سارا واقعہ رو کر سنا دیا، بولا۔ ”خواجہ بزرگ! آپ خود بتائیں کہ اس طرح میں فحش کر آسکتا ہوں بھلا! میں خود بھی مارا جائوں گا اور زندگی بھر کی بدنامی الگ۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟“

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ”تو موقع پاتے ہی یہاں سے فرار ہو جا اور برقائی سے مل کر اسے ہلا کو خان کی سازش سے مطلع کر دے۔ شاید تو نہیں جانتا کہ اس کا تجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔“

تردی نے پوچھا۔ ”اس کا مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”برقائی تیری وقاداری سے خوش ہو کر تیرے جرم کو بھلا دے گا اور تیرے بیوی بچے تیرے حوالے کر دیے جائیں گے۔“

تردی نے اس تجویز پر خوشی کا اظہار نہیں کیا، بے دلی سے پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ برقائی خان تجھ کو انعام و اکرام سے نواز دے۔“

تردی نے پھر مایوسی سے کہا۔ ”لیکن اس سے میں زیادہ خوش تو نہیں ہوں گا۔“

خواجہ نے کہا۔ ”بہر حال میں نہیں جانتا کہ تجھ کو کس طرح بہت زیادہ خوش کیا جاسکتا ہے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خواجہ بزرگ! میں یہاں کے ایک تاجر کی بیٹی روشک پر عاشق ہو گیا ہوں۔ اگر میں سرانے برقائی خان روشک کے بغیر گیا تو گویا میں یہاں سے ناکام، دل شکستہ و دل برداشتہ واپس جاؤں گا۔ میں روشک کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

خواجہ نے اس کو سمجھایا۔ ”تردی! بچوں جیسی باتیں نہ کر۔ روشک یہیں رہے گی، وہ تیرے ساتھ نہیں جاسکتی۔“

ماہ و مہر کی سردراتیں
جاسوسی کے شمارے کی چنچل کمیتیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

آتش بغاوت • سیاست کے میدان میں باپ اور بیٹی کا ٹکراؤ ایوان اقتدار کے ہشت پہلو رنگت ایچ اقبال کی خون رنگت تحریر

انگاریے • شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عمار کی یکجائی جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گرد • چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی... عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

پھلا رنگ • انگوٹھی و ادایت میں ملوث کچھ پرانے اور اپنوں کا بلاکت خیز انجام

دوسرا رنگ • جرم اور قانون کا ساتھ ہمیشہ سبب دونوں کے ملاپ سے جنم لینے والی داستان



آپ کے تہرے...
مشوے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM سسٹمز ڈائجسٹ جنوری 2017ء

تردی نے پوچھا۔ ”وہ میرے ساتھ کیوں نہیں جاسکتی؟ اس کی وجہ؟“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”تردی! اگر تو نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی غلطی کی تو ہلاکو خان کے آدمی بھیڑیوں کی طرح تیرا پیچھا کریں گے اور کہیں بھی تجھے ہلاک کر کے روشنگ کے ساتھ واپس آجائیں گے۔“

تردی نے پوچھا۔ ”ہلاکو خان کو روشنگ سے کیا دلچسپی ہے؟“
خواجہ نے جواب دیا۔ ”اس سوال کا جواب تو ہلاکو خان ہی دے سکتا ہے۔“

تردی زچ سا ہو گیا تھا، بولا۔ ”خدا یا! یہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو شرفاء میں گھرا ہوا ہے لیکن اگر ذرا سا بھی بہکا تو سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔“

تردی نے کہا۔ ”خواجہ بزرگ! مگر میں یہ راز جان کر رہوں گا کہ روشنگ ہلاکو خان کو کیوں عزیز ہے۔“

خواجہ نے جواب دیا۔ ”اس میں کوئی راز ہوگا تب تو، تو کچھ جانے گا۔ بات سیدھی سی یہ ہے کہ خان روشنگ کو پسند کرتا ہے اور ہمیں کچھ پتا نہیں کہ اس کو کب طلب کر لیا جائے۔“

تردی پر تو گویا بجلی گر گئی۔ وہ کچھ دیر گم صم خواجہ کے پاس بیٹھا رہا، اس کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

تردی انتہائی ضبط و برداشت کے باوجود روشنگ کے پاس جانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ خوب جان چکا تھا کہ روشنگ کے پاس جانے کا مطلب موت کو دعوت دینا ہے لیکن عشق کے ماروں کی طرح وہ بھی اپنی جان کو ہتھیلی پر لے کر روشنگ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت روشنگ تنہا تھی۔ اس کا باپ کہیں گیا ہوا تھا۔ تردی کی دستک ہی سے اس نے اسے پہچان لیا۔ تردی کو اندیشہ تھا کہ روشنگ دروازہ نہیں کھولے گی لیکن خلاف توقع دروازہ کھل گیا۔ تردی نے پوچھا۔ ”کیا تیرے باوا جان موجود ہیں؟“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ موجود نہیں ہیں۔“

تردی نے کہا۔ ”پھر تو حیرت ہے کہ.....“

روشنگ نے بات کاٹ دی، بولی۔ ”آج میں تمہیں اندر اس لیے بلاؤں گی کہ تم سے فیصلہ کن باتیں کروں گی۔“
تردی کھویا کھویا سا سوالیہ نشان بنا اندر داخل ہوا۔ روشنگ نے اسے دالان میں بٹھایا۔ وہاں پتھر کا ایک چبوتر

بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر غالباً بچھا ہوا تھا۔ روشنگ نے کہا۔ ”تردی! تم اس پر بیٹھ جاؤ۔“

تردی نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی، بولا۔ ”مجھے اندر کمرے میں نہیں بٹھاؤ گی؟“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”نہیں، تم اس وقت تک کمرے میں نہیں جاسکتے جب تک تم خود کو اس کا اہل نہیں ثابت کرو گے۔“

تردی نے پوچھا۔ ”کس قسم کی اہلیت؟“

روشنگ نے پوچھا۔ ”میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

تردی گھبرا گیا اور کچھ تامل سے جواب دیا۔ ”بس نہیں کی شادی، کوئی معقول لڑکی نہیں مل سکی۔“

روشنگ نے طنزاً کہا۔ ”تو کوئی معقول لڑکی نہیں مل سکی تم کو۔ گویا میں بہت معقول لڑکی ہوں۔“

تردی کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”بالکل بالکل، کسی معقول لڑکی کا ملنا آسان بات نہیں۔“

روشنگ نے پوچھا۔ ”کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تو..... یہاں ہلاکو خان کے پاس کیوں آیا ہے؟“

تردی اور زیادہ گھبرا گیا۔ ”میں یہاں کیوں آیا؟ تیرا باپ یہاں کیوں آیا؟ یہ لاکھوں لوگ ہلاکو خان کے پاس کیوں آئے؟“

روشنگ نے کہا۔ ”مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔

میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”کام کی تلاش میں۔ طالع آزمائیں کر۔“

روشنگ نے پوچھا۔ ”اور بیوی بچے یرغمال بنے بر قائی یا اس کے پیچھے کے پاس کس کے پڑے ہوئے ہیں؟“

تردی سمجھ گیا کہ روشنگ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا، بولا۔ ”یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ کس کی بیوی، کس کے بچے اور کس کے پاس یرغمال بنے ہوئے ہیں۔“

روشنگ نے بے مروتی سے کہا۔ ”زیادہ چالاک نہ بنو

تردی۔ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔“

تردی اپنی بات پر اڑا رہا، بولا۔ ”مجھے پر تہمت نہ لگا

روشنگ! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور تجھی سے شادی

کروں گا۔“

روشنگ نے جواب دیا۔ ”جب میں شادی کروں گی

تب تو کرو گے لیکن اب میں شادی نہیں کروں گی اور عتقریب اپنا مقدمہ ہلاکو خان کے دربار میں لے جاؤں گی۔ وہاں تیرا جھوٹ سچ سب پر عیاں ہو جائے گا۔“

اب تردی بالکل بے بس ہو چکا تھا، بولا۔ ”روشنک! تو مجھ سے شادی کر یا نہ کر لیکن اس مقدمے کو ہلاکو کے پاس ہرگز نہ لے جا۔“

روشنک جل کر بولی۔ ”اس لیے کہ تیرا جھوٹ کھل جائے گا اور ہلاکو خان تجھے اس جھوٹ کی سزا میں قتل بھی کر سکتا ہے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”اب جو چاہو سمجھ لو لیکن میں اپنے ذاتی معاملات منگول قاتح کے دربار میں نہیں جانے دوں گا۔“

روشنک نے اسی دل جلے لہجے میں کہا۔ ”بہر حال تم وہاں جاؤ یا نہ جاؤ لیکن میں تمہارے بارے میں تحقیقات ضرور کروں گی۔“

تردی نے جب یہ دیکھا کہ پوری طرح ہر طرف سے گھر چکا ہے تو کہا۔ ”اگر تیری خوشی اسی میں ہے کہ ہمارے گھروں کی باتیں ہلاکو خان کے دربار میں ہوں تو میں بھی تیار ہوں کیونکہ میں اس طرح اپنی سچائی ثابت کر سکوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک درخواست ضرور کروں گا۔“

روشنک نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”آج کل میں..... شہزادہ ابا قاخان کی دہن قسطنطنیہ سے آنے والی ہے۔ اس کے آنے کے بعد تو اپنا مقدمہ پیش کر سکتی ہے، اس وقت تجھ کو میری سچائی کا علم ہو جائے گا۔“

روشنک شک و شبہ میں پڑ گئی۔ اس کو اپنی معلومات پر شبہ ہو گیا، آہستہ سے بولی۔ ”میں چند دن صبر کر لوں گی لیکن اس معاملے کو ہلاکو کے دربار تک ضرور لے جاؤں گی۔“

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور روشنک کا باپ اندر داخل ہوا۔ اس نے تردی کو اندر بیٹھے دیکھا تو اس کا دماغی توازن بگڑ گیا، تردی کو گھورتے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر آگیا اس گھر میں؟ میری اجازت کے بغیر۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں آپ کی مرضی کے بغیر ایک بار پھر اس گھر میں آگیا لیکن.....“

روشنک کے باپ نے کہا۔ ”کیا میں نے تجھ کو یہاں آنے سے منع نہیں کیا تھا؟“

اس بار تردی کی جگہ روشنک بولی۔ ”باوا جان! آپ ذرا تحمل اختیار کریں۔ میں نے تردی سے تقریباً فیصلہ کن باتیں کر لی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں بعد یا تو تردی ذلیل و خوار ہو کر کہیں کا بھی نہیں رہ جائے گا یا پھر میں اس لائق ہو جاؤں گی کہ تردی کے بارے میں کوئی مخلصانہ فیصلہ کر سکوں۔“

روشنک کے باپ نے تردی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تردی! ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ قطع تعلق کر لیں اگر تو صاف صاف سننا ہی چاہتا ہے تو سن۔ یہاں ہم ہلاکو خان کی رعایا ہیں اور میں نے سنا ہے کہ ہلاکو خان نے روشنک کو پسند کر لیا ہے۔“ روشنک کے باپ کی آواز بھرا گئی۔ ”کبھی کبھی تو یہ جی چاہتا ہے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں مگر افسوس کہ جی چاہنے کے باوجود ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہلاکو خان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، وہ ہمیں کہیں سے بھی پکڑ سکتے ہیں۔“

تردی نے پوچھا۔ ”یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ہلاکو خان روشنک کو پسند کرتا ہے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”اس کے خاص آدمیوں نے۔ ان میں خواجہ طوسی بھی شامل ہے، میں تو یہاں آکر پہنچتا ہوں۔“

روشنک اٹھ کر جانے لگی، اس نے جاتے جاتے کہا۔ ”باوا جان! اگر ہلاکو خان نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

باپ نے کہا۔ ”مگر یہ نادانی ہے، میں تو مقدر کا قائل ہوں۔ اگر قسمت میں یہی لکھ دیا گیا ہے کہ تو ہلاکو خان کی داشتہ بن جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔“

تردی پر ہلاکو خان کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ وہ خاصا سہم چکا تھا، بولا۔ ”وہی یہ بات اچھی نہیں ہے۔ حکمرانوں کو اپنی رعایا پر ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔“

روشنک کے باپ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تردی! یہ کیا غضب کرتا ہے کہ تو ہلاکو خان کو بالواسطہ ظالم کہہ رہا ہے۔“

تردی نڈھال اور مایوس اٹھا اور روشنک کے کمرے میں چلا گیا۔ روشنک بستر پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ تردی کو گمان گزرا کہ شاید وہ رورہی ہے اس نے روشنک کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”روشنک! مت پریشان ہو۔ میں کوئی بات قبل از وقت نہیں کہنا چاہتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ظلم کی سیاہ ترین رات سپید سحر سے رشتہ قائم کر چکی ہے۔“

روشنک کے باپ نے تردی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے

باہر تک چھوڑ آیا، بوقتِ وداع کہا۔ ”تردی! اب تو یہاں نہیں آئے گا کیونکہ یہاں کی ذرا ذرا سی خبر ہلا کو خان تک پہنچ جاتی ہے۔“

تردی کوئی وعدہ کیے بغیر چلا آیا۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، اس نے اندر ایک شخص کو اپنا انتظار کرتے پایا۔ تردی اس شخص کو ہلا کو خان کے دربار میں دیکھ چکا تھا۔ اس شخص کی بڑی اور معنی مومنین اس کو ہزاروں میں ممتاز کیے رکھتی تھیں، تردی نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کا مجھ سے کوئی کام؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں جس مقصد اور پیغام کے ساتھ یہاں آیا ہوں، ناممکن ہے کہ تو اس کا علم نہ رکھتا ہو۔“

تردی نے بے پروائی اور بے دلی سے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ تم یہاں کیا اور کس کا پیغام لاتے ہو۔“

”فاتح خان کا حکم ہے تو شہزادہ ابا قا خان کی دہن کے آتے ہی یہاں سے چلا جائے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خان کا حکم سر آنکھوں پر۔ تم فاتح خان کو جا کر میری طرف سے یقین دلا دو کہ اب میں اس جگہ نہیں جاؤں گا جو میرے لیے ممنوع قرار دی جا چکی ہے۔“ وہ شخص چلا گیا، تردی کو اب اس جگہ اذیتیں پہنچ رہی تھیں۔

پانچ دن بعد قسطنطنیہ کے قیصر کی بیٹی دہن بن کر حشم و خدم کے ساتھ مراغہ میں داخل ہو گئی۔ گھوڑوں، اونٹوں اور گاڑیوں پر سامان لدا ہوا تھا اور ابا قا خان اپنی دہن کے استقبال کے لیے مراغہ کے باہر کھڑا تھا۔ ہلا کو خان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

دہن اور اس کے سامان کو دیکھنے والوں میں تردی بھی شامل تھا۔ جہیز کے سامان سے لدی ہوئی گاڑیاں اور اونٹ آہستہ آہستہ شہزادے کے مستقر کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

جب دہن ابا قا خان کے قصر میں اتاری گئی تو ہلا کو خان بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے خیموں کے شہر سے نکلا اور ابا قا خان کے قصر میں داخل ہو گیا۔ اس نے دہن کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا حسن خاصا پسند آیا، بولا۔ ”میں نے ابا قا خان کے لیے حسین ترین دہن کا انتخاب کیا ہے۔“

دہن نے چہرے پر بڑی ہوئی جالی میں سے دنیا کے

عظیم فاتح کا دیدار کیا۔ اس نے اس خوشخوار فاتح کی بابت معلوم نہیں کیا کچھ سن رکھا تھا۔ جب اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہی وہ ہلا کو خان ہے جس نے دنیا بھر کو لرزہ بر اندام کر رکھا ہے۔ دہن اپنے پدر بستی کے احترام میں کھڑی ہوئی تھی یا دنیا کے بہت بڑے فاتح کے رعب اور دبے نے اس کو کھڑا کر دیا تھا، اس کا اندازہ نہیں لگا جا سکا۔ لیکن دہن نے اس فاتح کے چہرے پر مزاح اور تمسخر کی ہلکی سی جھلک ضرور محسوس کی۔

ہلا کو خان نے دہن سے پوچھا۔ ”تیرا باپ قیصر کیسا ہے؟“ دہن نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہیں اور آپ کے حق میں دست بہ دعارہتے ہیں۔“

ہلا کو خان نے ناگواری سے منہ بنایا، کہا۔ ”لیکن میں نے جس مقصد سے اس رشتے کی بنیاد ڈالی تھی، وہ تو فوت ہو گیا۔“

اسی وقت دو قوز بھی وہاں پہنچ گئی۔ دو قوز نے دہن کو گلے لگالیا۔ ہلا کو خان نے دو قوز سے کہا۔ ”دو قوز! ذرا صبر کر، میں اس سے چند ضروری باتیں کر لوں۔“ پھر دہن کو مخاطب کیا۔ ”میں یہ چاہتا تھا کہ تیرے باپ سے رشتہ و تعلق پیدا کر کے فوجی مدد حاصل کروں اور پھر مسلمانوں کو یروشلم سے نکال کر مصر کو روندنا ہوا افریقہ میں داخل ہو جاؤں اور اسلام کو صحارا کے عظیم ریگ زار کے حوالے کر کے واپس آ جاؤں لیکن افسوس کہ تیرا باپ زیادہ عقلمند نہیں ثابت ہوا۔“

دہن نے سہم کر پوچھا۔ ”دنیا کے عظیم فاتح! میرے باپ نے وہ کون سی غلطی کی ہے جس کا آپ کو ملال ہے؟“ ہلا کو خان نے کہا۔ ”کیا تیرے باپ نے اپنی دوسری بیٹی کی شادی بر قائی خان کے بیٹے نوگائی سے نہیں کر دی؟ بر قائی خان مسلمان ہو چکا ہے اور اس کو مصر کے غلام بادشاہ پیرس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ میری اس تدبیر کو اس طرح زائل کر دے۔ مصر کا ایک چشم غلام بادشاہ پیرس بہت شریر اور ہشیار آدمی ہے۔ افسوس کہ وہ ابھی تک میرے ہاتھوں سے بچا ہوا ہے۔“

دہن کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہلا کو خان کچھ دیر خاموش کھڑا رہا، پھر پوچھا۔ ”کیا تیری دوسری بہن نوگائی کی بیوی بن گئی ہے؟“

دہن نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس وقت میری بہن دہن بنی ہوئی نوگائی کے محل میں اتر رہی ہوگی۔“

ہلا کو خان نے دو قوز سے کہا۔ ”اب تو دہن سے باتیں کر۔ میں اپنی تدبیر کو خاک میں ملے دیکھ کر کچھ دیر سوگ

منالوں گا۔“ ہلا کو خان نے اسی وقت تردی کو طلب کر لیا۔ جب وہ اپنے خیموں کے شہر میں واپس آیا تو مزاج چڑچڑا ہوا چکا تھا اور طبیعت پر جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ اس نے تردی کو بہت ڈانٹا پھینکا اور اس کو حکم دیا کہ وہ فوراً برقائی سے ملاقات کرے اور مجوزہ منصوبے پر فی الفور عمل کرے۔

ہلا کو خان نے تردی کو برقائی خان کے نام ایک خط دیا۔ اس خط میں تردی کی سفارش کی گئی تھی اور کہا گیا کہ تردی کے بیوی بچے اس کے حوالے کر دیے جائیں۔

اس موقع پر ہلا کو خان نے شیخ الجبال کی طرح تردی کو ایک خنجر بھی دیا۔ ہلا کو خان نے کہا۔ ”یہ خنجر ہر میں بجھا ہوا ہے اور اس کا ایک ہی بھر پور وار برقائی کی ہلاکت کے لیے کافی ہوگا۔“

ہلا کو خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کا یہ منصوبہ ناکام اور ناتمام رہے۔ اس نے اپنے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات بھی تردی کو سمجھائیں۔ ہلا کو خان نے کہا۔ ”اور تردی دیکھ! میری باتیں ذرا غور سے سن۔ اگر تو نے اس منصوبے پر اسی طرح عمل کیا جس طرح میں چاہتا ہوں تو یقین ہے کہ تو اس میں کامیاب رہے گا۔ تو برقائی خان کو راہ میں روک کر میرا خط اس کو دے گا پھر جب وہ غافل ہو کر پورے انہماک سے میرا خط پڑھنے لگے تو تو اسی وقت یہ خنجر اس کے سینے یا پہلو میں پیوست کر دے گا۔ تو اپنا کام ختم کرتے ہی کسی سے گھوڑا چین کر فرار ہو جائے گا۔ میں یہاں تیرا انتظار کروں گا۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”لیکن اس طرح میرے بیوی بچے مجھے کس طرح ملیں گے؟“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”اگر بیوی بچے نہیں ملیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ یہاں روشنگ تیرا انتظار کر رہی ہوگی اور روشنگ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ تو کنوارا ہے کیونکہ تو نے خود اس کو یہ یقین دلایا تھا۔“

تردی نے خنجر پر ایک نظر ڈالی اور ہلا کو خان سے اس کی پیشکش کی وضاحت چاہی۔ ”محترم خان! کیا میں اس پر یقین کر لوں کہ جب میں یہ کام کر کے واپس آؤں گا تو روشنگ مجھے مل جائے گی؟“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”یہ میں وعدہ کر رہا ہوں، ہلا کو خان۔ کیا میں وعدہ خلافی کر سکتا ہوں؟ کیا میں دروغ گوئی کا مرتکب ہو سکتا ہوں؟“

تردی نے سہم کر کہا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں۔ تب پھر میں یہ کام کروں گا اور اس کے عوض روشنگ کو حاصل کر لوں گا۔“

جاتے جاتے اس نے ہلا کو خان سے اجازت لی۔ ”محترم خان! کیا میں جانے سے پہلے روشنگ سے ملاقات کر سکتا ہوں؟“

ہلا کو خان نے جواب دیا۔ ”بالکل ضرور۔۔۔۔۔ تو روشنگ سے ملاقات کر سکتا ہے۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”میری ایک درخواست اور ہے۔“

ہلا کو خان نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”روشنگ کو کسی نے یہ بتا دیا تھا کہ میں بیوی بچوں والا ہوں لیکن میں نے اس کی تردید کر دی۔ آخر میں ہم دونوں میں یہ طے پا گیا تھا کہ یہ مقدمہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب میں تو برقائی کے پاس جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں بہت ممکن ہے کہ روشنگ کسی ذریعے میری اس بات کی تصدیق کرنا چاہے تو روشنگ کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں بیوی بچوں والا ہوں۔“

ہلا کو خان نے کہا۔ ”تو بالکل بے فکر ہو کر چلا جا، روشنگ یا کوئی اور تجھ کو جھٹلا نہیں سکے گا۔“

تردی ہلا کو خان کے پاس سے اٹھ کر سپید ہار روشنگ کے پاس پہنچا۔ اس وقت روشنگ کا باپ بھی گھر ہی میں موجود تھا۔

تردی نے اندر آنے کی اجازت چاہی مگر روشنگ کے باپ نے اس کو دروازے ہی پر روک دیا اور کہا۔ ”تجھ کو جو بات بھی کرنا ہو یہیں کر لے۔ میں روشنگ کو یہیں بلوائے لیتا ہوں۔“ اس کے بعد اس نے روشنگ کو آواز دی۔ ”بیٹی روشنگ! ذرا یہاں دروازے پر آ جا۔ تردی چند باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

روشنگ فوراً ہی آگئی۔ اس کے باپ نے تردی سے پوچھا۔ ”تجھ کو کیا بات کرنی ہے؟ جلدی کر اور اپنا راستہ لے۔“

تردی نے دونوں ہی کو مخاطب کیا۔ ”میں کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ میری یہ ملاقات عارضی الوداعی ہے۔“

روشنگ نے اندر سے پریشان آواز میں پوچھا۔ ”باہر جا رہے ہو؟ مگر کہاں اور کیوں۔۔۔۔۔ اور کب تک واپس آ جاؤ گے؟“

تردی نے روشنگ کے دل میں اپنے لیے دکھ جو محسوس کیا تو بہت خوش ہوا، بولا۔ ”شاید میں ڈیڑھ دو ماہ بعد

سور کے شمالی ساحل پر معمولی سے لشکر کو پڑاؤ ڈالے دیکھا اور نوگائی کی بابت یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی نئی ٹوپی دہن کے ساتھ فقط از کے شمالی دریا تیریک کے اس پار مرے لوٹ رہا ہے۔ یہ خاصا طویل سفر تھا۔ وہ کہیں آرام کیے بغیر دریائے تیریک کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے جنوبی کنارے سے، دوسری طرف ایک عظیم الشان لشکر کو پڑاؤ ڈالے دیکھا اور یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ یہاں برقانی خان بھی ضرور موجود ہوگا۔

واپس آ جاؤں گا۔“
روشنک نے پوچھا۔ ”اور وہ مقدمہ جواب ہلا کو خان کے دربار میں پیش ہونے والا تھا، اس کا کیا ہوگا؟“
تردی نے جواب دیا۔ ”روشنک! میں تجھ کو اجازت دیتا ہوں کہ تو میری عدم موجودگی میں بھی ہلا کو خان سے میرے جھوٹے سچ کی تصدیق یا تردید کر سکتی ہے۔ ویسے میں اب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور میں بیوی بچوں والا ہرگز نہیں۔“

روشنک نے شریر لہجے میں کہا۔ ”میں یہ مسئلہ تمہاری موجودگی ہی میں صاف کرنا چاہتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم راؤ فرار اختیار کر رہے ہو؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”روشنک! میں تجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ میں سچا ہوں اور میرے سچ کی تصدیق خود ہلا کو خان سے ہو جائے گی۔“

روشنک کے باپ نے کہا۔ ”بہر حال اگر تو واقعی جارہا ہے تو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے، خدا تجھے واپس نہ لائے۔“

تردی مسکرایا، بولا۔ ”خدا مجھے واپس بھی لائے گا اور میں واپس آتے ہی روشنک کو بھی حاصل کر لوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔“

روشنک اچانک اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا تھا اور اب روشنک اور تردی میں چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تردی کو روشنک کی جرأت اور دلیری نے بہت متاثر کیا۔ بولی۔ ”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

تردی نے شکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”روشنک! میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں تیرا باپ مجھ کو پسند نہیں کرتا اور جب بھی ملتا ہے دو چار جلی کٹی سنا دیتا ہے مگر تو ہے کہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتی اور برابر میری ہمت افزائی اور دل جوئی کرتی رہتی ہے۔“

روشنک نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب وہ جارہا تھا تو اس نے کئی بار گھوم گھوم کر روشنک کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ کھولے کھڑی اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بحیرہ کیپسین کے جنوبی ساحل سے گھوم کر مغربی ساحل کے کنارے کنارے داغستان میں داخل ہو گیا۔ اس کا خیال تھا، برقانی کا نامور بھتیجا اس کو دریائے سور کے کنارے لشکر ڈالے مل جائے گا لیکن اس نے دریائے

دریا کو عبور کرنا آسان نہیں تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر نوگائی اور اس کی فوج کا قبضہ تھا اور کوئی بھی کشتی والا نوگائی کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی ادھر سے ادھر یا ادھر سے ادھر نہیں لے جاسکتا تھا۔ تردی کے لیے یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کو دریائے تیریک کو واپسی میں اس طرح عبور کرنا تھا کہ کسی کو اس کے عبور کرنے کی خبر تک نہ ہو سکے اور وہ ادھر سے ادھر بھاگ آئے۔ وہ اس چکر میں دریا کے کنارے دور تک چلا گیا۔ مشرق میں اتنی دور کہ کچھ دور اور چلا جاتا تو بحیرہ کیپسین کا کنارہ نظر آنے لگتا۔ اس نے یہاں سے نوگائی کے لشکر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں نظر آیا۔ اب وہ دریا کے کنارے کسی کشتی کا غنہ تھا۔ کافی دیر بعد ایک کشتی شمالی ساحل کی طرف آتی دکھائی دی اور جب یہ ساحل پر آکر کھڑی ہو گئی تو اس میں سے پانچ آدمیوں نے ساحل پر کود کر کشتی کو خالی کر دیا۔ اب تردی نے کشتی کے ملاح سے اپنے کام کی بات شروع کر دی۔ اس نے کشتی والے سے دوسرے کنارے پر لے جانے کی اجرت پوچھی اور جب اس کو اس کی اجرت معلوم ہو گئی تو تردی نے کہا۔ ”میں تجھ کو تیری منہ مانی اجرت سے پانچ سات گنا زیادہ اجرت دے سکتا ہوں مگر اس کی ضروری شرط یہ ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تجھ کو مجھے فوراً ہی دریا کے اس پار اتارنا ہوگا۔“

بات دونوں میں طے پا گئی تو تردی دریا کے دوسرے کنارے پر اتار دیا گیا۔ وہ یہاں سے مغرب کی طرف نوگائی کے لشکر کی جستجو میں بڑھا، یہاں تک کہ وہ نوگائی کے لشکر میں پہنچ گیا۔ نوگائی اس وقت اپنے لشکر میں موجود نہیں تھا۔ اس نے دوسرے سرداروں سے نوگائی کی بابت پوچھا تو کسی نے بھی تشفی آمیز جواب نہیں دیا لیکن شام سے ذرا پہلے اس کی نوگائی سے ملاقات ہو گئی۔ نوگائی نے اسے گلے لگایا اور پوچھا۔ ”تو، تو وفد کے ساتھ ہلا کو خان کے دربار میں گیا تھا، پھر تو اتنے دنوں کہاں رہا؟“

کے لیے دریائے تیریک کے کنارے چلا آیا۔ یہاں نوگائی نے برقائی کو مطلع کیا کہ تردی واپس آچکا ہے۔ تردی کو اس بات کا انتظار تھا کہ برقائی سیرپانے یا کسی سے ملنے کے لیے پڑاؤ سے سفر کرے تو وہ اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دے لیکن تردی کو کئی دن تک اس بات کا موقع نہیں مل سکا۔

ایک دن اس نے علی الصباح برقائی خان کو اپنے گھوڑے پر سوار دریائے تیریک کے ساحل کی طرف جاتے دیکھا۔ اس وقت برقائی کے ساتھ پانچ آدمی اور تھے۔ تردی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور تیزی سے برقائی کی طرف بڑھا۔ تردی گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ ”زیریں خیل کے خان! میں آپ کے چچا کے بیٹے ہلاکو خان کا ایک سفارشی خط لے کر آیا ہوں۔“

برقائی خان اسے پہچان نہیں سکا، پوچھا۔ ”مگر تو ہے کون؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”تردی، وہی تردی جو گھوڑوں کی چوری میں پکڑا گیا تھا اور اس کے بیوی بچوں کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔“

برقائی خان مسکرایا۔ ”اچھا تو، تو تردی ہے مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تیرے سپرد کوئی کام کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟“

تردی نے برقائی کے پاس پہنچنے کی کوشش کی مگر برقائی کے آدمیوں نے اسے روک لیا اور کہا۔ ”لا وہ سفارشی خط کہاں ہے؟ ہم خان معظم کو دے دیں گے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”اپنی حفاظت کے لیے، کیا خنجر رکھنا جرم ہے؟“

برقائی خان نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ ”اس کا خنجر اسے واپس کر دو اور سفارشی خط مجھے دو۔“

تردی کو اس کا خنجر واپس مل گیا اور سفارشی خط برقائی کو دے دیا گیا۔

برقائی خان نے ہلاکو کا خط کھولا اور اسے پڑھنے لگا، تردی برقائی کے آدمیوں میں گھر چکا تھا۔ برقائی خان خط پڑھتا رہا۔ جب خط پڑھ چکا تو پوچھا۔ ”تردی! کیا تو یہ سمجھتا

تردی نے فرضی داستان گھڑ کر سنا دی۔ ”میں گیا تو وفد کے ساتھ ہی تھا مگر وہ سرزمین مجھے بہت اچھی لگی۔ میں کسی کو لیے بغیر ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا کہ کسی نے مجھے قید کر لیا۔ میں نے قید خانے میں ہاتھ پاؤں مارے مگر ناکام رہا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ ابا قاخان کی شادی کی خوشی میں جب قیدی رہا کیے گئے تو ان رہا ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا۔“

نوگائی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تب تو تو نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور اس منصوبے کا کیا ہوا جس کے ماتحت تجھ کو بھیجا گیا تھا؟“

تردی نے نہایت افسوس سے جواب دیا۔ ”جناب! آپ عجیب آدمی ہیں۔ جب میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے اپنا پورا وقت قید خانے میں گزار دیا تو آپ کا مجھ سے یہ پوچھنا کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اس منصوبے کا کیا ہوا جس کے ماتحت مجھ کو وہاں بھیجا گیا تھا۔“

نوگائی نے معذرت کر لی۔

تردی نے پوچھا۔ ”خان محترم برقائی خان ان دنوں کہاں تشریف فرما ہیں؟“

نوگائی نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں کیونکہ چچا اپنے منصوبوں سے ہر ایک کو لاعلم رکھتے ہیں۔“

تردی نے کہا۔ ”لیکن میں ان سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہوں۔“

نوگائی نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو چچا برقائی خان سے ہر قیمت پر ملاقات کرنا چاہتا ہے، خوب! مگر کیوں؟ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں اپنی داستان ناکامی انہیں سنانا چاہتا ہوں اور ان کی اجازت سے میں ایک بار پھر ان لوگوں میں واپس جانا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے... خواہ مخواہ اتنے دنوں قید میں رکھا۔“

نوگائی نے کہا۔ ”تب پھر تو ہمارے پاس رہ، کسی دن یہیں چچا برقائی سے ملاقات ہو جائے گی۔“

تردی نے پوچھا۔ ”کچھ پتا ہے ان دنوں میرے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

نوگائی نے جواب دیا۔ ”برقائی چچا کی قید میں۔“

تردی، نوگائی کی اجازت کے بغیر برقائی کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ اسے برقائی کے انتظار میں بیس دن ضائع کرنا پڑے۔ پھر معلوم ہوا برقائی آ رہا ہے۔ برقائی کو کچھ پریشان کن خبریں ملی تھیں اور وہ ان کے سدباب

برقائی نے اس خنجر کو طلب کیا۔ ”وہ میرے حوالے کر دے کیونکہ ہتھیار رکھنا سپاہیوں کا کام ہے اور تو محض چور ہے۔“

تردی نے خنجر نکال کر برقائی خان کے حوالے کر دیا، بولا۔ ”خان معظم! میں ایک شریف انسان ہوں، مجھے چور نہ کیسے کیونکہ میں نے آج تک چوری نہیں کی۔ میری بد قسمتی کہ جب مجھے لوٹا گیا تو میں اس لائق نہیں تھا کہ اس کی اطلاع آپ کو دیتا اور جب میں نے اپنا نقصان پورا کیا تو مجھے چور کہہ کر سزا دے دی گئی۔“

برقائی نے شاید اس کی باتیں سنی ہی نہیں، اس نے اپنے ایک سردار کو آواز دی۔ ”قائدو، اس خنجر کو دیکھ اور بتا کہ اس میں کیا خاص بات ہے؟“

قائدو نے کچھ دیر خنجر کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور جواب دیا۔ ”خان معظم! خنجر زہر میں بچھا ہوا ہے اور یہ اس قسم کا خنجر ہے جو الموط کے شیخ الجبال اپنے فدا نیوں کو دیا کرتے تھے۔“

برقائی نے تردی سے پوچھا۔ ”صاف صاف بتا تیرا کیا منصوبہ تھا؟“

تردی کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت منڈلاتی نظر آئی۔ بھگیا کر جواب دیا۔ ”میرا کوئی منصوبہ نہیں تھا، خان معظم! مجھ پر بلا وجہ شبہ نہ کیجیے۔“

برقائی نے تردی کا خنجر اسے واپس دلادیا اور کہا۔ ”اگر تو نے کسی کے شہ دینے پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں اس خنجر سے ہلاک کیا جاسکتا ہوں تو یہ تیری اور اس شہ دینے والے کی بڑی بھول ہوگی۔“

تردی لا جواب اور بے بس کھڑا اپنی بد قسمتی اور کم ہمتی کو کوس رہا تھا۔ اس کا خنجر اسے واپس مل چکا تھا۔ برقائی خان نے حکم دیا۔ ”تردی کو آزاد رکھا جائے اور اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ جہاں چاہے رہے۔ رہ گئے اس کے بیوی بچے تو ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

تردی کو برقائی کے خیمے سے نکال دیا گیا۔ برقائی کچھ دیر بعد باہر نکلا اور لوگائی سے اس کے لشکر میں ملاقات کی۔ اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ ”لوگائی! ابھی جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ ابا قا خان اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا ہوگا، تو بھی اپنی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منا۔“

لوگائی نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے ہلاکو خان کو حملے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا اور مجھے میرے خنجروں نے بتایا ہے کہ ہلاکو خان کے ہراول دستے

ہے کہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا؟ میں نے بھی تیرے سپرد ایک کام کیا تھا، کیا تو نے میرا وہ کام کر دیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”جناب! میں وہاں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بس جس طرح نکلا ہوں اس کی قید سے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ آخر میں ہلاکو خان مجھ پر بہت مہربان ہو گیا تھا۔“

برقائی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اس سے کہو میں یہاں راہ میں کوئی بات نہیں کروں گا، یہ میرے خیمے میں آئے۔“

تردی نے سوچا کیوں نہ برقائی پر خنجر سے وار کر دیا جائے لیکن اس نے برقائی کے پانچوں آدمیوں کو مستعد اور چاق و چوبند دیکھا۔ برقائی آگے بڑھ گیا اور تردی مایوس اور ناکام اپنی جگہ کھڑا کھڑا رہ گیا۔

تردی نے اس کام کو بے حد آسان سمجھ رکھا تھا مگر جب عملاً اس کا وقت آیا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

دوسرے دن کے انتظار میں اس کو وقت گزارنا دوبھر ہو گیا۔ وہ ہلاکو خان کا سفارشی خط پڑھوا چکا تھا۔ اب وہ کس چیز میں برقائی کو گھور کر دوار کرے گا، اس کا بیشتر وقت اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ برقائی کے خیمے میں پہنچا تو اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ برقائی کو دو چار وار میں بھی ہلاک کر دینا بالکل آسان نہیں تھا اور اگر وہ برقائی کو ہلاک کر بھی دیتا تو فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں اور وہ بھاگ کر ہلاکو خان کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔

برقائی نے تردی کو دس قدم دور کھڑا رکھا اور پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان ہم پر حملہ کرنے کی سوچ رہا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے۔“

برقائی نے تردی کو گھور کر دیکھا اور درشت لہجے میں پوچھا۔ ”تو ہلاکو خان کے پاس میرے لیے کوئی منصوبہ لے کر گیا تھا یا اپنے لیے سفارشی خط لینے؟“

تردی کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وہ گڑ گڑانے لگا۔ ”معزز خان! ہلاکو خان نے خود ہی سفارشی خط لکھ کر دے دیا۔ حالانکہ میں نے اس سے کسی قسم کی درخواست نہیں کی تھی۔“

برقائی نے چونکا دینے والا سوال کیا۔ ”تیرا وہ خنجر کہاں ہے جو کل تیری کمر سے اڑسا ہوا تھا؟“

تردی نے مردہ آواز میں جواب دیا۔ ”وہ اس وقت بھی میری کمر میں اڑسا ہوا ہے۔“

نے ایک نیا سوال کر دیا۔ ”ان دنوں ہلاکو خان کی جنگی تیاریاں کس حال میں ہیں؟ کیا وہ مصر کے خلاف لشکر کشی کا ارادہ رکھتا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں! وہ بیبرس کو تباہ و برباد کر دینے کا معمم ارادہ کر چکا ہے۔“

نوگائی نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو ہلاکو خان تجھ سے اتنا بے تکلف ہو گیا تھا کہ اپنے اس ارادے کا ذکر بھی تجھ سے کر دیا؟“

تردی نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”جب میں دربار میں کھڑا تھا تو وہاں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔“

نوگائی نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے تم واپس بھی جاؤ گے۔“
تردی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ آپ کو کس نے بتایا؟“
نوگائی نے جواب دیا۔ ”اس ملاح نے جس کو تو نے واپسی کا مشکلی کرایہ ادا کر دیا ہے۔“

تردی نے کہا۔ ”ایسا میں نے اس لیے کیا تھا کہ مجھے شبہ تھا کہ میں برقائی خان کے دربار سے بھگا دیا جاؤں گا۔“
نوگائی نے پھر ایک سوال کیا۔ ”وہاں تو نے کتنے دوست بنائے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ایک بھی نہیں کیونکہ وہ لوگ اس لائق نہیں کہ انہیں دوست بنایا جائے۔“

نوگائی نے کہا۔ ”تردی! مجھے کئی آنے جانے والوں نے بتایا کہ تو وہاں ایک دن بھی قید خانے میں نہیں رہا۔“

تردی چیخا۔ ”یہ مجھ پر اتہام ہے، تہمت ہے، الزام تراشی ہے، بہتان ہے۔“

نوگائی نے سوچا۔ تردی آدمی بہت پکا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس سے کون سا ایسا سوال کرے جس سے وہ گھر جائے۔ اس نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے مراغہ بڑی حسین جگہ ہے اور یہاں کچے پکے مکانات کے ساتھ ہی خیموں کا بھی ایک بہت بڑا شہر آباد ہے۔ تو نے مراغہ کو کیسا پایا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہاں خیموں کا شہر الگ اور کچے پکے مکانات کا شہر الگ آباد ہے اور شہر میں ہر مذہب و ملت کے لوگ آزادی سے رہ رہے ہیں۔“

نوگائی نے تردی کو چکر میں لے لیا تھا، اس جواب نے نوگائی کو بتا دیا تھا کہ تردی نے مراغہ کو آزادی سے گھوم پھر کر خوب اچھی طرح دیکھا ہے۔

وہ ابھی سوال جواب ہی میں مشغول تھا کہ اس نے دریاے تیریک کی طرف سے شور و غل کی آوازیں سنیں۔ وہ

بحیرہ خزر کے کناروں پر حرکت کر رہے ہیں اور قفقاز کے گھنے جنگلات میں راستے بناتے پھر رہے ہیں۔“

برقائی نے کہا۔ ”میں اپنے شہر واپس جا رہا ہوں۔ میں ہلاکو خان کے خلاف سرفرد و بخارا کے پُر جوش مسلمانوں کو بھرتی کر رہا ہوں۔ یہ مسلمان اس معرکے کو جہاد سمجھ کر سر کریں گے۔“

برقائی واپس چلا گیا۔ نوگائی کے عساکر میلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے تردی کو تلاش کروا کے اپنے خیمے میں بلوایا حالانکہ برقائی نے نوگائی کو تردی کی بابت یہ بتا دیا تھا کہ وہ ہلاکو خان یا کسی شہزادے کے ہاتھ بک چکا ہے۔ اس لیے وہ قابل اعتبار نہیں رہا اور وہ ہلاکو خان اور اس کے عزائم کے بارے میں جو کچھ بھی بتائے گا، وہ یقین کے لائق نہیں ہوگا مگر نوگائی کا خیال تھا کہ تردی سے بہت سے سوالات کر کے کام کی باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔

تردی اپنی ناکامی پر بہت زیادہ افسردہ تھا اور یہ افسردگی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ نوگائی نے پوچھا۔ ”تردی! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو آج کل بہت زیادہ افسردہ ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

تردی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”نوگائی بہادر! میں اپنے بیوی بچوں کی جدائی میں پریشان ہو رہا ہوں۔“

نوگائی نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے تیرے پاس سے ایک ایسا خنجر برآمد ہوا جو زہر میں بچھا ہوا تھا اور اس قسم کے خنجر شخ الجبال اپنے فدائیوں کو دیا کرتا تھا۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ خنجر تبریز میں خریدا تھا اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ زہر میں بچھا ہوا تھا یا شخ الجبال کے فدائیوں جیسا خنجر تھا۔“

نوگائی نے پوچھا۔ ”تردی! مجھے ایک بات اور بتا۔ ہلاکو خان تک رسائی حاصل کرنا آسان بات نہیں اور تو نے وہاں تک رسائی بھی حاصل کر لی اور چچا برقائی خان کے نام سفارشی خط بھی حاصل کر لیا۔ میں جانتا چاہتا ہوں کہ یہ دشوار کام کس طرح آسان ہوا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”جب میں ہلاکو خان کی قید میں تھا تو میں نے قید خانے کے عملے کو رو کر اپنے بیوی بچوں کی جدائی کی داستان سنائی۔ ان لوگوں نے میری پرورد داستان کسی طرح ہلاکو خان تک پہنچا دی اور معلوم نہیں کیوں ہلاکو خان کو مجھ پر رحم آگیا۔ اس نے مجھے بلایا اور بڑی تسلیاں دیں اور ایک سفارشی خط بھی میرے حوالے کر دیا۔“

نوگائی تردی کو کہیں سے بھی پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ اس

بڑی تیزی سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاتعداد کشتیاں دریا کی سطح پر تیرتی چلی آرہی ہیں۔ اس کے علاوہ ساحل پر بھی فوجیں اتر چکی تھیں۔ نوگائی پھرتی سے اٹھا اور نعرہ بلند کیا۔ ”دھوکا۔ ہلا کو خان نے ہم سے دھوکا کیا اور اس کے عساکر ہماری حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔“

طبل جنگ بج گیا اور برقائی کی سپاہ خیموں سے نکل نکل کر میدان میں پھیلنے لگی۔

نوگائی نے نہایت پھرتی سے قلب کو پیچھے ہٹایا اور اسے میلوں پیچھے ہٹا لے گیا۔ وہ جس تیزی سے پیچھے ہٹا تھا، اس سے ہلا کو خان کی سپاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اس اچانک حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ رہا ہے۔ ہلا کو خان کے عساکر کی قیادت شہزادہ ابا قا خان کر رہا تھا۔ اس کے حوصلے بلند تھے۔

نوگائی کا قلب تو راہ فرار اختیار کر چکا تھا اور مینہ میسرہ میلوں میں پھیلے ہوئے جنگلات میں غائب ہو چکا تھا۔ نوگائی کے خیمے خالی پڑے تھے۔ ابا قا خان نے ان خیموں پر قبضہ کر لیا اور اپنی افواج کو دور دور تک پھیلا کر مورچہ بندی شروع کر دی۔ وہ حیران تھا کہ برقائی خان کے عساکر کو آخر ہو کیا گیا ہے جو ان کے اچانک حملے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا۔ اب ابا قا خان اور اس کی افواج کے سامنے برقائی خان کا وسیع و عریض ملک تھا۔ مشرق میں کچھ ہی فاصلے پر استراخان تھا جو اس کا دوسرا ہدف بن سکتا تھا۔

نوگائی دائیں بائیں میلوں کا چکر لگا کے دریائے تیریک کے دوسرے کنارے اتر گیا اور جنوبی ساحل پر قبضہ جمالیا۔ گویا اب ابا قا خان اتنی آسانی سے واپس نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے مینہ اور میسرہ نے سمنا شروع کر دیا، نہایت پھرتی اور تیزی سے۔ جب یہ دونوں بازو دشمن کو گھیرے میں لے چکے تھے، اسی وقت قلب نے پلٹ کر ابا قا کی افواج پر حملہ کر دیا۔ اب ابا قا اور اس کی سپاہ ہر طرف سے گھر چکی تھی اور نوگائی اپنے دائرے کو تنگ کرتا چلا گیا۔

ابا قا خان کو اپنی زندگی میں ایسے شاطروں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اس نے اپنی سپاہ کو لڑنے کی تلقین کی اور خود بھی نوگائی کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ ابا قا خان کے لشکر کا بڑی تیزی سے صفایا ہونے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ سرعت دریا کو عبور کر کے جنوبی ساحل پر مورچہ بندی کی جائے۔ نوگائی کی سپاہ نے دریا میں اتر جانے والی فوج کو تیروں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ ہلا کو خان کے سپاہیوں نے بھی تیروں کی بارش

کردی لیکن اسی وقت ان پر جنوبی ساحل سے بھی تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اب اس مفروضہ میں مقابلے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے دریا میں کودنا شروع کر دیا لیکن نوگائی نے انہیں بھی نہیں بخشا اور انہوں نے جب بھی پانی پر سراٹھایا۔ نوگائی کی فوج نے تیروں سے انہیں چھلنی کر دیا۔

ابا قا خان کو شکست فاش ہو چکی تھی، وہ بمشکل اپنی جان بچا کر مراغہ چلا گیا۔

ہلا کو خان کو جب اس شکست کا علم ہوا تو گویا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے ابا قا خان سے کہا۔ ”کیا خوش طالعی ہم سے روٹھ گئی۔ کیا مقدر نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ اب کیا ہوگا؟“

تردی نے فرار ہو کر ہلا کو خان کے پاس پناہ لی۔ ہلا کو خان نے تردی سے پوچھا۔ ”کیا تو نے برقائی خان کو شکست لگا دیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”نہیں، کیونکہ برقائی خان نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں ایک بار پھر جاؤں گا اس کے پاس۔“

ہلا کو خان بہت اداس اور دل شکستہ تھا۔ اس نے تردی سے کہا۔ ”افسوس کہ تو ایک معمولی کام بھی نہیں انجام دے سکا۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! برقائی خان کو ہلاک کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔“

ہلا کو خان اتنا اداس تھا کہ اس کے منہ سے صاف آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے تردی کو ایک طرف بٹھا دیا اور پوچھا۔ ”میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کرتا مگر افسوس کہ روشنگ تیری قسمت ہی میں نہیں۔“

تردی نے روتے ہوئے کہا۔ ”خان محترم! میں انتہائی بد قسمت انسان ہوں، میں نے جس کو چاہا وہ مجھ سے دور ہو گیا۔“

ہلا کو خان نے تالی بجائی تو دو کنیزوں نے جھک کر ہلا کو خان کو سلام کیا۔

ہلا کو خان نے کہا۔ ”روشنگ کو حاضر کیا جائے۔“

تھوڑی دیر بعد روشنگ کو حاضر کر دیا گیا۔ وہ کچھ کمزور ہو چکی تھی، اس نے ہلا کو خان کے سامنے تردی کو دیکھا تو تلملا کر رہ گئی۔

ہلا کو خان نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، روشنگ؟“

پھر تردی کی طرف اشارہ کیا، پوچھا۔ ”کیا تو اس شخص کو جانتی ہے؟“

”محترم شامانو! کیا تم بتا سکتے ہو اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟“
ایک شامان نے جواب دیا۔ ”قراقرم کے جن قبائل
کو خان اعظم نے جھاڑو کے تنکوں کی طرح یکجا اور متحد کر دیا
تھا، وہ عنقریب انتشار کے شکار ہو جائیں گے۔“
ہلاکو خان نے مسلمان نجومیوں سے پوچھا۔ ”اور اس
سلسلے میں تمہارا علم کیا کہتا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہمارا علم ہمیں بتاتا ہے کہ
مشرق کا تاجدار اپنے جھگڑوں میں پھنس کر مزید فتوحات
سے محروم ہو جائے گا اور مغربی ممالک مشرقی تاجدار کا کوئی
ساتھ نہ دیں گے۔“

ہلاکو خان بڑی دیر تک سجدے میں سر ڈالے پڑا رہا۔
ابا قا خان نے درخواست کی۔ ”اب آپ اپنے خیمے
میں تشریف لے چلیں۔“

ہلاکو خان نے ولی عہد شہزادے سے کہا۔ ”مجھے سہارا
دے، معلوم نہیں کیوں طاقت سلب ہوتی چلی جا رہی ہے۔
مجھے معلوم نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔“

ابا قا خان نے غصے سے کہا کہ ہلاکو خان بے حد کمزور
ہو چکا ہے۔ اس نے باپ کو خیمے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔
اسی عالم میں اس نے اپنی قیمتی بیوی دو قوز کو طلب کیا۔ دو قوز
اس کو صاحب فراش دیکھ کر پریشان ہو گئی، پوچھا۔ ”میرے
آقا! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”آسمان کا یہ دم دار ستارہ
میرے لیے جو پیغام بھی لایا ہو، میں اس کو خوش آمدید کہوں
گا۔“

اس کے بعد ہلاکو خان کی طبیعت خراب رہنے
لگی۔ نصیر الدین طوسی نازک حالات کا اندازہ لگا کر چند
دنوں کے لیے کہیں اور چلا گیا۔

اطباء نے ہلاکو خان کا علاج شروع کر دیا۔ اس کو کیا
مرض ہو گیا ہے، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پانچویں
دن، رات کے پچھلے پہر ہلاکو خان نے دو قوز سے پوچھا۔
”کیا وہ دم دار خونی ستارہ آج بھی آسمان پر موجود ہے؟“
”میرے آقا! وہ دم دار سرخ خونی ستارہ اس وقت
بھی آسمان پر موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

ہلاکو خان دو قوز اور روشنگ کے سہارے باہر آیا اور
مشرقی افق پر طلوع ہونے والے خونی ستارے نے ہلاکو
خان کو ایک بار پھر خوف زدہ کر دیا۔ اس نے اپنا سینہ پکڑ لیا
اور کراہتے ہوئے کہا۔ ”کوئی میرا دل مسل رہا ہے۔“
دو قوز نے اسے تسلی دی۔ ”میرے آقا! یہ آپ کا

روشنگ نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا لگا گویا وہاں
ارواحِ خبیثہ کا قبضہ ہو چکا ہے، بولی۔ ”ہاں، میں اس کو کچھ
کچھ پہنچاتی ہوں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”ہم نے اس کے سپرد ایک کام کیا
تھا۔ اگر یہ میرا وہ کام کر دیتا تو میں تجھ کو اس کے حوالے
کر دیتا مگر یہ نہیں کر سکا۔ یعنی یہ تجھ کو نہیں حاصل کر سکا۔“
روشنگ آنکھیں بند کیے کچھ دیر کھڑی رہی۔ تروی کو
اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اچانک باہر سے شور و غل کی
آوازیں آنے لگیں۔ ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”یہ کون گستاخ
ہیں؟ یہ شور و غل کیسا؟ انہیں پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔“

تھوڑی دیر بعد اس کے خدمت گزاروں نے ہلاکو
خان کو ایک عجیب وحشت اثر خبر سنائی۔ ہلاکو خان کو بتایا گیا۔
”محترم ایل خان! آسمان پر ایک دم دار ستارہ نمودار ہوا
ہے۔ اس ستارے کی تیز روشنی دیکھنے والوں کے دلوں پر
خوف اور دہشت طاری کر رہی ہے اور لوگ ڈر کر شور و غل کر
رہے ہیں۔“

ہلاکو خان نے آہستہ سے کہا۔ ”سرخ دم دار ستارہ۔
کیا مطلب؟“

خدمت گار نے عرض کیا۔ ”جی حضور! والا! تیز سرخ
روشنی والا منحوس دم دار ستارہ۔“

اس وقت ہلاکو خان نے شراب پی رکھی تھی۔ اس نے
روشنگ سے کہا۔ ”میں اٹھنا چاہتا ہوں، مجھے سہارا دے۔“

روشنگ نے اس کو سہارا دیا۔ ہلاکو خان اپنے خیمے
سے باہر نکلا اور پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ تیز سرخ روشنی والا دم
دار ستارہ؟“

باہر ابا قا خان بھی موجود تھا۔ اس نے ہلاکو خان کو
مشرقی افق کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”ادھر دیکھیے، وہ رہا
دم دار ستارہ۔“

ہلاکو خان نے دیکھا۔ ایک سرخ روشنی والا دم دار
ستارہ جس کا ٹیلا حصہ جھاڑو کی طرح سٹپاٹا تھا اور پری
حصہ جھاڑو کے تنکوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ سرخ
سرخ تنکوں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ہلاکو خان اسے دیکھ کر
سہم گیا۔ وہ اسی جگہ جہاں کھڑا تھا سجدے میں گر گیا، بولا۔
”ادھاودانی نیلے آسمان رحم..... یہ کس بات کی نشانی ہے،
مجھے اس سے مطلع فرمایا جائے۔“

قبائلی شامان (ساحر) ہلاکو خان کے آس پاس جمع
ہو گئے۔ سجدے سے سر اٹھا کر اس نے شامانوں سے پوچھا۔

کنیزیں بھی تہ خانے میں پہنچادی گئیں اور اس کو باہر سے بند کر دیا گیا۔ کنیزوں کے رونے چہنچہنے کی آوازیں اس وقت تک سنائی دیتی رہیں جب تک وہ بالکل بند نہیں ہو گیا۔ تردی کا سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ اب مراغہ میں اس کا کون رہ گیا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس جا کر برقائی خان کی خوشامد کرے۔

وہ قفقاز کی سرسبز وادیوں کو عبور کر کے جب دریائے تیریک کے اس پار پہنچا تو برقائی اور نوگائی کو یہاں موجود پایا۔ اس نے عاجزی اور نیاز مندی سے برقائی کے خیمے میں حاضری دی اور قدموں میں گر کر رونے لگا۔

برقائی نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان مر گیا؟“
تردی نے جواب دیا۔ ”ہاں میرے آقا..... میرے بادشاہ! وہ مر گیا۔“

برقائی خان نے اپنے بھتیجے نوگائی سے کہا۔ ”تردی کو بتا کہ ہلاکو خان کس طرح مرا؟“

نوگائی تھوڑی دیر غائب رہ کر جب واپس آیا تو ہلاکو خان کی داشتہ روشک اور اس کا باپ دونوں اس کے ساتھ تھے۔ تردی کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں، بے اختیار بولا۔ ”روشک، یہ تم! مگر تم یہاں کہاں؟“

نوگائی نے کہا۔ ”ہلاکو خان حسین لڑکیوں کے ذریعے میرے عم محترم کو ہلاک کرنا چاہتا تھا، زہر دے کر۔ مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہی خطرناک اور جان لیوا حربہ اس پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

برقائی خان مسکرانے لگا اور تردی سے کہا۔ ”تیرے بیوی بچے موجود ہیں۔ تیری سزا معاف کر دی گئی۔ بیوی بچوں کو لے کر جہاں جانا چاہے، چلا جا لیکن خبردار اب کھوڑے نہ چراتا۔“

نوگائی نے اس کے بیوی بچوں کو بھی اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ روشک نے پہلے تو تردی کو غصے اور نفرت سے دیکھا اس کے بعد بیوی بچوں کو دیکھنے لگی۔

تردی نظریں جھکائے بیوی بچوں کے ساتھ برقائی خان کے خیمے سے باہر نکلا اور اپنے آبائی گاؤں روانہ ہو گیا۔

وہم ہے۔“
ہلاکو خان نے بڑے کرب سے کہا۔ ”نہیں دو قوز! یہ بات نہیں۔ کوئی میرا دل مسل رہا ہے۔ یہ خونیں ستارہ..... دیکھو اس کی دوخونی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ آہ! ان دونوں آنکھوں نے میرا سارا خون چوس ڈالا اور ان کی تیزی میرے دل میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔“
دو قوز رونے لگی۔ ”آپ بالکل ٹھیک ہیں میرے آقا!“

لیکن ہلاکو خان کی طبیعت گرتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ دو قوز رونے لگی اور چند منگول سرداروں نے اپنے آقا اور قاتل کو اٹھا کر خیمے میں پہنچا دیا۔

ہلاکو خان کافی دیر تک بے ہوش رہا۔ روشک سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔ ”نصیر الدین طوسی کہاں ہے؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”اس نے آپ کے لیے ایک شاندار رصد گاہ تعمیر کی ہے اور اس کا نام رکھا ہے رصد گاہ ایل خانی۔ وہ چند اور بڑے بڑے کام آپ کے نام پر کرنا چاہتا ہے اور اسی سلسلے میں وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔“

ہلاکو خان نے وصیت کی۔ ”اگر میں مر جاؤں تو نصیر الدین طوسی کو میرے ساتھ دفن نہ کیا جائے کیونکہ میرے نام کو زندہ رکھنے کے لیے اسے کئی بڑے کام انجام دینا ہیں۔“

دو قوز رونے لگی۔ ”میرے آقا! ایسی باتیں نہ کہیے۔“
ہلاکو خان نے اسے تسلی دی۔ ”اگر میں مر گیا تو تجھ کو بہت جلد بلوالوں گا۔“ پھر ولی عہد ابا قا خان کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی۔ ”اگر تیرا بس چلے تو مصر کے بھروس کو ہرگز معاف نہ کرنا اور برقائی خان سے ہوشیار رہنا۔“

ہلاکو خان مر گیا۔ سرخ دم دار موت کا ستارہ اسے آسمانی درپچوں میں لے کر غائب ہو گیا۔ مراغہ ہی میں اس کے لیے ایک شاندار تہ خانہ تعمیر کرایا گیا۔ ایک وسیع و عریض کمرے جیسا تہ خانہ۔ اس تہ خانے میں ہلاکو خان کی لاش رکھ دی گئی۔ ہلاکو خان کی خدمت اور دل بستگی کی خاطر بارہ

ماخذات

تاریخ تمدن اسلام، جو جی زیدان، الفہرست، ابن ندیم، طبقات ناصری، منهاج سراج الفغری، ابن طباطبا، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین لدوی، تاریخ الخلفاء، مولانا جلال الدین سیوطی



Downloaded From
Paksociety.com

صبری بات تو سنو!

طاہر حباوید معمل

بعض اوقات کسی کمزور پر ”دودے اور“ والی کہاوت بالکل درست بیٹھتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی منظر تھا جس کا پس منظر انتہائی غم ناک اور دل توڑ دینے والا تھا مگر کیا کہیے کہ نظر کا قریب عقل مند اور درد مند دل رکھنے والوں کو بھی اتنا ہی سفاک بنا دیتا ہے جس پر انسان بعد میں چاہے جتنا بھی پشیمان ہو مگر اس گناہ کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا جس کا وہ خطا وار ہو چکا ہو۔

ایک کمزور انسان کی مظلومیت اور اغوا کاروں کی
سفاکی کا احوال

رنگ کا شاپر ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر بیگم صفراں کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ انہوں نے بے تاب نظروں سے اپنے چار سالہ پوتے حمزہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ حمزہ پارک کی سلائڈ کے قریب دیگر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر

کالونی کے پارک میں وہ شخص آج پھر چہل قدمی کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن سال رہی ہوگی۔ اس کے کپڑے پرانے لیکن صاف ستھرے ہوتے تھے، شیو بڑھی ہوئی، بال لمبے لیکن منتشر۔ ہاتھ میں عموماً ایک سفید

سپنس ڈائجسٹ 59 جنوری 2017ء

شاز نے کہا: "ٹھیک ہے امی! لیکن آپ کو پتا ہے کہ میڈیا کچھ زیادہ ہی شور مچا دیتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی دوسرا ایشیونہ ہو تو کسی بھی ایشو کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اسے انتہا پر پہنچا دیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اخباروں اور ٹی وی وغیرہ کی ساری خبریں جھوٹی ہیں اور اس طرح کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ میرا مطلب ہے کہ اس معاملے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ احتیاط ضرور کریں لیکن یہ تو نہ ہو کہ بچوں کو گھروں میں بند کر دیں، ان کی پڑھائی اور تفریح کو درہم برہم کر دیں۔ پرسوں میں بھی اس بندے سے ٹلی تھی۔ دو چار باتیں بھی کی تھیں۔ دل کا برا نہیں لگتا۔ اچھرہ کی طرف کہیں رہتا ہے۔ چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر آگھٹا ہے۔"

بات کرتے کرتے شاز نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور ذرا چونک کر بولی۔ "وہ دیکھیں، اب بھی ان درختوں کے پاس نماز پڑھ رہا ہے۔"

آپا کھٹوں پر زور دے کر انھیں اور کھڑکی سے جھانکا۔ وہ شاید عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ڈاڑھی کے سفید بال ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ آپا نے ایک دوبار پہلے بھی اسے نماز پڑھتے یا قرمی مسجد کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ آپا نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "کسی کو نماز پڑھتے دیکھ کر یہ سرفیٹ تو نہیں دیا جاسکتا کہ وہ ہر طرح سے ٹیک پاک ہے۔ دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دوں۔۔۔۔۔ جب یہ بندہ پارک میں ہوگا، میں حزمہ کو پارک میں نہیں رہنے دوں گی۔"

شاز نے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے منہ بنایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے روز جب بڑی آپا بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چوبیس میں گئیں تو وہاں بھی یہی بات ہو رہی تھی۔ دو تین اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ آمنہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ کل اس پارک والے شخص نے اس کی تین سالہ پوتی کو ٹرائی سائیکل سے اتار کر گود میں لینے کی کوشش کی۔ بچی رونے لگی اور انہوں نے اس بندے کو جھڑک کر بچی واپس لی۔

اسی دوران میں فلیٹ نمبر بائیس کی حمیدہ بیگم جلدی سے اٹھ کر باہر نکلیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں کسی دوا کا سرخ رپر تھا۔ "یہ دیکھو کیا ہے؟" انہوں

رہا تھا۔ بیگم صغرا نے جلدی سے اپنی چادر سر پر اوڑھی اور حزمہ کو گھر لانے کے لیے پارک کا رخ کیا۔ میزجیوں کے قریب والی اس کھڑکی سے پارک کا منظر صاف نظر آتا تھا اور کم و بیش ایک سال سے بیگم حزمہ کا یہ معمول تھا کہ جب ان کا پوتا حزمہ پارک میں کھیلنے جاتا تو وہ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کو دیکھتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں جیسے حزمہ کے ساتھ چپکی رہتی تھیں۔ حزمہ کے ساتھ ان کی محبت بھی یہی ایسی۔

بیگم صغرا جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت ان کا بیٹا ارسلان بہ مشکل دو سال کا ہوگا۔ ان کے شوہر شاہ عالمی کی ایک دکان پر سیل مین تھے۔ ایک صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل پر کام پر گئے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔ ایک بس ڈرائیور کی غفلت اور جلد بازی نے ان کی جان لے لی۔ اس حادثے کے بعد بیگم صغرا کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ زندگی کی تمام مشکلات اور سختیاں جھیل کر انہوں نے نہ صرف ارسلان کو پال پوس کر جوان کیا اور تعلیم دلائی بلکہ اس کی شادی بھی کر دی۔۔۔۔۔ آج کل ارسلان ملازمت کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا۔ بیگم صغرا اپنی بہوشانہ اور پوتے حزمہ کے ساتھ اس خوب صورت فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کی ساری محبتیں جیسے اپنے پوتے میں سمٹ آئی تھیں، وہ ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا اور وہ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ سب لوگ انہیں بڑی آپا کہہ کر بلاتے تھے۔

اس اجنبی کو پارک میں دیکھنے کے بعد وہ حزمہ کو گھر لے آئیں۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ان کی بہوشانہ نے کہا: "کیا ہوا امی! آپ حزمہ کو واپس لے آئیں؟"

"وہ آج پھر پارک میں ہے۔" بڑی آپا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شاز نے کھڑکی کی طرف گئی۔ پارک میں جھانکا پھر واپس آ کر اپنی سانس کے پاس بیٹھ گئی۔ "امی! آپ بھی نا۔۔۔۔۔ کچھ زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ بندہ غلط نہیں لگتا۔ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ بچے بھی اس سے باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔"

آپا نے ٹھک کر کہا: "بچے اس سے باتیں کرتے ہیں تو کیا وہ ٹھیک ہو گیا؟ تم حالات کو نہیں دیکھتی ہو کہ کس طرح کے چارے ہیں۔ ہر روز بچے اغوا ہو رہے ہیں، ہر روز خبریں آرہی ہیں۔ اب تو قالم ایسے ہیں کہ ماں باپ کے ہاتھوں سے بچے چھین کر لے جاتے ہیں۔"

حزہ کا اصرار بڑھا تو شازیہ نے شال اوڑھ لی اور کہا۔ ”امی! میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“

بڑی آیا، بہو سے زیادہ ٹکرا نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئیں۔ شازیہ اور حمزہ کے باہر جانے کے کچھ دیر بعد وہ انھیں اور اس کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں جہاں سے پارک میں دیکھا جاسکتا تھا۔ حمزہ کھیل کود میں مصروف ہو چکا تھا۔ بڑی آپا نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ شاپر والا حمزہ پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔۔۔۔۔ یا شاید یہ ان کا وہم تھا۔ اب بھی وہ محویت سے حمزہ کو تنگ رہا تھا۔ شازیہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ شاپر والا بہت کم باتیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بہت کم بول رہا تھا۔ شازیہ بیس فقرے بولتی تو وہ جواب میں شاید ایک بولتا۔ اس دوران میں حمزہ ان دونوں کے پاس آیا تو شاپر والے نے اس سے بھی دو چار باتیں کیں اور شاپر سے ایک کیلا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ حمزہ نے لینے سے انکار کیا اور واپس جھولوں کی طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران میں شاپر والے نے اپنے دودھیا شاپر میں سے کوئی ڈائری نما چیز نکالی اور اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گا ہے بگا ہے وہ کن اکھیوں سے بچوں کی طرف اور خاص طور سے حمزہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ آپا کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ بہو اور پوتا جلدی واپس آجائیں۔

آخر وہ آگئے اور آپا نے سکھ کی سانس لی۔ اس نے شازیہ سے اس گفتگو کے بارے میں پوچھا جو شاپر والے سے ہوئی تھی۔ شازیہ نے کہا۔ ”امی! میرے خیال میں تو وہ کوئی غلط بندہ نہیں ہے۔ وہاں اچھرہ کی طرف اپنے کسی جتنیجے کے ساتھ رہتا ہے۔ نئی بلڈنگ میں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ شور سے اسے بہت نفرت ہے، خصوصاً گاڑیوں کے شور سے۔ ہماری کالونی کا یہ پارک پرسکون ہے، اس لیے پیدل چل کر یہاں چلا آتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگتا تو نہیں آیا کروں گا۔۔۔۔۔ میں نے کہا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تم نے یہ نہیں کہا کہ سارا دن ہی پارک میں گزارا کرو۔ بلکہ ہو سکے تو ہمارے گیٹ کے سامنے ہی ڈیرا ڈال لو۔“ آپا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ عام طور پر طنزیہ لہجہ اختیار نہیں کرتی تھیں لیکن اس موقع پر ان سے رہا نہیں گیا تھا۔

”امی! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔“ شازیہ نے

نے دیگر عورتوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ بولیں۔ ”یہ نشے کی گولیاں ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ بندہ وہیں پارک میں بیٹھ کر کھاتا ہے۔ پرسوں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس نے پہلے گولیاں کھالیں، پھر شاپر سے پانی کی بوتل نکالی اور اکٹھی دو تین گولیاں نگل گیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ نشے کی گولیاں نہ ہوں۔ کوئی دوا وغیرہ ہو۔“ حاجی نذیر صاحب کی بیوی بولی۔

”نہیں، میں نے خود پتا کیا ہے میڈیکل اسٹور والے سے۔ وہ کہتا ہے کہ نشے کی گولیاں ہیں، ہم نشے کے بغیر نہیں دیتے۔۔۔۔۔ بلکہ اکثر تو دیتے ہی نہیں۔“

خواتین بڑی فکر مندی سے کافی دیر گفتگو کرتی رہیں۔ عصر کی نماز کے وقت بڑی آپا اپنے فلیٹ میں واپس آئیں تو گولیوں والا سرخ رہا ان کے پاس تھا۔ سیڑھیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ شاپر والا آج پارک میں موجود نہیں تھا (اس کا نام غیر ارادی اور غیر محسوس طور پر شاپر والا پڑ گیا تھا)

بڑی آپا نے سرخ رہا بہو شازیہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو کیا ہے؟“

شازیہ نے استفسار کیا تو بڑی آپا نے ساری تفصیل بتائی۔ شازیہ گھریلو اشیاء لینے کے لیے قریبی اسٹور تک جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سودا سلف لے کر واپس آئی تو اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ ”امی! یہ کوئی نایاب یا ممنوعہ گولیاں نہیں ہیں۔ نہ ہی نشے کی ہیں۔ یہ سکون آور دوا ہے۔ ہر میڈیکل اسٹور پر دستیاب ہے۔ آپ کہتی ہیں تو میں ابھی لا کر دکھا دیتی ہوں۔“

”سکون کی گولیاں بھی اکٹھی دو تین کھالی جائیں تو نشہ ہو جاتا ہے۔“ بڑی آپا نے نکتہ نکالا۔

”امی جی! کسی نے نشہ ہی کرنا ہو تو پھر وہ ایسی گولیاں نہیں کھائے گا۔ کھانسی کا کوئی تیز سیرپ چڑھالے گا۔“

اگلے روز سہ پہر کے وقت شاپر والا پھر پارک میں موجود تھا۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ وہ ایک پتھر لی بیٹھ چکا تھا اور شاپر میں سے کیلا نکال کر کھا رہا تھا۔ ویک اینڈ پر تو حمزہ پارک میں ضرور جاتا تھا۔ آج بھی اس کے ہم عمر اس کے پیچھے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ضد کرنے لگا۔۔۔۔۔ لیکن بڑی آپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اسے پارک میں نہیں جانے دیں گی۔

برامانے بغیر کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ وہ غلط سلسلہ بند نہیں ہے۔ اگر.....“

”وہ ڈائری میں کیا دیکھ رہا تھا؟“ آپا نے بہو کی بات کاٹی۔

”وہ ڈائری نہیں تھی۔ دعاؤں کی کتاب تھی۔ پڑھ رہا تھا۔ بچوں پر پھونک رہا تھا۔“

بڑی آپا چپ ہو گئیں مگر دل میں کھٹکے بدستور موجود رہے۔ انہوں نے بارہا اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کسی وقت آپا کو لگتا تھا کہ یہ بندہ بہت بُرا ہے یا پھر بہت اچھا ہے۔ کالونی میں بھی اس کے متعلق دو طرح کی رائے تھی۔ کچھ لوگ اس کو بالکل بے ضرر سمجھتے تھے اور کچھ کے نزدیک وہ مشکوک تھا۔ اس کو بے ضرر سمجھنے والوں میں کالونی کا چوکیدار محمد خان بھی شامل تھا۔ اس نے کالونی کے دو چار معزز افراد کو شاپر والے کا شناختی کارڈ بھی دکھایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ آبائی طور پر فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور اس کے کوائف بالکل درست ہیں۔ اس کا نام سرمد احمد معلوم ہوا تھا۔

لیکن تنخواہ دار چوکیدار کی چھان پھٹک اور ایک مشکور داری کی چھان پھٹک میں بہت فرق ہوتا ہے اور پھر داری بھی ایسی جس کا کل سرمایہ اس کا پوتا ہو۔ اسی دوران میں ایک ایسی اطلاع بھی آئی جس نے بڑی آپا کو مزید پریشان کر دیا۔ ارشد جنرل اسٹور والے کی بیوی فرخندہ نے کہا کہ اسے شک ہے کہ شاپر والا اپنے شاپر میں کوئی پستول قسم کی چیز بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ پارک میں مٹی مٹی۔ چھوٹے بچے کو سلائیڈ دینے کے لیے وہ بڑی سلائیڈ کے اوپر چڑھ گئی۔ شاپر والا پاس ہی بیٹھ کر بیٹھا تھا۔ بلندی سے فرخندہ کی نظر شاپر پر پڑی۔ شاپر میں مین چار کیونو تھے، بسکٹ کاڈا تھا۔ اس کے علاوہ اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی سیاہ سی شے تھی، جس کے بارے میں فرخندہ کا خیال تھا کہ وہ کسی پستول وغیرہ کا دستہ تھا۔ شاپر والے نے جب دیکھا کہ فرخندہ شاپر کو تاڑ رہی ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے شاپر کو جلدی سے لپیٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے بعد فرخندہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ دونوں بچوں کو لے کر فوراً گھر آ گئی۔

کچھ دیر بعد آپا کی بہو شازیہ بچے کو لے کر گھر آئی تو آپا نے اسے بھی یہ خبر سنائی۔ شازیہ نے ہمیشہ کی طرح اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بولی۔ ”ای جان! جب بندہ

ڈرا ہوا ہو تو اسے رسی بھی سانپ لٹنے لگتی ہے۔ اکثر اوقات ہم دھوکا کھاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو فرخندہ کو فوراً شور مچا دینا چاہیے تھا یا کم از کم اپنے شوہر کو بتاتی اور وہ جا کر دیکھتا۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس نے بتایا ہی ہو۔“

”اگر بتایا تو کیا نتیجہ نکلا؟“ شازیہ نے پوچھا۔

نتیجے کا تو بڑی آپا کو پتا نہیں تھا، اس لیے وہ چپ ہو گئیں مگر چند گھنٹے بعد یہ بات بھی کلیئر ہو گئی۔ فلیٹ نمبر چوبیس والی آنٹی آمنہ ان کے فلیٹ میں آئیں اور انہوں نے بتایا کہ جنرل اسٹور والے کی بیوی نے جا کر اپنے شوہر کو بتایا تھا۔ شوہر ارشد نے اسی وقت کالونی کے چوکیدار محمد خان کو ساتھ لیا۔ دونوں پارک میں چلے گئے اور شاپر والے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں گفتگو کرتے ہوئے ارشد نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ وہ شاپر کو ٹول کر بولا۔ ”اس میں کیا لیے پھرتے ہو سرمد چاچا۔“ شاپر والے نے شاپر دکھا دیا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ دعاؤں کی کتاب تھی، دو تین طرح کی میڈ۔سنز تھیں اور اسی طرح کی دیگر چیزیں.....

سب کچھ بتا کر آخر میں آنٹی آمنہ نے کہا۔ ”لیکن سچ پوچھتے ہو بھئی! تو میری تسلی نہیں ہوئی ہے۔ اس بندے میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔“

بڑی آپا نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ فرخندہ کے جانے کے بعد وہ ہوشیار ہو گیا ہو اور اس نے ہتھیار شاپر سے نکال کر اپنے لباس میں چھپا لیا ہو۔ ان لوگوں کو اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔“

شازیہ بڑا سامنے بناتی ہوئی بچن کی طرف چلی گئی۔

یہ پستول والا واقعہ کل سہ پہر کو ہوا تھا۔ بڑی آپا نے وال کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ پستول والی بات سننے کے بعد بڑی آپا کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ آج ہی اچھرہ کالونی جائیں اور پتا کریں کہ یہ شاپر والا واقعی وہاں نقی بلڈنگ میں رہتا ہے یا نہیں۔ وہ اکثر شاپنگ کے لیے اچھرہ بازار جاتی رہتی تھیں اور انہوں نے نقی بلڈنگ بھی دیکھ رکھی تھی۔

دوپہر کو چند نوالے لینے کے بعد وہ فوراً نکل کھڑی ہوئیں۔ بہو شازیہ کو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ وحدت روڈ جارہی ہیں، اپنی بہن سے ملنے۔ انہوں نے بڑی سڑک

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اہلی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ جنوری 2017

کی جھلکیاں

سراپ

طویل سرگزشت کا آخری حصہ

اعلیٰ حضرت

اس شخصیت کا زندگی نامہ

جس نے دہنی انقلاب لایا

شکشاں سے ٹورنٹو

ایک چونکا نے والے موٹر پر، دلچسپی

سے بھرپور الگ انداز کا سفر نامہ

سنگ دل

ایک دو شیزہ کی دلچسپ سچ بیانی

نہ آموز تطبیق کار

فلمی دنیا کے دو ہدایت کاروں کی ان کہی کہانی

اس کی تلاش

بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے

قصے تاریخی واقعات

سے رکشا پکڑا اور سیدھی اچھرہ پہنچ گئیں۔ نئی بلڈنگ تک
جانے میں انہیں کچھ دشواری ہوئی کیونکہ ان کے دونوں
گھٹنے درد کرتے تھے اور وہ ”ہائے ہائے“ کرتی ہوئی
جارہی تھیں۔ نئی بلڈنگ میں نیچے دکانیں تھیں۔ بالائی تین
منزلوں پر دفاتر اور بڑے شاندار کشادہ فلیٹ تھے۔ دس
پندرہ فلیٹوں میں سے کسی شخص کے بارے میں معلوم کر لیتا
کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شاہر والے نے اپنے بھتیجے کا
نام عبدالحفیظ بتا رکھا تھا۔ اگلے دو گھنٹے کی سر توڑ کوشش کے
باوجود نہ تو عبدالحفیظ کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی یہ پتا چل سکا
کہ فلاں چلیے کا کوئی ادھیڑ عمر شخص یہاں رہتا ہے۔ شاہر
والے نے اپنی رہائش کے بارے میں سراسر جھوٹ بول
رکھا تھا۔ یہاں کوئی اور اچھرہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور نئی
بلڈنگ تھی۔

سہ پہر کے بعد جب بڑی آیا واپس لوٹیں تو بے حد
پریشان تھیں۔ شاہر والا حسب معمول پارک میں موجود تھا۔
بہر حال یہ دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی کہ شاہر یہ اور حمزہ پارک میں
نہیں تھے۔ وہ اوپر فلیٹ میں چلی گئیں۔ انہوں نے بہو کو
کچھ نہیں بتایا لیکن ان کے اندر ایک جوار بھاتا تھا۔ آج شام
کے بعد بلڈنگ کے مکینوں کی ماہانہ میٹنگ ہونے والی تھی۔
اس میں مکین چھوٹے بڑے مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ کبھی
کبھی یوسی ناظم صاحب بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے۔
آپا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس میٹنگ میں شاہر والے کا پول
کھولیں گی اور کل پولیس کی مدد سے اس پر پکا ہاتھ ڈالا جائے
گا۔ لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ آج ہی ایک ایسا واقعہ ہونے
والا ہے جو سب کچھ الٹ پلٹ کر ڈالے گا۔

حمزہ کو ہلکا سا بخار تھا اس لیے اسے آج پارک میں
نہیں جانا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ آج وہ اسے ہرگز نہ
جانے دیتیں چاہے شاہر یہ بھی اس کے ساتھ کیوں نہ ہوتی۔
وہ سیزھیوں کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں اور کھڑکی میں
سے پارک کا منظر دیکھنے لگیں۔ مغرب کے بعد شاہر والا چلا
جاتا تھا لیکن کبھی کبھی مغرب کے بعد بھی پارک میں ہوتا تھا۔
آج بھی ایسا ہی تھا۔ پارک میں گارڈن لائٹس روشن تھیں اور
ان کی مدھم روشنی میں اتکاؤ کا بچے اور ان کے ”بڑے“ اب
بھی پارک میں نظر آرہے تھے۔ شاہر والا پتھر ملی بیچ پر
خاموش بیٹھا تھا۔ کسی وقت ٹوٹی اپنے سر سے اتارتا، اپنے
الجھے ہوئے بالوں کو کھجاتا اور ٹوٹی دوبارہ سر پر رکھ لیتا۔ اس
کی طرف سے بڑی آیا کا ذہن شکوک سے بھرا ہوا تھا اور
ان شکوک کی ٹھوس وجوہات تھیں، پھر بھی ان کے دل و دماغ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

لگے۔ وہ چلا رہا تھا۔ ”میری بات تو سنو..... میری بات تو سنو.....“

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور سر بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی کوشش کامیاب ہونے والی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے نقاب اٹھ چکا تھا۔ اس نے ایک معصوم بچی کو اس کے ماں باپ سے یوں چھینا تھا جیسے کوئی بے رحمی سے ننھی کو نپل کو شاخ سے توڑتا ہے..... آج اس نے اپنا اصل روپ کالونی والوں پر عیاں کر دیا تھا۔

وہ ہجوم میں ڈوب چکا تھا۔ لوگ اسے مار رہے تھے، گھسیٹ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں، بٹے تھے، اینٹیں تھیں۔ وہ غم و غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ آج اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ وہ شاید اسی جگہ انصاف کر دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے..... مجرم ”پولیس کو اور قانون کو“ چمکا دیتے ہیں، وہ بچ جاتے ہیں، پھر سے لوگوں کا جینا حرام کرنے لگتے ہیں۔ شاہرہ والے کی آواز اب ڈوب چکی تھی۔ بس اس کا ایک ہاتھ کبھی کبھی ہجوم میں سے نظر آتا تھا۔ وہ جیسے اس زخمی ہاتھ کے ذریعے اب بھی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر یہ ہاتھ بھی نظر آتا بند ہو گیا۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پارک میں اور ساری کالونی میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔

آپا نے دیکھا پھرے ہوئے ہجوم میں دو چار لوگ ایسے بھی تھے جو شاہرہ والے کو بچانے کی آخری کوشش کر رہے تھے لیکن غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

”مر گیا ہے..... مر گیا ہے..... چھوڑ دو۔“ ایک چلاتی ہوئی سی آواز بڑی آپا اور شاہرہ کے کانوں تک پہنچی۔

لیکن لوگ مارتے رہے پھر وہ اس کے سٹے پھٹے خونچکاں جسم کو گھسیٹ کر رنگ برنگے جھولوں کے قریب لے آئے۔ وہ ہیٹرول یا مٹی کا تیل تلاش کر رہے تھے۔ وہ اسے نذر آتش کر دینا چاہتے تھے۔ پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ قانون کے محافظوں نے شہریوں کو یہ مشکل آگ لگانے کے عمل سے روکا۔ پولیس آنے کے بعد بہت سے لوگ منتشر ہو گئے لیکن کچھ اب بھی موقع پر موجود تھے اور ڈنڈے وغیرہ لہرا رہے تھے۔ بچی کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور نہ اس کے ماں باپ۔ وہ شاید بہت خوفزدہ ہو گئے تھے۔ افراتفری کا قائد اٹھا کر وہ بچی سمیت

میں کسی وقت بجلی سی کوند جاتی تھی اور وہ سوچنے لگتی تھیں کہ شاید وہ کچھ نہ ہو جو وہ سوچ رہی ہیں۔

پارک میں اب رونق نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑی آپا کی نگاہ ایک جوڑے پر پڑی۔ عورت کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ مرد جو یقیناً اس کا شوہر تھا، بیوی کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ اس نے پینٹ اور جری پہن رکھی تھی۔ عورت کی گود میں قریباً ڈیڑھ برس کی ایک خوب صورت بچی تھی۔ یہ لوگ غالباً اس کالونی کے ہی رہائشی تھے۔ اس اسمارٹ سی دراز قد عورت کو بڑی آپا نے ایک دوبار پہلے بھی کالونی کی مارکیٹ میں دیکھا تھا۔

دفعتاً آپا کی نگاہ چکر اگئی۔ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ شاہرہ والا اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور عورت کی طرف چھپنا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے اس میں حیران کن پھرتی تھی، اس نے بچی کو عورت کی گود میں سے جیسے لوچ لیا۔ عورت چلاتی ہوئی اس پر جھپٹی اور بچی واپس چھیننے کی کوشش کی۔ مرد بھی سنبھل کر شاہرہ والے کی طرف آیا۔ شاہرہ والا اپنے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ پکڑا جائے گا تو اس نے بیچ پر رکھے شاہرہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روتی چلاتی بچی بدستور اس کی گرفت میں گئی۔ بڑی آپا نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ شاہرہ والے نے شاہرہ سے سیاہ رنگ کا ریوالتور نکالا اور اس کا رخ عورت اور مرد کی طرف کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا، جیسے بھاگ نکلنے کی فکر میں ہو۔

بڑی آپا لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کلیٹ کی بالکونی میں پہنچیں اور سینے کی پوری قوت سے چلائیں۔ ”پکڑو..... پکڑو..... دیکھو..... اس کیسے کو.....“

سڑک سے گزرتے ہوئے لوگوں نے پہلے اوپر بڑی آپا کی طرف دیکھا پھر اس طرف دیکھا جدھر وہ اشارے کر رہی تھیں۔ کئی افراد پارک کی طرف دوڑے۔ ان میں سے جو سب سے آگے تھا، اس نے عقب سے شاہرہ والے کو اپنی پانہوں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں ارشد جنرل اسٹور پر کھڑے کئی اور لوگ بھی بھاگتے ہوئے پارک میں داخل ہو گئے۔ ایک نوجوان نے کرکٹ بیٹ کا بڑا بھرپور وار شاہرہ والے کے سر پر کیا، وہ گارڈن لائٹ کے سین نیچے گر گیا۔ بچی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ پھر بچی کی طرف بڑھا مگر اس مرتبہ ایک شخص نے اس کے سر پر اینٹ ماری۔ وہ سر پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ لوگ اس پر پل پڑے۔ اب پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لوگ اسے بے دردی سے مارنے

موت سے اوجھل ہو گئے تھے۔
 گاڑن لائٹ کے نیچے ایک ناقابل شناخت انسانی
 جسم بے سدھ اور مردہ پڑا تھا۔ یہ شاہر والا تھا..... کھڑکیوں
 اور بالکونیوں میں سے اُن گنت وحشت زدہ نگاہیں اس کی
 طرف دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آہا اور شازیہ تادیر یہ منظر نہیں
 دیکھ سکیں اور اندر کمرے میں آگئیں۔ بڑی آہا نے کہا۔
 ”دیکھ لیا شازیہ..... میں یہی کہتی تھی نا.....؟“
 شازیہ نے سوئے ہوئے حمزہ کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا
 اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

یہ کہانی یہاں تک ہی رہتی تو شاید کچھ لوگوں کے لیے

ٹھیک ہوتی لیکن یہ یہاں تک نہیں رہی اور اس نے ایک

دردناک موڑ لے لیا۔ ٹی وی چینلز پر ایک اور درندے کے

بارے میں خبریں چلیں، اگلے روز کے اخبارات میں بھی

اس کی تصویر چھپی۔ یہ تصویر شاید اس کے شاہر میں سے

حاصل کی گئی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر فیصل آباد سے کچھ لوگ

روتے پیٹتے کالونی میں پہنچے۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک

جواں سال عورت۔ مردوں میں ایک ستائیس اٹھائیس سالہ

جواں سال شخص تھا۔ اس کا نام ذیشان تھا۔ اس نے انکشاف

کیا کہ مرنے والا شخص اس کا والد تھا..... وہ کوئی بردہ فروش یا

انگو اکنتہ نہیں تھا۔ وہ تو آٹھ ماہ سے خود اپنی پوتی کو ڈھونڈتا

پھر رہا تھا۔

کسی نے اس بات پر یقین نہیں کیا لیکن حقیقت زیادہ

دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جب اس واقعے کی پریس کھلنا

شروع ہوئیں تو لوگ دنگ رہ گئے۔ بے شمار پیشانیاں پسینے

سے تر دکھائی دیں لگیں۔ پولیس کی تفتیش اور صحافیوں کے

ذریعے جو اصل کہانی مکمل ثبوتوں کے ساتھ سامنے آئی، وہ

کچھ اس طرح تھی۔

سرمہ صاحب کے تین بیٹے تھے مگر ایک کے سوا بھی

کوئی صاحب اولاد نہیں تھا۔ واحد ایک پوتی فاطمہ تھی جو سرمہ

صاحب کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

فیصل آباد میں ان کا کپڑے کا کام تھا، تاہم حج کے بعد اب

وہ تقریباً ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ ایک دن سرمہ

صاحب اور ان کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک

سالہ فاطمہ کی والدہ اسے اپنے ساتھ گھنٹا گھر کے ایک بازار

میں لے کر گئی اور روتی چپختی خالی ہاتھ واپس آگئی۔ فاطمہ گم

ہو چکی تھی۔ وہ شب و روز ایسے اذیت ناک تھے کہ ان کی

کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کون سا ایسا

دعا میں دوائیں، کچھ کام نہ آئیں۔ تین چار ماہ کی

سرتوڑ کوشش کے باوجود فاطمہ کا کوئی سراغ نہیں ملا پھر

آہستہ آہستہ یہ تلاش ماند پڑنے لگی۔ آنسوؤں کے

دھارے خشک تو خیر کہاں ہونے تھے لیکن دھیسے پڑنے

لگے..... یہ سزا نگاروں پر چلنے جیسا تھا۔ اسی طرح سات

آٹھ ماہ گزر گئے۔ وہ لوگ تقریباً ناامید ہو چلے تھے جب

ایک روز سرمہ صاحب کے ایک بھتیجے نے انہیں لاہور سے

فون کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے فاطمہ کو لاہور کے ایک

پارک میں دیکھا ہے۔ وہ ایک گہرے براؤن بالوں والی

عورت کی گود میں تھی۔ وہ خود ”کار“ میں تھا، اس لیے

فوری طور پر رک نہ سکا۔ جب گاڑی کو یوٹرن دے کر

واپس پارک تک پہنچا تو عورت کہیں نظر نہیں آئی۔ اسی روز

سرمہ صاحب اور ان کے دو بیٹے فیصل آباد سے لاہور پہنچ

گئے۔ انہوں نے پارک اور ارد گرد کے علاقے میں بچی

کی تلاش شروع کر دی۔ مقامی پولیس کو بھی مطلع کر دیا

گیا۔ سرمہ صاحب پارک میں بیٹھ رہتے تھے اور ان کے

دونوں بیٹے علاقے میں فاطمہ کی ٹوہ لگانے کی کوشش میں

رہتے تھے۔ بھتیجا جو کسی کام سے لاہور آیا تھا، واپس چاچکا

تھا۔ پندرہ بیس روز کی انتھک کوشش کے باوجود نہ تو

پولیس کوئی سراغ دے سکی اور نہ وہ لوگ خود کوئی کھوج لگا

سکے۔ دونوں بیٹے زیادہ دیر اپنے چاب اور کام سے دور

نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ تو واپس فیصل آباد چلے گئے لیکن

سرمہ صاحب کسی موہوم امید کے سہارے یہیں پر لاہور

میں موجود رہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ اپنا پرانا

لائسنس یافتہ ریوالتور فیصل آباد سے منگوا لیا تا کہ کسی برے

وقت میں کام آ سکے۔ گھر والے بہت کہتے رہے کہ وہ

واپس آ جائیں لیکن گھر میں اور فیصل آباد میں ان کے لیے

اس دن بھی وہ کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی، پارک میں جھانک رہی تھیں اور آنسو بہا رہی تھیں۔ اچانک انہیں نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ہچکیاں لے کر بلند آواز میں رونے لگیں۔

”دادی! کیا ہوا؟“ ننھے حزرہ نے انہیں اپنے ننھے منے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔

شازیہ بھی بچن سے دوڑی ہوئی آئی اور انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولیں۔ ”شازیہ! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ منظر دھوکا دیتے ہیں..... ہم اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے۔“

اس رات عشا کی نماز کے بعد بڑی آپا سجدے میں گر گئیں۔ دیر تک مسئلے کو آنسوؤں سے تر کرتی رہیں اور گڑگڑاتی رہیں۔ ”اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ اے اللہ! میری سن لے۔ وہ بچی جہاں کہیں بھی ہے اے انہوں میں واپس پہنچا دے۔ اے اللہ! آج میں تجھ سے لے کر رہوں گی۔ میں اس وقت تک سر نہیں اٹھاؤں گی جب تک تو التجا قبول نہ کرے۔ اے رب! میری التجا سن لے۔ یا پھر آج، اسی جگہ میری جان بھی لے لے۔ اے قادر مطلق..... اے قادر مطلق.....“ وہ ہچکیاں لیتی رہیں اور رونی رہیں۔

انہوں نے ایسی ضد پکڑی تھی کہ سر اٹھانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا جب انہیں ایک دم اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہوا۔ انہیں لگا کہ کچھ بدل گیا ہے..... کچھ ہو گیا ہے۔

انہوں نے سجدے سے سر اٹھالیا اور تہجد کی نماز کی تیاری کرنے لگیں۔

یہ تیسرے روز شام کی بات ہے جب شازیہ نے نیکار کر آپا کو ٹی وی لائونج میں بلایا۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی تھی کہ ننھی فاطمہ کو ملتان کے ایک علاقے سے بازو باندھا گیا ہے اور اسے اس کے والدین کے پاس واپس پہنچایا جا رہا ہے..... آپا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن اب یہ خوشی کے آنسو تھے..... وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئیں۔ پارک پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ انہیں لگا کہ شاہر والا آج پھر پتھر ٹیلی بیج پر موجود ہے..... دعائیں پڑھ پڑھ کر بچوں پر پھونک رہا ہے..... اور خوش ہے..... اس کی روح خوش ہے۔ اپنی پوتی کے لیے اس کی قربانی رائگاں نہیں گئی تھی۔

کیا رکھا تھا کہ وہاں جاتے۔ انہوں نے ایک آس کے ساتھ اس پارک میں آنا جاری رکھا۔ لاہور میں اپنی رہائش کے اخراجات کو کم رکھنے کے لیے وہ اسٹیشن کے قریب ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

سرمہ صاحب کے دونوں بیٹوں اور بہو کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ سرمہ صاحب اپنی دیوانی تلاش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس براؤن بالوں والی لڑکی کے ساتھ اپنی پوتی فاطمہ کو دیکھ لیا تھا..... اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اس پر آنسو ہی بہائے جاسکتے تھے اور سوگ ہی کیا جاسکتا تھا۔ بعض اوقات ذرا نوح ابلاغ لوگوں کو ”ہائپر“ کر دیتے ہیں..... ویسے بھی جھوم کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اندھا بہرا ہو جاتا ہے..... مار پہلے دیتا ہے، نام اور جرم بعد میں پوچھتا ہے۔ بد قسمت سرمہ صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مظلوم سے ظالم بنا دیے گئے۔ انہیں اپنی پوتی کو سینے سے نہیں لگانے دیا گیا، اس کا منہ نہیں چومنے دیا گیا۔ اسے ان سے دور کر دیا گیا اور انہیں تشدد کر کے موقع پر ہی مار دیا گیا۔

پولیس نے بہت سرگرمی دکھائی کیونکہ اکثر ”حادثوں“ کے بعد ہی سرگرمی دکھائی جاتی ہے اور اس سے بڑا حادثہ کیا تھا کہ اس کیس کے ساتھ ایک بے گناہ شخص کی دردناک موت ننھی ہو چکی تھی۔ پولیس نے کالونی کے قریبی علاقے سے براؤن بالوں والی لڑکی اور اس کے فرضی شوہر کا کھوج لگا لیا۔ انہوں نے ایک چھوٹا گھر کرائے پر لے رکھا تھا لیکن وہ واقعے کی رات ہی بچی سمیت اپنے گھر سے غائب ہو گئے تھے۔ پولیس تفتیش سے پتا چلا کہ وہ دونوں پیشہ ور مجرم تھے۔ بچوں اور خاص طور سے بچیوں کو اغوا کرنا اور آگے فروخت کر دینا ان کا مکروہ دھندا تھا۔

☆☆☆

بڑی آپا کھڑکی کے سامنے اداس بیٹھی رہتی تھیں۔ سارے دن میں پانچ چھ تقووں سے زیادہ نہیں لیتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہتے تھے۔ وہ منظر جیسے ان کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ لوگ اس کے بوڑھے جسم کو اندھا دھند ضربات لگا رہے تھے۔ وہ پکار رہا تھا..... ”میری بات تو سنو..... میری بات تو سنو.....“ اور اس کا جھوم میں سے بار بار اٹھتا ہوا بازو۔ وہ اس ناتواں بازو کے ذریعے شاید اپنا دفاع کر رہا تھا یا شاید اپنی پوتی کو تھامنا چاہتا تھا..... اور پھر وہ مر گیا تھا۔

سکونِ قلب

سایم انور

کوئی بھی انسان محبت، ہمت اور ذہانت اس لیے خرچ کرتا ہے کہ زندگی میں چند لمحات سکون سے بھی گزار سکے اور جب... محبت سے بنائے ہوئے گھر میں بھی دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگے تو تمام دیواریں گرا دینے کا دل چاہتا ہے تاکہ حبس کا عالم ختم ہوسکے لہذا جب اس نے بھی اپنے ارد گرد کھڑی ہر دیوار کو ڈھانے کا ارادہ کر لیا تو لمحے بھر کی قسمت کی اس مہربانی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے گوارہ نہ ہوسکی۔

وحشتوں سے چمٹکارا پانے والے شوہر کی کاوشوں کا حال



Downloaded From
Paksociety.com

سب سے پہلے اہم بات۔

میں ایک باغبان ہوں۔ پیشہ ور نہیں بلکہ صرف ویک اینڈز پر۔ وہ سچر کی صبح تھی جب یہ سب کچھ شروع ہوا۔ میں ٹماٹر اور کالی مرچ کے پودوں کی بوائی کر رہا تھا۔

میں اپنے آپ کو خود پسند اور برتری کے خبط میں مبتلا ثابت نہیں کرنا چاہتا لیکن حقیقت میں وہ مجھ سے کیا توقع کر رہی تھی؟ کیا وہ سچ سچ یہ سمجھتی تھی کہ میں اسے..... نہیں، اس کے متعلق ہم بعد میں بات کریں گے۔

سپینس ڈائجسٹ جنوری 2017ء

نہیں بلکہ کچھ مختلف کہہ سکتے ہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہونے میں ایک لمحہ لگا کہ مکان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ٹیلی ویژن بھی بند تھا۔ میری بیوی مائرا ٹیلی ویژن پر وقت آن رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ کوئی پروگرام نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی اور اس وقت بھی جب وہ مکان کے کسی اور حصے میں ہوتی تھی۔

میں نے بار بار اسے صوفے پر ٹانگیں پہارے اپنے پسندیدہ رسالوں میں سے کسی ایک کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ ٹیلی ویژن چل رہا ہوتا تھا۔ یہ ایک بے معنی پس منظر ہوتا تھا۔ اگر میں ٹیلی ویژن آف کر دیتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتی تھی۔ ”اے، میں یہ دیکھ رہی تھی!“

میں نے اپنی بیوی کا نام لے کر پکارا۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں تجسس ہو گیا اور بیڈروم میں چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اس کی الماری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں موجود بیشتر بیگز خالی لٹکے ہوئے تھے۔ جو کپڑے لٹکے ہوئے تھے وہ وہی تھے جو اس نے برسوں سے استعمال نہیں کیے تھے۔ چند بیل باٹم تھے جنہیں وہ رد کرنے اور پھینکنے کے حق میں نہیں تھی۔ ایک بلاؤز تھا جسے پہن کر بقول اس کے وہ موٹی دکھائی دیتی تھی۔ درحقیقت میرے خیال سے اب وہ اس کے لیے تنگ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر پیٹ والے حصے کی جانب سے۔

پھر میں نے اس کے زیر جاموں کی وراژ چیک کی۔ وہ خالی پڑی تھی۔ ہاتھ روم کے کاؤنٹر کا ٹاپ بھی تقریباً خالی تھا پھر میں ہال کی الماری کا جائزہ لینے بڑھ گیا۔ اس میں رکھا ہوا نرم تہوں والا سوٹ کیس اور ملبوسات کا بیگ اب وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ٹریول کیس بھی غائب تھا جسے وہ اپنے کاسٹیکس کے لیے استعمال کرتی تھی۔

میں کچن میں چلا گیا۔ میں نے بریڈ سلاکس پر چیز اور مسٹر ڈلگانی کے بعد اس کے درمیان گوشت کا بڑا سا پارچہ رکھ کر ایک سینڈوچ تیار کر لیا۔ پھر ایک ہاتھ میں سینڈوچ اور دوسرے ہاتھ میں بیئر کا گلاس لیے میں ٹہلتا ہوا لیونگ روم میں آ گیا۔

میری بیوی مائرا موجود نہیں تھی اس کا ثبوت ٹیلی ویژن کی سپاٹ اسکرین تھی۔ یہ میرے لیے ایک خوش نصیبی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا مجھے کچھ کرنا چاہیے؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں حقیقت میں یہی چاہتا ہوں کہ اپنے سینڈوچ اور بیئر کے ساتھ وہاں بیٹھ کر اس پیاری، خوشگوار اور دلکش خاموشی کو بھر پور طریقے سے انجوائے کروں۔

کیاریاں میں نے ہفتوں قبل تیار کر لی تھیں۔ کھاؤ کی موٹی تہ میں پہلے ہی بچھا چکا تھا اور پھاؤ ڈا بھی احتیاط کے ساتھ چلا لیا تھا۔ ان کیاریوں کی قطاروں کے درمیان گھنٹوں کے بل جھک کر میں ہلکی نم سیاہ کھاؤ کو کھرپی سے نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا رہا تھا تاکہ نئے پودے ان میں جما سکیں۔ پتوں کی کھاؤ ملی مٹی کی تیز مہک مجھے بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

میں باری باری ہر ایک پودے کو گڑھے میں رکھ کر اس کے اطراف میں ہلکی بھر پور مٹی بھرتا جا رہا تھا۔ اگر آپ ایک حقیقی باغبان ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اس سے بہتر اور کسی طریقے سے ہوائی نہیں ہو سکتی۔

جب میں نے اپنا کام مکمل کر لیا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی ایڑیوں کے بل وہیں بیٹھ گیا تھا اور اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا تھا۔ میں اپنے بقیہ باغ کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف سلاڈ کے تہ درتہ صاف سترے پتوں کی قطاریں تھی، گہرے سبز رنگ کے پالک کے پودے تھے، جالی دار شاخ پر چڑھی ہوئی مٹر کی پھلیں تھیں۔

یہ ابتدائی موسم بہار کی فصل تھی اور اب تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ میرے سامنے گاجریں اور مولیاں قطار در قطار دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک اچھتی نگاہ اپنے عقب میں ڈالی۔ اس کیاری میں اسٹرابریز اب پوری طرح تیار ہو چکی تھیں۔ ہر روز صبح میں اس خوش ذائقہ شیریں پھل کی ضرورت سے زیادہ مقدار اپنے ناشتے کے لیے جن لیتا تھا۔ جو اسٹرابریز کھانے سے بچ جاتی تھیں انہیں میں بعد میں استعمال کرنے کے لیے موی کاغذ کی شیٹ پر بچھا کر فریژر میں محفوظ کر لیتا تھا۔

میں اپنے ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی ٹانگوں اور کمر کے اکڑے ہوئے مسلز کو چکایا بنانے کے لیے چند انگڑائیاں کیں اور واپس اپنے مکان کی جانب چل دیا۔ یہ صبح کا ایک اچھا کام ہو گیا تھا۔ راستے میں، میں بلیویری کی جھاڑیوں کے پاس رک گیا اور ان کا جائزہ لینے لگا۔ موسم بہار نم گزرا تھا اور شاخیں اب بھی سبز پھلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بعد میں اگر یہ بلیویریز چڑیوں کے کھانے سے بچ گئیں تو پھر یہ میرے ناشتے کے طور پر اسٹرابریز کی جگہ لے لیں گی۔

جب میں گھر کے عقبی دروازے سے کچن میں داخل ہوا تو میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ حقیقت میں گڑبڑ تو

میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں کہ لطف اندوز ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ تم نے یہ کیا کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا؟ تم اپنا جشن اپنے انداز سے مناؤ، میں اپنا جشن اپنے انداز سے مناؤں گا۔

☆☆☆

اس سہ پہر اس کی بہن آگئی۔ میں نے اسے دروازے پر ہی روک لیا۔ ”مائر! یہاں نہیں ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔

”کیا مطلب ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے؟“

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن میں نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ نہیں دیا اور دروازہ روکے کھڑا رہا۔ مجھے مائر کی بہن اخیلا بالکل بھی پسند نہیں تھی۔ وہ ایک نہایت بد مزاج اور گھٹیا عورت تھی۔ ہمیشہ بدظن رہتی تھی اور ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ہمیشہ ہر ایک کے بارے میں بدترین سوچتی تھی۔ وہ اور مائر! بڑی حد تک بالکل ایک جیسی تھیں۔

”وہ جا چکی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں گئی ہے؟“

وہ دونوں یعنی اخیلا اور مائر! سازشیوں کے مانند تھیں۔ ہمیشہ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتی تھیں اور اپنے راز اپنے تک محدود رکھتی تھیں۔ ان کے قہقہے بھی بے آواز ہوتے تھے جیسے کہ دنیا کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

”مجھے نہیں معلوم۔ وہ بس چلی گئی ہے۔“

”ویل، وہ کب تک واپس آئے گی؟“ وہ دروازے پر کھڑی تاک جھانک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی کچھ سننے کے لیے اس نے اپنے کان بھی کھڑے کیے ہوئے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

میں اسے بتا سکتا تھا کہ مائر! کے لمبوسات بھی موجود نہیں ہیں۔ مجھے بتا دینا چاہیے تھا لیکن میں اس کے مزید احقانہ سوالوں کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے یہ بات نہیں بتائی۔

وہ اپنی نیم باز متشکل نظروں سے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”وہ جب واپس آجائے تو اس سے کہنا کہ وہ مجھے فون کر لے۔“

”اگر میری اس سے ملاقات ہوگئی تو۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔

اخیلا نے اگلے روز مجھے فون کیا۔ ”مائر! کو فون دوا“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”تو پھر وہ کہاں ہے؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ چلی گئی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے؟“

”مجھے نہیں معلوم!“

”یہ فاش غلطی ہوگی۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اسے بھی بتانا چاہیے تھا۔“

پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ مجھے دوسری جانب سے اس کی بیجان خیر لمبی سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ پرجوش لہجے میں پھٹ پڑی۔ ”تم حرام زادے! تم نے میری بہن کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

پھر اس کے بعد سے وہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ مجھے فون ضرور کرتی تھی اور ہر مرتبہ مختلف طریق کار آزمائی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے خیال کے مطابق وحیدہ سوالوں سے مجھے جال میں پھنسانے کی کوشش کی پھر پہلانا پھلانے پر اتر آئی۔ مجھے انسانیت کا واسطہ دینے لگی پھر دھمکیاں بھی دیں۔

پھر اس کے فون آنا بند ہو گئے۔

پولیس کی آمد ایک پستہ قد اور درخت کے تنے کے مانند گول منڈل فرد کی شکل میں ہوئی جس نے اپنا نام سراغ رساں ویسپر بتایا۔ اس کے سر کے بالوں میں تیزی سے جھڑنے اور سپیدی اختیار کرنے میں جیسے دوڑ لگی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے بال سپیدی اختیار کرنے سے پہلے ہی جھڑ جائیں گے۔ البتہ اس کی گہری سیاہ اور گہنی بھوئی اس دوڑ میں شامل نہیں لگ رہی تھیں۔ ان بھوؤں کے نیچے موجود اس کی دونوں آنکھوں میں کسی قسم کے جذبات عیاں نہیں تھے۔ بس وہ ہر شے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”بات صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس رپورٹ آئی ہے کہ تمہاری بیوی غائب ہے۔“ اس نے اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ ”شاید ایسی بات نہ ہو لیکن ہمیں چیک تو کرنا ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہوتا؟“

میں نے اسے بیڈروم کی تقریباً خالی الماری، تمام درازیں اور باتھ روم دکھا دیے لیکن اس کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان چیزوں سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا ہے۔

”کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ جا رہی ہے؟“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تمہارے مابین تعلقات کیسے تھے؟ کیا لڑائی جھگڑا“

جنوری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

69

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ہوا کرتا تھا؟

”نہیں۔“

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ آخر میں ہم یہ مشکل ایک دوسرے سے کچھ کہتے تھے۔

”تمہاری بیوی کے پاس اپنی کار تھی؟“

”نہیں۔ کار بس ایک ہی ہے اور وہ اب بھی یہیں موجود ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب وہ گئی ہے تو تب بھی کار یہیں پر تھی؟“

”گیراج میں تھی۔“ میں نے بتایا۔ تب مجھے اس بات کا دھیان آیا جو میں نے ابھی تک نہیں سوچی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ اس نے فون پر ٹیکسی کو طلب کیا ہو؟“

”یہ بات تم سوچ سکتے ہو لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اس بات کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ اس نے فون کر کے کوئی ٹیکسی طلب کی ہو۔“

ہم مکان سے باہر کھلے آگن میں آگئے۔ میں سراغ رساں و سپر کی نظروں کا جائزہ لینے لگا جو دیرے دیر سے حرکت کر رہی تھیں جیسے ہر منظر کو مکمل طور پر ذہن نشین کر رہی ہوں یا شاید رنگ برنگے پھولوں سے لدی ان خوشنما جھاڑیوں کو ستائشی انداز میں دیکھ رہی تھیں جو سلیقے سے قطار در قطار ایک دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔

پھر سراغ رساں کی نگاہیں باغ پر جم گئیں اور وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے پیٹ میں قدرے اینٹن سی محسوس ہونے لگی۔ شاید یہ پیش آگاہی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی تمہاری بیوی کو آکر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔“ سراغ رساں و سپر نے کہا۔ ”کوئی اس کا خاص دوست یا سہیلی ہے؟“

”وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنی بہن اہملا کے ساتھ گزارتی تھی۔ اہملا طلاق یافتہ ہے اس لیے اس کے پاس ڈھیروں وقت ہوتا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”وہ کہاں جاتی ہیں؟“

”یہ بات تمہیں اہملا سے پوچھنی چاہیے۔“

سراغ رساں و سپر کے چہرے کے تاثرات مجھے یہ بتا رہے تھے کہ وہ جو کچھ جاننا چاہتا تھا، اس سے کہیں زیادہ معلومات پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر باغ کی طرف دیکھا۔ ٹماڑوں اور کالی مرچوں کی نئی فصل گزشتہ ہفتے ہی پھوٹ چکی تھی۔ ہر شے اپنے شباب پر تھی۔ حتیٰ کہ سلاڈ کے نئے پتے بھی نمایاں ہو چکے تھے۔

وہ مسکرا دیا اور بولا۔ ”اتنے عمدہ باغ کو کھود ڈالنا

بڑے شرم کی بات ہوگی۔“

میں یہی سمجھا کہ وہ یہ بات مذاق میں کر رہا ہے۔ اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ پلٹا اور واپس مکان کی جانب چل دیا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد وہ گویا ہوا۔ ”سرا! تمہاری بیوی غائب ہے اور تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں، کیوں اور کس کے ساتھ گئی ہے..... یہ بات درست ہے؟“

”ہاں۔“

”اور اس کے باوجود جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں، تم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا کہ وہ کہاں پر ہے؟“

”نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”کیا تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے؟“ کیا واقعی.....؟ میں نے خود سے سوال کیا لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس مجھے اس وقت خوشی محسوس ہوئی تھی جب مجھے پتا چلا کہ وہ جا چکی ہے۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اسے تلاش کیوں نہیں کیا؟“

یہ ایک آسان سوال تھا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے مل نہ جائے۔“ میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

دس منٹ بعد ہی میرے پاس اہملا کا فون آ گیا۔ ”اب تم صحیح طور پر نرغے میں آ گئے ہو۔ تمہیں پولیس سے بات کرنا کیسا لگا؟“

میں بھلا کیا کہہ سکتا تھا؟

”مجھے نہیں معلوم کہ تم نے میری بہن کے ساتھ کیا کیا ہے لیکن تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔ کیا تم سن رہے ہو؟“

مجھے زندگی کی غیر ستائشی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں سے ایک خوشی اس وقت حاصل ہوئی تھی جب میں اہملا جیسے لوگوں کو فون پر کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیتا تھا۔

☆☆☆

میں سراغ رساں و سپر کے ہمراہ آگن میں کھڑا پولیس کے جوانوں کو اپنے باغ کو کھودنا دیکھ رہا تھا۔ و سپر کی تمام تر توجہ اس بات پر تھی کہ کوئی جگہ کھودے جانے سے رہ نہ جائے۔ خدا معاف کرے، انہوں نے ایک انچ جگہ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ میں اپنے باغ کی یہ تباہی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میری مجبوری تھی۔ میں زمین پر ٹگا ہوا گاڑے مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا پھاؤڑوں اور

بیلچوں کی آوازیں سن رہا تھا۔

اصل مسئلہ

ایک فوجی کی ایک ٹانگ محاذ جنگ پر لڑائی میں کٹ گئی۔ انہوں نے لکڑی کی ایک اتنی عمدہ ٹانگ بنوائی جو بالکل اصلی لگتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک جھگڑے میں ان کی مصنوعی ٹانگ میں گولی لگ گئی تو ان کا دوست بولا۔ ”گھبراؤ نہیں، میں ابھی جراح یعنی سرجن کو بلاتا ہوں۔“

فوجی بولا۔ ”نہیں بھائی، کسی بڑھی کو بلاؤ۔“

حسب حال

میدان جنگ میں جب نیولین کو شکست ہوئی تو نکلن نے نیولین سے طنزاً کہا۔ ”جانتے ہو ہم انگریز عزت کے لیے لڑتے ہیں اور تم لوگ دولت کے لیے لڑتے ہو۔“

نیولین نے جواب دیا۔ ”ہاں، جس کے پاس جو چیز نہ ہو، وہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

ناک

دیے تو بظاہر ناک سوکھنے کے کام آتی ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم جب سانس لیتے ہیں تو فضا میں جو گرد و غبار موجود ہوتا ہے، ناک کے اندر موجود بال ان کے راستے میں دیوار بن جاتے ہیں۔ دیے اگر کسی کو تنگ کرنا مقصود ہو تو اس کی ناک میں دم بھی کیا جاسکتا ہے۔ یار لوگوں نے ناک کے اور بھی بہت سے مصرف دریافت کر لیے ہیں۔ اس کو اونچا رکھنے کے لیے قرض لے کر اپنی زیب و نمائش کی جاتی ہے۔ یہ کبھی کبھی کٹ بھی جاتی ہے لیکن اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ اگر ستواں ہو تو خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور اگر موٹی ہو تو لوگوں کو پکڑے والی پچھتی کسنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی اسے موم کی ناک بھی بنا دیتا ہے پھر اسے جس طرح چاہے موڑا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح ہوتی ہے لیکن انہیں طوطا چشم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کسی وقت بند بھی ہو جاتی ہے اور سوکھنے کی حس سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ڈریں اس وقت سے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

”ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔“ سراغ رساں ویسپر نے کہا۔ ”تمہاری بیوی غائب ہے۔ گواہوں کا کہنا ہے کہ تم دونوں کی نہیں بھڑکی اور ہمارے پاس ایک باقاعدہ شکایت بھی آئی ہے..... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمیں یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ گھر سے کس طرح نکل کر گئی ہے۔ اس کے پیدل جانے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کوئی اسے لینے کے لیے آیا ہو؟“

اس بات پر سراغ رساں کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ”کون؟“ اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ بھلا میں اس بات کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ لہذا میں خاموش رہا۔

”اور تم پر موت کا سا خوف طاری ہے کہ تمہارے باغ کو کھود کر اس کا جائزہ کیوں لیا جا رہا ہے؟“ ”یہ وہ پہلی احمقانہ بات ہے جو تم نے کہی ہے۔“ میں نے غراتے ہوئے جواب دیا۔

سراغ رساں ویسپر کی آنکھیں غصے سے تھمتھانے لگیں لیکن اس نے اپنی آواز کو قابو میں رکھا اور بولا۔ ”تو پھر ایسا کیوں ہے؟“

”خدا کے لیے ذرا اپنے اطراف تو دیکھو!“ میں نے بھی اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لوگ پورا باغ تھس تھس کر رہے ہیں۔ یہ میری برسوں کی محنت ہے جو تم اجاڑ رہے ہو۔“

جب انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تو سراغ رساں ویسپر کا اعتماد ڈالوا ڈول ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی گھنی بھوؤں کا رخ میری جانب پھیر دیا جیسے اپنے ذہن کو کچھ کہنے کے لیے تیار کر رہا ہو۔

”شاید میں غلط تھا یا شاید نہیں۔ بہر حال میں نے جو تکلیف دی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

یہاں مجھے یہ بات کہنی چاہیے تھی۔ ”کوئی بات نہیں، تم تو بس اپنا فرض نبھا رہے تھے۔“ یہ جو کچھ ہوا تھا یہ درست نہیں تھا، ہرگز نہیں۔

ان کے جانے کے بعد میں اس تباہ شدہ باغ میں چلا گیا جہاں صبح تک ہر پودہ، پھل، پھول، کیاریاں سب ہی زندہ اور بے حد خوشنما تھے۔ انہوں نے کوئی بھی چیز نہیں چھوڑی تھی۔ ہر کیاری تاراج کردی تھی۔ تمام پھلوں، پھولوں اور سبز یوں کی جڑیں اکھاڑی جا چکی تھیں۔ نمائش کے

جنوری 2017ء

سپنس ڈائجسٹ

بودے جو تقریباً ایک فٹ اونچے ہو چکے تھے، ایک ڈھیر کی شکل میں ایک کنارے پر پڑے ہوئے تھے۔ اسٹرا بریز کی کیاری غائب ہو چکی تھی۔ اسی طرح بلیو بریز کی کیاری بھی۔ میں نے دس برس تک بلیو بریز کی جھاڑیوں کی اپنے بچوں کی طرح نگہداشت کی تھی۔

جبکہ وہ سپر کا خیال تھا کہ میں نے ان جھاڑیوں کو کھود کر اپنی بیوی ماڑا کو اس گڑھے میں ڈال دیا تھا اور ان جھاڑیوں کو دوبارہ بودیا تھا۔ کیا اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟ نہیں، بائی گاڈ یہ سب کچھ ہرگز درست نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد آنے والے ہفتوں میں، میں اس بات سے باخبر رہا تھا کہ سراغ رساں وہ سپر نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھ کام کرنے والوں کے انٹرویو لیے گئے ہیں کیونکہ جب میں ان کے پاس ہوتا تھا تو وہ عجیب بے چین سے ہو جاتے تھے اور مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے علاوہ پڑوس کی بعض خواتین مجھے دیکھ کر یا تو اپنی نظریں پھیر لیتی تھیں یا پھر اپنی نگاہیں مجھ پر بجا کر مجھے ٹھوڑی رہتی تھیں۔ میں بھی جب کسی پولیس مین کو دیکھتا تھا تو مجھے خاص طور پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔

ادھر اسٹیملا بھی بلاشبہ ہر روز مجھے فون پر اپنی احمقانہ دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔

☆☆☆

سراغ رساں وہ سپر کچن ٹیمبل کی ایک سائڈ پر اور میں اس کی مخالف سمت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نیلا لفافہ کھولا اور اس کے اندر سے آٹھ بائی دس کی ایک گلو سی تصویر باہر نکال لی۔ نصف تصویر ایک بزنس لفافے سے ڈھکی ہوئی تھی جسے ایک سپر کلب سے منسلک کیا ہوا تھا۔

وہ سپر نے وہ بزنس لفافہ ایک طرف کھسکا دیا اور تصویر میرے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟“

وہ تصویر قدرے اونچائی سے کھینچی گئی تھی۔ منظر کسی قسم کے اسٹور کے اندر کا تھا۔ مجھے تصویر میں ڈپلے کاؤنٹر کا ایک کنارہ دکھائی دے رہا تھا جس پر پوٹینو جیس، کارن جیس اور اسی قسم کے دیگر پیکٹ سجے ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ دراز قامت، سانولی رنگت..... وہ نہایت چوکنا نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی چوکی کا تعلق اس کمن سے ہے جو اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہی تھی۔

”کیا اس شخص کو کبھی دیکھا ہے؟“ سراغ رساں

وہ سپر نے سوال کیا۔

”نہیں، میرے خیال میں کبھی نہیں دیکھا۔“

تب سراغ رساں وہ سپر نے کلب نکال دیا اور لفافہ علیحدہ کرنے کے بعد ایک دوسری تصویر باہر نکال لی۔

اس تصویر میں بھی کاؤنٹر پر مختلف اشیاء سجی دکھائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی کیش رجسٹر بھی نمایاں تھا۔ کیش رجسٹر کے پاس ایک کلرک موجود تھا جس کی پشت کمرے کی جانب تھی۔ وہ کاؤنٹر پر رقم ڈھیر کر رہا تھا اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اٹھیا رہا تھا اسے ہوئے دراز قامت سانولے شخص کے برابر میں ایک عورت کھڑی تھی جس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

”اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ سراغ رساں وہ سپر نے پوچھا۔

میں اس تصویر کو دیکھتا رہ گیا۔ ”ہاں، یہ ماڑا ہے۔ اسے کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟“

تب سراغ رساں وہ سپر نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”وہ اس شخص کے ہمراہ آئی تھی اور اسی کے ساتھ واپس بھی چلی گئی تھی۔“

”یہ تصویر کب اتاری گئی ہے؟“

”دو روز قبل۔ کیا تمہاری بیوی نے تم سے کوئی رابطہ کیا ہے؟“

”نہیں، وہ کیوں رابطہ کرے گی؟“

”جس وقت وہ دونوں اس اسٹور سے نکل رہے تھے تو شریف کا ایک ڈپٹی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسٹور میں کوئی واردات ہوئی ہے لیکن اس ڈپٹی کی آمد نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنا لباس لینے کے لیے واپس اس موٹیل میں بھی نہیں گئے جہاں ان کا قیام تھا۔“

”کیا تم نے یہ تصویر ماڑا کی بہن کو دکھائی ہے؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں دکھائی۔“

”کیا تم اسے دکھا دو گے؟ شاید تب وہ مجھے اپنے احمقانہ فون کرنا بند کر دے۔“

اس بات پر سراغ رساں وہ سپر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ”غالباً مجھے دکھا دینی چاہیے۔ اگر تمہاری بیوی تمہارے پاس واپس آجائے تو کیا تم مجھے اس کی خبر کر دو گے؟“

”کیوں؟“

”اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ میرے خیال سے اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ ہم اس شخص کے بارے میں مزید جاننا

چاہتے ہیں۔ بے شک اگر تمہاری بیوی اب بھی اس شخص کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہوگا۔“

”تجارتوں نہیں تھیں۔“
”میں ہو سکتی ہوں۔“
”نہیں، تم نہیں ہو سکتیں۔“

اس نے اپنا سر قدرے خم کیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں واقعی میری کوئی پروا نہیں ہے۔ ہے نا؟“

”کوئی خاص نہیں۔“
”ویل، اگر تم لازمی جاننا چاہتے ہو تو میں کسی کے ساتھ تھی۔ وہ مجھے ایک بار میں ملا تھا۔ کیا تمہیں یہ سن کر شاک پہنچا؟“ مارا نے پوچھا۔

”تمہاری بہن کو معلوم نہیں تھا کہ تم جاری ہو؟“
”میں اسے کچھ بات نہیں بتاتی۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری یہ عادت مارا کو ہمیشہ بے چین کر دیتی تھی۔ اس کی نظریں نیوی کے ریموٹ کو تلاش کرنے لگیں، جب اس نے دیکھا کہ ریموٹ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔

”ویل، لعنت بھیجو! تم مجھے سیر و تفریح کے لیے کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں لے گئے۔ سو میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو سیر و تفریح کا دلدادہ تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ چلی گئی تھی تو پھر کیا ہوا؟ تم نے تو کبھی میری پروا ہی نہیں کی۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں قائم نہ رہ سکی۔ ”سنو، ہمیں لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ساتھ ہی میری طرف اپنی بھرپور لجا دینے والی بناوٹی مسکراہٹ سے دیکھنے لگی۔

میں خاموش رہا۔
”میں واپس آگئی ہوں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“
”وہ شخص کہاں ہے؟“

اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں چرائیں پھر دوبارہ نظریں ملاتے ہوئے بولی۔ ”وہ جا چکا ہے۔“

میں اس کی نظروں سے نظریں ملاتے اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار رہا۔ وہ قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ”ہمیں کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ وہ کتیا کا بچہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب یہ قصہ تمام ہو چکا ہے۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح ہوگا۔ میں واپس آ چکی ہوں۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں، تم واپس نہیں آئی ہو۔“
”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہیں یہاں واپس نہیں چاہتا۔“

میں نے شانے اچکا دیے۔
”میں معافی چاہتا ہوں تمہیں پریشان کیا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کوئی بھی اپنے اوپر نکل کا الزام پسند نہیں کرتا لیکن تمام باتوں پر لعنت بھیجو۔ بس میں اس بارے میں پُر یقین تھا۔ میں شاذ و نادر ہی غلطی پر ہوتا ہوں۔ میں ایمان داری سے کہہ رہا ہوں، میں یہی سمجھا کہ تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ گرمیوں کے اختتام پر میں خزاں کی چند فصلیں بوائی کرنا چاہتا ہوں جیسے مولی، گاجر، بند گوبھی، پھول گوبھی وغیرہ اور ایسی ہی دیگر سبزیاں۔ اگر تم باغ کو دوبارہ کھودنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میری خواہش ہے کہ تم اس وقت تک انتظار مت کرنا کہ ان کی بوائی ہو جائے اور پھر تم اسے دوبارہ کھود ڈالو۔“

☆☆☆

کام سے واپسی پر جب میں نے اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کی تو انجن کا سوچ آف کرتے ہی مجھے وہ آواز سنائی دی۔

ٹیلی ویژن آن تھا۔
میں ایک منٹ تک کار کے اندر ہی بیٹھا رہا اور خود کو صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگا پھر اندر چلا گیا۔

مارا صوفے پر گھٹنے سینے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک میگزین تھا اور وہ اس کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ ٹی وی کی اسکرین پر کسی سافٹ ڈرنک کا ٹین ایج کمرشل دکھایا جا رہا تھا اور ٹی وی کی آواز حسب معمول تیز تھی۔

جب میں اندر داخل ہوا تو مارا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ اٹھ آئی اور وہ بولی۔ ”ہائے، کیا تم مجھے مس کر رہے تھے؟“

میں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا لیا اور آف کا بٹن دبا دیا۔ وہ شکایت کرنا ہی چاہ رہی تھی لیکن عین وقت پر اپنا ارادہ بدل لیا۔

”تم کہاں تھیں؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے حقیقت میں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس وقت اس سے اور کیا کہوں۔
”بہت سی جگہوں پر۔“

اس وقت تک وہ بالکل سیدھی اور تن کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی خوف اور دہشت کے تاثرات اٹھ آئے تھے جیسے کہ اس تصویر میں تھے جب وہ اس شخص کے ہمراہ اسٹور میں تھی اور وہ ڈکیتی کی واردات کر رہا تھا۔

میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ میرا دوسرا ہاتھ میرے پہلے ہاتھ سے ملنے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر اپنے اجڑے ہوئے باغ کو دیکھ رہا ہوں۔ جو کچھ بچ رہا ہے وہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بلیو سیریز کی مختلف ورائٹرز اور نئی جھاڑیاں حاصل کر سکتا ہوں تاکہ ان کی صحیح طور پر بوائی ہو جائے پھر موسم خزاں میں، میں نئے پھل، پھول اور سبزیوں کی بوائی کر سکوں گا۔ اگلی مئی تک نئے پودوں کی تازہ کھپ اگنا شروع ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ پھلوں، پھولوں اور سبزیوں سے لدا خوشنما باغ۔ آپ مشکل ہی سے تیز کر پائیں گے کہ یہ وہ پہلا باغ ہے یا نیا باغ!

میری محنت ایک بار پھر رنگ لے آئے گی۔

نہیں، نہیں..... آپ سمجھ نہیں رہے۔ مائرا اس وقت غالباً اپنی بہن کے پاس ہوگی اور اسے بتا رہی ہوگی کہ میں کتنا نفسیاتی ہوں۔ میں نے آخری بار جب اسے دیکھا تھا تو وہ اپنی گداز چھوٹی ٹانگوں سے تیز تیز چلتی ہوئی داخلی دروازے سے باہر نکل رہی تھی اور بار بار یوں پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اچانک میرے سر پر سنگ نکل آئے ہوں اور میرے دانت ڈر کیولا کے مانند لمبے اور نکیلے ہو گئے ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا، میں اپنے آپ کو خود پسند اور برتری کے خط میں جلا ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مجھ سے کیا توقع کر رہی تھی؟ کیا وہ سچ بچ یہ سمجھتی تھی کہ میں اسے قتل کر دوں اور اسے اپنے باغ میں دفن کر دوں گا؟

ہرگز نہیں! یہ میرا باغ تھا..... میرا اپنا باغ۔ اس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جیسے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اب میں قطعی پرسکون اور بالکل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ بھی واپس نہیں آئے گی اور نہ ہی میں اس کی واپسی چاہتا تھا۔

میں زندگی بھر سکون قلب کا متحی رہا تھا اور اب مجھے آئندہ زندگی کے لیے سکون قلب حاصل ہو گیا تھا۔

”دلیل، یہ تو بہت بری بات ہے۔ ہے نا؟“
”تمہاری بہن سمجھتی ہے کہ میں تمہیں قتل کر چکا ہوں اور یہی خیال پولیس کا بھی ہے۔“ میں نے کہا۔
وہ ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگئی پھر تڑخ کر بولی۔ ”کیا تم؟ یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ تمہارے اندر.....“
”وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے تمہیں قتل کر دیا ہے اور تمہیں باغ میں دفن کر دیا ہے۔“

اس بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ”تم سنجیدہ نہیں ہو۔“
”وہ بھاؤ ڈرے اور نیچے لے کر یہاں آئے تھے۔ تمہاری لاش کی تلاش میں انہوں نے سب کچھ کھود کر رکھ دیا تھا۔ پورا باغ ہنس نہیں کر ڈالا تھا۔ کوئی بھی جگہ باقی نہیں چھوڑی تھی۔ حتیٰ کہ بلیو سیریز کی وہ جھاڑیاں بھی جو برسوں سے وہاں موجود تھیں۔ ہر چیز بے جان کر دی..... ہر چیز تباہ کر دی۔“

وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ ”اوہ! یہ تو واقعی بڑی تسخیر انگیز بات ہے۔ حقیقت میں تو تمہیں بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ خیال ہی بڑا معجزہ خیر ہے۔ تم تو مجھے جانتے ہو..... میں اس باغ کے اندر مردہ نہیں پائی جاسکتی۔“

میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ تب اس لمحے پہلی مرتبہ یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس وقت تک تو میں اس کے گھر میں موجود نہ ہونے سے صرف لطف اندوز ہوا تھا اور اب.....

میں اس کے پاس مرنے پر بیٹھ گیا۔ میں دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر لے گیا۔ میں نے اپنی انگلیاں اس کے گال پر رکھ دیں اور انگلیوں کی پشت سے اس کے رخسار کو سہلانے لگا۔ ساتھ ہی بولا۔ ”کیا تم یہ یقین سے کہہ رہی ہو؟“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرے یا الجھن میں پڑ جائے۔ ”کس بارے میں یقین کا کہہ رہے ہو؟“

میں مسکرانے لگا۔ میرا ہاتھ اس کے کان کے شپک کا جائزہ لیتا ہوا نرمی سے پھسلتا ہوا اس کی گردن کے خم پر آگیا۔ ”باغ کے بارے میں۔“

وہ یہ سنتے ہی تن کر بیٹھ گئی اور اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”کیا؟“

میری انگلیاں پھسلتی ہوئی اس کی گردن کے عقب میں پہنچ گئیں۔ میرا انگوٹھا سامنے زخروں پر آگیا۔ ”باغ نہایت عمدہ ہے۔ وہاں پر بے حد سکون ہے۔“

Downloaded From Paksociety.com

قسط: 17

شیش محل

اسماء تادری

حیار، پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا قریب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پرووں میں ملوث سطر سطر رنگ بدلتی وادعات قلبی کی عکاسی و ٹپس داستان

سپینس ڈائجسٹ 76 جنوری 2017ء



Downloaded From
paksociety.com

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جو لیت ایک مقامی بھائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کو لیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے قاصر ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی ثنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جو لیت کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار سیاست داں دلدارا آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدارا آغا انگریزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لیت اپنے اخبار کی طرف سے دلدارا آغا کا اعتراف لینے جاتی ہے۔ دلدارا آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے اعتراف کے بعد جو لیت مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حریفوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جو لیت کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جو لیت کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی ہوئی جو لیت گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زمین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جو زلف بھی مٹی اور بچی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جو لیت عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جو لیت اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش قاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ قاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جو لیت کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جو لیت اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک فنڈ کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدارا آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان چلے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ نگہ کش کے اس حریف میں اس کے باپ جو زلف کی حالت حریف خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جو لیت کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زمین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جو لیت صندوق میں کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑ ایک لاکھ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زمین اور ایک انجینیئر مرد کی جوانی کی ہے۔ جو زمین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں باقی میں ایک نواب خاندان کی گورنرس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جو زمین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر قاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر قاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سینٹ بھائی سے ہو جاتی ہے۔ سینٹ بھائی دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق قاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سینٹ بھائی کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائی کی بیٹی سلا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ سلا اور قاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو قاروق سے محبت کرتی ہے اور قاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سکی کر وہ چاند بانو کا دل سے احرام کرتا تھا، سلا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ رین دادا محلے کی ایک بیوہ شادی کی انتظامات کرتا ہے۔ مجبوراً اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو فنڈوں کے ذریعے رین کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے۔ رین کو اب مجبوری تلاش ہوتی ہے۔ رین جو لیت سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جو لیت کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ سلا ایک فنڈ سے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسپینڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمر دہائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر رین قاروق کا حساب چکا کرنے کے لیے ولیم کو اغوا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ غصہ اطلاق پر پولیس رین کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ قاروق بھی لوٹ آتا ہے۔ رین جو لیت کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب میں دلدارا آغا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے لیکن دلدارا آغا ملک سے باہر ہوتا ہے اس لیے رین کو واپس آنا پڑتا ہے۔ رین اور قاروق ولیم والے معاملے کو فٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جو لیت اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدر آباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ قاروق جو لیت کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسپنڈنٹ کے ذمے دار گیش کو دیکھ لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان دھیمکا مشقی میں گیش جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ قاروق سلا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ قاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیکم کا بیٹا اختر جو لیت کو پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جو لیت کے شور مچانے پر وہ بکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جو لیت انکشاف کرتی ہے کہ وہ جو زمین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آدھک متوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور حویلی میں تاحال صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر رین قاروق کی تلاش کرتے کرتے اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اغوا میں بھائی سٹیم کی بیٹی سلا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادھر سلا قاروق کو خود کو پھانسنے پر زور دیتی ہے۔ قاروق اسے انکار کر دیتا ہے۔ سلا کے ہاتھ میں چاقو ہوتا ہے۔ وہ اس سے آخری الفاظ ادا کرتی ہے اور اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آتا ہے، قاروق کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ جاتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آہکھیں، فاروق نے اپنے دل میں کھینچ ہوئی محسوس کیں۔
 جہنمی کے جانے مانے سینہ کی اکلوتی بیٹی بھلائی جسے جہنمی طور پر
 اپنی امارت پر ناز تھا، کیسے اپنی تمام تمنائوں اور آرزوؤں کو
 اپنے دل میں لیے اس دنیا سے خالی ہاتھ واپس جا رہی تھی۔
 فاروق کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے شاید مسکرانے کی
 کوشش کی لیکن تکلیف کی شدت کے باعث اس کے ہونٹ
 بس ذرا سے ٹیز سے ہو کر رہ گئے اور پھر اس کے جسم نے
 آخری زوردار جھٹکا کھا کر روح کو اپنی قید سے آزاد کر دیا۔
 اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی فاروق پر مرکوز رہ گئیں۔ نہ چاہتے
 ہوئے بھی اس کی دردناک موت پر فاروق کی آنکھ سے آنسو کا
 ایک قطرہ ٹپک گیا۔ کل عالم کو اپنی جاگیر بھنے والی کا یہ انجام
 بہت ہی دردناک تھا۔ اس کے انجام پر رنجیدہ فاروق ایک
 بار پھر اپنی آزادی کی فکر میں مبتلا ہوا اور سر جھکا کر پہلے اپنے
 دائیں ہاتھ کی بندشوں کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ
 دانتوں کی مدد سے رسی کی گرہیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 زیادہ مضبوط گرہیں نہ ہونے کے باوجود اس طرح ایک رخ
 پر جھک کر صرف دانتوں کی مدد سے یہ کام کرنا اتنا بھی آسان
 نہیں تھا، وہ بھی ایسی صورت حال میں کہ اس کے سینے سامنے
 بھلا کی خون میں تر بتر لاش پڑی تھی۔

گرہیں کھولتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کی
 بوندیں پھوٹ پڑیں لیکن بہر حال تھوڑی سی کوشش کے بعد
 وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ ایک ہاتھ آزاد ہوا تو باقی
 کے کام میں بالکل بھی مشکل نہیں رہی اور اس نے ایک ایک
 کر کے اپنا بایاں ہاتھ اور دونوں پیر کھول لیے۔ کرسی سے
 اٹھ کر پہلے اس نے ہاتھ پیروں کو حرکت دے کر خون کی
 روانی کو بحال کیا اور پھر درمیانی فاصلہ طے کر کے بستر کے
 قریب پہنچا۔ بستر کی چادر خون میں تر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی
 آستینیں اوپر چڑھا لیں اور بہت احتیاط سے بھلا کے سینے
 میں گھپا اپنا چاقو کھینچا۔ چاقو نکالنے پر اس کے سینے سے حریہ
 خون کا اخراج ہوا جس نے فاروق کے ہاتھ کو بھی بھگو دیا۔
 فاروق نے بستر کی چادر کے ایک صاف کونے سے اپنا ہاتھ
 اور چاقو دونوں اچھی طرح صاف کیے اور چاقو دوبارہ جیب
 میں واپس ڈال لیا۔ چاقو جیب میں ڈالتے ہوئے اسے
 جیب میں بٹوے کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا جس کا
 مطلب تھا کہ اسے اغوا کرنے کے بعد اس کی جیبوں کی
 تلاشی لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور بھلا نے صرف اس
 کا چاقو باہر نکالا تھا۔ اپنا چاقو فاروق کو بڑا عزیز تھا اور وہ
 زیادہ تر اسے اپنی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ یوں بھی چاقو جیب

فاروق کے لیے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔
 وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھلا اس کے چاقو کو اس طرح
 استعمال کرے گی۔ وہ حیرت اور دکھ کے جذبات کے ساتھ
 خون کے اس فوارے کو دیکھ رہا تھا جو بھلا کے سینے سے
 پھوٹ رہا تھا اور وہ مائی بے آب کی طرح بستر پر پڑی
 تڑپ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا موت کا فرشتہ اس کمرے
 سے خالی ہاتھ نہیں جائے گا اور فاروق سمجھا تھا کہ وہ اس کی
 جان کے درپے ہے۔ بھلا کے سابقہ کردار کو دیکھتے ہوئے
 وہ یہی سوچ سکتا تھا لیکن وہ واقعی حیران کن عورت تھی اور
 اپنے دعوے کے مطابق اس نے وہ کر ڈالا تھا کہ فاروق
 مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتا تھا۔ لوگ محبت میں جان
 دینے کے زبانی دعوے کرتے ہیں لیکن اس نے تو سچ سچ
 جان دے ڈالی تھی۔ وہ حقیقتاً فاروق پر مر مٹی تھی۔ وہ اسے
 اس حد تک مطلوب تھا کہ اس کے انکار کے بعد اپنی انتہا
 پسند طبیعت کے باعث اسے زندہ رہنا ہی منظور نہیں رہا تھا۔
 اس پاگل پن اور دیوانگی کو دل میں کیا مقام دیا جائے؟ یہ
 فیصلہ تو فی الحال فاروق نہیں کر سکتا تھا لیکن صورت حال کی
 نزاکت کا اسے شدت سے احساس ہو گیا تھا۔ بھلا کی
 حالت سے ظاہر تھا کہ بس وہ چند پل کی مہمان ہے اور وہ
 اس کی لاش کے ساتھ یہاں پایا جاتا تو بہت بھینچٹ میں
 پڑ جاتا۔ تفتیش، وضاحتیں، قانونی موٹوگافیاں جانے کن کن
 مسائل سے اسے غمتنا پڑتا اور وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔
 اسے تو ابھی دلدار آغا سے نمٹنا تھا۔ جو لیٹ کے پیچھے جانے
 نہ جانے کا فیصلہ ابھی وہ نہیں کر سکا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ
 جو لیٹ کے مجرم کو کسی صورت معاف نہیں کرے گا اور اسے
 اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود
 آزاد رہے۔

یہ سب سوچ کر اس نے فوری طور پر وہاں سے نکل
 جانے کا فیصلہ کیا اور جدوجہد شروع کر دی۔ ہوش میں آنے
 کے بعد سے وہ مستقل بھلا کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہا تھا
 اس لیے اسے اپنی بندشوں کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں
 ملا تھا۔ اب جو اس نے ان پر توجہ دی تو احساس ہوا کہ اسے
 بہت اتارنی پین کے ساتھ کرسی سے باندھا گیا تھا۔ ظاہر ہے
 یہ کام بھلا نے کیا تھا اور وہ ایسے کسی کام میں مہارت نہیں رکھتی
 تھی۔ اس نے ایک نظر بھلا پر ڈالی۔ اس کا جھٹکے کھاتا وجود
 اب آہستہ آہستہ ساکت ہوتا جا رہا تھا اور وہ بہت مشکل سے
 سانس لے رہی تھی لیکن اس عالم میں بھی اس کی نظریں
 فاروق پر ہی تکی ہوئی تھیں۔ حسرت و کرب کی تصویر وہ

میں رکھنا اڑے کی روایت کا حصہ تھا اور وہ اڑے سے اپنی وابستگی کے باعث اس روایت کا پاسدار تھا۔

ربن اوروں کی طرح اس سے کام نہیں لیتا تھا لیکن اسے چاقو بہت عمدہ مہیا کر رکھا تھا۔ فاروق خود اس چاقو کو بہت خیال اور احتیاط سے رکھتا تھا اور اس کی کارکردگی سے واقف تھا کہ یہ کیسے سخت سے سخت شے کو کھن کی طرح کاٹ ڈالتا ہے۔ بھلا کے سینے سے چاقو نکالتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ بھلا نے اپنے اناڑی پن کے باعث ویسا وار نہیں کیا تھا جیسا کوئی ماہر کرتا ہے۔ اگر وہ ماہر ہوتی تو چاقو اس طرح اس کے سینے میں اترتا کہ دل کا کام تمام کر دیتا اور وہ اتنا ترپ کر مرنے کے بجائے سیکنڈوں میں جان بے چلی جاتی۔ بہر حال اس کے نصیب میں جیسی موت نکسی تھی وہ دیسے ہی مری۔ فاروق اس کے مرنے پر دل میں افسوس محسوس کرنے کے علاوہ اب اس کے لیے کرم بھی کیا سکتا تھا۔ اسے جو کرنا تھا اب اپنے لیے کرنا تھا چنانچہ پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا اور بال سنوار کر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکلا۔ وہاں چھائے ستائے سے اس نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ بنگلا خالی ہے اور شاید یہاں اس کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکنے پر اسے پورج میں کھڑی بھلا کی گاڑی نظر آئی۔ بہت نوعمری کے دور میں اس نے اچھی خاصی گاڑی چلانا سیکھ لی تھی لیکن اب مشق نہیں رہی تھی۔ یوں بھی اسے گاڑی کی چابی کا علم نہیں تھا۔ ممکن تھا چابی بھلا کے پرس میں موجود ہو لیکن وہ گاڑی میں جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا تو چابی کس لیے ڈھونڈتا۔ وہ دبے قدموں باہر نکلا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ تین چار قدم ہی آگے چلا ہوا کہ یکدم چوکیدار سامنے آ گیا۔

”کہاں جاتے ہو صاحب؟“ چوکیدار نے اس سے دریافت کیا تو اس کے الفاظ، لہجے اور چہرے کے تاثرات سے فاروق کو اندازہ ہوا کہ چوکیدار کو اس کی صحیح حیثیت کا علم نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس کے متعلق کوئی واضح ہدایات دی گئی ہیں اس لیے وہ اس کے ساتھ اپنے برتاؤ کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا۔ وہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کر کے چوکیدار کے اس تذبذب کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور سنجیدہ و باوقار لہجے میں بولا۔

”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تھوڑی دیر

میں واپس آ جاؤں گا۔“

”اور مالکن.....“ چوکیدار تھوڑا سا الجھا۔

”وہ ابھی سو رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت تھک چکی ہیں اور دیر تک سونا چاہتی ہیں اس لیے کوئی انہیں پریشان نہ کرے۔“ فاروق نے باوقار لہجے میں ایسے احکامات صادر کیے کہ چوکیدار لمبے وقت تک اندر نہ جائے اور بھلا کی لاش دریافت ہونے کا دورانیہ بڑھ جانے سے خود اسے زیادہ مہلت مل جائے۔

”ٹھیک ہے صاحب! اپن دھیان رکھے گا۔“ چوکیدار نے حسب عادت فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر فاروق نے قدم آگے بڑھائے، چوکیدار نے دوڑ کر گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

”آپ بولو تو آپ کے لیے ٹیکسی دیکھ کر لے آؤں۔“ چوکیدار اس کے اعتماد سے مکمل طور پر متاثر ہو چکا تھا اور اب اس سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسا کسی محرز مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آگے سے ٹیکسی لے لوں گا۔“

فاروق نے جواب دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ کل رات چاند بانو کے کونچے سے نکل کر اٹھا ہونے کے بعد اب اسے مکمل فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں اغوا کیا گیا تھا اور اب ہر صبح کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کلائی موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ گھڑی بے شک موجود تھی لیکن وقت بتانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ اس کا ڈائل اچھا خاصا برباد ہو گیا تھا۔ البتہ وہ سورج کی شعاعوں کی تیزی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ آٹھ بجے کے بعد کا وقت ہے۔ فضا میں سمندر کی نمی کا احساس بہت گہرا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اطراف کا جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ جوہو کے علاقے میں ہے۔ بمبئی میں اتنے برس گزارنے کے بعد وہ اس کے ہر علاقے سے واقف ہو چکا تھا۔ اب بھی اسے ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہاں پہنچ کر ایک ٹیکسی کرنے کے بعد اس نے سیدھا اڑے کا رخ کیا۔ بعد میں وہ خود کو روپوش کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھاتا فی الحال اڑے جانا ضروری تھا کہ اسے معلوم تھا، وہاں اس کے غیاب پر ایک کیرام سا بچا ہوا ہوگا۔ اپنے چاہنے والوں کو اپنی شکل دکھا کر تسلی کروانے کے بعد ہی وہ نہیں اور کا رخ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

آخر حویلی کی مغموم فضا کی وجہ سے سخت یوریت کا

مہمانوں کے ہجوم میں گھری وہ بیٹے کے لیے کہاں سے وقت نکال پاتیں۔

صورت حال ایسی تھی کہ آخر فوری طور پر واپسی کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ نواب صاحب کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ لندن روانہ ہو جاتا تو عالیہ اور ان کے بھائیوں کے دل میں اس کے لیے مزید برائی آ جاتی اس لیے وہ بوریت کے باوجود مصلحتاً حویلی میں ٹکا ہوا تھا۔ یہاں قیام کے دوران اس کا بار بار جولیٹ سے بھی سامنا ہو جاتا تھا اور وہ ہر بار ہاتھ مل کر رہ جاتا تھا کہ حسن و رعنائی سے بھرپور یہ پیکر اس کی آغوش میں آتے آتے پھسل گیا۔ موقع ملنے پر اس کی نظریں جولیٹ کا ہی تعاقب کرتی رہتی تھیں اور وہ دل میں سوچتا رہتا تھا کہ کس طرح ایک بار پھر اس پر ہاتھ ڈال سکے۔ اس روز اسد اللہ کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی کے بعد اس کے سفلی جذبات کے ساتھ ساتھ متعینہ جذبات بھی جاگ گئے تھے اور وہ جولیٹ کو مل کر اپنے نفس کی تسکین کے ساتھ ساتھ انتقام کی آگ بجھانے کی بھی منصوبہ بندی کرتا رہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کے باعث وہ ہر وقت جولیٹ کی تاک میں رہتا تھا چنانچہ ایک رات جب سب تھک ہار کر سونے کے لیے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ جولیٹ کو تنہا چھت پر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کر تا دیکھ کر چو کنا ہو گیا۔ وہ خود کچھ دیر پہلے ہی نواب صاحب کی طبیعت معلوم کرنے کی رسم نبھا کر آیا تھا۔ آج ان کی حالت زیادہ ہی خراب تھی اور نواب زادی عالیہ سمیت نواب زادہ صفی اللہ اور اسد اللہ بھی ان کے کمرے میں ہی رکے ہوئے تھے۔ حویلی کے دوسرے کمینوں کو البتہ انہوں نے باصرار آرام کے لیے بھیج دیا تھا۔ آخر بھی آرام کی غرض سے اپنی خواب گاہ میں جا رہا تھا کہ جولیٹ کو اوپر کی طرف جاتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ادھر جولیٹ اس کی نظروں سے بے خبر تھی سو بے خوف و خطر اوپر چلی گئی تھی۔ اسے جوزفین کی ڈائری سے اوپر موجود اس کمرے کے بارے میں معلوم ہوا تھا جہاں جوزفین اور اسد اللہ اکثر اپنی خفیہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ حویلی آنے کے بعد کئی روز گزر جانے کے باوجود اس نے ابھی تک وہ کمرہ نہیں دیکھا تھا البتہ اسد اللہ سے اس کے بارے میں گفتگو ضرور ہوئی تھی اور انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کمرے کو جوزفین کی یادگار کے طور پر انہوں نے جوں کا توں رکھا ہوا ہے اور صفائی کے لیے جانے والی ملازمہ کے علاوہ کسی کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے پھر انہوں نے بڑی شفقت سے کمرے کے تالے کی چابی جولیٹ کے حوالے

شکار تھا۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں رہ کر اسے حویلی کی کٹی بندھی زندگی ویسے ہی اچھی نہیں لگتی تھی اور وہ مارے باندھے ہی کچھ عرصے کے لیے یہاں آیا کرتا تھا۔ یہاں آنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ تو اس کی ماں ندرت جہاں کا اصرار ہوتا تھا۔ اکلوتے بیٹے کی یاد سے بے قرار ہو کر وہ بار بار اسے خط بھجواتی تھیں کہ بہت مہینے گزر گئے تمہاری صورت نہیں دیکھی، کچھ دن کے لیے آکر ماں کا کچا ٹھنڈا کر جاؤ۔ اسے ماں کے جذبات سے چاہے غرض تھی یا نہیں لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ان کی بات ماننے میں ہی فائدہ ہے۔ وہ اس سے خوش ہوں، اسی صورت میں اس کا اکاؤنٹ اور جیمیں بھری رہ سکتی تھیں۔ دوسرے اسے اپنے ماموں اور سر نواب سلیم اللہ کو بھی مطمئن رکھنا ہوتا تھا کہ وہ عرصے بعد ہی سہی حویلی میں قدم رنجہ فرما کر ان کی بیٹی کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔ عالیہ بھی اس کے لیے ہمیشہ ایک فرمانبردار اور وفا پرست بیوی ثابت ہوئی تھی۔ جائداد میں حصہ دار ہونے کے ناتے انہیں زمینوں کی آمدنی سے باقاعدہ حصہ دیا جاتا تھا۔ اس رقم کو خرچ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی کہ ان کے جملہ اخراجات تو حویلی سے ہی پورے ہو جاتے تھے اور زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کے بعد بھی اچھی خاصی رقم ان کے پاس محفوظ رہتی تھی۔ شوہر ہونے کے ناتے آخر اس رقم کے بڑے حصے پر بھی آسانی سے قبضہ کر لیتا تھا، یوں لندن میں اس کی زندگی نہایت عیش و آرام سے گزر رہی تھی۔ حویلی کا ایک دورہ اسے مالا مال کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ چند دن کے مہمان کی حیثیت سے اس کی جواؤ بھگت ہوتی تھی وہ اپنی جگہ تھی لیکن اس بار اسے ہمیشہ جیسی اہمیت نہیں مل رہی تھی۔ ایک تو آتے کے ساتھ اس نے نشے کی حالت میں جولیٹ کے ساتھ جو بد تمیزی کی، اس کی وجہ سے بد مزگی پھیل گئی اور ہمیشہ کی تابعدار بیوی نے یکسر آنکھیں پھیر لیں۔ باقی لوگ بھی اس کے کردار کا یہ پہلو سامنے آنے کے بعد اس سے کچھ کچھے کچھے تھے اور صرف ندرت جہاں ہی تھیں جو بیٹے کو بے قصور تسلیم کرتی تھیں لیکن وہ بھی نواب سلیم اللہ کو پیش آنے والے حادثے کے بعد ایسی مصروف ہو گئی تھیں کہ ان کے پاس بیٹے کے ناز و نخرے اٹھانے کی مہلت نہیں تھی۔ انہوں نے اس حویلی میں جو مقام بنا رکھا تھا اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس موقع پر وہ سب سے زیادہ فعال نظر آئیں اور ضعفی کے باوجود وہ ایسا کر رہی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی مصروفیت تو عیادت کے لیے آنے والوں سے ملاقات کرنا تھی۔

کر کے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

چاہی مل جانے کے باوجود جو لیٹ کو وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ خصوصاً نواب سلیم اللہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد تو وہ بہت مصروف ہو گئی تھی لیکن اس روز عشرت جہاں کے دیے طعنوں نے اسے اتنی الجھن میں ڈال دیا تھا کہ مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن مسلسل اس بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جوزفین اور جوزف کے ساتھ رہ کر وہ عیسائی مذہب کی ہی پیروی کا رکھی لیکن اب اسے خیال آ رہا تھا کہ جوزفین نے اس کی تربیت کرتے ہوئے کبھی بھی مذہب کو بہت زیادہ ترجیح نہیں دی تھی۔ وہ نہ تو اسے پابندی سے چرچ لے جاتی تھی اور نہ ہی اسے عیسائیت کی تبلیغ کرتی تھی، بس وہ اس کی بیٹی ہونے کے ناتے عیسائی تھی اور وہ بھی اپنی کیونٹی کی دیگر لڑکیوں سے خاصی مختلف۔ جوزفین نے اسے ہمیشہ جسم کو ڈھانپنے والا مکمل لباس پہنایا تھا اور وہ اسے لباس کے ساتھ اسکارف کا بھی باقاعدگی سے استعمال کرواتی تھی۔ ایسا شاید وہ اس وجہ سے کرتی تھی کہ اسے احساس تھا کہ جو لیٹ ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہے اور اسے اس کی اصل سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ خود مذہب اسلام سے متاثر ہو اور اسد اللہ سے شادی کی صورت میں مذہب تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن پھر قسمت نے ساتھ ہی نہیں دیا اور وہ جوزف کی زندگی کی سناٹھی بن گئی۔ جوزف کو اپنانے کے بعد بھی اس نے اسد اللہ کو اپنے دل سے نہیں نکالا تھا اور بیٹی کے لیے اپنی داستانِ حیات تحریر کر کے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنے باپ کے پاس چلی جائے۔ اسے اندازہ ہو گا کہ باپ کے پاس جانے کی صورت میں جو لیٹ کے سامنے مذہب کے انتخاب کا مسئلہ ضرور آئے گا اسی لیے اس نے اسے عیسائیت کی طرف زیادہ راغب نہ کر کے اس کے لیے یہ گنجائش چھوڑی تھی کہ وہ وقت آنے پر دونوں ادیان کا تقابلی جائزہ لے کر اپنے لیے کسی ایک مذہب کا انتخاب کر لے۔

ماں کے کردار کے اس پہلو کو سوچتے ہوئے جو لیٹ کو بہت شدت سے اس کی یاد آتی تھی اور اس یاد ہی نے اسے چھت پر بنے اس کمرے کا رخ کرنے پر مجبور کیا تھا جو اسد اللہ اور جوزفین کی محبت کا امین تھا۔ جس کے بارے میں اسد اللہ کا دعویٰ تھا کہ وہاں انہیں آج بھی جوزفین کی خوشبو آتی ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کی خوشبو کی چاہت میں وہاں گئی تھی اور قطعی انجان تھی کہ شکاری گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اندھیرے میں کمرے کا قفل کھول کر اندر داخل ہونے کے بعد اس نے وہاں روشنی جلائی تو ایک نہایت صاف ستھرا لیکن سادگی سے سجا کمرہ اس کے سامنے تھا۔ کمرے میں ایک مسہری اور لکھنے کی میز کے سوا کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ مسہری پر ہلکے رنگ کی بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی اور فرش پر قدرے گہرے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ جو لیٹ نے حویلی کے قیمتی ساز و سامان سے بچ کرے دیکھے تھے۔ خود اس کے زیر استعمال کمرہ بھی بہت شاندار تھا لیکن یہ سادہ سا صاف ستھرا کمرہ عجیب ہی انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ اسے لگا کہ سچ وہاں جوزفین کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ شاید اسد اللہ کی چاہت نے اس خوشبو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کمرے میں محفوظ کر دیا تھا۔ وہ کسی سحر زدہ سے شخص کی طرح دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی اور یونہی اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسے لگا کہ وہاں اب بھی جوزفین کا لمس اور اس کے جسم کی حرارت موجود ہے۔

اپنی ماں کو اس انداز میں محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے جنہیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے وہ بستر سے اٹھی اور لکھنے کی میز کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ لندن سے اپنے ساتھ ایک کمرہ لائے تھے اور اس کمرے سے انہوں نے دیگر اہل خانہ کے علاوہ جوزفین کی بھی کچھ تصویریں اتاری تھیں۔ یہ تصویریں ایک البم میں محفوظ میز کی دراز میں موجود تھیں۔ جو لیٹ نے میز کی پہلی دراز کھینچی تو اس کے منتوں سے مسحور کن خوشبو کھرائی۔ اس نے دیکھا دراز میں پھولوں کے سوکھے ہوئے گجرے، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور ایک تہ کیا ہوا زنانہ رومال رکھا ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ ساری چیزیں جوزفین کی ہیں جو اسد اللہ نے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ اس نے ان چیزوں کو کسی مقدس امانت کی طرح محسوس کیا اور دراز کو آہستہ سے بند کر کے نیچے والی دراز کھولی۔ اس دراز میں بھی فوٹو البم موجود تھا۔ اس نے البم نکال کر میز پر رکھا اور احتیاط سے اسے کھولا۔ سب سے پہلی تصویر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون کی تھی۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی پھر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے بہت قیمتی ساڑی اور زیورات پہن رکھے ہیں۔ جو لیٹ ان خاتون کو پہچانتی تھی۔ اس نے حویلی کی دیواروں پر جو تصویریں بھی دیکھی تھیں، ان میں ایک تصویر ان خاتون کی بھی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ اس کی دادی تھیں جنہیں یہاں نواب بیگم کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی
طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس
لیے اپنا ہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا
اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرِ پیکار
رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

کے صفحات پر

ملاحظہ کریں

سرگزشت
ماہنامہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

اس سے اگلی دو تین تصویریں خاندان کے افراد کے گروپ فوٹو تھے جن میں سے بڑوں کو تو وہ پہچان سکتی تھی البتہ جو بہت چھوٹے تھے، انہیں شناخت کرنے میں اسے دشواری پیش آرہی تھی۔ کچھ بات یہ تھی کہ اس نے اس سلسلے میں کوشش بھی نہیں کی اور سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ اسے اس وقت سب سے زیادہ جو زمین کی تصویر دیکھنے کی خواہش تھی اور اگلے صفحے پر اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ چوڑی دار پا جاے اور کرتے میں چٹا ہوا دوپٹا اوڑھے کھڑی جو زمین ایک دہلی پتلی، نازک سی نو عمر لڑکی کی صورت اس کے سامنے تھی۔ اسے اپنی ماں کی نوجوانی کی تصویر دیکھنا بہت اچھا لگا۔ تصویر میں اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے ان میں وہ تھوڑی گھبراہٹ اور تھوڑی شرمائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً اس نے پہلی بار کمرے کا سامنا کیا تھا اور پھر تصویر کھینچ بھی اسد اللہ رہے تھے اس لیے اس کی یہ کیفیت تھی۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد اس نے اس خیال سے دوسرا ورق پلٹا کہ وہاں بھی جو زمین ہی براجمان ہوئی لیکن غیر متوقع طور پر وہاں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکے کی تصویر موجود تھی۔ لڑکے نے مکمل کالاس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ہاکی اسٹک اٹھا رکھی تھی۔ تصویر کھینچتے ہوئے وہ بہت اعتماد سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خود اعتمادی اور ذہانت کی جھلک تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر وہ ابھمن اور تجسس میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اتنے عرصے میں خاندان کے تمام افراد کی مختلف ادوار کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں لیکن یہ لڑکا اسے ان تصویروں میں کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے شناسائی محسوس کر رہی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اس لڑکے کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں؟ وہ اس پر غور کر پاتی، اس سے قبل ہی اختر دبے قدموں اس کے پیچھے پہنچا اور اس کی محویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی سے اتنی مضبوطی کے ساتھ اس کا منہ دبوچا کہ وہ اپنے منہ سے معمولی سی بھی آواز نہیں نکال سکی۔

☆☆☆

بھائی کی کوٹھی سے نکل کر فاروق سیدھا ڈے پر پہنچا تو اسے دیکھ کر سب محل اشے اور بھینچ بھینچ کر گلے ملنے لگے۔ اکبر تو باقاعدہ رو پڑا۔

”ارے، ارے یہ کیا؟ بھادر بنو یار..... میں صحیح سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں پھر کیوں آنسو بہاتے ہو۔“ فاروق اسے بہلانے لگا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت لوٹ آئے لیکن

اتنے عرصے میں مجھ پر کیا مزاری، یہ تو بس میں اور میرا رب ہی جانتے ہیں۔ مجھ خالی دامن کے پاس آپ کے سوا ہے ہی کیا۔ آپ ہی سے تو مجھے جینے کا حوصلہ ملتا ہے ورنہ میں کہاں اتنے حوصلے والا تھا کہ سب گھو کر بھی جیتا رہتا۔“ اکبر کے لہجے میں اس کے دل کی سچائی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اپنی محبوبہ پارو کو کھونے کے بعد وہ قاروق کی ہمدردی اور محبت کے نتیجے میں ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

”میں تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں اکبر لیکن یاد رکھو کہ فقط کوئی ایک شخص چاہے وہ آپ کو کتنا ہی عزیز ہو، سب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے بھری یہ اتنی بڑی دنیا بنائی ہے تو اس کا بھی کوئی سبب ہے۔ ایک کے بعد ایک جینے کے سہارے وہ خود پیدا کر دیتا ہے، بس انسان کو اس کی مصلحت کو سمجھ کر تھوڑے سے حوصلے اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو آپ کے لیے خاص ہے، وہ ہمیشہ خاص ضرور رہتا ہے لیکن اس کے ہونے سے زندگی کو مشروط کرنا اللہ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔ اس مالک نے انسان کو پیدا کیا ہے جو جینے کے اسباب بنانا بھی خوب جانتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نہ بھی رہا تو اس اڈے کا ہر فرد تمہارا دیے ہی خیال رکھے گا جیسے میں رکھتا ہوں بلکہ میں تو پھر بھی تھوڑا بے پروا انسان ہوں، یہ لوگ مجھ سے بہت زیادہ ڈرے دار ہیں۔ کیوں جانی..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ اکبر کو سمجھاتے سمجھاتے وہ جانی سے مخاطب ہوا تو وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

”سب ٹھیک ہو لے تم قاروق استاد پر یہ تو اپن بھی بول رہے کہ تمہارے کونگا ڈنے کچھ اسٹیشل دیا ہے۔ تمہاری والی بات کسی دوسرے بندے میں نہیں آسکتی۔“ اس کے جواب پر قاروق زور سے ہنس دیا اور اکبر کا شانہ ٹھیک کر منہ بسورے کھڑے گولو کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم کیوں دور دور کھڑے ہو بھائی! سب کی طرح پاس کیوں نہیں آتے؟“

”اپن کسی سے نہیں بولتا۔ یہ سب لوگ اپن سے جھوٹ بولا۔ بولتا تھا قاروق بھائی کام سے گیا ہے، شام تک آجائے گا پر اپن سمجھ گیا ہے کہ سب گڑبڑ تھا۔“ سب کو ٹوٹ کر قاروق سے ملنے دیکھ کر اسے سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اب تک جھوٹ بول کر بہلایا جاتا رہا ہے اس لیے منہ پھلا کر شکوہ کیا لیکن قاروق کے بلانے پر اس کے قریب ضرور آ گیا۔ قاروق نے خود کھینچ کر اسے گلے لگایا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

رہتا تھا اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے بغیر یہ آگ سرد ہونے والی تھی بھی نہیں۔

”فاروق بھائی! آپ نہادھو کر پڑے بدل لو، اتنے میں جو ناشا تیار کر دیتا ہے۔“ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ گولو نے اس کا بازو ہلا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ناشتے کی اسے خواہش نہیں تھی حالانکہ اس نے کل رات چاند بانو کے ہاں کھانا کھانے کے بعد سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ بھلا کی کرب ناک موت نے اس کے دل و دماغ پر اچھا خاصا اثر ڈالا تھا اور کھانے کے خیال سے ہی اسے ابکائی آرہی تھی۔ ہاں نہا کر حلیہ درست کرنے کا خیال اچھا تھا۔ امید تھی کہ شاید اس دوران ربن لوٹ آئے اس لیے اس نے ناشتے سے انکار کرتے ہوئے نہانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گولو حسب معمول خدمت کے لیے سرگرم ہو گیا۔ وہ نہا کر فارغ ہوا تو حسب توقع ربن اور رامو واپس آچکے تھے۔ وہ ربن کے سامنے پہنچا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈی دیکھی۔ ربن نے اس کے سلام کا جواب دیا اور کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر بولا۔

”تو اپنے ساتھ چل۔ تیرے کو اور یہاں نہیں رکھنے کا ہے۔“ اس نے فاروق کو مہلت دیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کا رخ کیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے حالات کی سنگینی کا پوری طرح علم ہے۔ اس کی معلومات کے ذریعے کا فاروق کو بھی درست اندازہ نہیں تھا، خود اس نے تو ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اپنے غیاب کے بارے میں ہونے والے اکاؤنٹا سوالات کو بھی نظر انداز کر گیا تھا۔ کسی نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے لیے سب سے اہم بات یہی تھی کہ فاروق صحیح سلامت ان کے درمیان موجود ہے۔

”کہاں جانا ہے کچھ بتاؤ تو۔ ایسے بنا کسی تیاری کے کہاں لے جا رہے ہو؟“ اپنے اندر ہوتی اکھاڑ پچھاڑ سے مجبور ہو کر اس نے ربن سے پوچھ ہی لیا۔

”تیرے دشمن نہیں ہیں۔ تیرا بھلا ہی سوچ رہے ہیں۔ تیرا تھوڑا سامان گولو سے کہہ کر تانگے میں رکھوا دیا ہے۔ باقی بعد میں جو چاہیے ہو منگوا لینا۔ ابھی تو بس ادھر سے لکھتا ہے۔“ ربن نے ڈیوڑھی پر رک کر اسے غلت میں سمجھایا۔

”پر کیوں.....؟“ فاروق کے لبوں سے سرسراتے لہجے میں پچھلا۔

”اپنے پیچھے بھلا کی لاش چھوڑ کر آنے کے بعد بھی

”ناراض نہیں ہو یا۔ ان لوگوں نے تمہیں پریشانی سے بچانے کے لیے اصل بات نہیں بتائی ہوگی اور یہ انہوں نے بہت اچھا کیا تھا۔“ گولو تھوڑا سا خزا دکھا کر مان گیا۔ ان سب سے فارغ ہو کر فاروق نے ربن کے بارے میں دریافت کیا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ ربن اڈے پر موجود نہیں ہے ورنہ وہ بھی اس سے ملنے آچکا ہوتا۔ اس کے پوچھنے پر جانی نے اس کی تلاش کے سلسلے میں ہونے والی ساری اٹھا خچ کی تفصیل، ربن کے بھائی سیٹھ کی طرف روانگی تک کہہ سنائی جسے سن کر خود فاروق تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ربن کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جسے کوئی ترنوالے کی طرح نکل سکے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دولت مندوں کے اپنے سوڈھنگ ہوتے ہیں اور ان کی دولت کی طاقت وہ، وہ کچھ کر دکھاتی ہے جو بظاہر مشکل دکھائی دیتا ہے۔

اڈے کے سامنے پولیس والوں، رامو اور ربن کے درمیان ہونے والی بحث اور انسپکٹر وکرم کی گمشدگی کے بارے میں بھی اسے علم ہو گیا تھا اور یہ اندازہ بھی تھا کہ اس سلسلے میں پولیس کا ربن پر شک درست ہی ہوگا، اس لیے اس کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی لیکن اس وقت وہ خود کیا کرے، اسے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ ربن کے پیچھے بھائی کی طرف دوڑ نہیں لگا سکتا تھا اور یہاں بھی زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ انتظام کر کے آیا تھا کہ چوکیدار ہنگلے کے اندرونی حصے میں نہ جائے لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ اپنی مالکن کی طرف سے مسلسل خاموشی اسے تشویش میں مبتلا کر کے اندر کی طرف لے جاسکتی تھی یا کوئی اتفاق اسے ویسے ہی اندر لے جاتا اور وہ اندر جاتا تو بھلا کی لاش دریافت ہو جاتی۔ بھلا نے خود کشی کی ہے یہ صرف وہ جانتا تھا۔ لاش دیکھنے والوں کو تو یہی شک گزرتا کہ وہ بھلا کو قتل کر کے وہاں سے فرار ہوا ہے۔ لاش دریافت ہونے کے بعد اسے قاتل قرار دے کر پولیس کے یہاں پھنسنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ پولیس ویسے ہی آج کل اڈے کی طرف سے بگڑی ہوئی تھی اس لیے اس سے کسی روز رعایت کی امید نہیں تھی۔ وہ لوگ اس پر قتل کا سنگین مقدمہ بنا کر کڑی سے کڑی سزا دلوانے کی کوشش کرتے۔ ایسی صورت میں اس کی بے گناہی کے ثبوت و دلائل پیش کرنے اور رہائی عمل میں لانے کے لیے ربن اور وکیل دونوں کو پتا نہیں کتنے پا پڑے پیلے پڑتے اور وقت مزید اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ جو لیٹ کے مجرم کو آزاد پھرنے کے خیال سے اس کا سینہ ویسے ہی ہر وقت آگ میں جلتا

پوچھتا ہے کہ کیوں.....؟“ ربن کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ فاروق تو سن کر ہی شپٹا گیا۔

”اپن اپنی آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ کر آیا ہے۔ اب تو ساری بحث چھوڑ اور ادھر سے نکل۔ باقی کی تفصیل بعد کو کہہ سن لیں گے۔“

اس بار فاروق اس سے کچھ نہیں کہہ سکا اور خاموشی کے ساتھ پہلے سے تیار تانگے میں ربن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے کو یقیناً منزل کا علم تھا چنانچہ ربن کا اشارہ ملنے ہی اس نے گھوڑے کو چابک رسید کر کے اپنا تانگا آگے بڑھا دیا۔ سفر خاموشی سے طے ہوا اور ایک جگہ تانگا رکنے پر ربن نے اسے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ اپنے سامان کا بیگ لے کر اتر گیا۔ یہ بیگ تانگے میں بیٹھے ہی اس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ تانگے کو فارغ کرنے کے بعد ربن اسے پیدل ہی لے کر چل پڑا۔ فاروق سمجھ رہا تھا کہ انہیں اسی علاقے میں کہیں جانا ہے لیکن اس کے اندازے کے برخلاف ربن نے ایک اور تانگا روکا اور اس میں بیٹھ کر کوچوان کو اپنی منزل سے آگاہ کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ ربن حد سے زیادہ محتاط ہے اور ہرگز یہی نہیں چاہتا کہ پولیس کو اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ نئی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک ایسی عمارت کا رخ کیا جس کی دونوں منزلوں پر اوپر نیچے بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے اور یہ کمرے کرائے پر دیے جاتے تھے۔ زیادہ تر ان کمروں میں دور دراز علاقوں سے بمبئی میں قسمت آزمائی کے لیے آنے والے چھڑے چھانٹ ہی رہتے تھے یا پھر وہ غربت زدہ خاندان تھے جو مناسب رہائش کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے دس دس یا اس سے بھی تجاوز افراد پر مشتمل ہونے کے باوجود کھولی نما مختصر کمروں میں مشترکہ طور پر رہنے پر مجبور تھے۔

”یہ بھائیہ سیٹھ کی بلڈنگ ہے۔ اپن تیرے کو ادھر اس لیے لایا ہے کہ ادھر تیرے ہونے کا کسی کو بھی مشکل سے ٹھک پڑے گا۔ اچھو والی طرف پچھلے دنوں پولیس بہت آ جا رہی ہے اس لیے اپن آج کل ادھر کا رخ نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ پتا نہیں کہ ادھر کلیوں میں پولیس کا کوئی ٹاؤٹ رہتا ہو اور مخبری کر ڈالے۔ دوسرے ٹھکانے پر اس حرام خورد و کرم کی لاش پڑی ہے اس لیے ادھر جانا بھی ٹھیک نہیں۔ تیسری جگہ کا تیرے کو خود معلوم ہے کہ ادھر ابھی تک کسی کو دیکھ بھال کے لیے نہیں رکھا ہے اور تو ٹھہرا شہزادہ۔ تو خود کیسے اپنے لیے کھانے پینے اور دھلائی صفائی کی جھنجٹ میں پڑ سکتا ہے اس

لیے اپن کو یہی ٹھیک لگا ہے کہ تو ادھر ٹھہر جائے۔ ادھر کام کرنے والے ملتے ہیں جو روپے لے کر سارا کام کر دیتے ہیں۔ آگے اپن تیرے لیے کوئی اور انتظام کر دے گا۔“ عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ربن نے اسے بتایا اور مزید بولا۔

”ادھر پہلی منزل پر آدمی بیٹھتا ہے۔ تو خود جا کر اس سے کمرے کے لیے بات کر لے۔ اپن کو وہ پہچانتا ہوگا اس لیے اپن سامنے نہیں جانا چاہتے۔“ فاروق نے اس کی ہدایت پر عمل کیا جبکہ ربن خود منہ چھپائے برآمدے میں ہی رکا رہا۔ وہ سیٹھ کے لیے کرایوں کی وصولی کا کام کرتا رہا تھا اس لیے کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ فاروق کمرے کی چابی لے کر آیا تو دونوں نے بتائے ہوئے کمرے کا رخ کیا۔

”اب بتا کہ تجھ پر کیا ہتی اور بھلا کیسے اپنی جان سے گئی؟“ چھوٹے سے سیلن زدہ کمرے میں پہنچ کر گویا ربن نے سکون کا سانس لیا اور اس سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے دھیرے سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جواب میں ربن نے بھی اسے سب بتا دیا کہ کیسے وہ اور راسو اس جھگڑے تک پہنچے جہاں بھلا نے فاروق کو رکھا ہوا تھا۔ وہاں بھلا کی لاش دیکھ کر سیٹھ کو بے ہوش کر کے نکل جانے کا ماجرا بھی اس نے بیان کر دیا اور بولا۔

”ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اپن تیرے کو ابھی بمبئی سے باہر نکال دیتے لیکن اپنے کو تیرے اندر کا بھی سب پتا ہے، تیرے کو جولیٹ کی بھی فکر لگی ہے اور اس کے پیچھے جانے کا ہے۔ اپن اب تک جو کھوج لگائے ہیں، اس سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ وہ حیدر آباد کی طرف ہی گئی ہے لیکن یہ بھی بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔ ایسی تلاش میں نکلنے کے لیے آدمی کے پاس انتظام بھی اچھا ہونا چاہیے۔ اپن اس کے لیے ہی تیرے کو تھوڑا روکے ہیں۔ اپن سفر کا سارا انتظام کر کے تیرے کو جانے کا بولتے ہیں۔ تو بس اپنے کو یہ بول کہ کس کس کو اپنے سنگ لے کر جائے گا؟“ اپنی بات کے اختتام پر ربن نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں فاروق فوری طور پر کچھ نہیں بولا اور کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اچانک ہی سراٹھا کر بولا۔

”مجھے لندن جانا ہے۔ میں دلدار آغا کے واپس آنے کا مزید انتظار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے انجام تک پہنچانے بغیر جولیٹ کا سامنا کر سکتا ہوں اس لیے بہتر ہے کہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے آغا کے پیچھے جاؤں۔ جولیٹ کی کھوج میں تم کسی اور کو بھیج دینا۔“ وہ اس نچ پر سوچتا رہا تھا

”شکر یہ بول کر غیروں جیسی بات کی تو دوں گا ایک اٹے ہاتھ کا۔“ ربن کی ناراضی میں بھی محبت تھی۔ فاروق بے ساختہ ہی اس سے لپٹ گیا۔ ربن نے اپنا سینہ گداز ہوتا ہوا محسوس کیا لیکن بغیر کسی جذباتیت کا اظہار کیے دھیرے سے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے خود سے الگ کر دیا۔ اس کا منصب اسے اظہار کی اجازت ہی کہاں دیتا تھا البتہ فاروق سے جدا ہو کر جاتے ہوئے اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، اسے وہ ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

”دو ٹکے کی لڑکی خود کو نواب زادی سمجھتی ہے۔ آج میں تجھے تیری اوقات یاد دلاؤں گا۔ تیری جیسی ناجائز اولادیں کٹھنوں کی زینت بننے کے لائق ہوتی ہیں۔ اسد اللہ کی طرح کوئی نواب زادہ اپنے گناہ کی نشانی کو ایسے گلے نہیں لگاتا۔ نوابوں کے ایسے شوق خاک میں رلنے کے لیے ہوتے ہیں اور آج میں تجھے رول کر رہوں گا۔“



میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جنوری 2017ء کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کر وائیں

اس لیے ربن کے سامنے اظہار میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی لیکن خود ربن ششدر تھا۔

”یہ کیا بولتا ہے رے؟ ادھر پردیس میں جا کر کہاں سر پھوڑے گا۔ آغا مل گیا اور تو نے اسے اس کے کیے کی سزا دے بھی ڈالی تو خود اپنی جان بچانے کو کیا کرے گا؟ سنا ہے ادھر کی پولیس یہاں سے بہت تیز ہے۔ وہ تیرے کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے اور ادھر کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے فاروق کے ارادے کی فوری طور پر مخالفت کی۔

”ایسے سینے پر بوجھ لے کر جینے سے بہتر ہے میں کچھ کر کے حوالات میں بند ہو جاؤں۔ رہی پردیس جانے کی بات تو کہاں کا پردیس۔ یہاں بھی ملکہ کی حکومت ہے اور وہاں بھی۔“ اس نے ربن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”حکومت جس کی بھی ہو، دونوں طرف کے حالات میں فرق ہے۔ ادھر انگریزوں کے قدم اکھڑ چکے ہیں اور بس کچھ وقت جاتا ہے کہ وہ ادھر سے نکل جائیں گے لیکن ادھر تو ان کا راج پکا ہے۔ ادھر تو وہ اپنے قاعدے قانون پر پورا عمل کرتے ہوں گے اور اشوک بچن جیسا کوئی وکیل قانون کو اپنے ڈنڈے سے ہانکنے کے لیے نہیں ملے گا۔“ ربن کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

”تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ میرے ساتھ لازمی کچھ برا ہوگا۔ لندن والوں کی مہارت تمہاری تربیت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ بے فکر رہو، میں کامیاب ہی لوٹوں گا۔ یہاں رہ کر گھٹ گھٹ کے جینے سے تو بہتر ہی ہے تاکہ میں کچھ ہاتھ پیر چلا کر ہی دیکھ لوں۔“ وہ ربن کو قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

”پر ادھر سب کا پتا ہے نا تجھے۔ سالوں کا کیسے تجھ میں دم الٹا رہتا ہے۔“ وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ میری خاطر نہ جا لیکن اوروں کا احساس ضرور دلا یا۔

”میں بھی خود کو ان سے الگ نہیں سمجھتا۔ میرے لیے اب تم لوگ ہی میرا خاندان ہو۔ مجھے لوٹ کر تم لوگوں کے درمیان ہی آنا ہے، بس مجھے کچھ دن کی رخصت دے دو۔“ اس کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ ربن مزید کچھ نہیں کہہ سکا اور اس کا شانہ خستہ ہونے سے بس اتنا ہی بولا۔

”چل جیسے تیرا من بولے۔ اپنا تیرے ادھر سے نکلے کا بندوبست کرتا ہے۔“

”شکر یہ داد! تم نے ہمیشہ میرا بہت خیال کیا ہے۔“ فاروق سچ سچ اس کا ممنون ہوا کہ اگر وہ اجازت نہ دیتا تو وہ لاکھ چاہنے کے باوجود کہیں نہیں جاسکتا تھا۔

جذبات لکھے تھے اور جسے پانے کے لیے اپنی ذات کی سچائی تک کی قربانی دے ڈالی تھی۔ اگر اختر کے حصول کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کیونکر جوزفین کے خلاف سازش میں شریک ہوتیں۔ اختر کو پانے کے لیے انہوں نے ساری زندگی کی شرمندگی اپنے حصے میں لکھ لی تھی اور جواب میں کیا پایا تھا؟ بے اولادی کا دکھ، شوہر سے طویل عرصے کی جدائیاں اور اس کی بے وفائی کے شکوک۔ کوئی انہیں بتاتا یا نہ بتاتا، وہ سمجھ سکتی تھیں کہ اختر سنہری زلفوں کی چھاؤں میں رہنے کی خاطر ہی ہمیشہ لندن میں رہنے کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ برسوں کا لاوا آج ایک ضرب لگنے پر پھٹ گیا تھا اور محبت کی گہرائی سے جنم لینے والی نفرت نے اپنا رخ دکھا دیا تھا۔

”میں مانتی ہوں کہ یہ شخص قابل نفرت ہے لیکن ایک گھٹیا آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر آپ کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہیں۔ اس کے مرنے سے بات پولیس اور کورٹ تک بھی جاسکتی ہے اور ایسا ہونے پر آپ کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تکلیف اور مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“ جوئیٹ نے ان پر سے اپنی گرفت کمزور نہیں کی تھی اور بہت نرمی سے انہیں سمجھا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں اختر کے وجود پر بھی ٹکی ہوئی تھیں۔ نیچے کرنے کے بعد وہ دو تین بار تڑپا تھا اور پھر ساکت ہو گیا تھا البتہ اس کے سر سے خون کا اخراج مسلسل جاری تھا اور اب یہ خون قالین میں جذب ہونے کے بجائے ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت اختر کے اطراف میں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ اس نے نواب زادی عالیہ کو چھوڑا اور اختر کی دست درازی کے دوران الٹ کر گر جانے والی کرسی کو سیدھا کر کے انہیں اس پر بٹھاتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”آپ یہاں بیٹھیں اور پلیز میرے واپس آنے تک یہاں سے بلیے گا نہیں۔“ عالیہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور فکلی باندھ کر اختر کو دیکھتی رہیں۔ جوئیٹ نے بھی ایک بار پھر اختر کو دیکھا اور مزید تاخیر کو نامناسب جانتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگی ہوئی نیچے پہنچی اور سیدھے نواب سلیم اللہ کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ وہاں طبی عملے کے دو افراد کے ساتھ صفی اللہ اور اسد اللہ دونوں موجود تھے۔ جوئیٹ کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے پر دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ دونوں ہی چونک گئے۔

”کیا بات ہے جوئیٹ! آپ اور اس وقت؟“

اختر نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا ہوا تھا اور دوسرے سے اسے جکڑے ہوئے انگریزی میں مغلظات بکنا جا رہا تھا۔ جوئیٹ بالکل بے خبری میں اس کا نشانہ بنی تھی اس لیے باوجود مزاحمت کے اس کے چنگل سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ اسے یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ پتا نہیں اس الگ تھلک کمرے میں اس دن کی طرح کوئی اس کی مدد کو پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ بے طرح خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور اختر پوری قوت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اپنی اپنی جدوجہد میں مصروف ان دونوں کو علم نہیں ہوسکا کہ کب نواب زادی عالیہ کمرے میں داخل ہوئیں اور اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے کھولتے ہوئے انہوں نے کمرے میں ایک نظر دوڑائی تو ان کی نظر لکھائی کی میز پر رکھے سنگ مرمر کے قلم دان پر پڑی۔ یہ قلم دان ایک بحری جہاز کے ماڈل کی شکل میں تراشا گیا تھا اور خاصا وزنی تھا۔ نواب زادی عالیہ نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوری قوت سے اختر کے سر پر پھینکی اور دے مارا۔ اس کے حلق سے فوراً ہی ایک دردناک چیخ نکلی اور تکلیف کی شدت سے تڑپ کر اس نے جوئیٹ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس کی چیخ پر جوئیٹ نواب زادی عالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ قہر برساتی آنکھوں سے اختر کو گھورتے ہوئے دوبارہ اس پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ جوئیٹ کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اختر کے پہلے ہی مجروح ہو جانے والے سر پر ایک وار اور کر دیا۔ اختر جو پہلے وار کے بعد ڈگمگا رہا تھا، اس بار خود کو سنبھال نہیں سکا اور تورا کر نیچے گر گیا۔ جوئیٹ نے دیکھا کہ اس کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ کھل گیا تھا اور خون اتنی سرعت سے بہہ رہا تھا کہ نیچے پچھے قالین پر فوری طور پر ایک بہت بڑا دھبا نمودار ہو چکا تھا لیکن نواب زادی عالیہ پر تو شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ اب وہ جھک کر اختر پر تیسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ جوئیٹ نے گھبرا کر ان کے ہاتھوں کو جکڑ لیا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ ایسے تو یہ مرجائیں گے۔“

”ایسے گھٹیا آدمی کا مرجانا ہی بہتر ہے۔ جیسے خاندان کی عزت و ناموس کا خیال نہیں اور جو رشتے میں بیٹھی لگنے والی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کا وجود اس حویلی کے لیے ایک بوجھ ہی ہے۔“ عالیہ اس کی گرفت میں بری طرح ہانپتی ہوئی ہڈیانی لہجے میں بول رہی تھیں۔ اختر وہ شخص تھا جس کے نام انہوں نے اپنی دوشیزگی کے سارے

احتیاط

ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون آیا کہ ”ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے نے ریت کھالی ہے۔ میں نے اسے پانی پلا دیا ہے، بتائیں میں اور کیا کروں؟“

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ”اب آپ صرف یہ احتیاط کیجیے کہ وہ سینٹ ہرگز نہ کھانے پائے۔“

طریقہ

”ہاں، تو بیٹا! آج تم نے کیا سیکھا؟“ ماں نے بڑے شوق سے پہلے روز اسکول سے واپس آنے پر بچے سے پوچھا۔

بچے نے مصیبت سے جواب دیا۔ ”مرغا بننے کا طریقہ۔“

مراسلہ نگار: ریحان شیخ، پنڈی

انہوں نے حیرت اور پریشانی کی جلی کیفیت میں اس سے سوال کیا۔ وہ اپنے والد کی وجہ سے بھی پریشان تھے جن کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرس مسلسل ان کی طرف متوجہ تھے لیکن کچھ دیر قبل ہی ڈاکٹر نے اسد اللہ کو ایک طرف لے جا کر انہیں یہ روح فرسا خبر سنا دی تھی کہ دوا جتنی کی جاسکتی تھی، کی جا چکی تھی اور اب قدرت کی رضا کے آگے میڈیکل سائنس کی شکست کا لمحہ قریب تھا۔ ڈاکٹر کی بات سن کر ان کے دل پر ایک قیامت گزر گئی تھی، اس کے باوجود انہوں نے حوصلے سے کام لیا تھا اور سب سے پہلے نواب زادی عالیہ کو زبردستی کچھ دیر آرام کرنے کے بہانے باہر بھجوا دیا تھا۔ اصل میں یہی وہ وقت تھا جب اختر جولیٹ کے پیچھے دبے قدموں سیزہیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا۔ عالیہ کو جولیٹ کے اوپر جانے کا تو علم نہیں تھا لیکن انہیں اختر کا انداز مشکوک لگا تھا اس لیے کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد وہ خود بھی اوپر پہنچ گئی تھیں اور اختر کو اس کے خطرناک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

”پلیز! آپ میرے ساتھ آئیں۔“ جولیٹ نے اسد اللہ کے سوال کے جواب میں سراپیمہ سے لہجے میں کہا تو ان کے ساتھ صفی اللہ بھی چونک گئے اور ان کے شانے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر انہیں جولیٹ کے ساتھ باہر جانے کا اشارہ کیا۔ انہیں شک تھا کہ نواب صاحب کی حالت کے پیش نظر کہیں اسد اللہ انکار نہ کر دیں۔ بڑے بھائی کا اشارہ پا کر اسد اللہ باہر نکل گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر طبی عملے کی موجودگی کی وجہ سے جولیٹ نے انہیں باہر بلوایا ہے۔

”آپ کو میرے ساتھ اوپر چلنا ہوگا۔“ باہر آکر ان کے کوئی سوال کرنے سے قبل جولیٹ نے ان سے کہا تو وہ مزید الجھ گئے اور ابھمن زدہ لہجے میں بولے۔

”آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ کیا مسئلہ ہے؟ اس وقت ہم ویسے ہی بہت پریشان ہیں اور ابا جان کو نرسائی حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتے۔“

”اوپر بھی اختر صاحب کچھ اسی حالت میں ہیں۔ اگر انہیں فوری میڈیکل ایڈ نہیں دی گئی تو ان کی جان بچنا مشکل ہو جائے گا۔“ جولیٹ نے دھیمی آواز میں ان پر انکشاف کیا۔

”کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ اسد اللہ کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا لیکن اب ان کے قدم حرکت میں آگئے تھے اور وہ اوپر جانے والے راستے کی طرف گامزن تھے۔

”میں اوپر کمرے میں تھی۔ وہ پتا نہیں کیسے وہاں

آگئے اور پہلے والی حرکت دہرانے کی کوشش کی۔ بائے لک نواب زادی صاحبہ وہاں آئیں اور انہوں نے پیچھے سے اختر صاحب کے سر پر کسی بیوی چیز سے ایک کیا جس کی وجہ سے ان کا سر پھٹ گیا اور بلیڈنگ ہونے لگی۔ میں انہیں بہت سیریس حالت میں چھوڑ کر آپ کو انفارم کرنے آئی تھی۔“ ان کے ساتھ ساتھ چلتی وہ انہیں حالات سے آگاہ کرتی جا رہی تھی۔ اس کی فراہم کردہ ان اطلاعات پر اسد اللہ کی پریشانی شکن آلود ہو گئی تاہم انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور اپنی محبت کے گواہ کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرے میں نواب زادی عالیہ ابھی تک کرسی پر بیٹھی ساکت نظروں سے اختر کو دیکھ رہی تھیں۔ اسد اللہ ان سے مخاطب ہونے کے بجائے اختر کی طرف بڑھے اور بچوں کے بل نیچے بیٹھ کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ انہوں نے اس کی دل کی دھڑکن اور نبض چیک کی۔ وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر وہاں بننے والے خون کے تالاب کو دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کبیر سنجیدگی کے ساتھ جولیٹ سے مخاطب ہوئے۔

”آپ نواب زادی عالیہ کو ان کے کمرے میں لے کر جائیں اور ان کے ساتھ ہی رہیں۔ اس معاملے کو ہم خود دیکھ لیں گے۔“

جولیٹ ان سے اختر کی حالت کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن ان کے لہجے کی قطعیت نے اسے ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ بھی کرنے کی ہمت نہیں

کر جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر اسد اللہ تیر کی طرح نواب صاحب کے کمرے کی طرف دوڑے۔ وہاں بھی موت اپنا وار کر کے جا چکی تھی اور صفی اللہ باپ کے بستر کے سرہانے رنج و الم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

”بھائی جان.....“ اسد اللہ نے انہیں پکارا اور پھر دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑے۔ انہیں معلوم تھا کہ بس یہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب وہ اپنے باپ کے لیے یوں آنسو بہا سکتے ہیں، بعد میں ذمے داریوں کا بوجھ انہیں غم منانے کی بھی اجازت نہیں دے گا۔

☆☆☆

ربن اڈے واپس پہنچا تو ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اے ایس آئی اے دیکھ کر طنز یہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”سنا تھا ربن دادا اپنے وعدے کا بڑا پکا ہے، پر دکھائی تو کچھ اور دے رہا ہے۔“

”سارا نظر کا ہیر پھیر ہے۔“ ربن نے اس کے طنز کا بے نیازی سے جواب دیا۔

”ایسا خود پر ناز ہے تو ادھر بھائیہ سیٹھ کی کوٹھی پر پولیس والوں کو جل دے کر کیوں نکل گئے؟“ اے ایس آئی نے اپنی جانب سے اس پر کاری وار کیا۔

”جس کام کی مہلت لے کر گئے تھے، اسی کو پورا کرنے نکلے تھے اور چھپ کر نہیں نکلے تھے۔ تمہارے سپاہیوں کی آنکھوں پر ہی پٹی بندی تھی تو اپن کیا کرتے۔“ ربن نے اس کے وار کا اطمینان سے جواب دیا۔

”اگر سارے کام انجام پا چکے ہیں تو کیا جناب تھانے بے حار نے کاکٹ اٹھانا پسند کریں گے۔ ادھر کب سے آپ کی راہ دیکھی جا رہی ہے۔“

”ادھر سے ادھر ہی جانے کا تھا بس ادھر دو منٹ کا کام تھا اس لیے پہلے ادھر آ گئے تھے۔ سوچا نہ جانے پولیس والوں کو کتنے دن اپنے کو مہمان بنا کر رکھنے کا ارادہ ہے اس لیے اچھا ہے سب ضروری کام نمٹاتے چلیں۔“ اس کی طنز یہ باتوں کا وہ نہایت سکون سے جواب دے رہا تھا۔

”اب بھی کچھ کام باقی ہے؟“ اے ایس آئی نے منہ بنایا۔

”بولانا ایک ضروری کام سے ہی ادھر آئے تھے ورنہ سیدھے تھانے ہی پہنچتے۔“ ربن نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے جانی کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں اور پھر شان سے پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہونے دی اور وہ نواب زادی عالیہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر بچنے جانے کے لیے روانہ ہو گئی۔ اسد اللہ ماتھے پر تل ڈالے کچھ دیر وہیں کھڑے رہے اور اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب وہ دونوں نواب زادی عالیہ کے کمرے میں پہنچ چکی ہوں گی، خود حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے حویلی کے مردانے کی طرف جانے والی میزبھیوں کا رخ کیا تھا۔ ذرا دیر میں ان کی دو وقادار ملازموں کے ساتھ واپسی ہوئی۔ ان ملازمین کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی جان دے سکتے ہیں لیکن ان کی مرضی کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکال سکتے۔ ان کی ہدایت پر ملازمین نے آخر کو اٹھایا اور لے کر نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ آخر کے سرے اب بھی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے لیکن پہلے جیسی روانی نہیں رہی تھی۔ اسد اللہ کی ہدایت پر آخر کو ایک قریبی کمرے میں لے جایا گیا اور ایک ملازم ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑا۔ ڈاکٹر فوراً ہی آ گیا۔ اس نے آخر کا معائنہ کیا اور فوری اعلان کر دیا۔

”نئی از نومور۔ چوٹ بہت شدید ہے اور میرے خیال میں بہت زیادہ خون بہہ جانے کے علاوہ دماغ کے متاثر ہونے سے بھی ڈر ہے۔ کون ہیں یہ اور کیا حادثہ پیش آیا ان کے ساتھ؟“ ڈاکٹر اپنے تجسس کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ ہمارے چھپی زاد بھائی اور بہنوئی دونوں ہی ہیں۔ شاید میزبھیوں چڑھتے ہوئے پھر پھسلنے سے گر گئے اور سر پر چوٹ لگ گئی۔ سب لوگوں کے اپنی اپنی خواب گاہوں میں ہونے کی وجہ سے فوری طور پر حادثے کا علم نہیں ہو سکا اور خون زیادہ بہہ گیا۔“ اسد اللہ نے سمجھے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر کو بتایا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ یہی داستان ہر ایک کو سنائی ہے اس لیے ملازمین کو پہلے سے ہدایت دے دی تھی اور وہ ڈاکٹر کی آمد کے بعد بہ سرعت خون کے ان قطروں کو صاف کرنے کے لیے حرکت میں آ گئے تھے جو اوپر والے کمرے سے یہاں تک ایک قطار کی صورت میں چلے آئے تھے۔

”بہت افسوس ہوا جان کے۔ میں بہت رنجیدہ ہوں کہ حویلی والوں کو ایک ساتھ دو اہم شخصیات کی جدائی کا صدمہ سہنا ہوگا۔“ ڈاکٹر کے الفاظ پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ابھی لمحہ بھر قبل ہی نواب صاحب بھی زندگی کی جنگ ہار گئے ہیں۔“ ڈاکٹر نے جیسے ان کی نگاہ کا سوال پڑھ

”کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تم سے لمبی بات ہونی ہے، کھڑے کھڑے نہیں ہو سکے گی۔“ ربن خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ راضیہ نے کرسی کی پشت گاہ سے آرام دہ انداز میں ٹیک لگائی اور گہری نظروں سے ربن کو دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں ابھی چند ہفتے پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہوں۔ بمبئی بڑا شہر ہے اور یہاں کے بڑے مسئلے ہیں۔ بمبئی کے بارے میں جانکاری کرتے کرتے تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ سننے کو ملا اور ملاقات کا شوق من میں جاگا۔ ملاقات کے لیے یہاں تو بہت سے تھے لیکن میں ذرا بڑی رہا اس لیے تم کو بلوا نہیں سکا۔ اب ایک نیا بہانہ بن گیا تو میں نے کہا چلو تم سے مل ہی لیتے ہیں۔“ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے ربن کا کوئی پرستار ہو لیکن اس کے لہجے کی گہرائی میں کہیں طنز کی کاٹ بھی تھی جو بس ربن جیسا شخص ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا لیکن ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر اس کی ستار ہا جواب کہہ رہا تھا۔

”تمہارے باقی سارے دھندے ایک طرف لیکن ہم اپنی کتنا انگریز افسر ولیم کے اغوا سے شروع کرتے ہیں۔ حکومت برطانیہ کے اس اہم نمائندے کو اغوا کر کے اتنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اس حادثے کا الزام تمہارے اوپر آیا لیکن تم مضبوط گواہوں اور اپنے چالاک وکیل کی وجہ سے بچ گئے۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں کچھ چھوٹے بڑے ایسے واقعات ہوئے جس میں تم یا تمہارے آدمیوں کا نام لیا جاتا رہا لیکن پولیس ثبوت نہ ہونے کے کارن تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ اب پھر تم ہمارے ایک انسپٹر وکرم کی تشدد کی معاملے میں مشکوک ہو اور آثار کہتے ہیں کہ اس کے کڈنیپ ہونے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے کیونکہ وکرم بہت سختی سے تمہارے گرد دائرہ تنگ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وکرم کے کوئیکز چاہتے ہیں کہ اس بار تمہیں گرفتار کر کے لا کر آپ میں بند کر دیا جائے اور تمہاری اتنی مرمت کی جائے کہ تم سب کچھ اگل دو اور تمہارے چالاک وکیل کو عدالت میں تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔“

”پھر دیر کا ہے کی ہے۔ اگر آپ کے پاس اپنے الزام کا ثبوت ہے تو بند کرو اپنے کو لا کر آپ میں۔“ ربن نے اسے مشورہ دیا۔

”ثبوت ہوتا تو تمہیں سامنے بٹھا کر بات کرنے کی نوبت کہاں آتی۔ میں اپنے ہاتھوں کی رائے مان کر تمہیں

”بڑا صاحب اندر انتظار کرتا ہے۔“ تھانے پہنچے ہی ایک سپاہی نے سرکوشی میں اسے ایس آئی کو اطلاع دی تو وہ یکدم ہی بہت چوکس نظر آنے لگا اور سخت لہجے میں ربن سے بولا۔

”ڈی ایس پی راضیہ خود تھانے میں موجود ہیں اور تمہارا انتظار کر رہے ہیں..... تو سمجھ لو تم گئے کام سے۔ آج تمہاری ساری دادا گیری تاک کے راستے باہر نکل جائے گی۔“ ڈی ایس پی کی موجودگی کی خبر نے ربن کو بھی چونکا کر دیا۔ وہ وکرم والے معاملے کی وجہ سے فکر مند نہیں تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس معاملے میں پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے گی لیکن بملا کی موت سے جو مسئلہ کھڑا ہوا تھا، وہ اس کی گھبراہٹ کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ بملا نے خودکشی کی تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہاں پہلے فاروق اور بعد میں وہ اور رامو جس طرح ہنگامے سے فرار ہوئے تھے، ان کے لیے مشکوک کے درمیان گئے تھے۔ اس واقعے کوئی گھنٹہ پیش آچکے تھے اور اس بات کا پورا پورا امکان تھا کہ اب تک مکمل چکی ہو۔ بھائیہ سیٹھ جس پائے کا آدمی تھا، اس کی بیٹی کی موت کا معاملہ کسی عام پولیس والے کے بجائے ڈی ایس پی جیسے عہدے پر فائز بندے کو ہی دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ دل میں بہت سے دوسرے لیے اسے ایس آئی کے پیچھے دفتر میں داخل ہوا۔

”ربن دادا حاضر ہے سر!“ اسے ایس آئی نے مؤدب لہجے میں شاندار شخصیت کے مالک ڈی ایس پی راضیہ کو اطلاع دی۔ وہ بہت نیچے کا آدمی تھا لیکن اسے اپنے کسی سینئر کے بجائے سیدھے ڈی ایس پی راضیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا تھا۔

”اوہ ربن دادا۔ بہت ویٹ کروایا تم نے مجھے۔“ راضیہ نے فوراً ہی سر اٹھا کر ربن کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں طنز اور اشتیاق کی ایسی آمیزش تھی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کس چیز کا اثر غالب ہے۔ ربن نے تولتی ہوئی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پہلے ہی مرحلے پر وہ اسے بہت گہرا آدمی محسوس ہوا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ راضیہ بھی اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

”تم جاؤ راہول۔ میں دادا سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں۔“ لمحہ بھر کی جانچ کے بعد اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا اور اس کے باہر نکلتے ہی ربن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولا۔

زبان کھولنے کے لیے ان کے حوالے بھی نہیں کر سکتا کہ میں ایک قانون اور انصاف پسند آدمی ہوں۔“ راٹھور نے اسے جتایا۔

”آپ کی انصاف پسندی تو ادھر ہی کھل گئی جب آپ نے انگریز افسروں کے اغوا سے اپنی کٹھا شروع کی۔ آپ اپنے کہے جیسے ہوئے تو قصہ ادھر سے شروع کرتے جدھر اپن کا نقصان ہوا تھا اور گورے ولیم نے اپنے بچے کو غیر قانونی طور پر تھانے میں رکھ کر اس پر ایسا ظلم ڈھایا تھا کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔“ ربن نے بغیر نفی لپٹی کے اسے نفی کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی بات پر راٹھور نے پہلو بدلا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

”ایسی کوئی بات ہمارے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔“
”اپنے کیے کا کون حساب رکھتا ہے۔ یہ حساب تو اسی کو رکھنا پڑتا ہے جس کا نقصان ہوا ہو۔“ ربن نے اس بار بھی کوئی رعایت نہیں کی۔

”سوچ لو دادا! ایسی بات کر کے تم خود ہی مان رہے ہو کہ اپنے آدمی کا بدلہ لینے کے لیے تم نے ہی ولیم کو اس حال تک پہنچایا تھا۔“

”آپ کا قانون ثبوت مانگتا ہے۔ آپ بولو کہ آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟“ ربن کے اطمینان اور اعتماد میں سرسوزی نہیں آیا۔ راٹھور نے اس کی بات پر اس کی طرف غور سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

”ثبوت ہوتا تو میں تمہیں اپنے سامنے یوں کرسی پر بٹھا کر تم سے بات نہیں کر رہا ہوتا۔“

”آپ اپنے کو کرسی پر بٹھائے یہ آپ کا بڑا اپن ہے پر اپن کو ابھی تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ آپ اپنے سے کیا چاہتے ہو؟“ ربن کی زیرک نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ بین السطور بھی ہے اور ڈی ایس پی جیسا افسر محض تبصروں اور تجویزوں کے لیے اس سے گفتگو نہیں کر رہا۔ اس لیے صاف الفاظ میں اس سے اس کا مدعا دریافت کیا۔

”تمہارا وہ بندہ فاروق کدھر ہے؟ بمبئی سے نکال آئے ہو کیا اسے؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے راٹھور نے جس معنی خیز لہجے میں پوچھا، اس نے ربن کا ماتھا ٹھنکا دیا۔ وہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ فاروق کے متعلق یہ گفتیش بلا جواز ہے اور پہلا جواز بسلا کی موت کی صورت خود اس کے ذہن میں موجود تھا۔

”آپ کیوں پوچھتے ہو فاروق کو؟“ اس نے اپنے اندرونی خلفشار کو لہجے سے ظاہر ہونے سے روکنے کی پوری

کوشش کی۔

”کہنا کیا ضروری ہے؟ کارن تم خود بھی جانتے ہو۔ بھائیہ سیٹھ بہت پیش میں ہے اور چاہتا ہے گھڑی کی چو تھائی میں تمہیں اور فاروق کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ تم سمجھ سکتے ہو دادا کہ یہ کیس اتنا کچا نہیں ہے کہ تم آسانی سے اپنے ہاتھ پیر بچالو۔ پولیس کے پاس گواہ بھی ہے اور بھائیہ سیٹھ جیسی مضبوط پارٹی بھی۔“ راٹھور نے اس کے اس خدشے کی تصدیق کر دی کہ بسلا کا کیس پولیس کے پاس پہنچ چکا ہے اسی لیے راٹھور جیسا افسر خود گفتیش کے لیے تھانے میں موجود ہے لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ پولیس اپنے روایتی طریقہ کار پر عمل کرنے کے بجائے اس طرح کا طرز عمل کیوں اپنائے ہوئے ہے۔

”اپن کے ہاتھ صاف ہیں اس لیے ہاتھ پیر بچانے کا انتظام بھی ہو ہی جائے گا۔ آپ بھروسہ کرو یا نہ کرو، پر جج یہ ہے کہ سیٹھ کی لڑکی نے آپ اپنی جان لی تھی۔“ ربن نے اسے پوری بات بلا کم و کاست سنا ڈالی۔

”اچھی کہانی ہے، پر آسانی سے ثابت نہیں کی جاسکتی۔ ہاں پولیس آسانی سے ثابت کر سکتی ہے کہ یہ آتما ہتھیا نہیں بلکہ مرڈر کا کیس ہے۔“ راٹھور نے جیسے اس کی بات ہوا میں اڑادی۔ اس کے انداز پر ربن اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا کہ وہ چاہتا تھا اب راٹھور خود ہی تھیلے سے ٹلی کو باہر لے آئے۔ راٹھور نے لحو بھر کے لیے ربن کے چہرے کے تاثرات جانچے اور میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر ڈاڑھا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

”ہم تمہاری ستائی کھا کو بچ مان سکتے ہیں اگر تم بھی ہماری مان لو۔“

”کیا چاہتے ہو آپ اپن سے؟“ ربن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی اونچے درجے کی ہی سودے بازی ہوگی کہ معاملہ بھائیہ جیسے بڑے سیٹھ کی بیٹی کی موت کا تھا۔

”سنا ہے فاروق تمہارا بڑا لاڈلا ہے اور تم اسے بالکل اولاد کی طرح چاہتے ہو۔ اولاد کو بچانے کے لیے تو آدمی بڑی سے بڑی قیمت دینے کو راضی ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہیں تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔“ راٹھور جیسے اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ اپنی بات بولو۔“ ربن نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے ٹھوس کجے میں کہا۔

”جناح کے ایک قریبی ساتھی کو ٹھکانے لگانا ہے۔“

اس کام کے لیے ہاں بولتو دوسرا کام بھی بتاتا ہوں۔
”کیا گناہ کیا ہے اس بندے نے۔“ ربن نے بے
نیازی سے دریافت کیا لیکن اندر ہی اندر وہ بے چین ہوا تھا
تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہندو اپنی روایتی نفرت کے اظہار کے
لیے اس سے یہ کام لینا چاہتے ہیں لیکن وہ اس مطالبے کو مان
کر ہندوستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت سے بیر نہیں لینا
چاہتا تھا۔ وہ ذاتی طور پر ہندوستان چھوڑنے کے لیے راضی
نہیں تھا لیکن تحریک پاکستان کے مخالفوں میں سے بھی نہیں
تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو بلا جواز
بھی نہیں کر رہے۔ ایسے میں وہ ان کے کسی اہم راہنما کو قتل
کر کے اپنے ضمیر پر بوجھ کیوں لیتا۔ وہ بلا جواز بے گناہ
لوگوں کو قتل کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

”جناح کا ساتھی ہونے سے بڑھ کر کیا پاپ ہو سکتا
ہے۔ جناح اور اس کے ساتھی حالات کو اس رخ پر لے
آئے ہیں کہ بھارت ماتا دو ٹکڑے ہونے کو ہے۔ ان لوگوں
کو اپنے اس پاپ کا بھگتان تو دینا ہوگا۔ میں نے تمہیں جس
بندے کا بولا ہے، اس کو مارو گے تو جناح اور سارے
مسلمان تڑپ اٹھیں گے اور یہی ہماری اچھا ہے۔“ راجھور
کے لہجے سے اس کی دلی نفرت جھلک رہی تھی۔
”اور دوسرا کام کیا ہے؟“ ربن نے اس سے
دریافت کیا۔

”مسلمانوں کے دو چار علاقوں میں بلوے کروانے
ہیں۔ ان میں سے بہت سے یہاں سے جانے کو اپنا سامان
باندھ لے بیٹھے ہیں۔ بلوے میں جو مال ہاتھ آئے، وہ تمہارا
ہوگا بس اپنے کو زیادہ سے زیادہ مسلوں کی لاشیں چاہیے
ہیں۔“ وہ جو دیکھنے میں شاندار اور مہذب شخصیت کا مالک
تھا، اندر سے کیسا کینہ پرور اور شقی القلب تھا، یہ دومنٹ میں
ربن کے سامنے آ گیا۔ ایسے آدمی کے سامنے سچ بولنا
خطرناک ہوتا ہے لیکن ربن کب کسی خطرے سے ڈرتا تھا۔
سب کچھ سنا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔
”آپ اپنی غلط جانچ کیے ہو صاحب۔ اپن
بھاڑے کا قائل نہیں ہے جو قصائیوں کی طرح لوگوں کے
گلے کاٹتا پھرے۔ اپن دادا ہے اند اپنے اصولوں پر
دادا گیری کرتا ہے۔“
”سوچ لو دادا! ہمارا کام تو کوئی بھی کر دے گا پر
تمہارے لیے اپنی مشکل سے نکلنے کا راستہ بند ہو جائے گا۔“
راجھور نے اسے دھمکایا۔
”موت سے زیادہ بندے کے ساتھ بھلا کیا برا ہو سکتا

”جناح کا ساتھی ہونے سے بڑھ کر کیا پاپ ہو سکتا
ہے۔ جناح اور اس کے ساتھی حالات کو اس رخ پر لے
آئے ہیں کہ بھارت ماتا دو ٹکڑے ہونے کو ہے۔ ان لوگوں
کو اپنے اس پاپ کا بھگتان تو دینا ہوگا۔ میں نے تمہیں جس
بندے کا بولا ہے، اس کو مارو گے تو جناح اور سارے
مسلمان تڑپ اٹھیں گے اور یہی ہماری اچھا ہے۔“ راجھور
کے لہجے سے اس کی دلی نفرت جھلک رہی تھی۔
”اور دوسرا کام کیا ہے؟“ ربن نے اس سے
دریافت کیا۔
”مسلمانوں کے دو چار علاقوں میں بلوے کروانے
ہیں۔ ان میں سے بہت سے یہاں سے جانے کو اپنا سامان
باندھ لے بیٹھے ہیں۔ بلوے میں جو مال ہاتھ آئے، وہ تمہارا
ہوگا بس اپنے کو زیادہ سے زیادہ مسلوں کی لاشیں چاہیے
ہیں۔“ وہ جو دیکھنے میں شاندار اور مہذب شخصیت کا مالک
تھا، اندر سے کیسا کینہ پرور اور شقی القلب تھا، یہ دومنٹ میں
ربن کے سامنے آ گیا۔ ایسے آدمی کے سامنے سچ بولنا
خطرناک ہوتا ہے لیکن ربن کب کسی خطرے سے ڈرتا تھا۔
سب کچھ سنا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔
”آپ اپنی غلط جانچ کیے ہو صاحب۔ اپن
بھاڑے کا قائل نہیں ہے جو قصائیوں کی طرح لوگوں کے
گلے کاٹتا پھرے۔ اپن دادا ہے اند اپنے اصولوں پر
دادا گیری کرتا ہے۔“
”سوچ لو دادا! ہمارا کام تو کوئی بھی کر دے گا پر
تمہارے لیے اپنی مشکل سے نکلنے کا راستہ بند ہو جائے گا۔“
راجھور نے اسے دھمکایا۔
”موت سے زیادہ بندے کے ساتھ بھلا کیا برا ہو سکتا

نواب زادی عالیہ اپنی خواب گاہ میں مسہری کے
سرہانے سے پشت لگائے بالکل ساکت اور لب بستہ بیٹھی
ہوئی تھیں۔ اختر اور نواب سلیم اللہ کی موت کو آج چوتھا دن
تھا۔ نواب صاحب کے لیے تو پھر بھی سب ذہنی طور پر تیار
تھے کہ کسی بھی وقت سانس کی ڈوری ٹوٹ سکتی ہے لیکن اختر
کی موت ایک سانحہ ثابت ہوئی تھی۔ ہر کوئی انگشت بدنداں
تھا کہ کیسے ایک صحت مند اور توانا آدمی یکدم زندگی کی بازی
ہار گیا۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ رات کے کسی پہر اختر
ہوا خوری کے لیے چھت پر جا رہے تھے کہ پاؤں پھسلنے سے
سر کے بل گر گئے۔ حویلی کے مکین اور ملازمین سب ہی اس
پہر سو رہے تھے اس لیے فوری طور پر اس حادثے کا علم نہیں
ہوسکا اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی موت واقع
ہو گئی۔ اس قصے میں سے جو لیٹ کا نام سرے سے نکال دیا
گیا تھا اور لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ نواب سلیم اللہ کی خدمت
میں موجود ان کی تینوں اولادوں میں سے عالیہ کو نواب
صاحب کے آخری وقت میں دونوں بھائیوں نے خود ہی
بہانے سے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں واپس
آ کر جب عالیہ نے اختر کو غائب پایا تو ان کی فکر میں باہر
نکلیں اور انہیں میڑھیوں کے قریب خون میں لت پت دیکھ
کر بھائیوں کو اطلاع دی۔ نواب صاحب کی خدمت پر
ماسور ڈاکٹر نے ہی اختر کا معائنہ کیا اور اس بات کی تصدیق
کی کہ ان کی موت واقع ہو چکی ہے۔
حویلی کے مکینوں کو یہ داستان اس اضافے کے ساتھ
سنائی گئی تھی کہ اختر بے حد نفیس کے عالم میں تھے اس لیے اپنا

توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور سیڑھیوں سے پھسل گئے۔ اس حادثے پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرنے والے بہت تھے لیکن شک گون کرتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس واقعے کی مرکزی کردار عالیہ تھیں اور انہوں نے اتنا مکمل سکوت اختیار کر رکھا تھا کہ سوئم تک کسی نے ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔ ان کی اس حالت کو دہرے صدے سے ہونے والا سکتہ قرار دے کر خواتین نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح عالیہ کو رلا سکیں لیکن ان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ اسد اللہ کو ان کی ذہنی حالت کا اچھی طرح احساس تھا اور وہ مردانے میں ہونے کے باوجود ان کی مکمل خبر گیری کرتے رہے تھے۔ ان ہی کی ہدایت پر عالیہ کو بہت دیر تک خواتین کے درمیان بیٹھنے نہیں دیا جا رہا تھا کہ کہیں وہ کسی کے سامنے کوئی ایسی سیدھی بات نہ کر جائیں۔ جیتیں اٹھنے کے بعد تو ڈاکٹر کے مشورے سے انہیں باقاعدہ سکون آور دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔ یہ سکون آور ادویات ندرت جہاں اور عشرت جہاں کو بھی دینی پڑی تھیں۔ اکلوتے بیٹے اور بھائی کی ناگہانی موت پر دونوں ماں بیٹی خوب بین کر کر کے روئی تھیں۔ ان دونوں کی حالت ایسی تھی کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا لیکن وہی بات تھی کہ ہمدردی کے اظہار کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔

صنی اللہ اور اسد اللہ اپنی پچھلی زندگی کا غم بانٹنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے تھے۔ ماں اور بہن کو صبر آنا آسان نہیں ہوتا لیکن قدرت کے وضع کردہ اصول کے مطابق ہرگز رتا دن خود ہی غم کی شدت کم کرتا چلا جاتا ہے۔ سسکیاں اور دہی دہی آہیں اب بھی تھیں لیکن پہلے دن والے بین اور نوے دم توڑ چکے تھے۔ سوئم کی فاتحہ کے بعد پڑ سے کے لیے آئے ہوئے زیادہ تر عزیز واقارب اور احباب اپنے گھروں کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور چند ایک قریبی لوگ ہی حویلی میں رہ گئے تھے جن کی بھی جلد روانگی متوقع تھی۔ ان حالات میں جولیٹ نے اپنی بساط سے زیادہ ذمے داریاں اٹھائی تھیں اور ہر مل متحرک رہی تھی۔ خصوصاً نواب زادی عالیہ پر اس کی بھرپور توجہ مرکوز تھی۔ اس کی کوشش رہی تھی کہ زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزارے اور اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ان کی خواب گاہ میں موجود تھی۔

کچھ دیر قبل ہی اس نے ان کا لباس تبدیل کروا کر ان کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور اب ان کی چیزیں سمیٹ کر رکھ رہی تھی۔ حالات نے اس کی حیثیت کا اعلان نہیں

ہونے دیا تھا لیکن اسد اللہ کی مہربانیوں نے بہر حال حویلی کے مکینوں اور جملہ ملازمین کو یہ باور کروا دیا تھا کہ اس کی ایک خاص اہمیت اور مقام ہے چنانچہ کوئی بھی اس کے کہے کو ٹالنے کی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ نواب زادی عالیہ کے ساتھ اس نے خود رہنے کا فیصلہ سنایا تھا تو پھر کسی ملازمہ کی یہ جرات نہیں ہوئی تھی کہ کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ سروری سمیت تمام ملازماہیں اپنی حد میں تھیں اور بس اسی حد تک خدمت بجالا رہی تھیں جتنا انہیں حکم دیا جا رہا تھا۔ اب بھی ایک ملازمہ نواب زادی عالیہ کا دھلا دھلایا صاف ستھرا لباس مہیا کر کے واپس چلی گئی تھی اور ان کے ساتھ ان کے کمرے میں صرف جولیٹ موجود تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”کون؟“ اس نے بلند آواز میں استفسار کیا۔
”ہم ہیں اسد اللہ.....“ باوقار لہجے میں سنائی دینے والے اس جواب پر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سر جھکا کر مودب لہجے میں خالعتا حیدر آبادی لہجے میں انہیں آداب کہا۔ اس کے اس انداز پر اسد اللہ کو بے ساختہ ہی جوزفین یاد آئی۔ وہ بھی تو چند دنوں میں ہی یہاں کے ادب و آداب سیکھ کر یہاں کے ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ جولیٹ نے شروع میں خود کو اس ماحول سے جدا رکھا تھا لیکن جب سے انہوں نے اسے اپنی بیٹی تسلیم کیا تھا، وہ بھی خود کو اس ماحول میں ڈھال رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی انفرادیت تھی جو اسے دوسروں سے زیادہ پرکشش اور پُر اعتماد ظاہر کرتی تھی۔

”جیتی رہے۔“ لہجہ بھر میں ماضی اور حال کا سفر طے کرتے ہوئے انہوں نے شفقت سے جولیٹ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں داخل ہوئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی پچھلی جان کی؟“ جولیٹ حذبذب تھی کہ یہاں ٹھہرے یا باہر نکل جائے کہ اسد اللہ کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

”بس پہلے دن ہی کی طرح کا حال ہے، کچھ بولتی ہی نہیں ہیں۔ کھانا بھی بہت اصرار پر چند لقموں سے زیادہ نہیں کھاتیں۔“ جولیٹ نے انہیں عالیہ کی کیفیت سے آگاہ کیا۔
”کیا بات ہے عالیہ! کیوں آپ نے اپنا یہ حال بنالیا ہے۔ جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ خود کو سنبھالیے۔ آپ کی یہ حالت ہمارے اور بھائی جان کے لیے ذہنی دباؤ کا باعث بن رہی ہے۔ ابا جان کی رحلت نے پہلے ہی ہمیں بہت بڑا دھچکا پہنچایا ہے، اب آپ کی

اپنے انسان

☆ رات کے اندھیرے سے ڈرتے ہو، قبر سے کیوں نہیں۔

☆ جنت میں جانا چاہتے ہو، مسجد میں کیوں نہیں۔

☆ رشوت دیتے ہو، غریب کو کھانا کیوں نہیں۔

☆ دنیا کی کتابیں پڑھتے ہو، قرآن پاک کیوں نہیں۔

☆ گانا گاتے ہو، درود پاک پڑھتے کیوں نہیں۔

☆ دنیاوی امتحان کے لیے ساری رات جاگتے ہو۔ آخرت کے امتحان میں پاس ہونے کے لیے کیوں نہیں۔

☆ بے تحاشا فضول خرچیاں کرتے ہو، زکوٰۃ نکالتے کیوں نہیں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل پور

مالک کے کام

باز اور شکروں کی موجودگی کے باوجود چڑیا کے بچے پرورش پاتے رہتے ہیں۔ آندھیاں سب چراغ نہیں بجھا سکتیں۔ شیر دھاڑتے رہتے ہیں اور ہرن کے خوب صورت بچے کلیں بھرتے رہتے ہیں۔

یہ سب اس مالک کے کام ہیں.....

اس کی پیدا کردہ مخلوق اپنے اپنے مقرر شدہ طرز عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ فرعون نے سب بچے ہلاک کر دیے مگر وہ بچہ فوج گیا جو اس کے لیے خطرہ تھا، یہ سب قدرت کے کام ہیں۔

زمانہ ترقی کر گیا ہے مگر..... کبھی..... پھر.....

اور چو ہے اب بھی پیدا ہوتے ہیں۔ طب مشرق و مغرب میں بڑی ترقی ہوئی۔

جراثیم کش دوائیں نے جراثیم پیدا کرتی ہیں۔ بیماریوں میں اضافہ ہوا..... انسان کل بھی دکھی تھا اور آج بھی سکھی نہیں ہے۔

انتخاب۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

حالت مزید تشویش کا باعث بن رہی ہے۔ ہم نے حاضر دماغی سے کام لے کر حالات کو قابو میں رکھا ہوا ہے لیکن آپ کی طرف سے خوف زدہ ہیں کہ آپ اپنی کیفیت کے باعث کسی بھی وقت خود پر قابو نہ کھو بیٹھیں۔ ہونے والی بات ہو چکی۔ اب حویلی کی عزت اسی میں ہے کہ جو ہوا اس پر پردہ پڑا رہے۔ بھائی جان کی بھی یہی خواہش ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ابا جان کے بعد اب وہی حویلی کے مختار کل ہیں۔ "اسد اللہ مسبری کے ساتھ رکھی ایک منقش کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور اب بہت دھیمی آواز میں عالیہ سے مخاطب تھے۔ پہلے تو عالیہ سر جھکائے ان کی بات سنتی رہیں پھر جب وہ خاموش ہوئے تو انہوں نے اپنا جھکا ہوا سراٹھایا اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"آپ ہماری طرف سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں بھائی جان۔ ہم مرتے مرجائیں گے لیکن کبھی اس حویلی کی آن اور عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اگر ہمیں یہ گوارا ہوتا تو اپنے ہاتھ سے اپنا سہاگ کیونکر اجاڑتے۔ ہمارے سکوت کو آپ ہماری ذہنی حالت کی خرابی پر محمول مت کیجیے۔ یہ خاموشی تو ہمارے گردنچی وہ فیصل ہے جو کسی کو بھی ہم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے۔ ہم نے ہمیشہ اختر کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ہمارے اختیار میں تھا۔ ان کی تمام تر کوتاہیوں اور بے نیازی کے باوجود ہم اپنی طرف سے بیوی ہونے کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کرتے رہے لیکن انہوں نے جواب میں کیا کیا.....؟ ہمارے ہی بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالا..... پہلے ان کا جرم پھر بھی قابل معافی تھا کہ وہ جولیت کی حیثیت سے واقف نہیں تھے لیکن واقف ہونے کے بعد بھی ایسی گھناؤنی حرکت کر کے انہوں نے خود کو ہماری نظروں میں اتار کر لیا تھا کہ ہمیں ان کا وجود روئے زمین پر بوجھ معلوم ہونے لگا۔ ہمیں ان کے قتل کے الزام میں دار پر لٹکا دیا جائے تو بھی ہمیں کوئی افسوس نہ ہوگا لیکن ہم نے اس حویلی کی عزت کی خاطر اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے۔ اس سکوت کی آڑ میں ہم بیوی کی حیثیت سے ان کا نوحہ کرنے کی زحمت سے بھی بچے ہوئے ہیں ورنہ یہ تو ہمارا دل جانتا ہے کہ ہم اپنے پیارے ابا جان کی جدائی میں کتنے دل گرفتہ ہیں اور ہمارے دل پر کتنے آنسو گر رہے ہیں لیکن ہم صرف اس لیے نہیں روتے کہ کہیں ابا جان کے لیے بہائے گئے آنسوؤں کو کوئی اختر کے لیے نہ سمجھ لے۔ وہ ہمارے لیے اتنے قابلِ نفرت ہو چکے ہیں کہ ہمیں ان کے لیے ایک آنسو بھی بہانا گوارا نہیں ہے۔"

بولتے بولتے عالیہ کی آواز بندھنے لگی۔ آج پورے تین دن بعد انہوں نے اپنے لب کھولے تھے اور اپنے اندر کی ہر بات کہہ ڈالی تھی۔ اسد اللہ نے ان کے اندرونی کرب کو پوری شدت سے محسوس کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کے ہاتھ کا لمس پا کر عالیہ اور بھی زیادہ شدت سے رو پڑیں اور اتنے دنوں کا روکا ہوا سہل آب بہہ نکلا۔ اسد اللہ پوری ہمدردی اور خلوص سے انہیں دلا سادیتے رہے۔ اس جذباتی منظر پر جولیٹ کی اپنی آنکھیں بھی جھلجھلا گئیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور ان دونوں کو پانی پیش کیا۔ پانی پی کر دونوں کے جذبات قابو میں آنے لگے۔

”اللہ آپ کو جزا دے بیٹی! آپ نے ان مشکل حالات میں ہماری بیٹی ہونے کا حق خوب ادا کیا۔ ہم نے آپ کے سلسلے میں بھی بھائی جان سے مشاورت کی تھی۔ ابا جان ہوتے تو فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہوتا لیکن بھائی جان نے سب کچھ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم کس انداز سے آپ کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے حعارف کرواتے ہیں۔ فی الحال حویلی کی فضا سوگوار ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی کا اعلان ان حالات میں کریں۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ ابا جان کے چہلم کے بعد باقاعدہ ایک تقریب منعقد کر کے آپ کی حیثیت کا اعلان کریں گے۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر ایک اور اہم اعلان کر دیا جائے لیکن اس کے لیے آپ کی اجازت درکار ہوگی۔“ اسد اللہ کی مخاطب اب جولیٹ تھی جس نے ان کی آخری بات پر نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

”ہم اور بھائی جان دونوں ہی سمجھتے ہیں کہ آپ کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے آپ کو کسی کے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ بھائی جان نے پورے خلوص سے ہم سے کہا کہ اگر ان کے چھوٹے صاحب زادے محب اللہ حویلی میں موجود ہوتے تو وہ بخوشی آپ کو اپنی بہو بنا لیتے۔ محب اللہ ہماری بھی اولین ترجیح ہوتے لیکن ان کی غیر موجودگی میں ہم آصف خان کے رشتے پر غور کرنے پر مجبور ہیں۔ آصف خان ہمارے عزیز دوست کے بیٹے ہیں اور ہمارے لیے اپنے سگے بھتیجوں جیسے ہی ہیں۔ آپ کی آصف خان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تقریب کے انعقاد سے قبل آپ ان کے رشتے پر غور کر کے کوئی فیصلہ کر لیں تو ہمیں بھی آسانی رہے اور ہم بھی اسی حساب سے انتظامات کر سکیں۔“

وہ اتنا کچھ طے کر چکے تھے اور جولیٹ اپنی جگہ سشدرد کھڑی تھی۔ وہ یہ سب سوچ کر یہاں کب آئی تھی۔ وہ تو اسد اللہ کا احتساب کرنے آئی تھی اور یہاں سے جا کر اسے دلدار آغا سے اپنا حساب کتاب چکاتا تھا لیکن اب سب کچھ بدلنے لگا تھا۔ انتقام کے سرخ شعلوں کی جگہ سنہری خواب دل میں جگہ بنانے کو بے چین تھے۔ اسے آصف خان سے ہونے والی اپنی گفتگو یاد تھی۔ وہ دل سے اسے اپنانے کا خواہش مند تھا اور اس نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ جولیٹ کے دل میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ وہ ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے کا اشارہ بھی دے چکا تھا تو کیا وہ آصف خان کا ساتھ قبول کر لے؟ اس کے دل نے اس سے چپکے سے سوال کیا تو ایک دوسرا سوال خود بخود ذہن میں چلا آیا۔ بھلا یہ محب اللہ کون ہے اور کہاں ہے؟ جو اس کے لیے اس کے باپ کی پہلی ترجیح ہوتا؟ اس نے اس بارے میں اسد اللہ سے استفسار بھی کر ڈالا۔

”یہ محب اللہ کہاں ہوتے ہیں پاپا! ہم نے تو کبھی یہاں ان کا ذکر تک نہیں سنا۔“

”یہ بھی اس حویلی کی الناک داستانوں میں سے ایک ہے۔ ہم پھر کبھی فرصت میں آپ کو اس بارے میں بتائیں گے۔ ابھی اجازت دیجیے۔ کچھ احباب کو ملاقات کے لیے آنا تھا اور ہم صرف عالیہ سے گفتگو کی مہلت لے کر یہاں آئے تھے۔“ اسد اللہ نے اسے جواب دیا اور خود وہاں سے رخصت ہو گئے۔ پیچھے جولیٹ کے ذہن میں ابھرنی سی رہ گئی۔

☆☆☆

ربن تھانے سے باہر نکلا تو بے حد شکر تھا۔ اس کی پریشانی کا سبب ڈی ایس پی راشور تھا۔ اس کا اب تک جتنے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا، راشور اسے ان سب سے زیادہ خطرناک اور عیار محسوس ہوا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس نے اپنی اس خطرناک اور عیار شخصیت کو نرمی اور تہذیب کی آڑ میں چھپا لیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ بھیڑی کھال میں بھیڑیا تھا اور ربن کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ جب وار کرتے ہیں تو سامنے والے کو اس وقت تک پتا ہی نہیں چل پاتا جب تک وہ شکار نہیں ہو جاتے۔ وہ اپنے سے زیادہ فاروق کے لیے تشویش میں مبتلا تھا۔ اگر وہ راشور کے مطالبات تسلیم نہیں کرتا تو راشور اسے بھلا کے قتل کے کیس میں پھنسا دیتا لیکن راشور نے جو مطالبات کیے تھے انہیں تسلیم کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ٹھیک ہے، وہ ایک دادا تھا اور اس نے زندگی چاقو کے

زور پر ہی گزاری تھی لیکن وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے چاقو نے بھی کسی بے گناہ اور معصوم شخص کے خون کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ وہ ان ہی لوگوں کے خلاف اپنا چاقو استعمال کرتا تھا جو خود کسی نہ کسی جرم میں ملوث ہوتے تھے اور قتل و غارت گری کی نوبت تو بہت کم ہی آپاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے خود ہی کچھ اصول وضع کر رکھے تھے اور ان پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اس کے اصولوں میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی کہ وہ راضی ہو کر کہنے پر کسی مسلمان لیڈر کو بلا و قتل کر ڈالے اور نتیجے میں مسلمانوں کے مشتعل ہو جانے کے باعث ہندوستان کے بگڑتے ہوئے حالات کو مزید خراب ہوتا دیکھتا۔ پھر مسلم آبادیوں پر بلوے کا مطالبہ تھا جو اس کے لیے قطعی ناقابل قبول تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو، وہ کسی بھی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے نہتے اور بے قصور افراد کو نشانہ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”چاچا جی.....!“ تھانے سے نکل کر کسی سواری میں بیٹھنے کے بجائے وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا بیٹھا چلا جا رہا تھا کہ ایک موٹر گاڑی اس کے قریب آ کر رکی اور اندر سے کسی نے اسے پکارا۔ پکار پر وہ متوجہ ہوا تو دیکھا پکارنے والی ٹھنڈا ہے۔ وہی کم سن اور کھلنڈری سی لڑکی جو فاروق کی پیاری کے دنوں میں اسے شملہ چھوڑنے کے لیے چاتے وقت ریل گاڑی میں ملی تھی۔ اسے ماجد علی نامی ایک شخص دھوکے سے ورغلا کر گھر سے بھاگ کر لے جا رہا تھا۔ ربن کی نگاہوں نے ماجد علی کی اصلیت کو پہچان کر ٹھنڈا کو اس کے پنجوں سے نکالا اور باعزت طور پر اسے اس کے باپ سیٹھ انوپم اگر وال کے حوالے کیا۔ اس کے اس احسان پر ٹھنڈا اور اس کا باپ دونوں ہی اس کے بے حد شکر گزار تھے اور انہوں نے اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ بھئی واپس آنے کے بعد وہ ان سے رابطہ ضرور کرے لیکن اپنے جھیلوں میں الجھے ربن کو فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ ملاقات کے لیے جاپا تا بس ایک بار منو اور اکبر کی ضمانت کے لیے سیٹھ انوپم اگر وال کو زحمت دی تھی اور اب سربراہ ان لوگوں سے ملاقات ہو رہی تھی۔ ربن نے دیکھ لیا تھا کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر خود انوپم اگر وال موجود ہے۔

”نمسکار چاچا جی! ایسے اکیلے پیدل کدھر جا رہے ہیں؟“ ٹھنڈا پھرئی سے دروازہ کھول کر نیچے اتری اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ربن کو نمسکار کیا۔

”جیتی رہ بیٹا! کیسی ہے تو اور سیٹھ آپ کیسے ہو؟“ ربن نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے

دونوں باپ بیٹی کو باری باری مخاطب کیا۔ بیٹی کے پیچھے انوپم اگر وال خود بھی گاڑی سے اتر کر آ گیا تھا اور مسکراتا ہوا ربن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں چاچا جی اور آپ کو ابھی کے ابھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔“ ٹھنڈا نے جواب دینے میں تیزی دکھائی اور مضبوطی سے ربن کا بازو پکڑ لیا۔

”ارے..... ارے بیٹا! یہ کیا کرتی ہو۔ ابھی اپن کو جانے دو۔ اپن کسی اور سے فرصت سے تیرے کئے آئیں گے۔“ ربن نے پہلو بچانے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ اتنی بڑی مشکل میں گھرا ہوا تھا اور اپنے دست راست رامو سے مشورہ کر کے نجات کی کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بھلا ٹھنڈا کی دعوت قبول کرنے کا کہاں موقع تھا۔

”سے ہی تو نہیں ہے چاچا جی۔ آج آپ نہ بھی ملتے تو میں نے ڈیڑی سے کہہ دیا تھا کہ آج ہر حال میں چاچا جی اور فاروق بھیا کو کھانے پر بلواتا ہے۔ آپ موٹر میں بیٹھیں، فاروق بھیا کو بھی ہم راستے سے لے لیں گے۔“ ٹھنڈا اپنے اصرار پر قائم رہی۔

”آخر ایسا کیا ہے کہ تو آج ہی ہمیں اپنے ہاں بلانے کو اتاؤ لی ہو رہی ہے اور تھوڑا انتظار نہیں کر سکتی۔“ ربن نے گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اس سے دریافت کیا۔

”میں بتاتا ہوں مسٹر رب! تو اڑ کہ ٹھنڈا کے اتاؤ لے پن کا کارن کیا ہے۔ ایسا ہے کہ ٹھنڈا پڑھنے کے لیے لندن جانا چاہتی ہے۔ اکیلی لڑکی کو بھیجنا اپنے کو ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس کی ماں سے بولا کہ تو بھی بیٹی کے ساتھ ہی چلی جا۔ اپن خود بھی ان دونوں کو چھوڑنے اور ادھر بیٹل کروانے کے لیے ساتھ جائے گا پھر بعد میں واپس آ کر ادھر سے اپنا بزنس وائسٹاپ کر کے خود بھی لندن شفٹ ہو جائے گا۔ ہندوستان ویسے بھی اب رہنے کی جگہ نہیں رہا ہے۔“ اس بار سیٹھ انوپم اگر وال نے گفتگو میں مداخلت کی اور ٹھنڈا کے اس قدر اصرار کی وجہ بتائی۔ وجہ سن کر ربن کے کان کھڑے ہو گئے اور فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک امکان روشن ہو گیا۔ اس امکان نے اسے ٹھنڈا کی دعوت قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ مزید مزاحمت کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”فاروق بھیا کدھر ہیں چاچا جی؟ آپ ان کا پتا بتائیں تو ہم انہیں بھی راستے سے لے لیں گے۔“ انوپم اگر وال نے گاڑی آگے بڑھائی تو ٹھنڈا نے ربن سے دوسرا مطالبہ کیا۔

ہم وہاں تنہا رہیں۔“

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری اچھا۔“ سیٹھ مسکرا کر بیٹی سے بولا اور پھر ربین سے مخاطب ہوا۔ ”اب آپ بولو کہ فاروق کو کدھر سے بلوانا ہے۔ ہم لوگ کونٹھی کے قریب پہنچ چکے ہیں، وہاں سے ڈرائیور کو فاروق کو بلوانے کے لیے بھیج دیں گے۔“

”شکر یہ سیٹھ! آپ جو کچھ کر رہے ہو وہ اپنے اوپر آپ کا احسان رہے گا اور جلدی (زندگی) نے موقع دیا تو اپن اس احسان کا بدلہ بھی چکا دے گا۔“ ربین سچ سچ اس کا شکر گزار تھا اور ہرگز یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ سیٹھ خود پر کیے گئے احسان کا بدلہ چکا رہا ہے۔ اس احسان کو کر کے تو وہ خود فراموش کر چکا تھا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور اختر کی اموات کو تھوڑے دن گزر چلے تھے۔ حویلی کی فضا میں اب بھی غم کے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن اب یہ بادل اتنے گہرے نہیں رہے تھے اور آہستہ آہستہ افراد خانہ زندگی کے معمولات میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد میں بھی بتدریج کمی آتی جا رہی تھی البتہ ندرت جہاں کی حالت ٹھیک نہیں تھی اس عمر میں اکلوتے بیٹے کی جدائی کے غم نے انہیں بالکل بستر سے لگا دیا تھا۔ افراد خانہ علاج اور دلجوئی کی اپنی سی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن بڑھاپا اور جدائی کا غم دونوں امراض لا علاج تھے۔ عشرت جہاں بھی باں کی حالت کے پیش نظر اپنے سسرال واپس نہیں گئی تھیں اور بچوں سمیت چہلم تک نہیں رکنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ موقع ایسا تھا کہ ان کے سخت گیر سسرالیوں اور نخریلے میاں کو بھی مروت سے کام لیتے ہوئے انہیں رکنے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ ان دونوں اموات کے اہم ترین متاثرین میں نواب زادی عالیہ بھی شامل تھیں لیکن وہ چپ کی بکلی مارے بیٹھی تھیں اور کوئی چاہتا بھی تو ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا کہ ان کی طرف سے کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ صرف جو لیٹ تھی جو ان کی خاموشی کے باوجود ان کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار لیتی تھی۔ وہی تھی جو ان کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ عالم جنون اور طیش میں اپنے ہاتھوں ہو جانے والے اختر کے قتل پر اگرچہ وہ ناوم نہیں تھیں لیکن ایک عام انسان پر اپنے ہاتھوں چلی جانے والی

”اے بعد کو بلوالیں گے۔ ابھی اپنے کو تیرے پتا سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ربین نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور ہمد تن گوش ہو جانے والے سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اپن اس وقت بڑی مشکل میں ہے سیٹھ اور آپ کے لندن جانے میں اپنے کو اپنی مشکل کا حل نظر آ رہا ہے اسی لیے اپن آپ کی موٹر میں بیٹھ گئے ہیں۔ پر زور زبردستی کوئی نہیں ہے۔ آپ کا من بولے تو اپنی بات ماننا۔ نہ بھی مانے تو اپنے کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ایسا کیا ہے مسٹر رب نواز! آپ بولو اپنے سے جو بین پڑا اپن ضرور کرے گا۔“ سیٹھ کی توجہ گاڑی چلانے پر تھی۔ اس کے باوجود وہ ربین کی بات بھی توجہ سے سن رہا تھا۔ ربین نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے کل حالات اختصار سے کہہ سنائے اور آخر میں بولا۔

”فاروق لندن جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اپنے کو خطرہ ہے کہ پولیس راہ میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ اے اگر آپ کی ٹیلی کا ساتھ مل جائے تو وہ آسانی سے نکل جائے گا۔ باقی بعد کو اپن ادھر کے حالات سے خود نمٹ لیں گے۔“ اس کی خواہش جان کر انویم اگر دال ایک لمبے وقفے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ شکستہ بھی سانس روکے بیٹھی رہی کہ اتنے لمبے حالات میں وہ اپنے باپ کو کوئی مشورہ دینے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ آخر سیٹھ نے خود ہی سکوت توڑا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اپن فاروق کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اپن تمہاری بات نہیں ٹال سکتے۔ اپنے کو دشا اس ہے کہ تم نے جو کچھ بتایا بالکل سچ ہے۔ اپن خود بھی ہندوستان کے حالات دیکھ رہا ہے جب ہی تو بولا تھا کہ ہندوستان اب رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ اب یہی دیکھو کہ پولیس کا کام جتنا کو پروٹیکشن دیتا ہے اور ادھر پولیس ہی بلوے کروانا چاہتی ہے۔ اپن ہندوستان کے بھوارے کے خلاف ہے، پر ایسا ظلم کرنے کو بھی ٹھیک نہیں بول سکتا۔“ سیٹھ کے فیصلے نے گاڑی میں چھا جانے والے بوجھل پن کو ختم کر دیا اور سب سے پہلے شکستہ چکی۔

”تھینک یو ڈیڈی! آپ نے میرے من کی بات مان لی۔ فاروق بھیا کتنے نائس آدمی ہیں، اس کی مجھے اچھی طرح خبر ہے۔ کسی کامرڈر تو دور کی بات، وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم لندن میں بھی انہیں اپنے ساتھ ہی رکھیں گے تاکہ آپ کے واپس ہندوستان آنے کے بعد بھی

جنوری 2017ء

98

سپنس ڈائجسٹ

انسانی جان کا جو بوجھ ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ تھا۔ جولیٹ کو اندازہ نہیں تھا کہ عالیہ پر یہ بوجھ کس طرح اثر انداز ہوگا البتہ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ ہڈ پانی کیفیت کا شکار نہیں ہیں چنانچہ اس بات کا اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کے سامنے سچائی کا اظہار کر دیں گی۔

صافی اللہ اور اسد اللہ دونوں نے مشترکہ فیصلہ کیا تھا کہ اس بات کو ہمیشہ راز میں رکھتا ہے کہ اختر کی موت عالیہ کے ہاتھوں ہوئی ہے اور جولیٹ کو بھی اس سلسلے میں سختی سے تاکید کر دی گئی تھی۔ جولیٹ پہلے ہی ایک مرد کی ہوسناکی کا شکار ہو چکی تھی چنانچہ اختر کی صورت سامنے آنے والے ویسے ہی دوسرے مرد کے انجام پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ عشرت جہاں کی طرف سے ملنے والے کافرہ کے طعنے کے بعد سے وہ کسی اور ہی فکر میں تھی اور اپنی اصل کی تلاش میں آج کل مذہب اسلام کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس مطالعے سے ہی اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اختر جیسے عزت کے لٹیروں کے لیے مذہب اسلام نے سنگساری جیسی سخت سزا تجویز کی ہے۔ اس حساب سے اسے پھر بھی ہلکی سی سزا ملنی تھی۔ اس کا جو کردار سامنے آیا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ جو شخص حویلی کے قواعد و ضوابط والی زندگی میں ایسی آوارگی کا مظاہرہ کر گیا تھا، وہ لیڈن کی آزاد فضاؤں میں تو نہ جانے کیا کیا گل کھلاتا رہا ہوگا۔ ایسے شخص کے انجام پر جولیٹ اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کر رہی تھی اور بلوری یکسوئی سے مذہب اسلام کے مطالعے میں مصروف تھی۔ مطالعے کے علاوہ اسے دوسرا کام آصف خان کے رشتے کے بارے میں غور کرنے کا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے باپ کی بات مان کر یہ رشتہ قبول کر لے اور سب عورتوں کی طرح سکون سے گھر گرہستی کرے لیکن دوسری طرف اسے لگتا تھا کہ اس کے لیے یہ سب ممکن نہیں ہے۔ دلدار آغا کو اس کے انجام تک پہنچائے بغیر وہ سکون سے رہ ہی نہیں سکتی تو گھر بسانے کا کیا سوال.....؟

اس وقت بھی وہ ایک کتاب سامنے رکھے لائبریری میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن کتاب سے زیادہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اسے بھائی نہیں دے رہا تھا کہ اگر وہ انتقام کی راہ پر چلنا چاہے تو اس کے لیے کیا تدبیر اختیار کرے۔ پہلے ہی بات اور بھی، وہ بمبئی میں بالکل آزادانہ زندگی گزار رہی تھی چنانچہ آغا تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پیر بھی مارتی رہی تھی لیکن اب اسد اللہ کی بیٹی کی

حیثیت سے وہ اتنی آزاد نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اب اسد اللہ اسے بمبئی واپس جانے اور پہلے کی طرح تنہا زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسے اپنا آپ ان دیکھی بندشوں میں جکڑا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اور کوئی تدبیر بھائی نہیں دیتی تھی کہ ان بندشوں سے خود کو آزاد کروا سکے۔ بات زور زبردستی کی ہوتی تو وہ اپنی فطری بے باکی اور خود اعتمادی کے سہارے اڑان بھر جاتی لیکن یہاں معاملہ محبت کا تھا۔ اسد اللہ نے اسے اپنی شفقت اور محبت کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا اور وہ خود میں ہمت نہیں پار رہی تھی کہ برسوں تنہائی اور نارسائی کا دکھ سہنے والے اپنے باپ کو کوئی دکھ دے سکے۔ وہ نفرت و محبت کی کشمکش میں پھنس گئی تھی اور ہر وقت الجھن کا شکار رہنے لگی تھی۔ اب بھی وہ کتاب سامنے رکھے الجھن ہوئی بیٹھی تھی کہ دسک کی آواز کے ساتھ کتب خانے کا دروازہ کھلا اور اسد اللہ اندر داخل ہوئے۔

”آداب!“ آواز پر توجہ ہونے والی جولیٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”جیتی رہے۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ اسد اللہ نے شفقت سے جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ جولیٹ نے اختصار سے جواب دیا۔

”ابا جان کی رحلت کے بعد سے مصروفیات کا سلسلہ اتنا دراز ہو گیا ہے کہ ہم چاہتے ہوئے بھی آپ سے ملاقات کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ بھائی جان کی بھی بہت سی ذمے داریاں ہمیں ہی انجام دینی ہوتی ہیں۔ وہ پہلے ہی اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ذمے داریوں کا زیادہ بوجھ ان کی ذات پر رہے۔ یوں تو حبیب اللہ بھی بساط بھر کوشش کرتے ہیں لیکن ابھی وہ نا تجربہ کار ہیں اس لیے انہیں بھی ایک حد سے زیادہ ذمے داریاں نہیں سونپی جاسکتیں۔“ جولیٹ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے معذرت نواہانہ لہجے میں اس سے کہا تو اس نے غور کیا کہ وہ بہت تھکے ہوئے اور شکستہ نظر آرہے ہیں حالانکہ لباس اور دیگر معاملات میں آج بھی وہی نفاست اور رک رکھ رکھاؤ تھا جو اول روز سے دیکھتی چلی آرہی تھی۔

”مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے اس لیے دل میں آپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے انہیں تسلی کروائی۔

”جیتی رہے۔ آپ کی صورت اللہ نے ہماری عمر بھر کی محرومیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ آپ کو دیکھتے ہیں تو

ہمارے دل میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے اور حقیقی طور پر احساس ہوتا ہے کہ اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اپنی یہ سرشاری ہمیں بھائی جان کے دکھ کا اور بھی زیادہ شدت سے احساس دلاتی ہے۔ کہنے کو وہ حبیب اللہ اور عافیہ کی خوشیاں دیکھ رہے ہیں اور انہیں پوتے پوتی اور نواسہ نواسی کی صورت ڈھیروں نعمتیں ملی ہوئی ہیں لیکن وہ جوان کے دل کا ایک گوشہ ان سے الگ ہو گیا ہے، اس کا دکھ اتنا بھاری ہے کہ خوشی میں بھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ایسے میں ابا جان کی جدائی کا غم سہنا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس لیے ہم زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”اسد اللہ کی اس بات نے اسے ابھمن میں ڈال دیا۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی انہوں نے آصف خان کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اس سے صنی اللہ کے چھوٹے بیٹے حبیب اللہ کا ذکر کیا تھا لیکن واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب دوبارہ اسی طرح کا ذکر چھڑا تو اس کی ابھمن سوال بن کر لیوں پر چلی آئی۔

”آپ نے بھی بتایا نہیں کہ بڑے ابا کو کیا دکھ ہے؟ کیا ان کے چھوٹے صاحب زادے کی ڈچھ.....“

”اللہ نہ کرے بیٹی! ہمارے حب اللہ زندہ ہیں۔ بے شک وہ ہم سب کی نگاہوں سے دور چلے گئے ہیں لیکن اس بات کا ہم سب کو یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں، بخیریت اور زندہ سلامت ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور وہ ہمارے دلوں کی ٹھنڈک لوٹانے کے لیے واپس ہمارے پاس آجائیں۔“ اسد اللہ نے اسے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور تڑپ کر اس کی بات کا ٹ ڈالی۔

”سوری! مجھے غلط نہیں ہو گئی تھی۔ اچھولی کسی نے ان کے بارے میں کچھ بتایا نہیں اور کچھ عجیب سی باتیں سامنے آئیں تو مجھے شک ہوا کہ.....“ اس بار جو لیٹ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ کی غلطی نہیں ہے۔ ادھوری اور مبہم باتوں سے کوئی بھی شخص غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اصل میں حب اللہ کی ذات سے ایک اتنا تکلیف دہ واقعہ جڑا ہوا ہے کہ ہم سب شرمندگی کے باعث ان کا ذکر ہی نہیں کر پاتے۔ دوسرے بھائی جان کی بھی یہی خواہش ہے کہ بار بار حب اللہ کا ذکر کر کے ان کے زخم کو نہ کریدا جائے اس لیے سب نے اس موضوع پر اپنے لب سی لیے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تصویریں بھی چھپا دی گئی ہیں، اسی لیے حویلی میں قیام کے باوجود آپ اب تک ان سے ناواقف تھیں۔“

”آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ حب اللہ اس حویلی کا فرد ہوتے ہوئے بھی یہاں سے الگ ہو گئے؟“ اسد اللہ کے الفاظ اور یاسیت زدہ لہجے نے جو لیٹ کے تجسس کو مزید ہوا دی۔

”یہ جن دنوں کا قصہ ہے ان دنوں ہم انگلیٹھ گئے ہوئے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی ہمارا وہاں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا اور قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس بار ہمارے پیچھے اتنا بڑا سانحہ پیش آجائے گا۔ ان دنوں حب اللہ بھی کوئی پندرہ سولہ سال کے تھے اور اپنی عمر کے اعتبار سے بے حد جذباتی اور جوشیلے بھی۔ مصلحت پسندی اور دروغ گوئی جیسی باتوں سے وہ گویا آشنای نہیں تھے۔ شاید یہاں ملازماؤں یا حویلی کے کسی فرد کے ذریعے ہی آپ کے علم میں آیا ہو کہ پچھپی بیگم ملازماؤں کو ان کی غلطیوں پر عجیب و غریب سزائیں دینے کی عادی ہیں۔ حویلی میں ایک نو عمر آسیہ نامی ملازمہ ہوا کرتی تھی۔ اسے پچھپی بیگم نے خاص اپنی خدمت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور وہ دن رات کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں گزارتی تھی۔ ایک روز پچھپی بیگم نے اپنے زیورات اگلوانے کے لیے نکالے اور خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئیں لیکن انہیں لگا کہ ہونہ ہو، ان زیورات کو آسیہ نے چرالیا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی ثبوت کے اس بے چاری پر الزام لگا کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے زیورات واپس کرے۔ زیورات اس کے پاس تھے ہی نہیں تو وہ واپس کیسے کرتی۔ رو رو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہی لیکن پچھپی بیگم کو اس پر رحم نہ آیا اور انہوں نے حکم دیا کہ آسیہ کو رسی سے باندھ کر اس وقت تک کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا جائے جب تک وہ سچ نہ اگل دے۔ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ کنوئیں میں لٹکی آسیہ وہاں سے بھی رو رو کر دہائیاں دیتی رہی لیکن ہمیں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے کہ پچھپی جان ایک نہایت سنگ دل خاتون واقع ہوئی ہیں اور ہم نے کبھی انہیں کسی پر رحم کھاتے نہیں دیکھا۔ آسیہ کی دہائیوں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب معلوم نہیں کہ رسی کمزور تھی یا آسیہ کو شیک سے باندھا نہیں گیا تھا کہ وہ بے چاری کئی فٹ گہرے کنوئیں میں جا گری۔ جب تک اسے کنوئیں سے نکالنے کی تدبیر کی جاتی۔ وہ اپنی جان سے چلی گئی۔ ادھر پچھپی جان کے کمرے میں ان کے زیورات کی تلاش میں مصروف اکا بیگم کو ان ہی کے کمرے کے ایک طاقے میں رکھے ہوئے زیورات مل گئے۔ پچھپی بیگم نے الزام لگایا کہ زیورات آسیہ نے ہی وہاں چھپائے تھے لیکن سب سمجھتے ہیں کہ یہ درست نہیں تھا۔ بہر حال آسیہ

جائے۔ بس اسی لیے آپ نے ان کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سنا۔ ہمارے یادگاری المیہ میں محب اللہ کی ایک بہت خوب صورت تصویر ہے۔ کسی دن ہم آپ کو وہ تصویر دکھائیں گے۔“

پوری داستان سنانے کے بعد اسد اللہ نے اس سے کہا تو اس کی آنکھوں میں چم سے اس لڑکے کی تصویر اتر آئی جس کے لیے اس نے شائستگی محسوس کی تھی۔ وہ اس تصویر کو بھی دیکھ رہی تھی جب آخر کی آفت ناگہانی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا اور بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جو لیٹ کے ذہن سے وہ تصویر ہی محو ہوگئی لیکن اب اسے پوری جزئیات کے ساتھ وہ تصویر یاد آگئی تھی اور ساتھ ہی ذہن میں ایک درجہ بھی روشن ہوا تھا۔ بے اختیار ہی اسے وہ دو گہری بھونرا سی آنکھیں یاد آگئی تھیں جو ہر دم اس کی راہ میں بچھی رہتی تھیں لیکن اس نے تو کبھی اسے درخور احتیاط نہ سمجھا تھا۔

”تو کیا وہ..... جسے میں بڑی حقارت سے ٹھکراتی رہی تھی، محب اللہ تھا۔ اس حویلی کے وارثوں میں سے ایک.....؟“ اس کے ذہن میں سوال جاگا اور وہ بے اختیار ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر رہ گئی۔

”محب اللہ ہمیں خاندان کے سارے بچوں میں سب سے زیادہ پیارے تھے۔ وہ تھے ہی ایسے دل موہ لینے والی شکل و صورت اور عادات کے مالک کہ کوئی بھی انہیں پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہانت میں بھی وہ سب بچوں سے آگے تھے۔ جو ذہین بھی ہمیشہ محب اللہ کی بہت تعریف کرتی تھیں اور سب کا یہی خیال تھا کہ وہ تعلیمی میدان میں بہت آگے تک جائیں گے لیکن افسوس کہ وہ جوش و جذبات میں حویلی ہی چھوڑ گئے۔ ابا جان نے اپنی بزرگی کے رعب میں شاید انہیں چند سخت جملے کہہ دیے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ پچھپی بیگم نے بھی طنز کے تیر چلائے تھے کہ حویلی سے نکل کر محب اللہ کو کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی اور وہ منہ کی کھا کر خود ہی واپس آ جائیں گے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ان ہی ساری باتوں نے انہیں بھی واپس نہیں آنے دیا ورنہ حویلی کی طرف آنے والے راستے انہیں بھولے تو نہیں ہوں گے۔ وہ کم سن تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاتے، بس انہوں نے کبھی واپس لوٹنا نہیں چاہا اور جو خود سے گم ہو جائے اسے کوئی کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔ پھر بھی ہم جب بھی حیدرآباد سے باہر نکلتے ہیں ہماری نگاہیں ہر سو بھٹکتی رہتی

کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے زمان خانے میں ہی دبا دیا جاتا۔ اس کا باپ جو حویلی ہی کا ملازم تھا، ابا جان کے سامنے دہائیاں دینے لگا کہ اس کی بن ماں کی بیٹی آپا بیگم کے ظلم کا شکار ہوگئی ہے۔ ابا جان کے لیے وہ بہت نازک وقت تھا۔ وہ غیر منصف نہیں تھے لیکن حویلی کی عزت اور بہن کی محبت کی خاطر انہیں مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے آسیہ کے باپ کے سامنے پچھپی بیگم کے موقف کی تائید کی اور اسے یہ باور کروایا کہ اس کی بیٹی اپنی ہی غلطی کے باعث انجام کو پہنچی ہے پھر بھی انہیں احساس ہے کہ اس کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے انہوں نے آسیہ کے باپ کو کثیر رقم قبول کرنے پر مجبور کیا ورنہ اس کے لیے دوسری صورت یہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ حویلی سے نکل جاتا اور جہاں چاہتا جا کر دہائی دیتا۔ آسیہ کا باپ حویلی والوں کی طاقت اور اختیار سے واقف تھا کہ ان کے سامنے اس غریب کی ہرگز بھی نہیں سنی جائے گی چنانچہ اس نے ابا جان کی پیشکش کو قبول کرنا منظور کر لیا۔ محب اللہ اپنی کم سنی کے باعث مردانے اور زنانے دونوں جگہ آزادانہ آتے جاتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے آسیہ کی چیخیں سنی تھیں اور پچھپی بیگم سے استدعا کی تھی کہ اگر وہ چور بھی ہے تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے لیکن پچھپی بیگم نے ان کی یہ استدعا قبول نہیں کی اور اسی اشنا میں آسیہ کنوئیں میں گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ محب اللہ کو اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ زیورات چوری نہیں ہوئے تھے بلکہ پچھپی بیگم خود ہی انہیں رکھ کر بھول گئی تھیں۔ بس وہ جوش میں آ گئے اور بپانگ دہلی پچھپی بیگم کو مجرم قرار دیتے ہوئے ابا جان کے سامنے بھی اڑ گئے کہ وہ اپنی بہن کی پشت پناہی نہ کریں۔ محب اللہ سب کی طرح ابا جان کو بھی بے حد عزیز تھے لیکن معاملہ حویلی کی عزت اور ساکھ کا تھا اس لیے انہوں نے محب اللہ کو سختی سے خاموش رہنے کا حکم سنا ڈالا۔ جوش و رنج میں مبتلا محب اللہ نے انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے ظلم کا ساتھ دیا تو وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ ابا جان اس دھمکی کو پوتے کی جذباتیت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے اور یہی خیال کیا کہ محب اللہ حویلی سے نکلے بھی تو چار چھ ٹھنڈے کہیں گزار کر واپس آ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس دن کے حویلی سے نکلے محب اللہ بھی واپس نہیں آئے۔ بعد میں انہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ نہیں ملے۔ دو تین سال بعد یہ کوششیں بھی ترک کر دی گئیں اور یہی فیصلہ ہوا کہ حویلی میں محب اللہ کا ذکر ترک کر دیا

ہیں کہ کہیں تو وہ نظر آجائیں گے لیکن برسوں سے مایوسی ہی ہمارا نصیب ہے۔ کاش کہ وہ یہاں ہوتے تو آپ کے لیے ہمارا انتخاب ان کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔“

اس کی حالت سے بے خبر اسد اللہ بولے جارہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ جسے حقیر جان کر ہمیشہ ٹھکرایا، وہ تو مجھ سے کہیں بڑھ کر عزت و مرتبہ کا مالک تھا لیکن اس نے کبھی جتایا نہیں اور اتنی خاموشی سے مجھ سے محبت کرتا رہا کہ کبھی اپنی زبان سے بھی اظہار نہیں کیا۔ اس کا دل چاہا کہ اسد اللہ کو بتا دے کہ آپ کا محب اللہ واقعی خیریت سے ہے اور میں آپ کو اس تک پہنچا سکتی ہوں لیکن پھر ایک خیال نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس نے سوچا کہ اگر محب اللہ حویلی پہنچ گئے تو وہ اپنے ساتھ میری بربادی کی داستان بھی لے کر آئیں گے اور میں جو اس حویلی کے کچھ لوگوں کے نزدیک ویسے ہی حقیر ہوں اور بھی کمتر سمجھی جانے لگوں گی۔ سب سے بڑھ کر میرے والد نواب اسد اللہ کو صدمہ ہوگا۔ انہوں نے اتنی مدت بعد کسی خوشی کی شکل دیکھی ہے۔ محب اللہ کے یہاں آنے سے ان کی خوشی روٹھ جائے گی۔

”کیا بات ہے بیٹی، آپ اچانک اتنی خاموش کیوں ہو گئیں؟“ اسد اللہ نے اسے سوچوں میں گم مسم پایا تو ٹوک بیٹھے۔

”نہیں، کچھ نہیں..... بس میں اس داستان کو سن کر اس ہو گئی تھی۔“ جو لیٹ نے بہانہ بنا کر اصل بات چھپائی لیکن اس کے اندر بڑی زور کی جنگ چھڑ گئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ حقیقت چھپا کر مجھ سے ایک جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔

☆☆☆

ربن، فاروق کو سیٹھ انوپم اگر وال کی کوشی میں منتقل کروانے کے بعد بہت ہلکا ہلکا ہو گیا تھا۔ اب اسے اطمینان سا تھا کہ فاروق بغیر کسی مشکل کے ہندوستان سے نکل جائے گا۔ سیٹھ اور اس کے گھروالے حقیقتاً ان کے بہت احسان مند تھے اور سیٹھ کی پتی نے بھی انہیں بہت عزت دی تھی۔ وہ سارا وقت ربن کو بھائی اور فاروق کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ کھانے پر بھی خاص اہتمام کروایا گیا تھا۔ شکنتلا سب سے زیادہ پرجوش تھی اور چمکتی پھر رہی تھی۔ ربن نے موقع دیکھ کر اسے فاروق پر خصوصی نظر رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ فاروق آغا کے خلاف جذبہ انتقام دل میں لے کر لندن جا رہا تھا اور ربن اس کے کسی نئی مصیبت میں جتلا ہونے کے خلاف تھا۔ بہر حال اس وقت تو اسے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ فاروق ہندوستان سے نکل جائے تو کم

از کم یہاں کے پیچیدہ حالات سے اس کی جان چھوٹ جائے گی اسی لیے وہ خاصا مطمئن تھا۔ اسے بے فکری ہو گئی تھی کہ اب اسے دباؤ میں رہ کر ڈی ایس پی راٹھور کے گھناؤنے مطالبات تسلیم نہیں کرنے پڑیں گے اور وہ اسے صاف انکار کر سکے گا۔ اس نے اکبر کو بھی فاروق کے ساتھ لندن بھجوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ نا تجربہ کار لڑکا تھا لیکن فاروق سے شدید محبت کرتا تھا اس لیے امید تھی کہ وہ کسی مصیبت میں فاروق کا بھرپور ساتھ دے گا۔ اکبر کے انتخاب کی دوسری وجہ اس کا ڈے سے متعلق نہ ہونا بھی تھا۔ ڈے کے لوگوں کو پولیس والے پہچانتے تھے اس لیے اگر وہ ان میں سے کسی کو فاروق کا ہمسفر بنانے کی کوشش کرتا تو اس کے نظر میں آنے کا ڈر تھا۔

سیٹھ اگر وال کے ہاں سے لوٹتے ہی اس نے اکبر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا جس پر اکبر بہت خوش تھا۔ منو نے البتہ اس موقع پر اس سے واپسی کی اجازت طلب کی تھی۔ وہ بہت عرصے سے چندی گڑھ سے نکلا ہوا تھا اور اب اس کا واپس لوٹ جانا ہی مناسب تھا۔ ربن نے خوش دلی سے اسے واپسی کی اجازت دے دی اور اس رات سکون کی نیند سویا لیکن صبح اس کے لیے نئی پریشانی لے کر آئی۔ جس ٹھکانے پر انہوں نے وکرم کو رکھا تھا وہاں سے ایک بندہ گھبرایا ہوا آیا اور اطلاع دی کہ جو بندے رات وکرم کی لاش ٹھکانے لگانے نکلے تھے، وہ واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ یہ ایک تشویش ناک خبر تھی۔ ربن نے فوراً ہی اپنے آدمیوں کو دوڑایا کہ وہ احتیاط سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں مل سکی۔ لاش کے بارے میں البتہ معلوم ہوا کہ صبح کے قریب ایک کچرا گھر سے مل گئی تھی اور پولیس والے اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ لاش کا ملنا اور اسے ٹھکانے لگانے والوں کا غیاب ایک معما سا بن گیا۔ ربن کی پریشانی کے بل بڑھ گئے۔ ایسے میں اسے راٹھور کی طرف سے تھانے پہنچنے کا حکم ملا تو وہ وہاں چلا گیا۔ ملاقات پہلے والے کمرے میں ہی ہوئی اور پہلے ہی کی طرح راٹھور نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔

”پھر کیا سوچا دادا تم نے..... ہمارے لیے کام کرو گے یا نہیں؟“ پہلے ہی کی طرح اس نے کرسی پر آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ربن سے دوستانہ لہجے میں گفتگو چھیڑی لیکن ربن نے محسوس کیا کہ آج اس کی آنکھوں کی چمک پہلے سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

”جواب تو اپن آپ کوکل ہی دے دیے تھے کہ اپن

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت
جلد منظر عام پر آ رہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آ رہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

۱۸/۱۸ اس بات کے لیے کہ ہمیں یا اللہ سے مل سکے ہیں اور ایک بڑا رقص ہو کی ان چیزوں کی تائید میں جہاں کی

03225494228

abbasnadeem283@gmail.com

حزبِ مظلومات کے لئے رابطہ

اور خلیفہ اقبالؒ نے حضرت شیخہؒ کو شہداء کے ساتھ ہی دفن کیا اور ان کے لیے نماز پڑھائی۔

سلسلہ انچارج

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دویت، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گئیں ان کی کتاب میں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے پہلے ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ

منیاب: داستان دل ڈائجسٹ نم

خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ ربن کو ڈرا دھمکا کر اس سے اپنا کام نکلوا سکتا ہے۔

”کیوں دادا! یہ تمہارے ہی آدمی ہیں نا؟“ راٹھور نے اپنے سابقہ طنزیہ لہجے میں ربن سے دریافت کیا۔
”ہیں تو سہی، پر آپ لوگوں نے انہیں آدمی کہاں رہنے دیا ہے۔ مار مار کر بھرکس بنا دیا ہے سالوں کا۔“ ربن نے کہا تو راٹھور ہنس دیا پھر بولا۔

”کیا کرتے دادا! بہت موٹی چڑی ہے تمہارے پٹھوؤں کی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے پھر بھی بہت مشکل سے اپنا جرم مانے۔“

”ایسا کیا جرم کر ڈالا تھا ان غریبوں نے کہ سرکار کو اتنی زحمت کرنی پڑی۔“ ربن نے تجاہل سے کام لیا۔

”واہ..... تو دادا کو نہیں خبر کہ اس کے بندے شہر میں کیا کرتے پھرتے ہیں۔“ راٹھور نے پھر طنز کیا۔

”خبر رکھنے کو آپ جو ہو۔“ ربن کے اطمینان میں سر مو فرق نہیں آیا۔ یہی اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ مخالف حالات میں بھی جبکہ خود اس کے اپنے اندر ہلچل مچی ہو، وہ سامنے والے کو آسانی سے پکڑا لی نہیں دیتا تھا۔

”ہمیں تو خبر ہے ہی۔ ہم نے انہیں وکرم کی لاش کو کچرے میں پھینکتے ہوئے پکڑا تھا اور انہوں نے مانا ہے کہ یہ ایسا تمہارے حکم پر کر رہے تھے۔“ راٹھور کا انداز جتانے والا تھا۔

”ایسی چار چوٹ کی لگانے کے بعد آپ ان سے بولو گے کہ یہ جو دوسری جنگ عظیم چھڑی ہے، یہ ربن کے کہنے پر چھڑی ہے تو ان بے چاروں کو ماننا ہی پڑے گا۔“ ربن کے مزے سے دیے گئے جواب پر راٹھور تھلا گیا اور بولا۔

”تم کہنا چاہتے ہو کہ ہم تم پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں ورنہ تم دودھ کے دھلے ہو۔ پر یاد رکھو، انہوں نے اور بھی بہت کچھ اگلا ہے۔ پولیس تمہارے اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہے جہاں تم نے وکرم کو رکھا تھا۔ وہاں سے بھی بہت سے ثبوت مل جائیں گے۔“ راٹھور کی کارکردگی زبردست تھی۔

”اڈے کے سوا پورے بھینٹی میں کسی مکان کو ربن کا ٹھکانا ثابت کر سکو تو یہ آپ کا کارنامہ ہوگا۔ رہی ثبوتوں کی بات تو یہ تو آپ پر ہے کہ چاہو تو کہیں سے توپ بھی نکال ڈالو اور بولو کہ یہ ربن نے چھپائی تھی۔“ وہ بڑی کامیابی سے راٹھور سے نمٹ رہا تھا اور اس کا ثبوت راٹھور کے چہرے کے بگڑتے ہوئے تاثرات تھے لیکن بہر حال وہ بھی کچھ ایسا

بھاڑے کے قاتل نہیں ہیں جو کسی کے بھی کہنے پر نردوش لوگوں کو قتل کرتے پھریں۔ اپن اپنے طریقے سے کام کرتے ہیں۔“ ربن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج ڈی ایس پی کل سے بھی زیادہ پُر اعتماد ہے کہ ربن سے اپنے مطالبات تسلیم کروالے گا، اس کے باوجود اس نے اسے گھرا جواب دیا۔
قاروق کی طرف سے اطمینان کے بعد وہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

”واہ بھئی واہ! کیا بات ہے ربن دادا کی۔ اپنے طریقے سے جس کی چاہے جان لے لے، جسے چاہے عمر بھر کے لیے اپناج کر دے، جسے چاہے سڑک پر لے آئے لیکن ہم کہیں تو انکار کر دے۔“ راٹھور نے طنز بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ربن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور وہ اس کے ساتھ کوئی دلچسپ کھیل، کھیل رہا ہو۔

”آپ جیسا چاہے سمجھو۔ اپن آپ کو اپنا جواب بول دیے ہیں۔“ ربن رد عمل میں پرسکون ہی رہا۔ راٹھور بھی اس بار زبان سے کچھ نہیں بولا اور میز پر دھری گھنٹی کو ہاتھ بڑھا کر بچایا۔

”یس سرا“ گھنٹی کے جواب میں فوراً ہی ایک سپاہی جن کی طرح نازل ہوا۔

”خاص مہمانوں کو لے کر آؤ۔“ راٹھور نے حکم دیا تو سپاہی فوراً باہر نکل گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد ربن کو تھانے لانے والا اے ایس آئی ہتھکڑی لگے دو افراد کو اپنے ساتھ لیے وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ربن نے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ وہی دونوں تھے جنہیں وکرم کی لاش کہیں پھینکنے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی اور وہ واپس نہیں لوٹے تھے۔ یقیناً وہ پولیس کے ہتھے لگ گئے تھے۔ ربن نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے اور ان کی حالت اتنی ابتر ہے کہ وہ ڈھنگ سے کھڑے بھی نہیں ہو پا رہے ہیں۔ حقیقتاً اگر وہ ربن کے تربیت یافتہ نہیں ہوتے تو اس وقت کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ ربن جانتا تھا کہ اتنے تشدد کے بعد آدمی کے لیے اپنی زبان بند رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے اڈے سے وابستہ لوگ اگرچہ بہت مضبوط تھے لیکن تھے تو بہر حال انسان ہی اور انسان کا کیا بھروسا ہوتا ہے کہ کب ہار جائے۔ وہ دونوں بھی ہار گئے تھے اور اب ربن سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ ان دونوں کو یہاں دیکھ کر ربن کو راٹھور کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ راٹھور اس وقت اس

کم نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور اسے ایسے آئی کوربن کے دونوں ساتھیوں سمیت وہاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ذرا سا آگے کی طرف جھکا اور ربن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”بھائیہ سیٹھ کو میں نے بڑی مشکل سے لارے لیے دے کر روک رکھا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کا خون معاف کرنے کو تیار نہیں ہے اور کہتا ہے کہ بہت اوپر جا کر اس معاملے کو اٹھائے گا۔ سیٹھ کو کیسے روکنا ہے، یہ مجھے معلوم ہے لیکن شرط وہی ہے کہ تم بھی تو ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو۔“

”سیٹھ سے اپن نمٹ لے گا۔ کورٹ کچہری اپنے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ اپن کا وکیل بھی تجربے والا ہے۔“ ربن کسی دھمکی میں نہیں آنے والا تھا۔

”تم اور کانفیڈنس کا شکار ہو دادا۔ ہم نے تم سے کوئی ایسا کام نہیں بولا تھا۔ ادھر یہ سب کرنے والے بہت ہیں، بس میرا من بولا تھا کہ تم کو دوستی کا ایک چانس دوں پر تم نے اس چانس کو کھو دیا۔ اب تم جاؤ اور ہماری دشمنی کا انتظار کرو۔“ راٹھور کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے یکدم ہی گفتگو کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

”دشمن بہادر ہو اور سامنے سے وار کرنا جانتا ہو تو دشمن کا حزمہ آتا ہے۔ اپن دیکھتا ہے کہ آپ بہادروں کی طرح دشمنی نبھاتے ہو یا بزدلوں کی طرح پیچھے سے وار کرتے ہو۔“ ربن اس کے حکم پر فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن چیلنج کرنے والے انداز میں راٹھور سے یہ سب کہنا نہیں بھولا۔ وہاں سے نکلے ہوئے اسے یقین تھا کہ راٹھور کو سخت غصے اور جھنجھلاہٹ میں جتا کر کے نکلا ہے لیکن سچ یہ تھا کہ وہ خود بھی تشکر تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے بگڑتے ہوئے حالات کی طرح اسے اور اس کے ساتھیوں کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

☆☆☆

جولیت نے اپنے سامنے موجود تصویر کو بغور دیکھا۔ لبا قد، صاف رنگت، خوب صورت نقوش، سیاہ بال اور سیاہ ہی خود اعتمادی و ذہانت کی چمک لیے آنکھیں..... پہلے بھی اس نے یہ تصویر دیکھی تھی اور اس وقت بھی اس کے لیے شناسائی محسوس کی تھی اور جب آج دوبارہ دیکھ رہی تھی تو مکمل پہچان کا مرحلہ طے کر چکی تھی حالانکہ وہ اسے پہچانتا نہیں چاہتی تھی اور دل میں کہیں یہ خواہش تھی کہ یہ وہ نہ ہو جسے وہ شناخت کر چکی ہے لیکن یہ وہی تھا۔ بڑھتی عمر نے اس کے اندر کچھ تبدیلی تو کی تھی۔ قد مزید لبا ہو گیا تھا، دہلا پتلا جسم بھر

کر مضبوط کاٹھی میں تبدیل ہو گیا تھا اور رنگت میں ہلکی سی سنو لائٹ آگئی تھی جو یقیناً بھینگی کی سمندری ہوا اور زندگی کی سختیوں کی دین تھی لیکن باقی سب کچھ تو ویسا ہی تھا اور وہ کسی طرح انکار نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے اس تیرہ چودہ سالہ محب اللہ کو بھینگی کی گلیوں میں قاروق دادا یا قاروق استاد کے روپ میں دیکھا ہے۔ بات صرف اس شناخت کے اعتراف کی تھی اور وہ کشمکش میں تھی کہ کیا کرے..... یہاں آتے ہوئے وہ اس حویلی میں مستقل رہنے کا ارادہ کر کے نہیں آئی تھی لیکن اسد اللہ کی محبت نے اس کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ جوزفین اور اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسے قبول کر کے انہوں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے ساتھ ولدہ آغا والا حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو وہ ہمیشہ باپ کی شفقت کے سائے میں رہتا پسند کرتی۔ اسے آغا کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے یہاں سے جانا تھا لیکن دل کچھ عرصہ یہیں پڑاؤ ڈال لینے پر بعد تھا۔

وہ جو زندگی سے بالکل خالی ہو گئی تھی، ایک بار پھر زندگی کو محسوس کرنے لگی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ محب اللہ یہاں آیا تو وہ یہاں نہیں رہ سکے گی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی ہستی کے عیاں ہو جانے کے بعد بھی یہاں رہ سکے لیکن سچ چھپانے پر بھی وہ اپنے آپ سے ناراض تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس حویلی کے ٹکین برسوں سے محب اللہ کی راہ دیکھ رہے ہیں اور وہ ذرا سا سچ بول کر ان کی خوشیاں لوٹا سکتی ہے۔ وہ جس کا ذکر زبان سے نہیں کیا جاتا لیکن جو سب کے دلوں میں بستا ہے، اگر حویلی لوٹ آتا تو اس حویلی کی رونق ہی اور ہوتی لیکن وہ اپنے وقتی پڑاؤ کی خاطر اس حقیقت کا انکشاف کرنے سے ہچکچا رہی تھی کہ وہ محب اللہ کے ٹھکانے سے واقف ہے۔

”اگر یہاں والوں کو پتا چلا کہ اس نجیب الطرفین خاندان کا فرد ہوتے ہوئے محب اللہ بھینگی کے ایک اڈے پر بیٹھا دادا گیری کر رہا ہے تو انہیں بہت صدمہ ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ میں انہیں اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔“ اس کے دماغ نے بچاؤ کی ایک راہ بھائی۔

”میں نہیں بتاؤں گی تو وہ ہمیشہ اپنی اصل سے کٹ کر جیتا رہے گا اور یہاں والے اس کی یاد میں مر مر کر جیتے رہیں گے۔“ اس کے دل نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا تو وہ بے ساختہ ہی اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دل و دماغ کی اس کشمکش نے اسے نڈھال کر دیا تھا تب ہی آج وہ دوبارہ اسد اللہ اور جوزفین کی محبت کے گواہ اس کمرے میں آ بیٹھی تھی اور

دوبارہ اس البم کو دیکھ کر اپنے شکوک و شبہات کو کسی حتی نتیجے پر پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی اور نتیجہ وہی تھا جو وہ پہلے ہی جانتی تھی۔ محب اللہ اور فاروق ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، اسے خود سے یہ اعتراف کرنا پڑ رہا تھا اور اب کوئی الجھن باقی تھی تو صرف یہ کہ وہ اس حقیقت کا انکشاف کرے یا نہ کرے۔ اس الجھن کا شکار وہ اپنا سر تھامے بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سن کر چوکی۔

”کون؟“

”ہم ہیں اسد اللہ۔“

”پلیز اندر آ جائیں۔“ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”ہم آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ سروری نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں تو ہم یہیں چلے آئے۔“ اسد اللہ اسے بتا رہے تھے کہ ان کی نظر کھلے ہوئے البم پر پڑی۔

”یہ محب اللہ ہیں۔ ہمارے سب سے پیارے بچے۔“ انہوں نے گویا جولیٹ کا اس سے تعارف کروایا۔ جواب میں وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”آئیے، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میز کے ساتھ صرف ایک کرسی رکھی تھی اس لیے اسد اللہ نے مسمری کی طرف اشارہ کیا۔ اختر کی موت کے بعد بہت خاموشی سے اس کمرے کی صفائی کر دی گئی تھی اور خراب ہو جانے والے قالین کی جگہ دوسرا قالین ڈال دیا گیا تھا۔ جولیٹ ان کے کہنے پر مسمری پر آ بیٹھی لیکن البم اس کے ہاتھ میں تھا اور محب اللہ کی تصویر والا ورق کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ گم سمی تھی۔

”ہم آپ سے آصف خان کے رشتے کی بابت رائے لینا چاہتے تھے۔ آپ کی رائے ہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ آپ آصف خان سے مل چکی ہیں اس لیے ہمارے خیال میں آپ کو ان کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے زیادہ وقت درکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم آپ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر رہی چکے ہیں کہ ہم ابا جان کے چہلم کے بعد باقاعدہ ایک تقریب منعقد کر کے آپ سے اپنے رشتے کے اعلان کے علاوہ آپ کی نسبت ٹھہرنے کا اعلان بھی کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ کی رائے جاننے کے لیے جلدت میں جتلا ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس تقریب میں آصف خان کے والدین بھی شامل ہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ انہیں جلد از جلد اطلاع کر دی جائے۔ پشاور سے یہاں تک کا سفر طے کرنے کے لیے انہیں کچھ

مہلت درکار ہوگی۔“ اسد اللہ اپنی کہے جا رہے تھے اور وہ گم سمی محب اللہ کی تصویر پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔ وہ ان سے کیا کہتی کہ وہ ان چند دنوں میں اتنی الجھی ہوئی رہی تھی کہ آصف خان کے رشتے کے بارے میں سوچنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ اس کے رشتے پر غور کرنا تو دور کی بات وہ آج کل اس کا سامنا کرنے سے بھی گریز کر رہی تھی کہ اپنے اندر اس کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔

”کیا بات ہے جولیٹ! آپ ہماری بات توجہ سے نہیں سن رہیں، کسی پریشانی میں مبتلا ہیں؟“ اسد اللہ نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے اسے ٹوکا۔

”میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ وہ جیسے لمحوں میں کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور اپنے خیالات سے نکل کر صاف آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے، ہم سن رہے ہیں۔“ اسد اللہ ہمتن گوش ہوئے۔ ”میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں کہ محب اللہ کہاں ہیں۔“ اس کے الفاظ اسد اللہ کے لیے دھماکے کے مانند ثابت ہوئے۔

”کیا..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ شدت جذبات سے ان کی آواز لرز گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے انہیں بمبئی میں دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں انہیں بالکل صحیح شناخت کر رہی ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ سچ بول دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور اب روانی سے محب اللہ عرف فاروق کے بارے میں سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ اسد اللہ نہایت جذباتی کیفیت میں لیکن توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئی تو بولے۔

”یا اللہ! محب اللہ ایسے لوگوں کے درمیان جا چھے تھے جب ہی تو باوجود کوشش کے انہیں تلاش نہیں کیا جاسکا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ وہ ایسی کسی جگہ ہوں گے۔ بہر حال ان کا پتا معلوم ہو گیا، یہی کافی ہے۔ ہم انہیں حویلی واپس لا کر دوبارہ اپنے ماحول میں ڈھال لیں گے۔“ پُر جوش سے اسد اللہ کو خود بھی بھول گیا تھا کہ وہ یہاں اس سے آصف خان کے رشتے کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔

”آپ کو یقین ہے نا جولیٹ کہ بمبئی کے فاروق ہی ہمارے محب اللہ ہیں؟“ وہ خوش بھی تھے اور بے یقینی کا شکار بھی۔ جولیٹ نے ایک باپھر سر ہلا کر تصدیق کی۔

”ہم محب اللہ کو لانے کل ہی بمبئی روانہ ہو جاتے ہیں

پڑے گی۔ مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔

☆☆☆

ربن خاموشی سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی وہ آج قبل از وقت بستر پر لیٹ گیا تھا۔ آج فاروق کی بمبئی میں آخری رات تھی۔ رات کے آخری پہر وہ، اکبر اور سیٹھ انوپم اگر وال کا خاندان لندن جانے والے بحری جہاز میں سوار ہو جاتے۔ راتھور سے ہونے والی آخری ملاقات کے بعد ربن اتنا محتاط ہو گیا تھا کہ دوبارہ انوپم اگر وال کی کوشی کا رخ نہیں کیا تھا کہ مبادا کوئی اس کا تعاقب کرتا ہو وہاں پہنچ جائے اور فاروق کی وہاں موجودگی ظاہر ہو جائے۔ اس نے تھانے سے آتے ہی منو کو چندی گڑھ اور اکبر کو سیٹھ کی کوشی پر روانہ کر دیا تھا۔ اکبر کے ذریعے ہی اس نے فاروق کو ضرورت کا اہم سامان اور کافی بھاری رقم اس ہدایت کے ساتھ بھجوا دی تھی کہ اب بھول کر بھی اڈے کا رخ نہ کرے اور نہ ہی روانگی سے قبل سیٹھ کی کوشی سے باہر نکلے۔ اس نے اکبر کو یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ حالات بہتر نہیں ہوئے تو وہ روانگی کے وقت ان لوگوں سے الوداعی ملاقات کے لیے بھی نہیں آئے گا اور وہ سچ سچ نہیں گیا تھا۔ اس کے بیٹے جیسا فاروق اس سے جدا ہو کر سمندر پار جا رہا تھا اور اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاروق اس کا منتظر ہوگا۔ ابھی کل ہی اس نے سیٹھ کے کسی آدمی سے ایک رقعہ بھجوا یا تھا۔ اس رقعے میں ربن کے لیے پیغام تھا کہ اگر وہ کسی کو جولیت کی تلاش میں حیدر آباد بھیجے تو بہتر ہوگا کہ تلاش کے لیے جانے والا ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے سیدھا نواب سلیم اللہ کی حویلی پہنچ جائے۔ رقعے میں یہ بھی استدعا کی گئی تھی کہ ربن الوداعی ملاقات کے لیے آئے تو اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کرے۔

ربن کو فاروق کی طرف سے دی گئی اتنی یقینی اطلاع پر حیرت تو تھی لیکن اس نے فوری طور پر جانی کو اس سلسلے میں ہدایت دے کر حیدر آباد کے لیے روانہ ہونے کا حکم دے دیا تھا اور خود اپنے دل پر جبر کیے اڈے پر ہی رکا ہوا تھا۔ گولو کو بھی اس نے کسی نہ کسی طرح بہلا لیا تھا۔ باقی کسی میں تو اس سے سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ جو اور جتنا چاہے اپنی مرضی سے ہی بتاتا ہے اور اس بار تو وہ بہت زیادہ خاموش تھا۔ اڈے سے باہر بھی بہت کم نکل رہا تھا۔ اسے راتھور کی طرف سے کسی زنگل کا انتظار تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ اس

لیکن ابھی یہاں کسی کو اس بارے میں مطلع نہیں کریں گے۔ خدا نخواستہ آپ سے شناخت میں غلطی ہوئی ہو یا کسی اور مسئلے کی وجہ سے ہم محب اللہ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس باندھنے والوں کو سخت مایوسی ہوگی۔ آپ ہمیں اپنا بمبئی کا پتا اور اہم لوگوں کے نام وغیرہ ایک ورق پر لکھ کر دے دیجیے۔ باقی ہم خود دیکھ لیں گے۔“ اسد اللہ اب آہستہ آہستہ معمول پر آتے جا رہے تھے۔ جولیت خاموشی سے رائٹنگ ٹیبل تک گئی اور ایک کاغذ پر اسد اللہ کی مطلوبہ معلومات درج کرنے لگی۔ سب کچھ کاغذ پر منتقل کرنے کے بعد اس نے کاغذ اسد اللہ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ایک نظر ڈال کر اپنا اطمینان کیا اور اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اپنے اندازے کے مطابق بولے۔

”ہم جانتے ہیں کہ آپ کے دل میں بمبئی جانے اور اپنے پرانے گھر کو دیکھنے کی خواہش چل رہی ہوگی لیکن آج کل جو حالات ہیں، ان میں ہم آپ کو اپنے ساتھ سفر پر لے جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے آپ ہماری عدم موجودگی میں یہاں رکنے کے خیال سے پریشانی میں مبتلا ہوں لیکن ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آپ بھی اپنے دیگر کزنز کی طرح اس حویلی پر پورا حق رکھتی ہیں اور ہماری خیر موجودگی میں بھائی جان آپ کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔ یوں بھی اس حویلی میں آپ کی سب سے بڑی مخالف پچھلی جان تھیں اور آخر کے بعد ان میں اتنے کس بل نہیں رہے ہیں کہ وہ کسی اور کو نشانہ بنا سکیں بلکہ ہماری اطلاعات کے مطابق تو وہ آج کل خود احتسابی کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پہلی بار بھائی جان کے سامنے محب اللہ کے غیاب پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ سچ ہے جب انسان کے اپنے دل کو لگتی ہے تب ہی اسے احساس ہوتا ہے۔ اپنا بیٹا کھوکھرو برسوں بعد پچھلی جان کو احساس ہوا ہے کہ ان کی وجہ سے بھائی جان کو اپنی اولاد کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔“ اسد اللہ اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی۔

”آپ اپنے بھائی کے جس درد کا علاج کرنے جا رہے ہیں، واپسی میں آپ کو خود اس درد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ فاروق کو لے کر یہاں آئیں اور میں اس کا سامنا کر سکوں۔ مجھے ویسے بھی یہاں سے جانا تھا کہ مجھے اپنے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ بجھانی ہے۔ میں تو آپ کی محبت کی زنجیر پیر میں پڑنے سے رک گئی تھی لیکن اب مجھے یہ زنجیر توڑنی ہی

نے اپنے اختیارات کا قلم اٹھا کر کسی قسم کی قانونی کارروائی تک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور رہن خاموشی میں چھپے طوفان کی آہیں محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے گرد نادیدہ سائے ناچے محسوس ہوتے تھے، سو وہ اپنے دل پر جبر کے پڑا تھا کہ کہیں الوداعی ملاقات کو جانے کی صورت میں کوئی سایہ اس کے ساتھ لگ کر فاروق تک نہ پہنچ جائے۔ احتیاط کی اس راہ نے اس کے دل کو سخت مضطرب کر رکھا تھا اور وہ بستر پر چت لیٹا خود پر جبر کر رہا تھا۔ رات بہت آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی پھر بھی اپنے آخری پہر تک پہنچ ہی گئی اور پہلی بار رہن کے ضبط کی طنائیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ وہ اچانک ہی بستر سے اٹھ بیٹھا اور چپلیں بیروں میں ڈالیں۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل میں خیال جاگا تھا کہ آج فاروق کو نہ دیکھا تو پھر بھی اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ دل میں جاگنے والا یہ خیال اتنا پختہ تھا کہ اس کی ہستی کی دیوار ڈھا گیا اور وہ خود پر ضبط کھو کر باہر کی طرف چل پڑا۔

”دادا!.....“ اس وقت اسے باہر جاتے دیکھ کر کسی نے سوال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ کے اشارے سے سوال کرنے والے کو خاموش کروا کر باہر نکل گیا۔ سواری کے لیے اس نے خود ٹیکسی اسٹینڈ پر جا کر ایک ٹیکسی کے اونگھتے ہوئے ڈرائیور کو جگا یا اور اسے بندرگاہ تک چلنے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بس دور ہی سے فاروق کو ایک نظر دیکھ کر واپس لوٹ آئے گا۔ وہ اب بھی نادیدہ سایوں کو اپنے ساتھ چلتا محسوس کر رہا تھا لیکن دل میں جاگنے والی خواہش اتنی شدید تھی کہ باقی ہر اندیشہ بس منظر میں چلا گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی خواہش پر بہت تیزی سے قاصد ملے کیا۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اپنا چہرہ اس نے ایک بڑے سے رومال نما کپڑے سے چھپا لیا تھا اور وہاں موجود چہل پہل اور روشنیوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک قدرے تاریک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس گوشے میں چپ چاپ کھڑا وہ وہاں موجود چہروں میں فاروق کا چہرہ نکھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور اس نے سیٹھ انوپم اگر وال کے خاندان کے افراد کے ساتھ فاروق اور اکبر کو آتے ہوئے دیکھا۔ فاروق کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت تھی اور وہ بار بار یوں ارد گرد دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا متلاشی ہو۔ رہن کے دل نے گواہی دی کہ وہ اسے ہی متلاش کر رہا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر فاروق کو گلے لگا لے لیکن بروقت اس نے خود کو لگام

ڈال دی اور وہیں اپنی جگہ دبکا رہا۔ فاروق کی متلاشی نگاہیں بھٹکتی ہوئی ایک پل کے لیے اس گوشے پر بھی ٹھہریں جہاں رہن موجود تھا۔ اس کی نگاہوں کو ٹھہرتے دیکھ کر رہن کا دل زور سے دھڑکا لیکن اسی لمحے شکل لانے کچھ بولتے ہوئے فاروق کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کی طرف کھینچا تو اس کی نگاہیں اس گوشے سے ہٹ گئیں اور وہ اوروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

رہن اپنی جگہ دبکا اس وقت تک اس کی جانب دیکھتا رہا جب تک اس کی معمولی سی جھلک بھی دکھائی دیتی رہی پھر وہ ہجوم میں کھو گیا تو رہن نے بھی اپنی جگہ سے نکل کر واپسی کی راہ لی۔ واپسی کے سفر میں اسے کوئی جلدی نہیں تھی اس لیے وہ پیدل ہی وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ رات کی تاریکی نے چھٹنا شروع کر دیا تھا اور سمندر کی ٹھنڈی ہوا کو جسم پر محسوس کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دور چلنے کے بعد سواری لے لے گا۔ سواری نہ بھی ملتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ٹانگوں میں اتنا دم تھا کہ وہ گھنٹوں پیدل چل سکتا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور کافی آگے جانے کے بعد اسے ایک ٹانگہ لگ گیا۔ وہ تانگے میں سوار ہو کر آنکھیں موند کے بیٹھ گیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے یکدم ہی اس کی مرحومہ ماں اور بہن کی شبیہیں جاگ گئیں۔ ایک پیارا جدا ہوا تھا تو باقی پیارے بھی خود بخود ہی یاد آنا شروع ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے اس ریلے میں بہا جا رہا تھا کہ یکدم ہی ٹانگارک گیا۔

”کیا ہوا؟“ رہن کی حسیات فوراً ہی جاگیں۔ ”آنے جانے کا راستہ نہیں ہے۔“ تانگے والے نے خوف زدہ لہجے میں اسے مطلع کیا تو اس نے سر جھکا کر ارد گرد دیکھا۔ تانگے کے آگے ایک گاڑی کھڑی تھی اور اطراف میں بھی دو ٹیکسیاں نظر آرہی تھیں۔ رہن نے ایک ٹیکسی کے ڈرائیور کو شناخت کر لیا۔ یہ وہی تھا جو اسے اڈے سے بندرگاہ لے گیا تھا۔

”خبر!“ اس کے ذہن میں فوراً ایک لفظ گونجا اور وہ راہ روکنے والوں کو اپنی اپنی گاڑیوں سے اترتے ہوئے دیکھنے لگا۔ نادیدہ سائے جو اس کے ارد گرد ناچتے رہے تھے، اس لمحے مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

پلاٹ

تنویر ریاض

کہانی کوئی بھی ہو... اگر پلاٹ مضبوط ہو تو عمارت کی دلکشی قابل دید ہوتی ہے مگر... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے پلاٹ کسی ایک کا ہوتا ہے اور کہانی کے لکھاری دو ہوتے ہیں جس کا ہر موڑ ایک نئے اور منفرد منظر نامے سے روشناس کراتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی مقابلہ تھا جس کے نتیجے میں ایک پلاٹ پر دو مختلف کہانیوں نے جنم لیا جن کے جداگانہ انجام نے ہر ایک کو چونکا دیا۔

حقائق کے منافی، مفاد کی بنیاد پر خبر شائع کرنے والے بے خبروں سے انتقام

اس عورت نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔
”میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے جسے لیڈ اسٹوری بنایا جاسکتا ہے۔ اس کا میک اپ زدہ چہرہ جوش سے تھمتھما رہا تھا اور عام طور پر خشک رہنے والے بالوں میں بھی اس وقت چمک نظر آرہی تھی۔

ٹریڈر پاورز نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ عورت دوبارہ بولی۔ ”کیا تم اسے لکھنے کی اجازت دو گے؟“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم تنخواہ کی بات کرو گی۔“

اس نے روشنی کی طرف چند حسیاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور کرسی کی پشت سے فیک لگاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے حیرانی ہے کہ تم یہ سن کر پریشان کیوں ہو گئے؟“
”ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔“ اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

نکول سیمن ایک ماہ قبل اس کے پاس بغرض ملازمت آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کی بلاگ سروس دی پاورز لیج کی زبردست مداح ہے۔ یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ نکول صحافت کی طالبہ تھی اور رات میں کام کر کے اپنی گزراؤات کر رہی تھی۔ اب اسے عملی تجربہ درکار تھا۔ اس نے اس کی لکھی ہوئی خبریں پڑھیں جو بہت اچھی تھیں لیکن اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی معاون نہیں رکھ سکتا۔ میری اتنی آمدنی نہیں اور نہ ہی اشتہارات ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے نقصان ہو رہا ہے۔“

Downloaded From
Paksociety.com

بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ "کیسلر....."

اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ دفتر سے باہر اس جگہ کیوں ملنا چاہ رہی تھی۔ کئی سنسنی خیز اور متنازعہ موضوعات بلاگ کرنے کی وجہ سے کچھ نام نہاد پارسا اور خود ساختہ معزز لوگ اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے؛ اور پاورز کو یقین تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کے چھوٹے سے دفتر میں ہونے والی گفتگو شپ کی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں اس کے کاروباری حریف، سیاستدان، ان کمپنیوں کے سربراہان جن سے وہ بارے میں اس نے لکھا اور ممکنہ طور پر حکومتی اہلکار بھی شامل تھے۔ حال ہی میں اس نے ایک پرائیویٹ سرائف ریسٹوران کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ کچھ دریافت نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود وہ کیسلر کے بارے میں کچھ لکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"کیسلر کے بارے میں تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟" اس نے دوبارہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ گلاس پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوئی تھی۔

"میں اپنی رات کی ڈیوٹی پر تھی کہ میری نظر ایک شخص پر گئی جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکی لیکن مجھے یاد آ گیا کہ اس کی تصویر ٹائمز میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ بچپاس کے بیٹے میں تھا۔ اس نے عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے انداز و اطوار سے حکم پسندی چمک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو اس سے چند سال چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ مرد اور عورت الگ الگ مشروب سے شغل کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ ان کے نام کیوں نہ جان سکی۔ تمہیں معلوم ہے پھر کیا ہوا؟"

"مجھے امید تھی کہ وہ نقد ادا نگلی نہیں کریں گے چنانچہ میں اس کے کریڈٹ کارڈ سے معلوم کر سکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کیسلر ڈیولپمنٹ۔ دوسری عورت اس کی بہن تھی۔"

"بہن!" پاورز نے چونکتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے گوگل سے معلوم کیا۔ اس کا نام سارہ ہے۔ میں نے اس کی تصویریں بھی دیکھیں۔ وہ اس کی کمپنی کی چیف فنانسل آفیسر ہے۔"

"بہت خوب! تمہیں تو بہت اچھی شپ ملی ہوگی؟"

"کوئی خاص نہیں۔" گول نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"میں کارڈ لے کر بارٹینڈر کے پاس گئی اور جب ان کی میز پر واپس آئی تو وہ آگے کی طرف جھک کر باتیں کر رہے تھے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ شکریہ ادا کر کے چل دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ بولی۔ "میں چند ماہ یہاں کام کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے میرے تجربے میں اضافہ ہوگا۔ کیا تم مجھے ہو کہ ایک تینتالیس سالہ مطلقہ عورت زیر تربیت کارکن کے طور پر کام کر سکتی ہے؟"

"کیا تم تنخواہ کے بغیر کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"میں صرف تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔"

گول بہت اچھی تحقیقی معاون اور ایڈیٹر ثابت ہوئی۔ اسے لکھنا آتا تھا اور اس کی تحریریں پُر مغز ہوتی تھیں۔ وہ ٹیلی فون پر معلومات لیتی اور انہیں اس پیرائے میں لکھتی کہ بیان کا غلط مطلب نہ لیا جائے لیکن بھی اس کے لکھے ہوئے مضامین پر کوئی بات نہیں ہوئی جن پر اس کا نام نہیں ہوتا تھا۔ ہر دفعہ اس کی تقریباً آٹھ یا اس سے بھی زیادہ خبریں لگتی تھیں اور وہ ان سب پر اپنا نام دینا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ پاورز نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے آئیڈیا بتاؤ۔"

گول نے میز کی سطح پر دباؤ ڈالا اور کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گھوم کر اپنی جیب سے ایک بزنس کارڈ نکالا، اس پر لکھا ہوا نام پڑھا اور اس کی کئی ٹکس کر کے میز کی ٹانگ کے نیچے رکھ دیا تاکہ اس کا لیول برابر ہو جائے پھر اس نے اپنی پشت پر لٹکے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈالا جس پر اسپائیڈر مین لکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتا کیونکہ یہ اس کا واحد خط تھا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ انٹرویو کے دوران جب گول نے اپنی عمر بتائی تو وہ بہت حیران ہوا کیونکہ وہ اسے قدرے کم عمر سمجھ رہا تھا۔ البتہ طلاق والی بات سمجھ میں آتی تھی۔ گوکہ وہ اب بھی پُرکشش تھی لیکن لباس کے معاملے میں بہت بد ذوق تھی۔ وہ مونے بھدے سوٹر اور خراب فننگ والے اسکرٹ پہنا کرتی تھی۔ اس کے جوتے بوسیدہ ہوتے اور وہ ایسی خوراک لیتی جس سے اس کے جسم پر چربی چڑھ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا میک اپ کرتی تھی، اس کے باوجود اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گول اپنی دانش ورانہ فطرت کے سبب کسی سے سمجھوتا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے تھیلے سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی۔ اس نے اس پر نظر دوڑائی اور سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

"مائیکل کیسلر....."

پاورز کو اپنے بیٹ میں مروڑ اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ

دوستی

دوستی: موسم نہیں جو اپنی مدت پوری کرے
اور رخصت ہو جائے۔

دوستی: ساون کی بارش نہیں جو ٹوٹ کے
بر سے اور پھر ٹھہم جائے۔

دوستی: آگ نہیں جو سگے، بھڑکے اور بجھ
جائے۔

دوستی: گلاب کا پھول نہیں جو کھلے، مکائے
اور مرجھا جائے۔

دوستی تو سانس کی ڈور ہے، جو چلے تو زندگی اور
رکے تو موت آ جائے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک چین شریف

پہن رہی تھی۔ کندھے پر تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ پاورز نے اسے دیکھ
کر ہاتھ ہلایا اور وہ چلتی ہوئی ان کی میز پر آ گئی۔ پاورز نے
تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”میری! یہ گول ہے۔“

میری نے خوش دلی سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔
پاورز نے کہا۔ ”یہ میری اسٹوڈنٹ ہے اور گول میرے
ساتھ کام کرتی ہے۔ یہ بھی مصافحہ پڑھ رہی ہے۔“

میری نے گول سے پوچھا۔ ”تم کس شعبے میں جانا
چاہو گی؟“

”بلا ٹنگ یا پوڈ کاسٹ..... اور تم؟“

میری نے کہا۔ ”میں پروفیسر پاورز کی نیومیڈیا کلاس
میں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے براڈ کاسٹ کے شعبے
میں جانا چاہیے۔“

پاورز نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کے
بھی شاکر د جانتے تھے کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو کی رپورٹنگ کو
پسند نہیں کرتا۔ اس لڑکی نے قہقہہ لگایا اور اپنے بیگ میں سے
ایک سرخ پلاسٹک کالفا ٹکالتے ہوئے بولی۔ ”اضافی وقت
دینے کا شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے رپورٹ لے لی اور اس
کا عنوان پڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میری نے اچھی طرح
تحقیق کرنے کے بعد اسے خوب صورت پیرائے میں لکھا
ہوگا۔ وہ اس انیس سالہ لڑکی کی صلاحیتوں پر حیران تھا۔ اس
نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”کافی بہتر ہے۔ کل اسے اسپتال سے ڈسچارج
کر دیا جائے گا۔ ایک بار پھر تمہارا شکریہ پروفیسر۔“

لگتا تھا جیسے وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کی گفتگو سنے، کم از کم
میں یہی سمجھ رہی تھی۔ لہذا ان کی میز سے کچھ فاصلے پر رک
گئی۔ اس کے باوجود میں تھوڑی بہت باتیں سن سکتی تھی۔“

”کیا یہی وہ خاص بات ہے جس کے لیے تم مجھے مجبور
کر رہی ہو کہ اسے لکھنے کی اجازت دے دوں؟“

اس کی نیلی آنکھیں سڑگئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے
بولی۔ ”میں ریسرچ کے علاوہ بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“

غالباً اس کا پوشیدہ مفہوم یہ تھا کہ اگر وہ اسے تنخواہ نہیں
دے رہا تو کم از کم اسے آگے بڑھنے کا موقع تو دے اور
شاید وہ ایسا کر سکتی تھی لیکن کیا اس کے لیے یہی مناسب وقت
تھا کہ وہ ایک دھماکا خیز خبر سے آغاز کرے۔ یقیناً وہ ایک
اچھی صحافی ہو سکتی تھی۔ عمدہ مضامین لکھ سکتی تھی اور اس کا عزم
پختہ تھا لیکن اس کے پاس ایسا کیا مواد تھا جسے لے کر وہ
مائیکل کیسلر کے خلاف کچھ لکھ سکتی۔

دوسرے کئی لوگوں کی طرح ٹریپور پاورز بھی یہی سمجھتا
تھا کہ کیسلر کی یہ شان و شوکت اس کی لاپرواہی فطرت کی بدولت
ہے۔ اس نے یہ شاندار مرتبہ ان لوگوں کو شکست دے کر
حاصل کیا تھا جو اس کے مخالف تھے یا اسے دھمکیاں دیتے
تھے۔ ممکن ہے کہ اس میں سو فیصد حقیقت نہ ہو لیکن اس کے
بارے میں اس قسم کی افواہیں گردش کرتی رہتی تھیں۔

پاورز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گول کو اس کی اجازت نہیں
دے گا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پاورز یہ اعتراف نہیں
کر سکتا تھا کہ وہ کیسلر کے بارے میں کبھی ہوئی کہانی پر اپنا
نام دینا نہیں چاہتا۔ گوکہ اس نے اپنے طالب علموں کو یہ پیچھے
نہیں دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ رپورٹنگ کی دنیا میں اتنا سب
سے اہم چیز ہوتی ہے۔ اس نے گول سے بے تکلفی کے انداز
میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے گول..... وہ بہت بڑا اور خطرناک
فحش ہے۔ اگر وہ بھر گیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ تم اس
کے علاوہ کسی اور موضوع پر بھی لکھ سکتی ہو۔“

گول خاموش رہی تو اس نے کہا۔ ”میں مذاق نہیں کر
رہا۔ وہ واقعی بہت خطرناک ہے اور انتہائی بے رحم بھی۔
اسے کسی پرترس نہیں آتا۔ اگر تمہارے لکھے ہوئے سے
اسے تکلیف پہنچی تو وہ تمہیں اس سے بھی زیادہ تکلیف
پہنچائے گا۔“

پاورز نے بار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اس جانب
دیکھا۔ ایک دیلی پسلی سنہرے بالوں والی نوجوان لڑکی اندر
داخل ہو رہی تھی۔ اس نے پرانی چوڑے کی جیکٹ اور جینز

”ٹھیک ہے۔ تم سے کلاس میں ملاقات ہوگی۔“
اس کے جانے کے بعد گول بولی۔ ”تمہیں پڑھانے میں مزہ آتا ہے؟“

”بالکل۔ میرے لیے یہ ایک تفریح ہے۔“
”ہم اصل موضوع پر واپس آتے ہیں۔ اگر کیسلر کے علاوہ کچھ لکھوں گی تو اس پر میرا نام ہوگا۔ کیا تم اس کا وعدہ کرتے ہو؟“
”ہاں، مجھے منظور ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی تم پر ہی ہوگی۔“

”مجھے اگلے شمارے میں پہلے صفحے پر نمایاں جگہ چاہیے۔ اس پر صرف میرا نام ہوگا۔ کسی اور کی شراکت مجھے قبول نہیں۔“

پاورز کو ان شرائط کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں، اس لیے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیا سنا تھا؟“

”وہ بار میں ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔ یہ ایک شاندار پلاٹ ہے۔ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، شکریہ۔ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔“

پاورز کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ کیسلر کسی سازش کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ بہت ہی مزے دار اسٹوری تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”وہ اپنی بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا..... ہمیں بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ اس میں کچھ رکاوٹیں ہیں لیکن یہ کارآمد ہوگا۔“

پاورز بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”پلاٹ..... کچھ اندازہ ہے کہ وہ فون پر کس سے بات کر رہا تھا؟“

”نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے چھپ کر باتیں سننے ہوئے نہ دیکھ لیں چنانچہ میں ان کی میز پر نہی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، میں نے کریڈٹ کارڈ کا بل ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اپنے دستخط کیے اور دونوں وہاں سے چلے گئے۔“

پاورز نے اپنی کرسی کی پشت سے لگائی اور باریک کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دوسرے صحافیوں کے برعکس جو عام طور پر جینز، ٹی شرٹ اور خاص مواقع پر اسپورٹس کوٹ پہنتے ہیں، اس نے ہمیشہ کی طرح نیوی بیورنگ کا سوٹ اور آسانی رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ لباس اسے یاد دلاتا تھا کہ وہ ایک معزز پیشے سے وابستہ ہے اور ان بدعنوان، لالچی

اور دھوکے باز لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہے جن کے بارے میں وہ بلاگ لکھا کرتا ہے۔ وہ کیسلر جیسے ہی لوگ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ پلاٹ کس نوعیت کا ہو سکتا ہے، اس بارے میں امکانات کی کوئی کمی نہیں تھی۔

مائیکل کیسلر جائیداد کا کاروبار کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے ورثے میں کافی دولت ملی تھی جو صنعت کار تھا اور دس سال قبل انتقال کر گیا تھا۔ گوکہ وہ بہت ہوشیار اور محنتی تھا لیکن اس کے بیٹے نے ورثے میں ملی بے رحمی کو ایک نئے وصف سے آشنا کیا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگوں کی خواہشات لامحدود ہیں اور وہ ان کی ضرورتیں پوری کر کے خوش ہوتا تھا۔ لوگ دیہاتوں سے بینٹ ہاؤس اور چھوٹے گھروں سے بڑے اپارٹمنٹس میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔ کیسلر نے سستے داموں زمین خرید کر اس پر لوگوں کی ضروریات کے مطابق مکانات اور اپارٹمنٹس تعمیر کیے اور انہیں کرائے پر چڑھا دیا۔ وہ اپنے کرایہ داروں پر کڑی نظر رکھتا تھا اور اس کے لیے اس نے پرائیویٹ جاسوسوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ایسے کرایہ دار جو قانون کی خلاف ورزی کرتے یا بجلی، گیس اور ایئر کنڈیشننگ میں کھپے کرتے۔ ان سے وہ فوری طور پر مکان خالی کرواتا اور اگر کوئی مزاحمت کرتا تو اسے مختلف طریقوں سے ہراساں کرتا۔ یہ سب کچھ کیسلر کے کاروبار کا حصہ تھا۔

دوسری جانب اگر کوئی سیاست دان یا بااثر شخص یہ سمجھتا کہ کیسلر کی تعمیرات اور زمینوں کی خریداری قانون کے مطابق ہے تو اس کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی تھی اور ان کی پسندیدہ جگہ پر مارکیٹ سے کم قیمت پر اپارٹمنٹ دے دیا جاتا۔ اس کے خلاف کئی مدعیان نے ناجائز تعمیرات، خطرناک حالات اور کرایہ داروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کے حوالے سے مقدمات دائر کیے لیکن سب ایک ایک کر کے خارج ہو گئے۔ کوئی بھی ڈسٹرکٹ اٹارنی اس پر جرم ثابت نہیں کر سکا۔ وہ کوئی عفریت نہیں تھا۔ وہ نیویارک کے ثقافتی اداروں کو بھاری رقوم عطیے میں دیا کرتا لیکن جب بات کاروبار کی ہو جے وہ اپنے لیے زندگی کی حرارت سمجھتا تھا تو اس پر وہ کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد پیسا کمانا تھا گوکہ وہ ابھی ملک کے نامی گرامی سرمایہ داروں جتنا دولت مند نہیں ہوا تھا لیکن اس نے بھی یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ایک روز وہ ان سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔

پریس بھی اس کی کمزوریاں تلاش کرنے میں لگا رہتا

جانے کی کوشش کرو۔“ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”تم جس بار میں کام کرتی ہو، وہاں کریڈٹ کارڈ کی سلیپ پر تمہارا نام ہوتا ہے؟“

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، گا ہک کو سروس دینے والے فرد کا پہلا نام سلیپ پر درج ہوتا ہے۔“

”اور تم نے اس کے باوجود عملے کے لوگوں سے پوچھ کچھ شروع کر دی۔ اسے شبہ ہو سکتا ہے کہ کوئی رپورٹر خبر کی تلاش میں ہے اور تم اس کے لیے ایک ذریعہ ہو۔ لہذا تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”وہ مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا ٹریور۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے پاورز کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ ایک ماہ کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ گول نے اس کے جسم کے کسی حصے کو ہاتھ لگایا تھا۔ اچانک ہی وہ بالکل مختلف نظر آنے لگی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں انتہائی خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ پُرکشش ضرور تھی لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بھوکے شیرنی کو شکار مل گیا ہو۔

☆☆☆

وہ اپنے بستر میں لیٹا ہوا باہر سے آنے والے ٹریک کا شور سن رہا تھا۔ غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی جس سے اس کی سوچوں کا سلسلہ منتشر ہو رہا تھا۔ کل وہ اس مواد پر کام شروع کرنے والے تھے جو گول نے کیسلر کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس میں سے کیا برآمد ہوتا ہے؟ کیا ایک اور واٹر گیٹ اسکیڈل سامنے آنے والا تھا؟

لیکن فی الوقت اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لہذا اس نے کیسلر کے پلاٹ کے بارے میں قیاس آرائی سے توجہ ہٹائی اور سرہانے رکھی ہوئی ایک کتاب کو دیکھنے لگا جس کا عنوان تھا ”دی نیو جرنلزم“ اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کا پیشہ کس طرح تبدیل ہو گیا۔ بیس سال قبل جرنلزم کی ڈگری لینے کے بعد اس نے بھی اپنے بیشتر کلاس فیوز کی طرح روایتی میڈیا میں کیریئر بنانے کی کوشش کی لیکن اس کا کسی بڑے اخبار سے رابطہ نہ ہو سکا اور وہ ایک چھوٹے ٹی وی چینل سے منسلک ہو گیا لیکن وہ کام کے معیار سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک دن کھانے کے وقفے میں ایک کار حادثے کی ویڈیو کو پچاسویں مرتبہ چلتے دیکھ کر وہ شپٹا گیا اور اس نے نشریات کی دنیا سے علیحدہ ہونے میں دیر نہیں لگائی اور اشتہارات کے شعبے سے منسلک ہو گیا جہاں سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی لیکن اس دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ کس طرح اس پیشے میں رہ کر اپنی خواہشات کی تسکین کرے جس

تھا جیسا کہ حال ہی میں ایک اخبار نے سرخی لگائی تھی۔ ”ڈیوی لپر کی کیسلر میں جتلا دادی کو مکان سے نکالنے کی کوشش کیونکہ کرایہ ادا کرنے میں ایک ہفتے کی تاخیر ہو گئی تھی لیکن یہ اخبارات کارروایتی انداز تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی بھی رپورٹر کسی ایسی کارروائی کا سراغ نہ لگا سکا جو قابل گرفت ہوتی اور نہ ہی اس کی برائی کے بارے میں کوئی پُر مغز مضمون شائع ہوا۔ اس طرح کیسلر تحقیقاتی رپورٹروں کو بھی دھوکا دینے میں کامیاب رہا۔

ان تمام باتوں کے بارے میں سوچتے ہی پاورز پُر جوش ہو گیا۔ اس نے گول سے پوچھا۔ ”کیا تم بار کے دوسرے عملے سے بات کر سکتی ہو؟ اگر کسی نے اسے وہاں پہلے دیکھا ہو۔ وہ کن لوگوں سے ملتا رہا ہے؟“

”یہ کام میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ ان کا جواب نفی میں تھا۔ کسی نے اسے وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

پاورز نے مشروب کا ٹھونٹ لیا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

گول نے اسے چند کہانیوں کے بارے میں یاد دلایا جن پر کام ہونا ہائی تھا۔ ان میں سے ایک ان اداروں کے سربراہان کے بارے میں تھی جو سیاست دانوں کی دعوتیں کر رہے تھے۔ دوسری ان ریسٹورنٹ مالکان سے متعلق تھی جو ہیلتھ انسپکٹروں کو رشوتیں دیتے تھے۔ ان میں واحد بڑی کہانی نیویارک کے ایک کانگریس مین کے بارے میں تھی جس کی غیر نصابی سرگرمیاں قابل اعتراض حد تک بڑھ گئی تھیں۔

پاورز کو اس کہانی میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ اس کا کہنا تھا کہ کانگریسی رکن ایک ہوشیار اور باصلاحیت شخص ہے اور اس نے اپنے حلقے کی نمائندگی اچھے انداز میں کی ہے۔ اس نے اپنی جو ممتاز تصویریں ٹوٹ کی ہیں، ان کا اس کے کام سے کوئی تعلق نہیں۔ پاورز کا کہنا تھا کہ اصل کہانی اس کے نیم عریاں لباس کے بارے میں نہیں ہے بلکہ سارا مسئلہ یہ ہے کہ اس بلاگ کے پوسٹ ہونے کے بعد اس کا کیا رد عمل ہوگا۔ کیا وہ یہ سب برداشت کر سکے گا یا چلائے گا، ہنگ عزت کا دعویٰ کر دے گا یا انتقامی کارروائی پر اتر آئے گا۔ اس نے گول کو بتایا۔ ”اگر اس نے غلط مطلب لیا تو اس کا اثر میری ملازمت پر پڑ سکتا ہے۔“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”ان کہانیوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اب ہم کیسلر اور اس کے خفیہ پلاٹ پر توجہ دیں گے۔ تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ

جنوری 2017ء

سینس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں آگے بڑھنے کے مواقع محدود ہوتے جا رہے ہیں۔

اس کا دھیان انٹرنیٹ کی جانب کیا جس کے ذریعے بلاگز اور آن لائن میڈیا کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس نے بہت جلدی محسوس کر لیا کہ صحافت کا مستقبل اسی شعبے سے وابستہ ہے۔ یہی ان لوگوں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا جنہوں نے روایتی رپورٹنگ پر انحصار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ لوگ ان خبروں، مضامین اور اسٹوریز کی سچائی پر یقین رکھتے تھے جو یوٹیوب، اسنیپ چیٹ یا ٹوئٹر کے ذریعے ان تک پہنچتی تھی چنانچہ پاورز نے اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ ایک نیالیپ ٹاپ خریدا۔ اپنی ویب سائٹ بنائی اور دی پاورز جی کے نام سے لانچ کر دی۔

بہت جلد اس کا شمار امریکا کی دس بڑی بلاگ سائٹس میں ہونے لگا۔ اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی تھی جبکہ بیس لاکھ افراد روزانہ اسے اتفاقی طور پر دیکھتے تھے۔ اس بلاگ سائٹ پر عموماً یہ تنقید کی جاتی تھی کہ یہ زیادہ تر سنسنی خیز موضوعات کا انتخاب کرتی ہے اور ان بلاگز کا انداز جارحانہ ہوتا ہے۔ یقیناً ایسی کچھ مثالیں تھیں جیسے ایک پوسٹ میں پاورز نے ایک نوجوان کا معاملہ اٹھایا جس پر دہشت گردوں سے ہمدردی کرنے کا الزام تھا۔ پاورز نے سرکاری وکیل کے دلائل میں خامیوں کی نشاندہی کی اور وہ نوجوان ضمانت پر رہا ہو گیا لیکن بد قسمتی سے ایک ماہ بعد وہ ایک کار میں بم نصب کرتے ہوئے پکڑا گیا پھر اس نے ایک اکاؤنٹ کے بارے میں ایک تحقیقاتی رپورٹ پوسٹ کی جو کہ تنویر خیراتی ادارے کے فنڈ میں خورد برد کر رہا تھا۔ اس کی سرفی سے یہ مطلب لیا گیا کہ وہ بچوں کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو رہا تھا جبکہ درحقیقت وہ چرائی گئی رقم سے ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا جن کے ساتھ ناجائز سلوک ہوا لیکن اس طرح کی مثالیں بہت کم تھیں۔

پاورز کے لیے اس سے زیادہ مشکل صورت حال وہ تھی جب وہ پہل کرنے میں ناکام رہا۔ مثال کے طور پر ایک حریف بلاگ سائٹ نے اس سے پہلے نیویارک ٹی وائر سسٹم کے بارے میں ایک اسٹوری پوسٹ کر دی جس پر وہ خود بھی کام کر رہا تھا اور اس طرح پاورز کی ساری محنت ضائع ہو گئی۔ اسی طرح ایک اور بلاگ سائٹ ”پوسٹ“ نے بھی ایک بد زبان باسکٹ بال کے کھلاڑی کے بارے میں اسٹوری پوسٹ کر کے اسے پیچھے چھوڑ دیا جس نے اپنی بیوی کا جیڑا توڑ دیا تھا کیونکہ اس نے مذاق میں دوسری ٹیم کے کھلاڑی کی تعریف کر دی تھی۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ ایسے واقعات کا

اعادہ نہ ہونے پائے جو اسے بلندی کی جانب بڑھنے سے روک سکتے ہیں اور اگر مائیکل کیسلر کی اسٹوری پوسٹ ہو گئی تو وہ ایک ہی جست میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے دروازے کے نیچے سے آتی ہوئی روشنی کی طرف دیکھا اور کبل ایک طرف کر کے بستر پر جگہ بنائی۔ اسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”ہیلو!“ اس کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ کھلا اور اس میں سے میری برآمد ہوئی۔ پاورز نے بستر کی جانب اشارہ کیا اور دوبارہ فون سننے لگا۔ دوسری جانب سے ٹکول بول رہی تھی۔

”ٹریور! معاف کرنا، کافی دیر ہو گئی لیکن مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔“ اس نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے پوری توجہ اس کی جانب مبذول کر لی۔

”میں اس وقت یونین کلب میں ہوں۔ مجھے مظلوم ہوا تھا کہ کیسلر بھی اس کلب کا ممبر ہے چنانچہ میں نے وہاں کے اسٹاف اور ویٹرز سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک جان پہچان کا ویٹر مل گیا۔ وہ مجھے کلب کے عقبی حصے میں لے گیا اور میں نے اسٹاف کے کچھ لوگوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا کیسلر یہاں اکثر پیشتر آتا رہتا ہے اور کیا کسی نے حال ہی میں اسے اس جگہ پر دیکھا ہے۔ سب نے اس بارے میں لاعلمی ظاہر کی البتہ ایک ویٹر نے بتایا کہ گزشتہ روز ایک اور شخص بھی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کسی بلاگ کار پورٹر تھا اور ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ ویٹر نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے لیکن اس نے حلیہ بتایا۔ اس کے مطابق وہ پست قد، گنجا اور سلوٹ دار سوٹ پہنے ہوئے تھا۔“

”اوہ میرے خدا۔ یہ تو ڈینیئل لیویٹ کا حلیہ ہے۔“

وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ڈینیئل کا تعلق ”آل دی نیوز“ بلاگ سے تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے کئی بار اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

”ممکن ہے کہ اس نے بھی کسی سے پلاٹ کے بارے میں سن لیا ہو۔“ ٹکول نے کہا۔

”ہمیں تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ کل تم مجھ سے ملو۔ کیا

آٹھ بجے تک آسکتی ہو؟“

”تم نے دیکھا کہ وہ کون تھے؟“

”نہیں، انہوں نے گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی۔ جیسے ہی ایک ٹیکسی نظر آئی، میں جھٹ اس میں سوار ہو گئی لیکن اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کیسلر سب کچھ جانتا ہے۔“

پاورز نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا لیکن اسے کوئی مشتبہ بات نظر نہیں آئی۔ پھر بھی اس نے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤ۔ اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ دو اور اپنی ملازمت سے کچھ دنوں کی چھٹی کر لو۔“

”میں یہ افورڈ نہیں کر سکتی ٹریور۔ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔“

”میں تمہارا نقصان پورا کر دوں گا۔ چند ہفتوں کے لیے کسی ہوٹل میں چلی جاؤ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسا تم کہو۔“

پاورز نے دو ہزار ڈالر کا چیک لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ”ایک طرح سے یہ ہم دونوں کے لیے اچھی خبر ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“ نکول نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کوئی بڑا کام کرنے

”یقیناً..... ہاں، ایک بات اور۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ لیویٹ اپنے حریفوں کی جاسوسی کرنے کے لیے لوگوں کو استعمال کرتا ہے۔ کیا تم نے بھی کوئی ایسی بات سنی ہے؟“

”نہیں لیکن مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی۔“ یہ کہہ کر پاورز نے میری کی طرف دیکھا جو اپنے بیگ سے ٹیلی فون اور چھوٹا لیپ ٹاپ نکال رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس نے ہماری گفتگو ریکارڈ کر لی؟ لیکن اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے اپنی گفتگو میں کیسلر یا اس کی اسٹوری کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تم سے کل ملاقات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اگلے روز نکول ٹھیک آٹھ بجے اس کے دفتر پہنچ گئی اور پاورز نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے..... خیریت تو ہے؟“

اس نے اس کی میز پر ایک بھاری ڈبا رکھا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی سایہ میرے پیچھے ہے۔ میں جیسے ہی رکی وہ بھی رک گئے۔“

بازوق پاکیزہ قارئین کے لیے خوشخبری

زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو نہایت مہارت سے پراثر الفاظ کا جامہ پہناتی
بے شمار یاد گار تحریروں کی خالق

شیریں حیدر

کی ایک اور دلکش و دلربا سلسلے وار تحریر

امرت

انشاء اللہ جنوری 2017ء پاکیزہ صفحات کی زینت بننے جا رہی ہے

سپنسن ڈائجسٹ 15 جنوری 2017ء

دے رہا ہو جو پرانی اور غیر منافع بخش عمارتوں کو منہدم کر کے بنائی گئی تھیں۔

پاورز نے روم سروس کو کھانے اور کافی کا آرڈر دیا پھر خاکوں میں سے غیر ضروری معلومات الگ کرنے لگا جن کا کیسلر کی سازش سے کوئی تعلق نہیں بتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس طرح کی رپورٹیں پڑھنے والوں کو کیونکر متاثر کرتی ہیں۔ نیک مقصد کے لیے عطیہ دینا، تقریبات یا کسی قریبی عزیز کی موت کی خبر سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ صحافت نہیں بلکہ ان لکھنے والوں کی طرف سے خانہ پرستی تھی جو تحقیقی رپورٹنگ نہیں کر سکتے تھے۔

کھانا کھانے اور کافی پینے کے دوران بھی وہ ان کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ کافی ختم ہو گئی تھی اور اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی لیکن اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا اور وہ سب کچھ بھلا کر مائیکل کیسلر کی سازش کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا، وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں ان خاکوں میں سے ایک پر تھیں جو نکول نے ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ اس نے تلاش جاری رکھی اور مزید تین فائلیں مل گئیں پھر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

☆☆☆

”میں نے معلوم کر لیا کہ وہ کیا سازش کر رہا ہے۔“
”اوہ ٹریور! مجھے بتاؤ، اس کا منصوبہ کیا ہے؟“
دوسری جانب سے نکول نے پوچھا۔ وہ اس وقت ایک کافی شاپ میں تھی جو اس کے ہوٹل سے زیادہ قاصدے پر نہیں تھا۔
”اگلے مہینے الیکشن ہونے والے ہیں، وہ سینیٹ کی ایک سیٹ میں دھاندلی کا منصوبہ بنا رہا ہے۔“

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے الیکشن کے بارے میں بھی کچھ مضامین دیکھے تھے لیکن مجھے ان کی تفصیل یاد نہیں۔ اس نشست کے لیے کون امیدوار ہے؟“

”یہ مین ٹین کی ایک نشست ہے۔ ڈیموکریٹ کے امیدوار نے غیر مساوی آمدنی کو اپنے منشور کا حصہ بنایا ہے۔ وہ دولت مند لوگوں بشمول ایک کروڑ سے زیادہ مالیت کی جائیداد پر بھاری ٹیکس لگانے کی حامی ہے۔ کیسلر کی زیادہ تر کمپنیاں اور جائیدادیں اسی علاقے میں ہیں اور اس خاتون امیدوار کی تجاویز اسے معاشی طور پر تباہ کر دیں گی۔“

”پھر تم بھی..... وہ سازش کیا ہے؟“
”اس معاملے میں بہت ہوشیاری دکھانی گئی ہے۔ اسے

جار ہے ہیں۔“ اس نے کارٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”اگر میں حقیقت جاننے میں کامیاب ہو گیا تو ہماری سرکولیشن آسمان کو چھونے لگے گی اور تم ملک کی سب سے زیادہ بااثر بلاگ سے وابستگی میں فخر محسوس کرو گی۔“
نکول کے چہرے پر ایک پھمکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔ ”یقیناً۔ میں امید ہی کر سکتی ہوں کہ شہرت کا مزہ چکھنے کے لیے لمبی عمر پاؤں۔“

نکول کے جانے کے بعد پاورز نے بھی احتیاط برتنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر پیک کیا اور بھاری کارٹن سمیت سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کارٹن میں کیسلر کے بارے میں تحقیقی مواد تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو مختلف راستوں پر گھماتا ہوا شہر کے وسط میں واقع ایک ہوٹل پہنچا اور تین دن کے لیے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اس نے روم سروس سے کافی منگوائی اور کمرہ بند کرنے کے بعد کارٹن نکول کر دیکھا۔ واقعی نکول نے بڑی محنت سے مواد جمع کیا تھا۔

اس کارٹن میں درجنوں فائلیں تھیں جن میں کم و بیش دو ہزار کاغذات لگے ہوئے تھے۔ جیسا کہ نکول نے بتایا کہ ان میں مضامین، بلاگ پوسٹ، ٹویٹ، فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا پوسٹ کا ریکارڈ تھا۔ اس کے علاوہ کیسلر کے قریبی لوگوں کے انٹرویوز سے بھی اقتباسات لیے گئے تھے۔ پاورز نے ان کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں کیسلر کی پوری زندگی، اس کی کاروباری اور سماجی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ نکول نے اتنے بڑے پیمانے پر تحقیق کی تھی کہ پاورز متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلے تو وہ اس کی ضخامت دیکھ کر گھبرا گیا پھر اسے یاد آیا کہ نکول کوئی تربیت یافتہ صحافی نہیں ہے۔ ویسے بھی کم ہونے کے مقابلے میں زیادہ مواد بہتر تھا اور اس میں سے کئی کام کی چیزیں مل سکتی تھیں۔ ان میں کچھ عنوانات ایسے تھے جن سے واضح طور کیسلر کے کسی سازش میں ملوث ہونے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے جرم کی حقیقت جاننے کے لیے اس مواد میں سے بہت کچھ پڑھنے کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے کسی نا جائز طریقے سے نیویارک کے مدعی کو دھمکایا جا رہا ہو جو ٹیکس لائن دھمانے کے بارے میں الزام عائد کرنے پر غور کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یورپین یا جنوبی امریکا کے حکام کو ترغیب دی جا رہی ہو کہ وہ اس کی کم آمدنی والے لوگوں کے لیے سرمایہ کاری اسکیم میں رکاوٹ نہ ڈالیں اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ اپنی چند عمارتوں کے بارے میں کمشنر کو دھمکی

تھے جب میں ہوٹل سے کافی ہاؤس جانے کے لیے نکلی لیکن جب میں ایک بلاک آگے نکل آئی تو وہ جاچکے تھے۔ پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اپنے طالب علموں کو یہ پڑھاتے ہو کہ یہ جنون صحافت کے لیے ضروری ہے؟“

”نہیں لیکن مجھے بتانا چاہیے۔ ٹھیک ہے، اب میں لکھنے بیٹھ رہا ہوں۔ تم محتاط رہنا۔“

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد پاورز دوبارہ اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ گیا اور دو گھنٹے میں اس نے اسٹوری مکمل کر لی۔ اب اسے ایک زوردار سرخی لگانا تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ ایکشن اگلے ماہ کے پہلے منگل کو ہونے والے تھے۔ اس مناسبت سے اس نے سرخی بنائی۔

”منگل پلاٹ، مائیکل کیسلر نے مخالف امیدوار کی انتخابی مہم تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔“

پھر اس نے ٹن دبا کر اس اسٹوری کو اپ لوڈ کر دیا۔

☆☆☆

پانچ بجے کے قریب کول وال اسٹریٹ کے قریب واقع اسٹین فورڈ ہوٹل میں واپس آئی اور لفٹ کے ذریعے تیرہویں منزل پر واقع کمر نمبر 3002 پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا پھر اس نے اپنی جیکٹ اتاری اور فریج سے مشروب کی بوتل نکالی۔ اس نے ڈھکنا کھولا ہی تھا کہ ایک دیہی پتلی عورت سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہاتھ روم سے برآمد ہوئی۔ کول نے اسے دیکھ کر گہری سانس بھری۔ وہ اس کی بہن کیتھی تھی۔

”معاف کرنا۔“ کیتھی نے کہا۔ ”میرا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں تھا۔“

”اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ دونوں بہنیں گرم جوش سے بغل گیر ہوئیں۔ کول نے کیتھی کو مشروب کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خریداری کیسی رہی؟“

”بہت اچھی۔ اب بچوں کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ کیتھی نے کئی بڑے تھیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مئی شہر گھومنا چاہ رہی تھیں لیکن بچوں نے اسٹار وائز اور لیگاس کو ترجیح دی۔“

”میری خواہش تھی کہ اس بار میں بھی ان سے مل سکتی۔“ کول نے کہا۔

”وہ چند ماہ بعد آئی گی کے ساتھ دوبارہ آئیں گی۔“ کیتھی اصل موضوع کی طرف آنا چاہ رہی تھی۔ کول

جنوری 2017ء

سن کرتم بھی کیسلر کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکو گی۔ تم نے اس کے چینل کے بارے میں بھی ایک اسٹوری تلاش کی ہے جو اس حلقے کے ریپبلکن امیدوار کے حق میں اشتہارات اور پروپیگنڈا مہم چلا رہا ہے لیکن میں نے ایک اور چینل تلاش کیا ہے جو ای ڈسٹرکٹ میں ڈیموکریٹ امیدوار کے اشتہار دکھا رہا ہے۔“

”کیا یہ حیران کن نہیں ہے؟“ پاورز مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بالکل نہیں، سوائے اس کے کہ دونوں چینلز کا پتا ایک ہی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ کیسلر کا چینل مخالف امیدوار کے اشتہارات بھی دکھا رہا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میں سمجھاتا ہوں۔ ڈیموکریٹ امیدوار نے ان احتجاجی مظاہروں میں شرکت کی جو غیر مسلح اقلیتوں پر پولیس فائرنگ کے خلاف ہو رہے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا حلقے کے ووٹروں پر اچھا اثر پڑ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی ایک پرانی ویڈیو بھی دکھادی گئی جس میں وہ ایک پولیس واسلے کی تدفین کے موقع پر تقریر کر رہی ہے۔ اس وقت وہ یوٹوبیسی کی میز تھی۔ اس تقریر میں وہ تشدد کے خلاف بول رہی تھی۔“

”اب میں سمجھی۔ کیسلر کے چینل پر چلنے والے اشتہار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیموکریٹ امیدوار مکمل طور پر امن و امان قائم رکھنے کی حامی ہے اور اس نے اقلیتوں سے زیادہ پولیس کا ساتھ دیا ہے۔ اس سے ووٹروں پر خراب اثر پڑے گا اور اس ڈسٹرکٹ میں اس کے ووٹ کم ہو جائیں گے۔ اس طرح کیسلر کا امیدوار جیت جائے گا۔“

”بالکل سبکی بات ہے۔“ ”کیا یہ اشتہارات اب بھی دکھائے جا رہے ہیں؟ تم ان کے کچھ حصے اپنے بلاگ میں شامل کر سکتے ہو۔“

”نہیں۔ فی الحال انہیں روک دیا گیا ہے۔ اب یہ ایکشن سے چند روز قبل دکھائے جائیں گے لیکن میں اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ لیوٹ کو بھی اس کی سن گن مل گئی ہے لیکن اس بار میں اسے کوئی موقع نہیں دوں گا۔ واقعی تم نے زبردست کام کیا ہے۔“

”مجھے اس میں بہت مزہ آیا لیکن یہ مت بھولنا کہ تم نے میرے نام سے ایک اسٹوری پوسٹ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہیں اس کا موقع ضرور دوں گا۔“ پاورز نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تم اس جگہ پر محفوظ تو ہو؟“ ”میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے

17

سپینس ڈائجسٹ

کے خلاف کوئی قانون بنانے کی کوشش کرتی تو نیو یارک کا ریپبلکن گورنر اسے وینو کر دیتا۔

”جب اس رپورٹر نے اس ”پلاٹ“ کے بارے میں جاننا چاہا تو کیسلر خاندان کے ایک ترجمان نے بتایا..... ہاں، حال ہی میں خاندان کے افراد، ایک پلاٹ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے ہیں اور یہ بات خبروں میں بھی آچکی ہے۔ شاید مسٹر پاورز نے یہ لفظ وہیں سے سنا ہوگا جب حال ہی میں مائیکل اور سارہ کی آنٹی گبریلہ ہومز کا انتقال ہوا تو ان کی تدفین کے سلسلے میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ لائک آئی لینڈ میں واقع ان کے خاندانی قبرستان میں پتھروں اور دوسری رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے بہت زیادہ کھدائی کی ضرورت تھی تاکہ ہومز کو اس پلاٹ میں دفن کیا جاسکے جہاں وہ چاہتی تھی۔ بہر حال وہ جگہ صاف ہوگئی اور پروگرام کے مطابق اس کی تدفین کر دی گئی۔ یہ تھا وہ پلاٹ جسے غلطی سے سازش سمجھ لیا گیا۔ میں مسٹر پاورز سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا بھی انہوں نے صحافت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی؟“

”آج تین بجے دی پاورز لچ بند ہو گیا اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ مائیکل کیسلر نے پہلے ہی کئی اونچے درجے کے وکیلوں سے ہتک عزت کا دعویٰ کرنے اور لاکھوں ڈالرز ہرجانے کا مطالبہ کرنے کے سلسلے میں مشاورت کر لی ہے۔“

”اوہ کئی!“ کیتھی نے ایک نشوونما سے آنکلیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم کامیاب ہوگئی ہو۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو تم نے کر دکھایا۔“

یہ سچ ہے کہ منصوبہ بالکل واضح تھا اور مکمل خود بھی حیران تھی کہ اس پر اتنی آسانی سے عمل ہوتا چلا گیا۔ کیتھی کا شوہر سام کیتھولک چرچ میں اکاؤنٹنٹ تھا اور ٹین کر کے کٹام طریقے سے ان متاثرین میں وہ رقم تقسیم کر دیتا جو پاور یوں کی زیادتی کا شکار ہوتے تھے۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا، وہ گرفتار ہونے اور سزا پانے کے لیے پوری طرح تیار تھا لیکن وہ پاورز کے بلاگ میں لگائے گئے داغ کو نہ دھو سکا جس نے شاید نادانستگی میں اسے ہی زیادتی کا مجرم قرار دے دیا۔ یہ ایک سفید جھوٹ تھا لیکن ایک بار یہ داغ لگ جائے تو کبھی نہیں نٹا۔ سام اس کے خلاف کارروائی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی اور نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے جھیل میں ڈوب گیا۔

مکول اسٹون (اس نے پاورز کو اپنا نام غلط بتایا تھا)

اس کا مطلب سمجھ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے توقع کے مطابق کامیابی ہوئی۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر مکول نے لیپ ٹاپ کھولا اور ایک ویب سائٹ کو کلک کر کے اس کا رخ اپنی بہن کی طرف کر دیا اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ وہ پاورز کی حریف ویب سائٹ ”آل دی نیوز“ بھی اور لکھنے والا ڈینیل لیویٹ تھا۔ اس بلاگ کا عنوان تھا ”ایک بلاگر کا اوجھا قدم!“

”کچھ گناہ اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بلاگر ٹریور پاورز نے صحافتی اخلاقیات کی قیمت پر شہرت حاصل کی اور اس کیڑے نے خود ہی اسے کاٹ لیا۔ میں مائیکل کیسلر کے بارے میں لکھے گئے اس بلاگ کی بات کر رہا ہوں جو آج صبح اس کی ویب سائٹ دی پاورز لچ پر دکھایا گیا۔ گوکہ میں کیسلر کا مداح نہیں ہوں لیکن کسی ایسی تحریر کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو صحافتی قدروں کے منافی ہو۔“

”پاورز نے کیسلر پر ایک پلاٹ کا الزام لگایا ہے جس سے اس کی مراد سازش ہے اور اس مضمون کی بنیاد ان حقائق پر رکھی گئی ہے جو سیاق و سباق سے ہٹ کر ہیں اور اخبارات میں کسی تحقیق کے بغیر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سازش کا خلاصہ یہ ہے کہ کیسلر نے اپنے چینل پر ڈیموکریٹک امیدوار کی انتخابی مہم چلانے کے لیے وقت خریدا تھا۔ پاورز کا دعویٰ ہے کہ یہ چوری کی اشتہار بازی ہے اور اس کا مقصد ڈیموکریٹک امیدوار کی انتخابی مہم کو سبوتاژ کرنا اور ریپبلکن امیدوار کی حمایت کرنا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کیسلر کے چینل نے خفیہ طور پر کوئی اشتہار نہیں خریدا بلکہ انہوں نے صرف ریپبلکن امیدوار کے لیے وقت مخصوص کیا تھا۔ ڈیموکریٹک امیدوار کی اشتہاری مہم کے لیے ایک دوسرے چینل سے وقت خریدنے کا منصوبہ تھا جس کا کیسلر سے کوئی تعلق نہیں۔ پاورز نے صرف یہ بات نوٹ کی کہ دونوں چینلز کا پتا ایک ہی ہے اور وہ میڈیسن اسکوائر پر واقع ہیں اور اس بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ دونوں چینل کیسلر کی ملکیت ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ اس عمارت میں تیس کے قریب انتخابی کمیٹیوں، لائنگ فرموں اور اشتہاری ایجنسیوں کے دفاتر ہیں جو ڈیموکریٹ اور ریپبلکن دونوں کے لیے کام کرتی ہیں۔“

”پاورز کو اس سارے معاملے میں سازش نظر آئی جو خلاف عقل ہے۔ کیسلر کو ڈیموکریٹک امیدوار سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر وہ جیت بھی جاتی اور بڑے کاروباری اداروں

کیلی فورنیا میں وکالت کرتی تھی۔ اس نے اپنی بہن پر زور دیا کہ وہ پاورز کے خلاف ہر جانے کا دعویٰ کرے اور معذرت یا وضاحت کا مطالبہ بھی کرے۔ کیتھی نے اس کے کہنے پر عمل کیا لیکن اس کا دعویٰ خارج ہو گیا جس کا ٹکول کو ڈر تھا۔ اس کے باوجود کیتھی سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے شوہر کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن تھک ہار کر خاموش ہو گئی البتہ اس کی بہن نے پاورز کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی اور پاورز کی بلاگ سائٹ بلکہ اس کے کیریئر کو تباہ کرنے کا عزم لے کر نیویارک چلی آئی جو سنسنی خیزی اور آدھے سچ کو صحافت کا نام دیتا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو جزوقتی صحافت کا طالب علم اور کاک ٹیل ویٹرس ظاہر کیا اور پاورز کے یہاں تنخواہ کے بغیر زیر تربیت ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے لگی۔ اس نے پاورز کی وہ تمام پوسٹ پڑھ ڈالیں جو اس نے گزشتہ چند برسوں میں لکھی تھیں۔ اس طرح اسے اس کی کمزوریوں کا علم ہو گیا۔ اسے کسی بھی سازش کا اشارہ ملا، چاہے وہ سچ ہو یا جھوٹ، وہ اس پر لکھ دیا کرتا تھا۔ اسے اس کے اثرات یا نقصانات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے پاورز کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ ایک عمل اور بے داغ منصوبہ بنانا چاہتی تھی۔ اسے حال ہی میں اخبار میں شائع ہونے والا مضمون یاد آیا جس میں کیسلر کے خاندانی قبرستان کا ذکر تھا اور یہ کہ انہیں اس پلاٹ کو حاصل کرنے میں کچھ مشکل پیش آرہی تھی جو ان کی مرنے والی آنٹی کے لیے مخصوص تھا۔

بار میں کیسلر اور اس کی بہن سارہ اسی پلاٹ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لیکن ٹکول نے اسے ایک سنسنی خیز کہانی کا روپ دے کر پاورز کو اس طرح ستایا جیسے وہ کسی سازش کا پلاٹ بنا رہے تھے۔ اسے سن کر پاورز کی بھوک چمک اٹھی اور اس نے ٹکول کو اس بارے میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے کہا۔ اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں کاغذ جمع کیے جو کیسلر کے بارے میں خبروں اور دیگر معلومات پر مشتمل تھے اور پاورز اس جال میں پھنس گیا۔

وہ کیتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”جو کچھ میں نے اسے دیا، وہ سب سچ تھا۔ یہاں تک کہ کیسلر کی آنٹی کے انتقال اور قبرستان کے بارے میں بھی خبر شامل کر دی۔“ ”اگر وہ اسے پڑھ لیتا۔“ کیتھی نے کہا۔ ”تو وہ جان سکتا تھا کہ یہ قبرستان کے پلاٹ کی بات ہو رہی تھی۔“

”ہاں لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کی پوری توجہ سازش پر مرکوز تھی۔ وہ وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو دیکھنا چاہتا تھا۔ البتہ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں بھی بے قصور نہیں تھی۔ میں نے ڈینیئل لیویٹ کو بتا دیا کہ شاید پاورز ایک مشتبہ اسٹوری دینے والا ہے اور پھر پاورز کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی کہ لیویٹ اس معاملے کی بوسگتھا پھر رہا ہے جو کہ غلط نہیں تھا۔“ ”اسی لیے پاورز نے تیزی دکھائی اور پوری طرح حقائق معلوم نہیں کئے جو کہ اسے کرنا چاہیے تھے۔“ ”اسے جھوٹی شان اور انا نے مار دیا۔“ ٹکول نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کے ساتھ ایک اور حرکت کی۔“ ”وہ کیا؟“

”وہ خفیہ اپنی ایک شاگرد کے ساتھ عشق لڑا رہا تھا۔ میں نے اسے فون پر بتایا کہ لیویٹ اس کی کہانی چرانے کے لیے کسی کو استعمال کر رہا ہے۔ اس کا شک اس لڑکی پر گیا اور ان میں علیحدگی ہو گئی۔“ ”اب اس کے ساتھ کیا ہوگا؟“ کیتھی نے پوچھا۔ ”میں نہیں جانتی لیکن وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔“ کیتھی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”سام ایک رحم دل شخص تھا۔ اسی لیے اس نے وہ رقم خرد برد کی تھی۔ وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا جو کچھ ہم نے پاورز کے ساتھ کیا۔“

ٹکول کے فون پر پیغام آیا۔ ”تم لوگوں سے کرمس پر ملاقات ہوگی۔ امید ہے کہ میرے خلاف یہ مقدمہ جلد ختم ہو جائے گا۔“

دونوں بہنیں بغل گیر ہو گئیں۔ کیتھی نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔ یہ بھی پلاٹ تھا۔ میں تمہارا شکر یہ ادا نہیں کر سکتی۔“ ”سام کے ساتھ یقیناً انصاف ہوگا۔ مجھے اپنی عدالتوں پر پورا یقین ہے۔“

”تم نے ہی اسے روپوش ہو جانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ اس پر لگا ہوا داغ دھندلا ہو جائے۔ اب یہ گروہٹ چکی ہے اور وہ قانون کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔“ ”میرا کام ختم ہو گیا۔“ ٹکول قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں کل صبح کیلی فورنیا چلی جاؤں گی۔ اپنا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

نظر فریب

سرزا امجد بیگ

بات شخصیت کی ہو یا کسی بھی جوڑ کی اگر... متوازن ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے مگر جہاں اس توازن میں اونچ نیچ ہوئی وہیں نگاہوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ جو اپنا لگتا ہے اچانک غیر ہو جاتا ہے۔ گویا غیر متوازن انداز میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تقدیر نے کچھ ایسا ہی جوڑ اس کا بھی بنا دیا تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر فریب کی پٹی باندھ لی... ان دونوں کا کوئی جوڑ نہ تھا جسے زبردستی باندھ تولیا گیا مگر اسے ایک نہ ایک دن ٹوٹ جانا تھا اور پھر اس ایک لمحے میں اس جوڑ توڑنے ان کی زندگی کا منظر نامہ ہی بدل ڈالا۔ یہ اور بات کہ مرغی جان سے گئی اور کھانے والے کو سوا دی نہیں آیا مگر... ہر بار ایسا نہیں ہوتا کہ صرف مرغی خاموشی سے ذبح کر دی جائے۔ کبھی کبھی رائگاں جانے والی قربانی بڑی شدت سے اپنا حساب مانگتی ہے۔

پُر خلوص جذبوں کی تذلیل کرنے والے ایک فریبی کا

عبرت اثر انجام

سے اکتوبر تک ان لوگوں کی زندگی میں اے سی کا عمل دخل رہتا ہے جو اے فورڈ کر سکتے ہیں۔
لگتا ہے، اے سی اور کاٹن کے سوٹ کی زمانہ قدیم سے کوئی خاص رشتہ داری ہے۔ انہیں حاصل کرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا بعد میں بھگتا۔ اگر بجلی چوری نہ کریں اور سوٹ کی کلف دار دھلائی کر دیا جائے تو دونوں کے بلز دماغ کی چوکیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔
ان دنوں میرے آفس کا اے سی سروس کے لیے گیا ہوا تھا لہذا سیلنگ فین سے گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی ایک جتنی ہوئی جس زدہ سہ پہر تھی۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ سیکریٹری نے بتایا، صدیقی صاحب کی کال ہے۔ میں نے اسے کال ٹرانسفر کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اگلے ہی لمحے صدیقی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بیگ صاحب! السلام علیکم.....“

منظیر صدیقی سے میری بہت پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ ایک فلاحی تنظیم کے روح رواں تھے۔ جواباً میں نے شائستہ لہجہ میں ان سے کہا۔

”علیکم السلام!“

”آپ کیسے ہیں؟“ صدیقی نے پوچھا۔ ”کام کیسا

وقت بادشاہ ہے اور..... یہ بادشاہ، بادشاہوں کے بادشاہ مالک کائنات کے حکم پر انسانوں سے کہتا ہے۔ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دولت کی طرح یہ کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس زیادہ نہیں ہوتا۔ ہر دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور ہر ہفتے میں سات دن۔ یہ الگ بات کہ زیرک اور چابک دست انسان موقع شناس ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو پرکھنے اور برتنے کا ہنر جانتے ہیں لہذا وہ کچھ داری کا مظاہرہ کر کے وقت کو اپنے لیے سودمند بنا لیتے ہیں جبکہ نالائق اور عاقبت نااندیش افراد اپنی کوتاہیوں اور غلط فیصلوں کے باعث وقت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ وقت اپنی فطرت کے مطابق ہمیشہ آگے کی سمت سفر کرتا ہے اور گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ بل اس کے کہ وقت ہماری مخالفت میں کوئی فیصلہ سنا دے، ہمیں اپنے معاملات زندگی کا قبلہ درست کر لینا چاہیے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ اس سال اپریل کے آغاز ہی سے گرمی نے زور پکڑ لیا تھا۔ ویسے تو کراچی میں پورا سال ہی اے سی کی ضرورت بہر حال موجود رہتی ہے لیکن اگر محتاط اندازہ بھی لگائیں تو آٹھ سے دس ماہ کہیں نہیں گئے، خاص طور پر مارچ



چل رہا ہے؟“
”اللہ کا کرم ہے، آپ سنا لیں۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے بتایا پھر پوچھا۔
”آپ آج کتنے بجے تک آفس میں موجود رہیں گے؟“

”کم از کم نو بجے رات تک تو ہوں۔“ میں نے
جواب دیا۔ ”اس کے بعد کا انحصار کلائنٹس کی آمد پر ہے۔“

”میں آپ کے پاس ایک بندے کو بھیج رہا ہوں۔
اس کا نام شا کر علی ہے۔“ صدیقی صاحب نے کہا۔ ”اس کی
ایک عزیزہ کسی قانونی مسئلے میں پھنسی ہوئی ہے۔ آپ ان
لوگوں کے لیے وقت نکال لیجیے گا۔“

”جی، میں ضرور وقت نکال لوں گا لیکن آپ کو پتا
ہے نا.....“

”جی، مجھے بالکل پتا ہے۔“ وہ قطع کلامی کرتے
ہوئے خوش دلی سے بولے۔ ”کہ آپ فیس کے بغیر کسی کیس
میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ میں نے بھی جواباً زندہ
دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فیس کی وصولی کے علاوہ
بھی میرا ایک اصول ہے۔“

”وہ کیا؟“ انہوں نے استفسار کیا۔
”میں صرف اسی شخص کے کیس میں ہاتھ ڈالتا ہوں جس
سے مطمئن ہو جاتا ہوں۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”یہ آپ کا حق ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولے۔
”اگر آپ کو اطمینان محسوس نہ ہو تو آپ اس کیس کو چھوڑ سکتے
ہیں اور فیس کے لیے بھی بے فکر ہو جائیں۔ یہ کوئی چیرائی
ایشو نہیں ہے جو میں آپ سے فیس میں رعایت کے لیے
درخواست کروں۔ آپ کلائنٹ سے اپنی پوری فیس وصول
کیجیے گا۔“

میں نے صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اختتامی
کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ موقوف
ہو گیا۔

ٹھیک آٹھ بجے مظہر صدیقی کا بھیجا ہوا وہ بندہ
میرے سامنے بیٹھا تھا۔ شا کر علی کی عمر کا اندازہ میں نے
پہننا لیس اور پچاس کے درمیان قائم کیا۔ وہ ایک خوش لباس
اور دراز قامت شخص تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ موجود تھا۔

صحت مناسب اور سر کے بال درمیان سے خاصی حد تک
رخصت ہو چکے تھے۔ شا کر علی نے بعد ازاں مجھے بتایا کہ
طارق روڈ پر اس کا ایک ریسٹورانٹ تھا جو خوب چلتا تھا۔ اس
کی رہائش گلشن اقبال کے علاقے میں تھی۔ اپنی وضع قطع اور

”شا کر صاحب! تو جیہہ اور وضاحت سے کسی کیس
کی سنگینی کم نہیں ہو جاتی۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کسی نے قتل کیا
ہے تو وہ ہر حال میں قاتل ہی کہلائے گا۔ ہر جرم کا کوئی نہ کوئی
سبب یا محرک ضرور ہوتا ہے۔“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“
وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”جب آپ اس کیس کے پس

سپنس ڈائجسٹ 2017ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

منظر سے آگاہ ہوں گے تو مجھے یقین ہے، آپ کو بھی نادورہ سے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس کے معاملے میں گہری دلچسپی لینے پر تیار ہو جائیں گے۔“

”اور وہ پس منظر کیا ہے؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
”بے چاری نادورہ کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔“ شاکر علی نے بتایا۔ ”کامران نے پہلے ایک قریب سے نادورہ کے ساتھ شادی کی پھر اس کا بنگلہ بیچ ڈالا اور ایک سازش کے تحت لاہور سے فرار ہو کر کراچی آ گیا اور یہاں آنے کے بعد اس نے فوزیہ نامی ایک طرح دار حسینہ سے شادی کر لی اور.....“

”ایک منٹ شاکر صاحب۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ”کیا آپ کی اس عزیزہ نادورہ کا تعلق لاہور سے ہے؟“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”اور کامران کو اس نے کہاں قتل کیا ہے؟“
”کراچی میں۔“ اس نے بتایا۔ ”بہادر آباد کے علاقے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ کامران اپنی دوسری بیوی فوزیہ کے ساتھ بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے رف پینڈ پر اہم نوٹس لینے کے بعد کہا۔ ”آپ اپنی بات جاری رکھیں شاکر صاحب۔“
”کامران، نادورہ کو لوٹنے کے بعد لاہور سے کراچی آ گیا تھا۔“ وہ سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
”یہاں اس نے خود کو چاول کا ایک بیوپاری ظاہر کیا اور بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ چند روز بعد فوزیہ نامی ایک لڑکی سے اس کی ملاقات ہوئی اور جلد ہی ان کے بیچ خاصے مضبوط تعلقات استوار ہو گئے جو شادی پر منتج ہوئے اور اب.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اور اب وہ فوزیہ کے ہمراہ پاکستان سے امریکا جانے کے لیے پرتول ہی رہا تھا کہ نادورہ لاہور سے کراچی پہنچ گئی۔ وہ کامران سے کڑی باز پرس کرنے آئی تھی لیکن اس ملاقات پر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نادورہ نے طیش کے عالم میں کامران کو قتل کر ڈالا۔“

”نادورہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کامران کراچی میں موجود ہے اور اس نے دوسری شادی کر لی ہے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”معلومات میں نے اپنے ایک رشتے دار صفدر علی تک پہنچائی تھیں۔“ اس نے بتایا۔ ”صفدر علی، نادورہ کا لاہور

میں پڑوسی رہا ہے۔“
”تو کیا آپ کراچی میں کامران سے ملنے جلتے رہتے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”جو آپ کو اس کے بارے میں یہ سب معلومات تھیں؟“

”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ایک اتفاق تھا کہ چند روز پہلے میں نے کامران کو ایک دلکش عورت کے ساتھ اپنے ریستورنٹ میں دیکھا۔ میں لاہور میں ایک مرتبہ نادورہ اور کامران سے مل چکا تھا۔ یہ بس سرسری سی ملاقات تھی لہذا میں جانتا تھا کہ کامران نادورہ کا شوہر ہے۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے چنانچہ کامران کا چہرہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ جب میں نے اسے اپنے ریستورنٹ میں دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ کامران مجھے دیکھ نہیں پایا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر ساری صورت حال سے صفدر علی کو آگاہ کر دیا۔“

”اور پھر نادورہ نے کراچی پہنچ کر کامران کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟“ میں نے سرسرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے اس بات کا یقین ہے وکیل صاحب کہ نادورہ اس کی جان لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”بس سب کچھ آنا فانا ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، پیش آمدہ حالات کی روشنی میں نادورہ کے لیے کافی گنجائش نکالی جاسکتی ہے..... مطلب یہ کہ اسے پھانسی لگنے یا عمر قید سے بچایا جاسکتا ہے اور یہی میرا مقصد بھی ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”نادورہ کی فیملی میں اس کیس کی پیروی کون کرے گا؟“

”اس کی فیملی میں کوئی بھی قریبی رشتے دار زندہ نہیں ہے۔“ شاکر علی نے بتایا۔ ”اور اگر کوئی زندہ ہے بھی تو اس کی کوئی خبر نہیں۔ یوں سمجھیں کہ اس کیس میں نادورہ کی پشت پر میرے عزیز صفدر علی کا ہاتھ ہے اور یہاں کے سارے معاملات میں دیکھوں گا۔ آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کا جو بھی ایشو ہو، وہ آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں شاکر صاحب۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نادورہ کے کیس میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے.....“

”کیسی شرط وکیل صاحب؟“ وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صدیقی صاحب نے بتایا

کبھی منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی اداکاری میں اتنی جان تھی کہ نادرہ کو ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نیت پر شک نہیں ہوا۔ کامران نے نادرہ پر اپنی محبت کا جال پھینکنے سے پہلے اس کے بارے میں مکمل چھان بین کر لی تھی۔ کسی منصوبے کا ہوم ورک اچھا ہو تو کامیابی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

کامران نے خود کو ایک دل گرفتہ اور محبت میں ناکام بلکہ محروم شخص کی حیثیت سے نادرہ کے سامنے پیش کیا اور اپنی چرب زبانی کے طفیل نادرہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نادرہ سے شدید نوعیت کی محبت کرنے لگا ہے۔ نادرہ واجبی سی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اسے اپنے سے کم عمر کا ایک وجیہہ و شکیل عاشق میسر آیا تو اس کے سوچنے بچھنے کی صلاحیت کو زنگ لگ گیا۔ جواباً نادرہ کو بھی کامران سے محبت ہو گئی۔ چند ملاقاتوں میں نادرہ پر کامران کا ایسا رنگ چڑھا کہ وہ اس سے شادی کے لیے تیار ہو گئی۔

اس شادی کی خبر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کی ملاقاتیں لوگوں کے علم میں آ چکی تھیں۔ نادرہ کی فیملی کا کوئی چھوٹا بڑا اس کے آس پاس موجود نہیں تھا جو ان دونوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے مراسم میں کوئی رکاوٹ ڈالتا یا کوئی سوال اٹھاتا۔ بڑی صبر و تحمل کے کانوں تک جب نادرہ کے ارادوں کی خبر پہنچی تو اسے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ مرحوم ملک وحید کے ساتھ صفر علی کے اچھے مراسم تھے لیکن ظاہر ہے، وہ نادرہ کو کھل کر منع تو نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ملک وحید کے انتقال کے بعد سے نادرہ نے اپنے پڑوسیوں سے میل ملاقات بہت کم کر دی تھی۔ سچی بات تو یہ کہ نادرہ آزاد اور خود مختار عورت تھی۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔ اگر اس نے ایک خوب رو جوان مرد سے شادی کرنے کی ٹھان لی تھی تو اس نیک کام سے کون اسے روک سکتا تھا۔ قصہ مختصر، ایک سادہ سی تقریب میں ان کی شادی ہو گئی۔

روایت تو یہی ہے کہ لڑکیاں بیاہ کر اپنی سسرال میں جاتی ہیں لیکن یہاں کامران بیاہ کر رہنے کے لیے نادرہ کی گودھی میں چلا آیا تھا۔ نادرہ بہت خوش تھی جیسے یہ شادی کر کے اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے لیا ہو۔ ہنی مون کا عرصہ وہ دونوں ایک دوسرے میں کم رہے۔ بس کامران ڈیوٹی پر جاتا۔ باقی کا سارا وقت وہ نادرہ کی معیت میں گزارتا۔ اس دوران میں کامران نے اسے اتنی محبت دی کہ وہ کامران کی بے دھام کتیز بن کر رہ گئی۔ اسے کامران

اور تمام قیمتی اشیاء فروخت کر کے بھاری رقم ان کمپنیوں کے پاس رکھوا دی تھیں۔ مذکورہ کمپنیوں نے بالآخر اپنے کھاتے داروں کے ساتھ کیا ”سلوک“ کیا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس عبرت ناک تاریخ ماضی سے آپ سب اچھی طرح واقف ہیں۔

لاح انسان کی فطرت کا لازمی جزو ہے اور مال و دولت کا لالچ دیگر اشیائے ضروریہ پر ہمیشہ سبقت رکھتا ہے کیونکہ سکھ راج الوقت سے انسان کے ننانوے فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں چنانچہ کسی خیال کے تحت نادرہ نے بھی ایک انویسٹمنٹ کمپنی کا رخ کیا۔

نادرہ کی جو رقم بینک میں رکھی تھی، اس پر ملنے والے منافع سے دو گنا منافع ایک انویسٹمنٹ کمپنی دے رہی تھی لہذا انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس نے بینک سے رقم نکال کر اس انویسٹمنٹ کمپنی میں لگا دی۔ مذکورہ کمپنی کا نام آپ ”اورنٹ انویسٹرز“ فرض کر لیں..... مطلب راتوں رات امیر بنادینے والی کمپنی!

جب دو تین ماہ تک طے شدہ منافع نادرہ کے ہاتھ میں آتا رہا تو اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں موجود یہ خدشہ بھی نکل گیا کہ کہیں ”اورنٹ انویسٹرز“ والے اس کے ساتھ کوئی ہاتھ نہ کر جائیں۔ ہر ماہ دو گنا منافع ملنے لگا تو ذہن و دل کے تمام اندیشے رخصت ہو گئے۔ وہ مطمئن اور پرسکون ہو گئی لیکن یہ سگون کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

اورنٹ انویسٹرز کے آفس میں نادرہ کی کامران سے ملاقات ہوئی۔ کامران مذکورہ کمپنی میں ملازم تھا۔ کامران کی عمر تیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ بہت ہی بینڈسم اور اسارٹ شخص تھا۔ اس پر مستزاد اس کی خوش اخلاقی نے نادرہ کو بہت متاثر کیا۔ کامران کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک دل آویز مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور وہ سامنے والے کی بات بہت توجہ سے سنتا تھا۔ اس کے رویے کو دیکھ کر کوئی اس کی عیاری اور خباثت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا چنانچہ سادہ لوح نادرہ بھی اس کی لچھے دار باتوں میں آگئی۔ نتیجتاً وہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے اور یہ قربت گل کھلائے بتانہ رہ سکی۔

اس وقت کامران کی عمر تیس سال تھی جبکہ نادرہ چالیس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی مگر عمروں کا یہ تفاوت ان کی ملاقاتوں کے جوش و جذبات پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ کامران ایک ہوشیار اور چال باز شخص تھا۔ وہ ایک سوچے

کے سوا اس دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گویا کامران بڑی ہوشیاری اور کامیابی کے ساتھ اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی راہ پر گامزن تھا۔ ایک رات کامران نے نادرہ سے کہا۔

”ہنی! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے.....“

نادرہ چونک اٹھی۔ ایک واجبی سی شکل و صورت کی مالک چالیس سالہ عورت کو جب اس کا خوبو تیس سالہ شوہر ”ہنی“ کہہ کر مخاطب کرے تو آپ مذکورہ عورت کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

”کیسی خوش خبری کامران؟“ نادرہ نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

”چند روز بعد میری کمپنی انویسٹ منٹ کی ایک نئی اسکیم لانچ کر رہی ہے۔“ کامران نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”لیکن اس اسکیم میں ہر کوئی اپنی رقم نہیں لگا سکے گا۔“ ”کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں۔“ نادرہ کے لہجے میں الجھن درآئی۔

”مطلب یہ کہ اس اسکیم میں اچھائی تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس ایک سادہ سا فارم بھر کر جمع کرانا ہوگا لیکن صرف دس افراد کو اس اسکیم میں رقم لگانے کی اجازت دی جائے گی اور.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اور ان دس خوش قسمت افراد کا فیصلہ قرعہ اندازی کی بنیاد پر ہوگا۔“

”ایسی کیا اسکیم ہے جو اتنی لمبی چوڑی احتیاط برتی جا رہی ہے؟“ نادرہ پوچھے بناترہ سکی۔

”سنوگی تو پھڑک اٹھوگی۔“ کامران اس کے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہت ہی خاص قسم کی اسکیم ہے۔ صحیح معنوں میں راتوں رات امیر بنا دینے والی۔“

”میں ضرور سننا چاہوں گی۔“ نادرہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ ”مجھے تفصیل سناؤ۔“

”اگر کوئی شخص صرف سودن کے لیے ہماری کمپنی میں اپنا سرمایہ لگائے گا تو ٹھیک سودن کے بعد اس کی رقم دوگنا ہو جائے گی۔“ کامران نے بتایا۔

”اوہ.....“ نادرہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو واقعی بڑی زبردست اسکیم ہے۔“

”زبردست تو ہے مگر اس کے ساتھ ہی ایک مشکل بھی ہے.....“

”کیسی مشکل؟“ کامران کی ادھوری بات کے جواب میں نادرہ نے سوال کیا۔

”اس اسکیم میں کم از کم بیس لاکھ کی انویسٹمنٹ کی شرط ہے۔“ کامران نے بتایا۔ ”جو سودن کے بعد چالیس لاکھ روپے ہو جائیں گے۔ سودن کے بعد رقم لگانے والا اگر چاہے تو چالیس لاکھ روپے کمپنی سے وصول کر لے اور اگر چاہے تو مزید سودن کے لیے انویسٹ کر کے اس رقم کو اتنی لاکھ بنالے۔“

”واقعی، یہ اسکیم تو بہت ہی سنسنی خیز اور منافع بخش ہے۔“ نادرہ نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”مگر اس کے ساتھ قرعہ اندازی کا دم چھٹا بھی تو لگا ہوا ہے نا.....“

”اس دم چھلے کا توڑ ہے میرے پاس۔“ کامران نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ نادرہ نے استفسار کیا۔

”کمپنی میں میرا اتنا اثر و رسوخ تو ہے کہ میں اپنا نام قرعہ اندازی میں بآسانی نکلوا سکتا ہوں۔“ کامران نے بتایا۔

”زبردست!“ نادرہ نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اس اسکیم میں رقم لگانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہو؟“

”ہر عقل مند اور ذی شعور شخص اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں ضرور سوچے گا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ کامران نے جملہ ادھورا اچھوڑا تو نادرہ نے پوچھا۔

”لیکن یہ کام محض عقل اور شعور کے بل بوتے پر ہونے والا نہیں۔“ کامران بڑی صفائی سے اپنے مقصد کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اس اسکیم میں حصہ لینے کے لیے بیس لاکھ نیٹ کیش کی بھی ضرورت ہے۔“

”اور تمہارے پاس بیس لاکھ نہیں ہیں۔“ نادرہ نے کہا۔ ”ہیں نا؟“

”میں زیادہ سے زیادہ ادھر ادھر سے پکڑ کر پانچ لاکھ روپے جمع کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اس بزنس کے لیے مزید پندرہ لاکھ کی ضرورت ہوگی۔“

”بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں کامران؟“ نادرہ نے وارفتگی کے عالم میں کہا۔

”تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔“ وہ نادرہ کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے بولا۔ ”مگر میں کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہوں کہ کہیں تمہیں برانہ لگ جائے۔“

وہ محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ جنگل بیابان میں بھی رہ سکتی ہوں۔ تمہاری محبت میرے لیے کسی شاہی محل سے کم نہیں ہے۔ بس، میرے ذہن میں ایک خوف سا ہے۔“

”کیسا خوف؟“ کامران نے استفسار کیا۔

”میں لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔“ وہ اپنے خدشات کو نوک زبان تک لاتے ہوئے بولی۔ ”اگر خدا نخواستہ کوئی اونچے سچ ہوگئی تو.....“

”اس کا مطلب ہے، تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔“ کامران نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔

”ایسا نہ کہو کامران!“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”میری جان بھی تم پر قربان ہو۔“

”پھر کیا مسئلہ ہے؟“

”اصل میں یہ رقم ہم کمپنی میں لگائیں گے نا۔“ نادرہ

نے دبی زبان میں کہا۔ ”اگر وہاں کوئی ٹرڈ ہوگئی تو.....؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے

مضبوط لہجے میں بولا۔ ”یہ انویسٹمنٹ کمپنی بہت مستحکم ہے۔

تمہیں باقاعدگی کے ساتھ کئی ماہ سے منافع مل رہا ہے نا.....

اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک سود

کے بعد ہم چالیس لاکھ کے مالک بن جائیں گے اور.....

دیکھ لینا، یہ تین ماہ پر لگا کر اڑ جائیں گے۔“

کامران کی بات نادرہ کی سمجھ میں آگئی اور وہ اپنی

کونٹری فروخت کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ کامران نے اپنے

روئے سے نادرہ کے دل و دماغ کو اس طرح اپنی منگی میں

جکڑ رکھا تھا کہ وہ اس کی ذات کے حوالے سے منی انداز میں

سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ رشتے میں کامران اس کا مجازی خدا

تھا مگر وہ کامران کی فریبی محبت میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ

حقیقی خدا سے زیادہ اس پر بھروسہ کرنے لگی تھی اور..... اس

نوعیت کے اندھے اعتماد کا جو انجام ہوتا ہے، نادرہ کے ساتھ

بھی وہی ہوا۔

شادمان کالونی والی کونٹری لگ بھگ پندرہ لاکھ میں

فروخت ہوگئی اور وہ لوگ اچھرہ والے مکان میں شفٹ

ہو گئے۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ واقعہ آج سے بہت

سال پہلے کا ہے۔ مذکورہ کونٹری کی قیمت آج کی مارکیٹ کے

حساب سے کسی بھی طرح دس کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔

اچھرہ والے مکان میں رہائش اختیار کیے انہیں لگ

بھگ ایک ماہ ہو چکا تھا۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی

تھی۔ کامران نے نادرہ کے اطمینان کی خاطر دیوار گیر کیلنڈر

”تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگ سکتی کامران۔ تم میری زندگی ہو، میرا سب کچھ ہو۔“ وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ”بتاؤ، کیا کرتا ہے؟“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“ کامران نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”اگر اس آئیڈیا پر عمل کیا جائے تو پندرہ لاکھ روپے حاصل ہو سکتے ہیں۔“

”اور وہ آئیڈیا کیا ہے؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”ہم اس کونٹری کو فروخت کر دیتے ہیں۔“ کامران نے اپنا ارادہ ظاہر کر ہی دیا۔

کامران کو یقین تھا کہ نادرہ اس کی بات سے انکار نہیں کر سکے گی۔ اس نے نادرہ کے دل و دماغ میں اترنے کے لیے بہت ”محنت“ کی تھی لہذا اب اس محنت کا پھل کھانے کا وقت آ گیا تھا۔

”یہ کونٹری تمہاری کسی خواہش سے زیادہ اہم نہیں ہے کامران۔“ نادرہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ہم سو دن تک رہیں گے کہاں؟“

”یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔“ کامران چالاکی سے بولا۔ ”لہذا میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔“

”کیسا بندوبست؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”میرے ایک دوست کی فیملی تین چار ماہ کے لیے

سعودی عرب جا رہی ہے۔“ وہ کمال ہوشیاری سے بولا۔ ”ان

کی غیر موجودگی میں وہ گھر خالی رہے گا۔ تین کمروں کا صاف

سترا گھر ہے۔ میں نے اپنے دوست سے اس سلسلے میں بات

کر لی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تین ماہ کے لیے اپنا

گھر مجھے استعمال کرنے کے لیے دینے کو راضی ہے۔“

”تمہارے دوست کا گھر کس علاقے میں ہے؟“

نادرہ نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھا۔

”اچھرہ میں۔“ کامران نے بتایا۔ ”ادھر سلطان

احمد روڈ پر گلاس ٹیکنری کے نزدیک ہے یہ گھر۔“

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ کامران نے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ اچھرہ والا وہ گھر شادمان کالونی

والی اس کونٹری کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا لیکن جانو..... صرف سو

دن کی تو بات ہے۔ اس کے بعد چالیس لاکھ ہمارے ہاتھ

میں ہوں گے تو ہم اپنی مرضی سے شہر کے کسی پوش علاقے

میں عالی شان گھر خرید لیں گے۔ بس، چند روز تک تمہیں

میرے ساتھ قدرے چھوٹے گھر میں رہنا ہوگا۔“

”بات چھوٹے اور بڑے گھر کی نہیں ہے کامران۔“

پر بولند مار کر کی مدد سے سودن کی تارخوں کے گرد دائرے لگا دیے تھے اور ایک سو ایک والے دن پر لکھا تھا..... جشن آزادی..... اور اتفاق سے یہ تاریخ تیرہ اگست تھی یعنی اگلے روز چودہ اگست کو پاکستان کا "یوم آزادی" بھی تھا۔ اس سال وہ ڈبل جشن آزادی منانے والے تھے۔

نادرہ دن دن گن کر تیرہ اگست کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک روز اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس شام کامران دفتر سے گھر واپس نہیں آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد جب اس کی تشویش پریشانی میں بدلنے لگی تو اس نے کمپنی کے آفس فون کیا مگر اس وقت تک آفس بند ہو چکا تھا۔ اس صورت حال نے اسے عجیب سی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ کئی بار اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کامران کے کسی دوست کا اس کے پاس نمبر بھی نہیں تھا کہ وہ فون کر کے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لیتی۔ وہ پوری رات اس نے اپنے گھر میں ٹپکتے ہوئے گزار دی۔

شادی کے بعد یہ پہلی رات تھی جو اس نے کامران کے بغیر بسر کی تھی۔ جب وہ لوگ اچھرہ والے مکان میں شفٹ ہوئے تھے تو کامران نے ایک پتل لاکر نادرہ کو دیا تھا۔ "یہ کس لیے ہے؟" نادرہ پستول کو دیکھ کر بولی تھی۔ "نئی جگہ ہے، نئے لوگ ہیں لہذا تمہیں ڈر خوف محسوس ہو سکتا ہے۔" کامران نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔"

"اوہ..... تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔" نادرہ ستائشی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "مگر میں نے کبھی گن استعمال نہیں کی۔ اگر کبھی ضرورت پڑ بھی گئی تو میں اس پستول کو چلاؤں گی کیسے؟"

"اللہ نہ کرے کہ کبھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئے۔" کامران نے کہا۔ "یہ حفظہ ماتقدم کے لیے ہے تاہم میں تمہیں پستول چلانا سکھا بھی دوں گا۔ ویسے یہ دکھانے سے بھی کام چل جاتا ہے۔ بعض لوگ تو کھلونا پستول سے چوری اور ڈکیتی کی بڑی بڑی وارداتیں کر ڈالتے ہیں، یہ تو پھر بھی اصلی ہے۔ اگر تمہیں کبھی کسی بھی شخص سے کوئی خطرہ محسوس ہو تو تم فوراً پستول نکال لینا۔ وہ تمہارے ہاتھ میں گن دیکھتے ہی پسا ہو جائے گا اور تم محفوظ رہو گی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے نادرہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"چور، سانپ اور ہتھیار کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ یہ اصلی ہوں یا تھکی، سامنے والے کے چٹکے چمڑا دیتے ہیں۔" اس رات بھی مذکورہ پستول نادرہ کے پاس تھا لیکن کامران کے واپس نہ آنے کی پریشانی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی جو اسے پستول کا خیال آتا۔ وہ مضطرب اور فکر مند تھی کہ اس کے شوہر کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے..... کہیں کامران کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟

وہ رات جیسے تیسے گزری۔ اگلی صبح وہ اس کے آفس پہنچ گئی اور یہاں آ کر گویا اس پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ اسے بتایا گیا کہ کامران نے چند روز پہلے کمپنی کو چھوڑ دیا ہے۔ اسے کوئی اور اچھی جاب مل گئی تھی لہذا وہ کمپنی کو اپنا استعفا دے کر رخصت ہو گیا تھا اور اب اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اس صورت حال نے نادرہ کے دماغ کا فیور اڑا دیا۔ وہ کمپنی کے منیجر کے کمرے میں پہنچ گئی اور اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ منیجر نے توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"بی بی! اگر آپ بالکل سچ کہہ رہی ہیں تو پھر اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہمارے ریکارڈ میں تو یہ بھی نہیں ہے کہ کامران نے آپ سے شادی کی تھی۔ بہر حال، وہ ہماری کمپنی چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب اس سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

"اور وہ میں لاکھ کی انویسٹ منٹ.....؟" نادرہ نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا، کامران نے آپ کے ساتھ سنگین دھوکا کیا ہے۔" منیجر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ہماری کمپنی نے ایسی کوئی اسکیم لالچ نہیں کی جس میں رقم لگانے سے سودن میں پیسے دو گنا ہو جاتے ہوں۔ اگر آپ کی کہانی سچی ہے تو پھر کامران نے آپ کو الو بنایا ہے البتہ آپ نے ابتدا میں ہماری کمپنی میں جو رقم انویسٹ کی تھی، اس پر آپ کو ہر ماہ باقاعدہ منافع ملتا رہے گا اور آپ جب چاہیں وہ رقم نکالوا بھی سکتی ہیں۔"

"میرے ساتھ فراڈ ہوا ہے اور آپ کی کمپنی کے ایک نمائندے نے مجھے دھوکا دیا ہے۔" نادرہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔"

"میڈم! پہلی بات تو یہ کہ کامران یہ کمپنی چھوڑ کر جا چکا ہے۔" منیجر نے دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے

کہا۔ ”اب اس کا اس کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ آپ کے ساتھ آپ کے شوہر نے فراڈ کیا ہے تو آپ بڑے شوق سے پولیس کے پاس جائیں اور اپنے شوہر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں۔“

”مگر میں نے اپنی کوٹھی چھ کر بیس لاکھ آپ کی کمپنی میں لگائے تھے۔“ نادرہ شپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آپ اتنی آسانی سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔“

”اگر آپ نے ”اور ٹائٹ انویسٹرز“ کی کسی اسکیم میں بیس لاکھ کی خطیر رقم لگائی ہے تو آپ کے پاس اس انویسٹمنٹ کے ڈاکیومنٹس بھی ہونا چاہئیں جیسا کہ آپ کی ابتدائی انویسٹمنٹ پر ڈاکیومنٹس تیار کیے گئے تھے۔ لائیں دکھائیں مجھے وہ بیس لاکھ کی سرمایہ کاری کے کاغذات!“

”میرے پاس اس رقم کی سرمایہ کاری کے ثبوت کے طور پر ایک پرزہ بھی نہیں ہے۔“ نادرہ روہانسی ہو گئی۔ ”میں نے یہ رقم اپنی کوٹھی چھ کر کامران کے ہاتھ میں دی تھی۔“

”تو پھر جا کر آپ کامران ہی سے بیس لاکھ کا حساب طلب کریں۔“ منیجر نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے بقول، وہ آپ کا شوہر ہے، تو اس تناظر میں یہ آپ لوگوں کا خانگی معاملہ ہے۔ ہماری کمپنی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں لگتا لہذا آپ میرا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔ مجھے اور بھی بہت سارے ضروری کام ہیں۔“

نادرہ کا ذہن بار بار چچ رہا تھا کہ کامران اسے جوتا لگا کر فوجی ہو چکا ہے مگر دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دل کے نزدیک ”اور ٹائٹ انویسٹرز“ کا منیجر بھی جھوٹا تھا۔ کامران نے ابھی جا ب بھی نہیں چھوڑی تھی اور اس نے پوری دنیا کو اپنی شادی کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا اور..... یہ کہ وہ کسی ایسی مصیبت میں گرفتار تھا کہ نادرہ کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔

نادرہ کو اس کا دل جو یقین دہانیاں کر رہا تھا اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ اس کی محبت کا اعجاز تھا جو وہ کامران سے کرتی تھی۔

شاید اسی لیے محبت کو اندھی کہا جاتا ہے کہ یہ عقل پر تالا ڈال دیتی اور منطق کا منہ بند کر دیتی ہے اور..... نادرہ نے ٹوٹ کر کامران سے محبت کی تھی۔ محبت میں عقل اور منطق کا کوئی عمل دخل نہیں۔

چند روز بعد نادرہ کی محبت پر اس وقت ایک کاری چوٹ پڑی جب ایک شخص نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔

”کامران صاحب کہاں غائب ہیں؟“

”آپ کون؟“ نادرہ کے لیے وہ شخص اجنبی تھا لہذا وہ اس کے سامنے اپنی چٹائیں رکھ سکتی تھی۔ ”آپ کو کامران سے کیا کام ہے؟“

”بی بی! آج اس مینیج کی دس تاریخ ہو گئی ہے۔“ اس شخص نے بتایا۔ ”ابھی تک کرایہ نہیں پہنچا جبکہ میں نے کامران صاحب پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ہر صورت کرایہ ادا کرنا ہوگا۔“

نادرہ کو یہ سمجھنے میں چنداں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس مکان کے سلسلے میں بھی کامران نے اس کے ساتھ سنگین نوعیت کی غلط بیانی کی تھی۔ یہ مکان اس کے کسی دوست کا نہیں بلکہ کرائے کا تھا اور مالک مکان اس وقت اس کے سامنے کھڑا تھا اور کرائے کا تقاضا کر رہا تھا۔

چاہے کچھ بھی تھا لیکن نادرہ کو اپنی محبت کی توہین گوارا نہیں تھی۔ اس نے اپنے اندرونی بھونچال پر جیسے تیسے قابو پایا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں بہت معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو کرائے کے لیے میرے دروازے تک آنا پڑا۔ اصل میں، کامران چند روز سے لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ کرائے کے بارے میں مجھے بتانا بھول گئے ہوں گے۔ بہر حال، میں کل آپ کو کرایہ دے دوں گی۔“

مالک مکان شکر یہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

اس نئے ہولناک انکشاف نے نادرہ کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بند کمرے میں رونے لگی تاکہ اس کی محبت کی رسوائی کی داستان اس مکان کے در و دیوار سے باہر نہ جاسکے۔

کرایہ ادا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیسے رہتے تھے۔ ”اور ٹائٹ“ سے ماہانہ اتنا منافع مل جاتا تھا کہ وہ مذکورہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی بڑے اچھے انداز میں گزر بسر کر سکتی تھی۔ مسئلہ معاش کا نہیں تھا۔ مسئلہ تو اعتماد اور بھروسے کا تھا۔ اس نے جس شخص کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی عزت و آبرو، جان و مال سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا تھا، وہی قدر ناشناس اس کی وفا اور محبت کو پاؤں تلے روند کر چلا گیا تھا۔ یہ اتنا بڑا دکھ، اتنا عظیم سانحہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے اپنے درد کو بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے اعتماد کا خون کرنے والا اب اس کی دسترس میں نہیں تھا۔

بہت سوچ بچار اور کرب کی منزلوں سے گزر کر نادرہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی اور اسی گھر میں رہتے

ہوئے کامران کا انتظار کرے گی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ کامران ضرور واپس آئے گا۔

☆☆☆

نادرہ کا کیس شاکر علی کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا اور یہ شاکر علی کسی صفدر علی کا رشتے دار تھا جو بھی شادمان کالونی لاہور میں نادرہ کا پڑوسی تھا۔ بعد ازاں کامران سے شادی کر کے نادرہ شانمان کالونی سے اجھرہ کے علاقے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ شاکر علی نے ایک بار نادرہ اور کامران کو میاں بیوی کی حیثیت سے لاہور میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے عزیز صفدر علی سے ملنے لاہور گیا ہوا تھا۔

شاکر علی ایک ریسٹورنٹ کا مالک تھا۔ اس کا عالی شان ریسٹورنٹ طارق روڈ پر لبرٹی چوک کے قریب واقع تھا۔ اپنے اسی ریسٹورنٹ میں ایک روز شاکر علی نے کامران کو ایک نوخیز دوشیزہ کے ساتھ دیکھا تو اس کا ہاتھ ٹکا۔ وہ چالیس سالہ واجبی سی شکل و صورت کی مالک نادرہ کو کامران کی بیوی کی حیثیت سے جانتا تھا اور اب وہی کامران ایک پچیس سالہ خوب رو حسینہ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا راز و نیاز میں مصروف تھا۔ اس بدلاؤ نے شاکر علی کو الجھا دیا تھا۔

انسانی نفسیات ہے کہ جب کوئی چیز اس کے ذہن کو الجھا دے تو وہ اپنی اس الجھن کی سنجھن کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ اسی رات شاکر علی نے اپنے عزیز صفدر علی کو فون کیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد شاکر علی نے پوچھا۔ ”یار صفدر! آپ کے پڑوس میں ایک خاتون رہتی تھیں نا جنہوں نے کسی جوان مرد سے شادی کر لی تھی.....!“

”ہاں..... تم نادرہ کی بات کر رہے ہو نا۔“ صفدر علی نے کہا۔

”جی بالکل۔“ شاکر علی نے مضبوط لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”نادرہ کیسی ہیں؟ کیا وہ اب بھی تمہارے پڑوس میں آباد ہیں؟“

”نہیں.....“ صفدر علی نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ شادی کے چند روز بعد ہی اپنی کوٹھی بچ کر شہر کے کسی اور علاقے میں شفٹ ہو گئی تھیں.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”سب خیریت تو ہے نا..... تم اچانک نادرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اللہ کرے خیریت ہی ہو۔“ وہ ذومعنی لہجے میں

بولا۔ ”مگر مجھے کوئی گڑ بڑ لگ رہی ہے۔“

”کیسی گڑ بڑ لگ رہی؟“ صفدر علی پوچھے بنانہ رہ سکا۔ جواب میں شاکر علی نے صفدر علی کو کامران اور اس کی ساتھی دوشیزہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد صفدر علی نے کہا۔

”مجھے تو پہلے ہی یہ شخص کامران کافی مشکوک سا لگا تھا۔ میں نے دہلی زبان میں نادرہ کو اس سے شادی سے باز رہنے کے لیے بھی کہا تھا۔ مرحوم ملک وحید کے ساتھ میرا اچھا وقت گزرا تھا۔ وہ گلبرگ میں بیٹھتا تھا اور میں نے ٹیمپل روڈ پر جیولری کی دکان کھول رکھی ہے۔ جب مجھے نادرہ کی کامران سے شادی کی اطلاع ملی تو اسی وقت مجھے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا تھا لیکن ظاہر ہے، میں کھل کر اس شادی کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا لہذا چپ ہو رہا پھر چند روز بعد نادرہ نے اپنی کوٹھی بیچ دی اور کسی اور علاقے میں چلی گئی۔“

”صفدر علی! میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ نادرہ کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہے۔“ شاکر علی نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا کسی طرح تم نادرہ سے رابطہ کر سکتے ہو؟“

”اگر میں کوشش کروں تو اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“ صفدر علی نے پرسوج لہجے میں کہا۔

”پلیز..... یہ کوشش فوری ہی کر ڈالیں۔“ شاکر علی نے کہا۔ ”اس دوران میں، میں کامران کا حدود اربعہ اور تازہ ترین سرگرمیوں کا سراغ لگاتا ہوں۔“

چند روز بعد وہ دونوں ایک مرتبہ پھر نادرہ اور کامران کے موضوع پر خاصی سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس بار بھی ان کی بات ٹیلی فون پر ہی ہو رہی تھی۔

صفدر علی نے نادرہ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ نادرہ سے ملاقات پر کامران کے فراڈ کی کہانی بھی صفدر علی تک پہنچ گئی تھی۔ صفدر علی نادرہ کو اپنے ساتھ اپنی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ دوسری جانب شاکر علی نے کامران کی کنڈلی نکال لی تھی۔ کامران، نادرہ کو لوٹنے کے بعد لاہور سے کراچی آ گیا تھا۔ یہاں اس نے بہادر آباد کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کی اور چاول کے بیوپاری کی حیثیت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ لوگوں کو اس نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اندرون سندھ اور اندرون پنجاب سے چاول خرید کر کراچی کی غلہ مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے۔ شاکر علی نے اس طرح دارحسینہ کا کھوج بھی لگالیا تھا جسے اس نے پہلی

یہ دھندلے غیر قانونی کے زمرے میں آتا ہے لیکن یہ کام نہایت ایمان داری سے کیا جاتا ہے تاہم تائن الیون کے واقعے کے بعد سے ہنڈی کے حوالے سے خاصے سخت بین الاقوامی قوانین بنائے گئے ہیں لہذا یہ کام خاصا کم ہو گیا ہے اور جتنا بھی ہو رہا ہے، نہایت ہی احتیاط اور رازداری کے ساتھ جاری ہے۔ آج کل اسے ”منی لائڈرنگ“ کا ٹائٹل دے دیا گیا ہے۔

شا کر علی نے بہت اچھا ہوم ورک کر رکھا تھا لہذا جب نادرہ کراچی پہنچی تو وہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ شا کر کی معلومات کے مطابق کامران اور فوزیہ کو سنڈے کی رات دس بجے اپنے فلیٹ سے لکھنا تھا۔ یہاں سے وہ سیدھا ائرپورٹ کا رخ کرتے پھر وہ دونوں نصف شب کے آس پاس امریکا کے لیے پرواز کر جاتے۔ امریکا میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے ایک ٹھکانی رقم نیویارک ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ نادرہ کے اعتماد کو دھوکا دینے کے علاوہ کامران نے اس سے لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے ہتھیالے تھے۔ یہ تو ایک کیس تھا۔ وہ ہتھے چڑھتا تو پتا چلتا کہ اس کمبخت نے اور کہاں کہاں اور کیا کیا کھلا رکھے تھے۔

شا کر علی چونکہ ریسٹورنٹ لائن کا بندہ تھا لہذا ہر قسم کے لوگوں سے اس کا ملنا جلتا رہتا تھا۔ اس نے اس مشن کے لیے اپنے ایک دوست مستعد بنائے والوں کو پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا چنانچہ قبل اس کے کہ کامران فوزیہ کے ہمراہ بہادر آباد والے فلیٹ سے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوتا، شا کر علی، نادرہ اور اپنے بندوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔

یہ بہادر آباد کا بارونٹ کمرشل علاقہ تھا۔ شا کر علی کی معلومات کے مطابق وہ فلیٹ کامران نے کرائے پر لے رکھا تھا اور اب وہ یہاں سے اپنے پرسمیٹ کر ہزاروں میل دور ایک نئے آشیانے کی جانب کوچ کرنے والا تھا۔ جب یہ لوگ کامران کی گلی میں داخل ہوئے تو اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نیچے ایک ٹیکسی کھڑی دکھائی دی جو یقیناً کامران اور فوزیہ کو لے کر ائرپورٹ جانے والی تھی۔ اگلے ہی لمحے بلڈنگ کی سیڑھیوں سے کامران باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جبکہ اس کے عقب میں فوزیہ ایک چھوٹا سٹری بیگ اٹھائے دکھائی دی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کی ڈکی کھول دی تاکہ کامران اپنے سامان کو ڈکی میں رکھ سکے۔ اسی لمحے شا کر علی اپنے بندوں کے ہمراہ کامران کی جانب بڑھا۔ نادرہ کو گاڑی کے اندر بیٹھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ نادرہ نے خود کو

مرتبہ کامران کے ساتھ ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ اس لوکی کا نام فوزیہ تھا اور..... وہ کامران کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی تھی اور اس سے بھی سنسنی خیز انکشاف یہ کہ چند روز میں کامران اور فوزیہ امریکا شفٹ ہونے والے تھے۔

”وہ کمینڈ کب امریکا جا رہا ہے؟“ صفدر علی نے استفسار کیا۔ ”میں اسے ایسے نہیں جانے دوں گا۔ اس نے نادرہ کو نہ صرف دھوکا دیا ہے بلکہ اس کی کوشی بچ کر لاکھوں روپے ہڑپ کر گیا ہے۔“

”وہ دو دن بعد یہاں سے پرواز کر جائے گا۔“ شا کر علی نے بتایا۔ ”میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو سائے کی طرح اس کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ وہ سنڈے کی رات جہاز پر سوار ہوگا لیکن جہاں تک لاکھوں روپے کی رقم کا تعلق ہے تو وہ سارا اماؤنٹ کامران اور فوزیہ کے روانہ ہونے سے پہلے ہی امریکا بھیجا جا چکا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ صفدر علی نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”میری معلومات کے مطابق کامران نے چند روز پہلے اپنا سارا سرمایہ ہنڈی کے ذریعے نیویارک کے ایک اسٹاک بروکر کے نام یہاں سے امریکا بھیج دیا ہے۔“

”اوہ.....“ صفدر علی نے ایک گہری سانس لی۔ ”گویا اب ہمارے ہاتھ میں صرف یہ کامران ہی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اسے فوزیہ کے ساتھ امریکا جانے سے روک سکتے ہیں۔“

”بالکل، یہ ممکن ہے۔“ شا کر علی نے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے نادرہ کا یہاں کراچی میں ہونا ضروری ہے۔ کیا آپ اسے ایک آدھ دن میں یہاں میرے پاس پہنچا سکتے ہیں؟“ ”میں یہ کر سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔“ صفدر علی نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جو میں سمجھنے کے بعد نادرہ تمہارے پاس ہوگی۔ پیسے تو گئے۔ ہم اس خبیث ہی کو پکڑ لیں تو کافی حد تک یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کیا تم کراچی میں اس معاملے کو آسانی سے وینڈل کر لو گے؟“

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ شا کر علی نے کہا۔ ”میں سب دیکھ لوں گا۔ بس آپ نادرہ کو کسی بھی طرح سنڈے کی دوپہر تک میرے پاس پہنچا دیں۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔“

ہنڈی یا حوالہ کے ذریعے بھاری رقوم کو ایک ملک سے دوسرے ملک ٹرانسفر کرنا بہت پرانا طریقہ ہے۔ اگرچہ

چھپانے کے لیے ایک بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

کامران نے تین افراد کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ شاکر علی نے اس کے سامنے پہنچ کر پاٹ لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ کامران صاحب ہیں نا؟“

”جی!“ کامران نے جواب دیا پھر پوچھا۔
”آپ کون؟“

شاکر نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے فوزیہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ غالباً آپ کی بیوی ہیں اور لگتا ہے، آپ لوگ کسی طویل سفر پر روانہ ہونے والے ہیں؟“

”جی، آپ کا اندازہ درست ہے۔“ کامران نے بدستور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”ہم لوگ کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں مگر..... آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟“

”ہم خدائی فوجدار ہیں۔“ شاکر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”بچھڑے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملانا ہمارا نصب العین ہے اور ہم اسی غرض سے آپ کے پاس آئے ہیں۔“

”مم..... مگر..... میرا تو کوئی بچھڑا ہوا نہیں ہے.....“ کامران نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے کسی سے نہیں ملنا..... پلیز، آپ میرا وقت برباد نہ کریں۔ ہمیں اترپورٹ جانے میں دیر ہوگئی تو ہماری فلائٹ نکل جائے گی۔“

”فلائٹ تو یقیناً نکل جائے گی مسٹر کامران!“ شاکر علی نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”امریکا جانے کا خیال ذہن سے نکال دیں اور اس شخصیت سے ملیں جو آپ سے ملنے کے لیے طویل سفر کر کے یہاں پہنچی ہے.....“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ کامران جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

شاکر نے نادرہ کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر نکل آئے پھر وہ کامران کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

”یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو تم پر بجلی بن کر گرے گی اور تمہارے حواس کی ایسی کم تھسی کر کے رکھ دے گی۔“

اس دوران میں نادرہ گاڑی میں سے نکل کر کامران کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اس کا جسم چادر میں لپٹا ہوا تھا تاہم چہرہ پوری طرح کھلا تھا اور..... نادرہ پر نگاہ پڑتے ہی

کامران کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی تھی۔
”یہ تمہاری بچھڑی ہوئی بیوی ہے یا تم اس کے بچھڑے ہوئے شوہر ہو، یہ فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔“ شاکر علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”فی الحال مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہم تمہیں نادرہ کے لاکھوں روپے لوٹ کر اور اس کے اعتماد کا خون کر کے امریکا نہیں جانے دیں گے۔ تم یہاں سے اترپورٹ نہیں بلکہ سیدھے حوالات میں پہنچو گے۔“

”یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ کامران شپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے ایسا مذاق ہرگز پسند نہیں ہے۔“

صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوزیہ آگے بڑھی پھر نادرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے تیز لہجے میں کامران سے استفسار کیا۔ ”کیا یہ عورت تمہاری بیوی ہے؟“

”بالکل نہیں.....“ وہ کمال ڈھٹائی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں..... میں تو آج اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔“

پہلے اعتماد کا خون پھر پندرہ بیس لاکھ کی ڈر اور اب پہچاننے سے انکار..... اس صورت حال نے نادرہ کے ذہن کے پرچے اڑا دیے۔ اس کے وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اس کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس نے اسے محبت کا فریب دے کر نہ صرف مال و جائیداد سے محروم کر دیا تھا بلکہ اسے در بدر کر کے اسی سے لونی ہوئی دولت کے بل بوتے پر وہ اپنی نو عمر بیوی کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے امریکا جا رہا تھا۔

نادرہ کا دماغ الٹ گیا۔ اچانک اس نے چادر اتار چھین کر اور بجلی ایسی سرعت کے ساتھ اس نے اپنے پرس میں سے ایک خطرناک پستول برآمد کیا اور آن واحد میں اس نے کامران پر کئی بعد دیگرے تین فائر کر دیے۔

شاکر علی اینڈ کمپنی اس قسم کی سچویشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سب کچھ چشم زدن میں رونما ہو گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ نادرہ کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے، وہ اپنا کام کر چکی تھی۔

کامران اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکا اور گولیاں کھانے کے بعد کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گرا اور زمیں بوس ہو گیا۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ نادرہ نے پستول کو اس کی لاش پر پھینکا اور خواب ناک لہجے میں بولی۔
”کامران! تم مجھے نہیں جانتے نا..... آج کے بعد میں بھی تمہیں نہیں جانتی۔ یہ پستول تم ہی نے مجھے لا کر دیا تھا تاکہ

”اس واقعے نے نادورہ کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ عجیب سی بھکی بھکی باتیں کرنے لگتی ہے یا پھر زیادہ تر خاموش ہی رہتی ہے۔ نظر یہی آرہا ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ میں وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ اس نے پولیس کو کیا بیان دیا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، میں یہ کیس لینے کو تیار ہوں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اگر نادورہ کا ذہنی توازن ٹھکانے نہیں تو یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے۔ اگر عدالت میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ وقوعہ کے روز شدید غیظ کے باعث اپنے حواس کھو بیٹھی تھی تو اس کا فعل قتلِ عمد کے زمرے میں نہیں آتا چنانچہ اس کی سزا میں حتی الامکان کمی کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔“

”شکریہ بیگ صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ نے میرے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”جی فرمائیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں چاہتا ہوں، اگلی پیشی سے پہلے آپ حوالات جا کر نادورہ سے ایک ملاقات کر لیں۔“ اس نے کہا۔

”ضرور، یہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آج میری کچھ مصروفیات ہیں۔ آپ کل آجائیں پھر نادورہ سے ملنے چلتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”شاکر صاحب! آپ بھی اپنے عزیز صدف علی کی مدد سے وہ تمام دستاویزی ثبوت یہاں منگوائیں جو نادورہ کے کیس کے سلسلے میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مثلاً نادورہ اور کامران کا نکاح نامہ، اوور نائٹ انویسٹرز کے ساتھ نادورہ کے معاملات کی دستاویزات اور رسیدیں وغیرہ۔“

”جی، میں سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں یہ سب کر لوں گا بلکہ میں کامران اور نادورہ کی شادی کے گواہوں میں سے کسی کو بھی اسٹینڈ بائی رکھوں گا اور اس مالک مکان سے بھی رابطہ کروں گا جس سے کامران نے اچھرہ والا مکان کرائے پر لیا تھا۔“

”گڈ.....!“ میں نے سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس نے میری فیس ادا کی اور اگلے دن حاضر ہونے کا

میں اپنی حفاظت کر سکوں..... دیکھ لو، آج کس طرح میں نے اپنی حفاظت کی ہے..... ایک لٹیرا میرا اعتماد، میری دولت، میری جائیداد اور..... سب سے بڑھ کر میری محبت لوٹ کر امریکا فرار ہو رہا تھا..... میں نے اسے ختم کر ڈالا.....“

پھر وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اسے اپنے کیے کا افسوس تھا یا وہ اپنی مرحوم محبت کا ماتم کر رہی تھی، یہ آنسو بڑے بے زبان ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا، خونِ جگر کس کے لیے آنکھوں سے بہہ گیا۔

کراچی کے باسی بخوبی آگاہ ہیں کہ بہادر آباد کمرشل ایریا کس قدر مصروف اور بارونق ہے اور رات کے دس بجے وہاں کیسی گہما گہمی ہوتی ہے۔ فائرنگ کی آواز نے کئی افراد کو اس جانب متوجہ کر دیا تھا اور بعض نے تو نادورہ کو گولیاں چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ فائرنگ کی آواز، قریب سے گزرنے والی ایک پولیس موہائل تک بھی پہنچی چنانچہ نادورہ کی گرفتاری فوراً عمل میں آگئی اور اس واردات کے سنی شاہد بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کی گواہی سراسر نادورہ کے خلاف تھی۔

شاکر علی نے تمام کہانی بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کی تو میں نے صاف کوئی کامظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”خاصا مشکل کیس ہے.....!“

”اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کافی مشکل پسند ہیں۔“

اس نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کس سے پتا چلا ہے؟“

”مظہر صدیقی صاحب سے۔“ وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”صدیقی صاحب سے میری دیرینہ دوستی ہے۔ اگر یہ کوئی سیدھا سادہ کیس ہوتا تو کسی بھی رٹگروٹ وکیل کی خدمات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ صدیقی صاحب نے آپ کی جتنی تعریف کی ہے، اس کے پیشِ نظر ہی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“

”ہوں.....“ میں نے پرسوج انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”نادورہ کا کیا حال ہے؟“

”وہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے۔“ شاکر علی نے بتایا۔ ”پولیس نے سات دن کاریمانڈ لے رکھا ہے جس میں سے دو دن گزر چکے ہیں۔“

”نادورہ نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نادرہ صاحبہ!“ میں نے نہایت ہی نرم لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔ ”پولیس والے بکواس کرتے ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ لوگ اپنی کمائی کے چکر میں اسی طرح ملزموں کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”پولیس والوں نے آپ سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ تو نہیں کیا؟“

”یہ کہتے ہیں کہ اگر میں انہیں دو لاکھ دے دوں تو میری گردن بچ جائے گی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”مگر میں کہاں سے دوں دو لاکھ۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ کامران لوٹ کر لے گیا۔“ اس کی سوئی بار بار کامران پر آ کر رک جاتی تھی اور اس کا بڑا مضبوط، بڑا ستلین سبب تھا۔ اس عالم انسان نے نادرہ کی زندگی تباہ و برباد کر کے رکھ دی تھی۔

”میری بات غور سے سنیں نادرہ صاحبہ!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی تو آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر ہوں بھی تو پولیس والوں کو ایک روپیہ نہیں دینا۔ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں آپ کے کیس کو سمجھ گیا ہوں۔“

”اچھا جی.....“ وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں؟“

اس کا سوال کرنا میرے لیے باعث اطمینان تھا۔ گویا میں اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اس کیس میں میری ابتدائی کامیابی تھی۔ میں نے اپنا تہ بھرے لہجہ میں کہا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ کامران کی موت آپ کے ہاتھوں ہوئی ہے لیکن آپ نے جن حالات میں اس شدید رد عمل کا مظاہرہ کیا، وہ فطرت کے عین مطابق تھا۔ آپ کے اس فعل پر آپ کو پھانسی کی سزا نہیں ہو سکتی۔“

پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں مجھے زندگی کی رقی نظر آئی۔ گویا وہ دہشت کی کیفیت سے رفتہ رفتہ باہر نکل رہی تھی۔ اس کی امید بھری سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

”میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں.....؟“ یہ بھی ایک مثبت علامت تھی کہ وہ اپنی زندگی کے معاملے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے یہ دستور نرم لہجہ

آئندہ روز میں شاکر علی کے ساتھ متعلقہ تھانے جا کر حوالات میں نادرہ سے ملا۔ ریمانڈ پر پولیس کفڈی میں کسی ملزم سے ملاقات کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا پڑتا ہے، اس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے۔

نادرہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ ابھی تک میں نے اس کا ذکر ہی سنا تھا۔ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ واجبی سی شکل و صورت کی مالک ایک فریہ اندام عورت تھی۔ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ تیس سالہ مرد کسی لالچ کے بغیر ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کامران نے یہ شادی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی تھی۔

نادرہ کی آنکھوں کے گرد چلتے پڑے ہوئے تھے جیسے دو تین راتوں سے مسلسل جاگ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر بھی ویرانی اور ناامیدی کا راج تھا۔ جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو وہ سپاٹ نظر سے ہمیں دیکھنے لگی۔

”نادرہ!“ شاکر علی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ میں نے آپ کا کیس ان کے حوالے کر دیا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہت قابل اور تجربہ کار وکیل ہیں۔ یہ تمہیں باعزت بری کروائیں گے۔“

نادرہ نے خالی خالی نظر سے مجھے دیکھا اور خواب ناک لہجہ میں متفسر ہوئی۔ ”وکیل صاحب! آپ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں کیا؟ مگر..... اب مجھ سے شادی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس کوئی رقم ہی ہے، نہ مال و دولت اور نہ ہی میرے دل میں کسی کے لیے محبت باقی ہے۔ یہ ساری چیزیں تو کامران لے گیا۔“

”ہوش میں آؤ نادرہ!“ شاکر علی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”یہ وکیل صاحب آپ کا مقدمہ لڑیں گے اور آپ کو باعزت چھڑوا کر لے جائیں گے۔“

”کیا پولیس والے مجھے جانے دیں گے؟“ وہ بے یقینی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر یہ تو کہہ رہے تھے، زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ بس ذرا سا جھکا لگتا ہے اور پانچ دس منٹ میں جان نکل جاتی ہے۔“

اس کا مطلب ہے، پولیس والوں نے اسے پھانسی سے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے پیچھے یقیناً ان کا کوئی مقصد ہوگا۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی اور شاید پھانسی کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی تھی اور اسی دہشت نے اس کے حواس کا

شا کر علی نے کہا۔ ”نادرہ! آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ صفدر علی وکیل صاحب سے ہر ممکنہ تعاون کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ اگلی پیشی پر آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔“

”میں کس منہ سے آپ کا اور صفدر بھائی کا شکریہ ادا کروں۔“ اس کی آواز بھیگ گئی۔ ”آپ لوگ اپنوں سے بڑھ کر میری مدد کر رہے ہیں۔“

”شکریہ ادا کرنے کے لیے ابھی بڑی عمر پڑی ہے۔“ شا کر علی نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال آپ وکیل صاحب سے تعاون کریں اور بیگ صاحب جو بھی پوچھیں، انہیں بتادیں۔“

نادرہ نے آنسو پونچھے اور میری جانب متوجہ ہو گئی۔ اب وہ بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے چند ضروری سوالات کیے پھر وکالت نامے اور دیگر اہم کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد اسے ”چے کی باتیں“ ذہن نشین کرائیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔

دو روز بعد سانولے رنگ کا ایک شخص میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور چہرے کے تاثرات سے خاصا میزھا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور پوچھا۔

”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”خدمت تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔“ وہ بھونڈے انداز میں سکراتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”کیسا تعاون..... میں کچھ سمجھا نہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”پانچ لاکھ کی ایک ڈیل ہے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایک لاکھ آپ کے ہوئے۔“

”بھائی صاحب! شاید آپ کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔“ میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک وکیل ہوں اور لوگوں کے کیس عدالت میں لڑتا ہوں۔ یہی میرا پیشہ ہے۔ اس کے سوا میرا اور کوئی کاروبار نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں جناب..... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جس ڈیل کا ذکر کیا ہے وہ بھی ایک کیس کے سلسلے ہی میں ہے۔“

”کس کیس کے سلسلے میں؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

میں کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں۔ کامران نے قدم قدم پر آپ سے جھوٹ بولا اور آپ کو دھوکا دیا، یہاں تک کہ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا..... ہیں نا؟“

”جب اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کیا تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”اور شدید قسم کے طیش نے آپ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے جو کچھ بھی کیا، اس میں آپ کے ارادے کو دخل نہیں۔ بس وہ سب کچھ بے اختیار، خود کار انداز میں ہو گیا تھا۔“

”جی..... جی ہاں.....“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”بس تو اب آپ میری بات کو دھیان سے سنیں۔“

اس کی ہمت بندھانے کی غرض سے میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میری ساری عمر قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے اور پیچیدہ کیس لڑتے گزری ہے۔ یاد رکھیں کہ ہر مل کی سزا موت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی حرکتوں سے اس قدر مشتعل کر دے کہ دوسرے شخص کی برداشت جواب دے جائے اور اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہے اور اسی بے قابو پن میں دوسرا شخص پہلے شخص پر حملہ آور ہو جائے اور اسے کوئی ضرر پہنچانے کی کوشش کرے جس کے نتیجے میں پہلے شخص کی موت واقع ہو جائے تو قانون کی زبان میں اسے قتل عمد نہیں کہتے۔ اس صورت میں قانون پہلے شخص کی ہلاکت پر دوسرے شخص کو موت کی سزا نہیں دیتا۔“

اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ متوجہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستغرق ہوئی۔ ”اچھا..... ایسا بھی ہو سکتا ہے؟“

”بالکل..... جو قانون کی کتابوں میں لکھا ہے، میں نے آپ کو وہی بتایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہیں آپ مجھے جھوٹی تسلی تو نہیں دے رہے؟“ وہ تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”نہیں.....“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ غلط بیانی نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں جھوٹی تسلیاں دیتا ہوں۔ جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“

وہ تشکرانہ انداز میں باری باری مجھے اور شا کر علی کو دیکھنے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سپنس ڈائجسٹ

جنوری 2017

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”جناب! میں اس کیس کی بات کر رہا ہوں جس میں ایک بیوی نے بیچ بازار اپنے شوہر کے جسم میں تین گولیاں اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ نادرہ کے کیس کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے اس کیس کو؟“

”وکیل صاحب! میری معلومات کے ذرائع بڑے باوثوق ہیں اور پولیس کے حلقے میں بھی میرا چھا خاصا اثر رسوخ ہے۔“ مجھے مرعوب کرنے کے لیے وہ خریہ لہجے میں بولا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ اس بیوہ کا کیس آپ نے پکڑ لیا ہے۔“

”آپ کو بالکل درست پتا چلا ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کی تعریف اور اس کیس میں اتنی گہری دلچسپی کا سبب؟“

”میرا نام عدنان ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں مقتول کا مران کا بڑا بھائی ہوں۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ میرے پاس کوئی ڈیل کرنے آئے ہیں؟“

”جی بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس عورت نے جو کچھ کیا ہے، اس کی سزا میں وہ پھانسی چڑھ جائے گی اور میں چاہتا ہوں، آپ اسے سمجھائیں۔“

”مثلاً..... کیا سمجھاؤں؟“ میں بلی کو تھیلے سے باہر لانے کے لیے اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کرنے لگا۔

”دیکھیں وکیل صاحب! میرا بھائی تو اب واپس آ نہیں سکتا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر وہ عورت مکہ مکہ کے لیے تیار ہو جائے تو میں اپنے بھائی کا خون معاف کرنے کو تیار ہوں۔“

”ہوں.....“ میں نے اپنے چہرے سے تاثر دیا جیسے اس کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔ ”مثلاً آپ کس قسم کا مکہ چاہتے ہیں؟“

”شریعت کی اصطلاح میں اسے دیت کہتے ہیں۔“ وہ گویا میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر وہ عورت خوں بہا کے ذیل میں مجھے پانچ لاکھ ادا کر دے تو میں اس رقم میں سے ایک لاکھ روپے آپ کو دے دوں گا۔ اس طرح ہم سب مل کر اس کیس کو عدالت کے باہر ہی رفع دفع کر دیں گے۔“

”چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ!“ میں نے دل میں یہ محاورہ دہرایا۔ وہ گھٹیا شخص اپنے مردہ بھائی کے پیسے کھرے کرنے آیا تھا۔ اس کی پیشکش سن کر مجھے

غصہ تو بہت آیا مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”مسٹر عدنان! آپ کے بھائی نے اس بے چاری عورت کے ساتھ کیا کم زیادتیاں کی ہیں جواب آپ اس کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کے قہر سے ڈریں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آپ کو وکیل کے بجائے کوئی مولوی ہونا چاہیے تھا۔ میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو اب آپ خود ہی سمجھیں۔“

وہ درپردہ مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ ”مجھے کیا بھگتنا ہے؟“

”میں نے آپ کے فائدے کی بات کی تھی۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”بیٹھے بٹھائے ایک لاکھ روپے آپ کی جیب میں آجاتے مگر آپ نے میری پیشکش کی قدر نہیں کی۔ میں شہر کے سب سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کروں گا۔ اس خونی بیوہ کو پھانسی نہ کروائی تو میرا نام بھی عدنان نہیں ہے۔“

میں اس کی حماقت اور کمینگی پر مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ استغاثہ کی جانب سے ایک معروف وکیل پیش ہوا تھا۔ میں اس وکیل کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ وکیل صاحب کی فیس یقیناً مقتول کے بھائی عدنان نے ادا کی ہوگی۔ عدنان چند روز پہلے مجھے کسی چوٹی کے وکیل کے حوالے سے دھمکی بھی دے کر گیا تھا۔ گویا اس کی دھمکی کھوکھلی نہیں تھی۔

چالان میں پولیس نے دفعہ تین سو دو لگائی تھی، یعنی اسے قتل عہد کا کیس بنا کر پیش کیا تھا۔ میں نے ملزمہ کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! یہ قتل عہد نہیں بلکہ قتل خطا کا کیس ہے لہذا چالان میں دفعہ تین سو دو کے بجائے دفعہ تین سو اٹھارہ اور تین سو انیس لگائی جانا چاہیے۔“

”یور آنر! یہ قتل عہد کا کیس ہے۔“ وکیل استغاثہ نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”ملزمہ نے ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت لاہور سے کراچی کا سفر کیا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ کیس ناقابل ضمانت ہے لہذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزمہ کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیل بھیج دیا جائے۔“

”جناب عالی! یہ درست ہے کہ میری موکلہ نے

لاہور سے کراچی تک کا سفر کیا۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "لیکن اس مقصد کے پیچھے اس کی کوئی خفیہ پلاننگ نہیں تھی۔ وہ اپنے دھوکے باز شوہر کو ملک سے فرار ہونے سے روکنا چاہتی تھی۔"

"دھوکے باز شوہر..... ملک سے فرار.....؟" جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

"میں یور آنر!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "میں نے وکالت نامے اور ملزمہ کی درخواست ضمانت کے ساتھ اس کیس کے پس منظر کی سری منسلک کر دی ہے تاہم مختصراً عرض ہے کہ....." لگاتی توقف کر کے میں نے وکیل استفسار کی جانب دیکھا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مقتول کچھ عرصہ پہلے تک لاہور کی ایک انویسٹمنٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ اگر عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو مذکورہ کمپنی کے منیجر جواد حسین کو عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ ملزمہ نے اپنی کچھ رقم اس کمپنی میں انویسٹ کر رکھی تھی اور یہیں پر مقتول اور ملزمہ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ چند ہی روز میں مقتول نے ملزمہ کو اپنی تکی محبت کے شیشے میں اتارا اور اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔ اگر عدالت حکم دے گی تو اس شادی کے نکاح خواں حاجی نواز علی کو بھی پیش کر دیا جائے گا۔" میں نے ذرا سی دیر کے لیے توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"شادی کے چند روز بعد ہی مقتول نے ملزمہ کو راتوں رات امیر بننے کا خواب دکھا کر اس کی کوٹھی پندرہ لاکھ میں بکوا دی مگر یہ خطیر رقم اس نے کہیں بھی انویسٹ نہیں کی۔ اس امر کی گواہی کے لیے منیجر جواد حسین کو عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک روز مقتول ملزمہ کو کرائے کے ایک مکان میں بے یار و مددگار چھوڑ کر لاہور سے کراچی چلا آیا۔ ملزمہ کا سابق پڑوسی صفدر علی اور کرائے کے مکان کا مالک نفیس احمد اس حقیقت کی گواہی دے سکتے ہیں۔ کراچی آنے کے بعد مقتول نے خود کو چاول کا ایک بیو پاری ظاہر کیا اور چند ہی روز بعد ایک خوب رو حسینہ سے شادی کر لی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ کراچی سے امریکا روانہ ہوتا، ملزمہ کے ایک خیر خواہ شاگرد علی نے اس کے منصوبے کی بوسنگھ لی اور فی الفور لاہور میں ملزمہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ ملزمہ اپنے شوہر کو فرار ہونے سے روکنے اور اپنی رقم کا حساب لینے جب کراچی پہنچی تو مقتول نے اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا....." میں نے ایک مرتبہ پھر لگاتی توقف کیا پھر اپنی

بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! آپ خود سوچیں..... ایک عورت جس کا شوہر اس کا گھر بار، مال و دولت، اعتماد، وفا، محبت سب کچھ لوٹ کر اسے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ آیا ہو اور اسی ستم رسیدہ عورت کے پیسوں سے وہ کسی اور حسینہ کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے امریکا جانے کے لیے تیار بیٹھا ہو..... جب وہ مظلوم عورت اپنے مجرم شوہر کے سامنے پہنچے اور شوہر نئی بیوی کی موجودگی میں اسے پہچاننے سے انکار کر دے تو اس عورت کے ذہن و دل کی کیا حالت ہوگی۔ میری مؤکلہ اور اس کیس کی ملزمہ اس ذہنی کیفیت سے گزر رہی ہے جناب عالی....."

عدالت کے کمرے میں سناٹے کا راج تھا۔ میں نے جذباتی لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مقتول نے جب ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو فریاد غیظ نے ملزمہ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر دی۔ اس کی عزت، وفا اور دولت کا لٹیر اس کے سامنے کسی اور عورت کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ اپنے شوہر کو باز پرس کے لیے روکنا تو اس کا حق بننا تھا؟"

"وکیل صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

"جناب عالی! میری مؤکلہ ہرگز ہرگز اپنے شوہر کی زندگی سے کھیلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔" میں نے ایک جذباتی مگر ٹھنکی پنیرا مارتے ہوئے کہا۔ "بس، وہ اسے روکنا چاہتی تھی اور اس لیے ملزمہ کے ذہن نے سمجھایا کہ اس دھوکے باز کینے کو زخمی کر کے ہی روکا جاسکتا ہے۔ اگر وہ مقتول کو شدید زخمی کر دے تو وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ امریکا نہیں جاسکے گا۔ بس اس نے یہی کیا۔ اس نے زخمی کرنے کی نیت سے اپنے شوہر پر تین گولیاں چلائیں لیکن ظاہر ہے، ملزمہ کوئی ماہر شوٹر نہیں ہے لہذا اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ ایک گولی مقتول کی ٹانگ میں بہت ہوئی، دوسری گولی اس کے پیٹ میں جا بھکی اور تیسری گولی نے اس کے سینے کو چھید ڈالا..... یہ قتل خطا ہے یور آنر..... قتل خطا۔"

وکیل استفسار نے ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنا شروع کر دیا۔ جج توجہ سے اس کی باتیں سن رہا اور آخر میں اس نے کہا۔

"وکیل صفائی نے دفعات کے حوالے سے جو اعتراضات اٹھائے ہیں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟" "جناب عالی! شاید معزز عدالت کو یہ معلوم نہیں کہ

میرے فاضل دوست ایک بہت اچھے فکشن رائٹر بھی ہیں۔ ایک مقامی ڈائجسٹ میں ان کی محرکہ آرا تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ عدالت کا کراہے، کوئی ڈائجسٹ نہیں.....“ لہائی توقف کر کے اس نے طنزیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہاں پر ہر معاملے کو حقائق اور ٹھوس ثبوت کی بنا پر رکھا جاتا ہے۔ ملزمہ کی مظلومیت کے حوالے سے وکیل صفائی نے جو افسانوی داستان سنائی ہے اس میں رتی بھر بھی سچائی نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ملزمہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لاہور سے کراچی پہنچی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ رکھتی تھی اور اس نے اپنے مقصد کو پورا کر لیا۔ یہ سراسر قتل عمد یعنی دفعہ تین سودو کا کیس ہے ورنہ اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی ہوئی کوئی بیوی اپنے پرس میں بھرا ہوا پستول نہیں رکھتی۔“

آخری جملہ اس نے ایک نشتر کے طور پر میری سمت پھینکا تھا۔ میں نے اس کے وار کو الفاظ کی ڈھال پر روکتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! وکیل استغاثہ نے جس پستول کا ذکر کیا ہے، وہ مقتول ہی نے لا کر ملزمہ کو دیا تھا تاکہ وہ کسی ہنگامی صورت حال میں اپنی جان اور عزت کی حفاظت کر سکے۔“

”اپنی جان اور عزت کی حفاظت کر سکے یا کسی دوسرے کی جان و عزت سے کھیل سکے؟“ وکیل استغاثہ نے چیختے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”جناب عالی! انسان اپنی نفسیات کے سامنے مجبور ہے۔“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”اور ہر سچویشن میں انسان کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ ماحول اور حالات انسان کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی چوٹ پر اگر ذرا سی ٹھوکر بھی لگ جائے تو انسان درد کی شدت سے بلبلاتا ہوتا ہے.....“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مقتول نے غلط بیانی اور دھوکا دہی کے نشتروں سے ملزمہ کی روح کو بری طرح گھائل کر رکھا تھا۔ پھر جب اس نے ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو یہ سچویشن ملزمہ کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ وہ مقتول کی جان لینے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ محض اسے امریکا جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس نے مقتول کو زخمی کرنے کی نیت سے مقتول کی ٹانگوں پر قاترنگ کی۔ یہ مقتول کی

بدقسمتی کہ ملزمہ کا نشانہ چوک گیا اور ایک گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی جو بالآخر مقتول کی موت کا سبب بنی۔ موقع پر موجود ہر شخص بشمول مقتول کی دوسری بیوی فوزیہ، یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اس روز جب شا کر علی نے مقتول کو بتایا کہ اس کی بیوی اس سے ملنے آئی ہے اور ملزمہ کی جانب انگلی اٹھا کر جب فوزیہ نے اپنے شوہر مقتول کا مران سے یہ سوال کہ کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟ تو مقتول نے سرے سے ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ اس صورت حال نے ملزمہ کے حواس مختل کر دیے اور اس نے اپنے شوہر کو امریکا جانے سے روکنے کے لیے اس کو زخمی کرنے کی غرض سے قاترنگ کر دی.....“ میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر کراچی آواز میں بولنا شروع کیا۔

”پورا آئز! پاکستان پینٹل کوڈ کے مطابق دفعہ تین سو اٹھارہ بتاتی ہے کہ..... اگر کوئی شخص، کسی دوسرے شخص کی موت وقوع میں لانے یا اسے شدید ضرر پہنچانے کی نیت کے بغیر کسی غلطی فعل یا غلطی واقعہ سے دوسرے شخص کی موت کا باعث بن جائے تو پہلا شخص قتل خطا کا مرتکب کہلائے گا اور قتل خطا کی تشریح دفعہ تین سو انیس میں کی گئی ہے یعنی قتل خطا کا مرتکب شخص قابل ضمانت ہے اور قابل راضی نامہ ہے۔ اگر عدالتی کارروائی کے نتیجے میں ایسا ملزم قصور وار ٹھہر جائے تو دیت اور پانچ سال کی سزا کا مستحق ٹھہر سکتا ہے۔ ویس آل پورا آئز!“

وکیل استغاثہ نے ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے زور لگانا شروع کیا لیکن جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”وکیل صاحب! اس کیس کی دفعات کا فیصلہ آئندہ پیشی پر کیا جائے گا۔ اس سے پہلے آپ مقتول اور ملزمہ کے میاں بیوی ہونے کے ثبوت کا بندوبست کریں۔ کیا آپ ان کے نکاح خواں کو بطور گواہ عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟“ ”ضرور جناب!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ انتظام ہو جائے گا۔“

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔ گویا ملزمہ کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ نادرہ کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے عدنان کو وکیل استغاثہ سے بات کرتے دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری جانب

دیکھا جیسے بہ زبان خاموشی یہ کہہ رہا ہو کہ دیکھا، میں نے ملزمہ کی ضمانت نہیں ہونے دی۔ میں انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ میں جج کی توجہ ایک نہایت ہی اہم نکتے کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ نکتہ تھا دفعات کا استعمال۔ اگر ملزمہ پر دفعہ تین سو دو کے بجائے دفعہ تین سو اٹھارہ لگا دی جاتی تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہو جاتا۔

اگلی پیشی پر میں نے جج کی فرمائش پر نہ صرف نکاح خواں حاجی نواز علی کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا بلکہ ”ادور ٹائٹ انویسٹرز“ کے منیجر جواد حسین اور کوٹھی کے خریدار مطلوب بٹ کے حلفیہ بیانات بھی عدالت میں دائر کر دیے۔ جواد حسین نے اپنے بیان میں اس بات کی گواہی دی تھی کہ مقتول کامران ان کی مہنی میں کام کر چکا تھا اور جب وہ کمپنی چھوڑ کر چلا گیا تو ملزمہ اس کی تلاش میں کمپنی آئی تھی جسے یہ راز کھلا کہ انویسٹمنٹ کے نام پر مقتول، ملزمہ کے پندرہ لاکھ کھا کر کہیں چلا گیا تھا جبکہ مطلوب بٹ نے اپنے بیان میں اس امر کی تصدیق کی تھی کہ جب اس نے ملزمہ سے وہ کوٹھی پندرہ لاکھ میں خریدی تو مقتول شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا اور یہ پندرہ لاکھ ملزمہ نے مقتول کے ہاتھ ہی میں دیے تھے۔

ان حالات کی روشنی میں جج نے پولیس کو ہدایت کی کہ وہ عرصہ سات یوم میں اس کیس کا نیا چالان پیش کرے۔ گویا اب پولیس کو زیر دفعہ تین سو اٹھارہ کا نیا چالان پیش کرنا تھا جو میری مؤکلہ کے لیے حد درجہ سودمند ثابت ہوتا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس بدلتی ہوئی صورت حال کے طفیل نادرہ کی دہشت اور وحشت تقریباً ختم ہو گئی تھی اور اس کے اندر پیش آمدہ حالات سے نمٹنے کی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ دو ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ جج کی ہدایت کے مطابق نئے چالان میں میری مؤکلہ پر دفعہ تین سو اٹھارہ لگا لی گئی تھی یعنی اب یہ کیس قتل عمد کا نہیں بلکہ قتل خطا کا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہ پیش کیے گئے لیکن میں یہاں پر انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کی گواہی کی کوئی خاص اہمیت ہوگی۔ یہ واقعہ چونکہ ایک پر رونق مقام پر پیش آیا تھا لہذا استغاثہ کے پاس گواہوں کی

کوئی کمی نہیں تھی۔

سب سے پہلے ملزمہ نادرہ کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ وہ اب بڑی حد تک سنبھل چکی تھی اور اس نے میری ہدایت کی روشنی میں بڑا پنا تلایا بیان دیا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے پہلا گواہ عدنان پیش ہوا یعنی مقتول کا بڑا بھائی۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان دیا۔ وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا تو میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

”عدنان صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ ”مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔“

”میں آپ کے محسوسات کا ٹھیکے دار تو نہیں ہوں۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو یاد نہیں آ رہا کہ کبھی ہماری ملاقات ہوئی ہو۔“

”ٹھیک ہے، آپ خفا نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے، مجھے مغالطہ ہوا ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”بہر حال، مجھے آپ کے بھائی کی موت کا بہت دکھ ہے۔“

”آپ کو میرے بھائی کی موت کا دکھ بھی ہے اور آپ اس کی قاتل کا مقدمہ بھی لڑ رہے ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہ اچھی ہمدردی ہے وکیل صاحب!“

”میں ملزمہ کا مقدمہ لڑ رہا ہوں تو یہ میرا پیشہ ورانہ فرض ہے اور اگر میں آپ کے بھائی کی موت پر افسوس کا اظہار کر رہا ہوں تو یہ بحیثیت انسان میرا اخلاقی فریضہ ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ بھی اپنے فرائض کو باحسن طریق ادا کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا مقتول واقعی آپ کا بھائی تھا؟“

”جی بالکل، کامران میرا سگا چھوٹا بھائی تھا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کوئی شک ہے کیا؟“

”ہاں، کسی حد تک شک سا محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیسا شک؟“ وہ ناگواری سے مجھے گھورنے لگا۔ میں اپنے دھیمے اور ٹھنڈے انداز سے اس کے غصے کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ وہ غلطی کرے اور میری پکڑ میں آجائے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”مطلب یہ کہ آپ کراچی میں اور وہ لاہور میں رہ رہا تھا اور آپ دونوں کے بیچ کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔“

اب..... اس نے اپنی آواز میں جذبات بھرتے ہوئے کہا۔ ”ابے میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس ظالم عورت نے میرے چھوٹے بھائی کی زندگی چھین لی ہے۔“ بات کے اختتام پر عدنان نے اکیڑوڑا کس میں کھڑی نادہ کی جانب انگلی سے اشارہ بھی کر دیا۔

”عدنان صاحب! چھوٹے بھائی کے لیے آپ کی جذباتی وابستگی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“ میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ اپنے اکلوتے عزیز از جان چھوٹے بھائی کی شادی میں شریک کیوں نہیں ہوئے تھے؟ پر اپنی کامیابی کا کام ایسا تو نہیں کہ انسان ایک دن کی فرصت بھی نہ نکال سکے؟“

ایک لمحہ اس نے سوچا پھر جواب دیا۔ ”وہ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے کامران کے فیصلے سے دکھ پہنچا تھا اور میں نے اسے اس شادی سے منع کیا تھا۔ میرا بھائی سینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ اسے ایک سے بڑھ کر ایک جوان اور حسین لڑکی کا رشتہ مل سکتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا جو اپنی اماں کی عمر کی ایک بد شکل عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ بس، میں اسی بات پر اس سے ناراض تھا اس لیے اس کی شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کے شادی میں شرکت نہ کرنے کے فارمولے کو تسلیم کر لیتا ہوں۔“ میں نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب آپ مجھے یہ بھی بتادیں کہ آپ نے اپنے بھائی کی دوسری شادی میں شرکت کیوں نہیں کی تھی حالانکہ یہ شادی تو آپ ہی کے شہر میں ہوئی تھی اور اس مرتبہ آپ کا بھائی ایک نو عمر طرح دار حسینہ سے شادی کر رہا تھا؟“ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے پھیلے ہوئے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے یہ دستور اس کے چہرے پر نظر جواتے ہوئے کہا۔

”عدنان صاحب! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا اپنے بھائی سے کبھی رابطہ رہا ہی نہیں تھا۔ وہ جب کراچی سے لاہور گیا تو آپ سے بالکل کٹ گیا لہذا آپ کو اس کی پہلی شادی کی خبر ہے اور نہ دوسری شادی کا علم۔ یہ تو آپ نے جب اخبار میں کامران کے قتل کی خبر پڑھی تو آپ اس کی لاش پانچ لاکھ میں فروخت کرنے منظر عام پر آگئے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہمارے بیچ رابطہ نہیں تھا۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لاہور اور کراچی ایک ہی ملک کے دو شہر ہیں اور اس ملک کا ہر شہری کسی بھی شہر میں رہائش اختیار کر سکتا ہے۔“ ”میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بہت شکر یہ عدنان صاحب۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تو گویا آپ دونوں رابطے میں رہا کرتے تھے؟“ ”جی بالکل۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”پھر تو آپ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں شریک ہوئے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ شادی جو مقتول نے لاہور میں ملزمہ سے کی تھی؟“

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر گڑبڑا ہٹ کے آثار نمودار ہوئے لیکن جلد ہی وہ سبھل گیا اور بولا۔ ”جی نہیں..... میں اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔“ ”اس عدم شرکت کا کوئی سبب؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ”مقتول نے آپ کو انوائٹ نہیں کیا تھا یا کوئی اور مجبوری تھی؟“ ”کامران نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا لیکن میں اپنی مصروفیت کے باعث جا نہیں سکا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کا شغل کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“ ”میں پراپرٹی کا کام کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”محمود آباد میں میری اسٹیٹ ایجنسی ہے۔“ ”آپ کا کوئی اور رشتہ دار.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”آجیکشن یور آف!“ وکیل استغاثہ نے یہ آواز بلند کہا۔ ”اس وقت عدالت میں کامران مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست غیر متعلقہ سوالات سے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ”میں نے ابھی تک ایک بھی غیر ضروری سوال نہیں کیا جناب عالی۔“ میں نے بیچ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میں اپنے اس موقف کو ابھی عدالت میں ثابت بھی کر کے دکھا دوں گا۔“

”وکیل صاحب۔“ بیچ نے مجھ سے کہا۔ ”پلیز پروسیڈ۔“ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”عدنان صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ ”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہمارا اور کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ بس ہم دونوں بھائی تھے اور

”مگر آپ بھی کیا کریں..... آپ تو ایک پراپرٹی ایجنٹ ہیں۔ نازک قرآنی معاملات کو بھی کمیشن کے اصولوں پر ہی طے کریں گے نا!“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ اکھڑے ہوئے لہجہ میں بولا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے بھائی کی موت کا ذرا سا بھی دکھ یا صدمہ نہیں ہے۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”آپ کی نظر دیت کی رقم پر لگی ہوئی ہے لیکن یاد رکھیں، یتیموں اور بیواؤں کا مال کھانے والوں کا بڑا عبرت ناک انجام ہوا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کی المناک موت ہی سے کچھ سبق سیکھ لیں۔“

”آپ وکیل ہیں یا مولوی صاحب؟“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”میں کیا ہوں، اگر ابھی تک آپ کو پتا نہیں چلا تو انشاء اللہ، اس کیس کے اختتام تک آپ سب جان جائیں گے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ نے ملزمہ کو پھانسی دلوانے کے لیے اپنی جیب سے ایک مہنگے وکیل کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ آپ کا کیس بھی یقیناً بھی وکیل صاحب لڑیں گے لیکن اس کیس میں ان کی حیثیت وکیل صفائی کی ہوگی۔“ پھر میں نے مڑ کر مرچ پی لگانے والے انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت پر خاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر تین گواہوں کو استغاثہ کی جانب سے پیش کیا گیا لیکن وہ میری مؤکلہ کے خلاف کوئی خاص محاذ کھڑا نہ کر سکے۔ میں نے ان کے بیانات کے پرچے اڑا دیے تھے۔ ان میں سے ایک گواہ پر ہونے والی جرح خاصی دلچسپ ہے لہذا میں صرف اسی کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔

یہ وہی نیکی ڈرائیور تھا جو اس روز مقتول اور اس کی بیوی کو اتر پورٹ پہنچانے والا تھا۔ اس کا نام قاسم معلوم ہوا۔ قاسم کا شمار بھی اس واقعے کے چشم دید گواہوں میں ہوتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اسے نادیرہ کے خلاف بیان دینے کے لیے خصوصی طور پر تیاری کرائی تھی۔

اس نے بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ جرح

”میں آپ کے پاس جو تجویز لے کر آیا تھا، وہ شریعت کے عین مطابق تھی۔“ وہ میرے چکر میں آ گیا۔

”دیت کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مگر میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔“

”تو آپ کی یادداشت نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ مبارک ہو عدنان صاحب۔“ میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے آپ معزز عدالت کے سامنے یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ آج سے پہلے میری آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”یہ پانچ لاکھ کا کیا معاملہ ہے وکیل صاحب؟“ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

”جناب عالی!“ میں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور بولنا شروع کیا۔ ”استغاثہ کا معزز گواہ اس کیس کے آغاز میں میرے آفس میں ایک آفر لے کر آیا تھا کہ اگر میں ملزمہ کو پانچ لاکھ دیت (خون بہا) دینے کے لیے راضی کر لوں تو اس رقم میں سے ایک لاکھ بطور کمیشن مجھے دے گا لیکن میں نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”چھوٹا بھائی ملزمہ کو پندرہ بیس لاکھ کی ڈروے کر لاہور سے کراچی چلا آیا تھا اور بڑا بھائی خون بہا کے نام پر اس ستم رسیدہ عورت سے مزید پانچ لاکھ بنور نے کے چکر میں تھا۔ یہ اپنے مردہ بھائی کے پیسے گھرے کرنا چاہتا تھا۔“

”میں نے جو کچھ بھی کیا، شریعت میں اس کا حکم موجود ہے۔“ وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ قرآن کو نہیں مانتے؟“

”قرآن کریم اللہ کے احکامات کی کتاب مقدمہ ہے اور میں اللہ کے ہر حکم کو مانتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دیت کا معاملہ ایسا نہیں جیسا آپ نے میرے سامنے پیش کیا تھا۔ اگر کوئی کیس عدالت میں ہے تو دیت کا فیصلہ بھی عدالت ہی کرتی ہے اور دیت کی رقم کی ادائیگی کے لیے بھی قانون موجود ہے۔ از روئے دفعہ تین سو اکتیس..... دیت کی ادائیگی دو طرح سے کی جائے گی۔ اول، اگر ملزم کی حیثیت ہو تو یکمشت۔ دوم، اگر ادائیگی کی حیثیت نہ ہو تو دیت کی رقم قسط وار واجب الادا بنائی جاسکتی ہے جو کیس کے آخری فیصلے کی تاریخ سے تین سال کی مدت تک پھیلی ہو سکتی ہے۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر عدنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



حاضر جوابی

احمد بن ابی طاہر ایک بد شکل انسان تھا اور اس کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت خادمہ تھی۔ ایک دن وہ گھر میں داخل ہوا تو سامنے خادمہ کو دیکھ کر مسکرا دیا مگر خادمہ اسے دیکھ کر ناراض ہو گئی۔ خادمہ کے ماتھے پر شکن دیکھ کر احمد بن طاہر نے پوچھا۔ ”میں تیری صورت دیکھ کر ہنس رہا ہوں اور تو ہے کہ ناراض ہو رہی ہے۔“

خادمہ نے کہا۔ ”تم من بھاتی چیز کو دیکھ کر مسکرائے ہو اور مجھے ایک ناگوار چیز سے واسطہ پڑا ہے اس لیے ماتھے پر شکن آگئی۔“

مرسلہ۔ عبد الجبار رومی انصاری، چوتھنگ، لاہور

”تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم ٹیکسی میں مقتول کا سامان رکھوار ہے تھے تو طزمہ نے اچانک وہاں پہنچ کر مقتول پر فائرنگ شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“ میں نے یہ دستور گواہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت طزمہ نے کس قسم کی سینڈل پہن رکھی تھی؟“

”جی نہیں۔ میں نے اس کی سینڈل پر دھیان نہیں دیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ تو یاد ہوگا کہ طزمہ نے وقوعہ کے روز کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟“

میرے سوالات نے قاسم کو کافی حد تک الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب! مجھے اس کے کپڑوں کا رنگ بھی یاد نہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ با دام کھانے سے انسان کی یادداشت کافی تیز ہو جاتی ہے؟“

”جی، میں نے سنا ہے مگر کبھی ثرائی نہیں کیا۔“ وہ ہونقوں کے انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

”ثرائی کرنا بھی نہیں کیونکہ آج کل ایک نئی ریسرچ بھی مارکیٹ میں آچکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون سی ریسرچ؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”بتاؤں گا مگر میری ایک شرط ہے!“ میں نے کہا۔

کے لیے اس کے پاس چلا گیا اور کہا۔ ”قاسم! کیا تم مقتول کو پہلے سے جانتے تھے؟“

”بالکل نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو مزدور آدمی ہوں وکیل صاحب! ٹیکسی چلاتا ہوں اور اپنی روزی کما تا ہوں۔ مقتول نے مجھے اثر پورٹ جانے کے لیے بلایا اور میں آ گیا۔“

”مطلب یہ کہ اس سے پہلے تم نے مقتول کو کہیں نہیں دیکھا تھا؟“

”جی نہیں۔“ گواہ نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

”اور کیا تم طزمہ سے پہلے بھی کہیں مل چکے ہو؟“

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”نہیں جناب! یہ عورت بھی میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔“

”کیا تم عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے، مقتول کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“

”میں ٹیکسی میں سامان رکھوانے میں مقتول اور اس کی بیوی کی مدد کر رہا تھا۔“ ڈرائیور نے بتانا شروع کیا۔

”کہ طزمہ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئی اور اس باگل عورت نے آتے ہی مقتول پر فائرنگ بھی شروع کر دی جس کے نتیجے میں مقتول زمین پر گر کر مر چکے لگا۔“

”فائرنگ کے دوران طزمہ نے کوئی بات بھی کی تھی یا بالکل خاموش رہی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ سے سوال کیا۔

”خاموش کہاں رہی تھی جناب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ عورت فائرنگ کرتے وقت۔۔۔ یہ آواز بلند کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ کامران! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا اور آخر تم مجھے مل ہی گئے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم کہیں نہیں جاسکو گے۔ ادھر ہی میرے ہاتھوں سے مرو گے۔۔۔۔۔ اور اس عورت نے واقعی مقتول کو مار ڈالا۔“

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”دیش آل پور آنر۔“

اپنی باری پر میں استغاثہ کے گواہ کے پاس پہنچ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”قاسم! تم کتنے نمبر کی بس چلاتے ہو؟“

میرا سوال اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”جناب! میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ بس کی ڈرائیوری سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

اس کی الجھن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ”کیسی شرط جناب۔“
”تمہیں میرے ایک سادہ سے سوال کا جواب دینا ہوگا۔“

”جی پوچھیں.....“ وہ سادگی سے بولا۔
میں نے پوچھا۔ ”قاسم! کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے پہلا سوال کیا کیا تھا؟ میں تمہاری زبان سے اپنے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔“
میرے انداز نے اس پر گہرا ہٹ طاری کر دی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اسے یاد نہ آ سکا کہ میں نے اس سے پہلا سوال کون سا کیا تھا۔ وہ بے بسی سے بولا۔

”مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا.....“
”ٹھیک ہے قاسم!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے تو میرے سوال کا جواب نہیں دیا مگر میں تمہیں نئی ریسرچ سے ضرور آگاہ کروں گا اور وہ نئی ریسرچ ہے.....“
”لحاقی توقف کر کے میں نے جیسی نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر ڈرامائی لہجے میں کہا۔
”.....کہ عقل با دام کھانے سے نہیں آتی، بھوک کھانے سے آتی ہے۔“

”مم..... مگر آپ نے تو یادداشت کی بات کی تھی۔“
وہ روہانسا ہو گیا۔ ”اور اب عقل کا ذکر کر رہے ہیں۔“
”عقل اور یادداشت آپس میں کزن ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے استغاثہ کے گواہ کے ساتھ تفریح کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک کے ساتھ دوسری بونس میں چلی آتی ہے۔ تم اسے ”بائی ون، گیٹ ون فری“ کی کوئی ڈیل سمجھ لو۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے احتجاج کا علم بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صفائی نے عدالت کے کمرے میں مداری کا تماشا لگا رکھا ہے۔ انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

”بیگ صاحب! آپ کے ان سوالات کا زیر ساعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟“ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔
”بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی!“ میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں عدالت کے علم میں اس حقیقت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں کہ استغاثہ کا گواہ قاسم دروغ گو درجہ اول ہے۔“

”وہ کیسے؟“ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
”وہ ایسے جناب کہ.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”اسے یہ یاد نہیں کہ وقوعہ کے روز ملزمہ نے کس قسم کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس روز ملزمہ نے کس رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا حتیٰ کہ اسے تو چند لحات پہلے کی بات بھی یاد نہیں آ رہی کہ میں نے اس سے پہلا سوال کیا کیا تھا۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ مان لیا جائے کہ اس کی یادداشت بہت کمزور ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ.....“ میں نے سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے لحاقی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ کیسے یاد رہ گیا کہ وقوعہ کے روز ملزمہ نے مقتول پر قاترنگ کرتے ہوئے یہ کہا تھا..... کا مران! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا اور آخر تم مل ہی گئے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم کہیں نہیں جاسکو گے۔ ادھر ہی میرے ہاتھوں سے مرو گے.....“

عدالت میں یکدم سناٹا چھا گیا۔ جج نے ناگواری سے استغاثہ کے گواہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جب تمہاری یادداشت اتنی ہی کمزور ہے تو پھر اتنا عرصہ پہلے کے ملزمہ کے الفاظ تمہارے ذہن میں کس طرح محفوظ ہیں؟“

وہ جواب دینے سے پہلے وکیل استغاثہ کی جانب امداد طلب نظر سے نکتے لگا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”قاسم! میں نے تم سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ تم کتنے نمبر کی بس چلاتے ہو؟ مگر تمہیں تو کچھ یاد ہی نہیں ہے سوائے ان الفاظ کے جو بقول تمہارے وقوعہ کے روز ملزمہ کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے لیکن جج صاحب کے سوال کا اگر تم نے جواب نہیں دیا تو یہاں سے گھر نہیں بلکہ سیدھے جیل جاؤ گے.....“

وہ میری دھمکی سے بری طرح بدحواس ہو گیا۔ روئے خن جج کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ ”سر! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ یہ بیان مجھے وکیل صاحب نے رٹایا تھا.....“

”یہ کواں کرتا ہے۔“ وکیل استغاثہ بوکھلا گیا اور غصے سے بولا۔ ”یہ جھوٹا ہے..... احق کہیں کا۔“
”جناب عالی!“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وکیل استغاثہ کے ان الفاظ کو ریکارڈ میں لایا جائے۔ فاضل وکیل نے

موت کو ترجیح دیتی۔ جب تک مقتول کا فراڈ کھلا نہیں تھا، ملزمہ بڑی امید کے ساتھ اس کی واپسی کی خطرہ تھی لیکن حقیقت سامنے آنے کے بعد اس کے پاس جینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا تھا.....“

میں نے ایک بار پھر لگاتی توقف کیا۔ سچ پوری توجہ سے میرے دلائل سن رہا تھا۔ میں نے اپنی محنت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! ملزمہ اپنے بیان میں بتا چکی ہے کہ اس نے ارادہ قتل کی نیت سے مقتول پر گولی نہیں چلائی تھی اور یہ بات اصولی طور پر درست بھی نظر آتی ہے کیونکہ کامران کا زندہ رہنا نادرہ کے لیے زیادہ ضروری تھا کیونکہ مقتول کی زندگی سے زیادہ اہم وہ رقم تھی جو وہ ملزمہ سے ہتھیا کر لے گیا تھا۔ مقتول کی زندگی کی صورت میں ملزمہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتی تھی۔ ملزمہ اسی لیے مقتول کو زخمی کرنا چاہتی تھی کہ وہ امریکا نہ جاسکے لیکن مقتول کی بد قسمتی کے ملزمہ کا نشانہ خطا ہو گیا..... اور.....“ میں نے رک کر اس کیس کے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا پھر سچ سے درخواست کی۔

”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں آئی او صاحب سے چند نہایت ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں جو اس کیس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیں گے۔“ کسی بھی کیس کے انکوائری آفیسر (تفتیشی افسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر قسم کی عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

سچ نے مجھے آئی او سے سوالات کی اجازت دے دی تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سچ کا اشارہ پا کر وٹنس باکس میں آ گیا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر دوستانہ انداز میں کہا۔

”ماشاء اللہ! آپ پولیس کی وردی میں بہت اسمارٹ لگتے ہیں۔“

”جی شکریہ۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ میں نے آئی او کی جھوٹی تعریف نہیں کی تھی۔ وہ واقعی ایک اسمارٹ اور بینڈم شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آئی او صاحب! میرے پاس پوسٹ مارٹم کی جو رپورٹ ہے، اس کے مطابق مقتول کامران کی موت سینے میں پیوست ہونے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ

نہیں گیا بلکہ ہر لمحہ اس کی محبت اسے یقین دلاتی رہی کہ مقتول ضرور ایک دن لوٹ کر واپس آئے گا تاہم وہ دن بھی طلوع نہیں ہوا، البتہ ایک روز ملزمہ کو پتا چلا کہ اس کا گمشدہ شوہر کراچی میں ہے اور اس نے ایک اور شادی بھی کر لی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مقتول اس سے ہتھیائی ہوئی دولت کے بل بوتے پر اپنی نئی بیوی کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے امریکا جا رہا ہے تو وہ فی الفور لاہور سے کراچی پہنچ گئی تاکہ مقتول کو امریکا جانے سے روک سکے لیکن یہاں آ کر جب اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر صرف خود غرض، فریبی اور دعو کے بازی نہیں تھا بلکہ اپنی نئی بیوی کے سامنے تو وہ اسے پہچاننے ہی سے انکاری ہے تو پھر اس کا غصہ اور اشتعال اس انتہا کو پہنچ گیا کہ دماغ اس کے قابو میں نہ رہا اور اس کے حواس خمسہ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے ہتھ پھر سلسلہ دلائل کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! بعض ناگہانی اشتعال ایسے ہوتے ہیں جن کا رد عمل فوری ظاہر ہوتا ہے مگر یہ رد عمل دیر پا نہیں ہوتا جبکہ بعض اشتعال بہت خطرناک اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے اشتعال رفتہ رفتہ انسان کے ذہن اور دل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور انسان ان کے بارے میں جتنا سوچتا ہے، ان کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کامران نے میری مؤکلہ کو محبت کا فریب دے کر جو اشتعال دلا یا تھا، وہ اسی نوعیت کا خطرناک اشتعال تھا۔ اس اشتعال کے اثرات نے ملزمہ کی ساری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ گھریلو زندگی سے محروم ایک تنہا عورت تھی۔ اس کی نہ کوئی اولاد تھی اور نہ ہی کوئی قریبی رشتے دار۔ وہ اپنا دکھ کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ مقتول نے اسے دولت و جائداد سے بھی محروم کر دیا تھا۔ جب ملزمہ کو مقتول کی اصلیت کا علم ہوا تو اس وقت اس کی جو دلی کیفیت رہی ہوگی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میرے علم کے مطابق ابھی تک ایسے الفاظ ایجاد بھی نہیں ہوئے جو کسی کے دلی جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ مقتول نے ملزمہ کو محبت سے محروم کیا، از دو اجی زندگی سے محروم کیا، ایک عالیشان کوٹھی سے محروم کیا اور اس سے لوٹے ہوئے مال اور اسباب پر عیاشی کا منصوبہ بھی بنا ڈالا۔ اگر مقتول اپنی نئی بیوی کے ساتھ امریکا فرار ہو جاتا تو میری مؤکلہ اس وقت کشمیر میں کھڑی انصاف کی بھیک مانگتی دکھائی نہ دیتی۔ اتنا بڑا صدمہ اٹھانے کے بعد اس کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کا ہارٹ فیل ہو جانا یا وہ اپنے سامنے پھٹی ہوئی ویران اور طویل زندگی پر

میں نے متذکرہ بالا سرٹیفیکیشن کی مصدقہ نقول اپنی فائل میں سے نکال کر جج کی طرف بڑھادیں اور کہا۔

”جناب عالی! ان چاروں ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ اگر مقتول کو فوری طبی امداد فراہم کر دی جاتی تو اس کی جان بچائی جاسکتی تھی لہذا.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے انکو آری آفیسر کی طرف دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”لہذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ مقتول کی موت کی اصل ذمہ دار پولیس ہے۔ دیش آل یور آنر۔“ عدالت میں سرگوشیوں کی آوازیں ابھریں پھر... چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں شور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

”آرڈر، آرڈر.....“ جج نے حکمانہ انداز میں کہا۔ ”سائنٹسٹ پلینز..... عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔“ پھر اس نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

”آپ ہیگ صاحب کے اس پوائنٹ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”جناب عالی! یہ سب کچھ بعد از وقت ہے۔“ وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ ”اگر ایسی کوئی بات تھی تو میرے فاضل دوست نے یہ سرٹیفیکیشن وغیرہ پہلے کیوں نہیں پیش کیے؟“

”دیر آید، درست آید۔“ میں نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! میں سمجھتا ہوں اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب بھی اور جہاں سے بھی جو حقائق ہاتھ لگیں، انہیں شامل مقدمہ کیا جاسکتا ہے حتیٰ کہ اگر لوئر کورٹ سے کسی کیس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تو اس ثبوت کی بنا پر اس فیصلے کے خلاف ہائر کورٹ میں اپیل کی جاسکتی ہے۔“

میرا استدلال اتنا جاندار تھا کہ وکیل استغاثہ اس کی مخالفت میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ جج تھوڑی دیر تک، اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو شا کر علی میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ خدا کا بندہ ہریشی پر عدالت میں موجود ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کے گھر کا کوئی کیس ہو۔ ویسے ریسٹورنٹ لائن میں صبح کا وقت زیادہ بڑی نہیں ہوتا لہذا اسے عدالت آنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔

تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مقتول کو کل تین گولیاں لگی تھیں جن میں سینے میں پیوست ہونے والی گولی جان لیوا ثابت ہوئی۔ ویسے پیٹ میں گھسنے والی گولی سے بھی بہت زیادہ خون کا اخراج ہوا تھا۔“

”اوہ یس.....“ میں نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔ ”خون کے اخراج سے یاد آیا کہ مقتول کی موت کا ایک سبب تیزی سے جسم سے خارج ہونے والا خون بھی تھا۔“ لمحائی توقف کر کے میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میری معلومات اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق کم و بیش دس بجے رات مقتول پر فائرنگ کی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت ساڑھے دس کے بعد واقع ہوئی تھی اور جب اسے اسپتال پہنچایا گیا تو وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کو لگ بھگ پونے گیارہ بجے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ کیا آپ اتنے بجے ہی اسپتال پہنچے تھے؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا پھر سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔

”ہیراز پوائنٹ یور آنر!“ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔

”اپنے پوائنٹ کی وضاحت کریں ہیگ صاحب۔“ جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جناب عالی! اہم واقعاتی شہادتیں، میڈیکل ایفیسر کی رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ مقتول کا مران کی موت جسم سے بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث واقع ہوئی ہے۔ ٹھیک دس بجے رات مقتول کے بدن میں تین گولیاں پیوست ہوئیں اور لگ بھگ پونے گیارہ بجے جب اسے اسپتال پہنچایا گیا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ پولیس نے زخمی مقتول کو فوری طبی امداد دینے کے سلسلے میں جبرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ پولیس کے محکمے میں اس نوعیت کی بے قاعدگی اور غفلتیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ضابطے میں کارروائی کے نام پر پولیس متاثرہ شخص کی تکلیف کو پیش پشت ڈال کر اپنے کام میں لگ جاتی ہے۔ میں نے اسپتال کی رپورٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں شہر کے چار نام اور ڈاکٹروں سے مقتول کی موت کے حوالے سے سرٹیفیکٹ حاصل کیے ہیں۔ یہ چاروں بہت مستند اور معروف ڈاکٹر ہیں۔ ان کی رپورٹیں اور سرٹیفیکیشن کو

”بیگ صاحب! آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔“
شا کر علی میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”مجھے لگتا ہے، اگلی
پیشی پر بیج فیصلہ سنا دے گا۔“
”مجھے بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔“ میں نے تائیدی لہجے
میں کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ ہمارے حق میں ہی
ہوگا۔“

”انشاء اللہ!“ وہ کراڑی آواز میں بولا۔
ہم پارکنگ لائٹ تک ساتھ آئے اور پھر اپنی اپنی
گاڑی میں بیٹھ کر عدالت سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے اس کیس کا فیصلہ سنا دیا۔
شا کر علی کا بے لوث تعاون اور میری استھک محنت رنگ
لے آئی تھی۔ اگرچہ عدالت نے اس پیشی پر نادرہ کو بری تو نہیں
کیا تھا تاہم بیج کا فیصلہ اس کے حق میں تھا۔ عدالت نے
نادرہ کو دو سال کی سزائے محض سنائی تھی اور اس کے ساتھ دیت
کے طور پر مقتول کے لواحقین کو ایک لاکھ روپے بھی ادا کرنا
تھے۔ یہ خوں بہا ظاہر ہے، مقتول کے بڑے بھائی عدنان کی
جیب میں جاتا۔ کامران کے لواحقین میں صرف وہی ایک شخص
زندہ تھا۔

وہ بد ذات شخص اپنے مرے ہوئے بھائی کی لاش کو بیچ
کر پانچ لاکھ روپے کھرے کرنا چاہتا تھا اور اس ڈیل کے
بدلے میں وہ مجھے ایک لاکھ روپے دینے کو تیار تھا لیکن میں نے
اس کی بے غیرتی کا ایسا آپریشن کیا تھا کہ وہ ایک لاکھ روپے
تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور..... یہ ایک لاکھ روپے بھی اسے
قسطوں کی صورت میں عرصہ دو سال کے عرصے میں ملنا تھے
یعنی اس رقم کی چوبیس قسطیں ہو گئی تھیں یعنی پانچ ہزار سے بھی
کم قسط بنتی تھی۔ وہ کمیشن ایجنٹ اس میں بھی خوش تھا۔ اگر اس
کے بس میں ہوتا تو وہ کامران کی ہڈیاں بھی بیچ کر کھا جاتا۔

اچھائی کی ایک حد ہوتی ہے لیکن برائی کی کوئی حد نہیں
ہوتی۔ اگر انسان بے غیرتی کی راہ پر چل نکلے تو اسے مہا...
بے غیرت بننے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عدنان کا
شمار ایسے ہی افراد میں کیا جاسکتا تھا۔

جب عدالت نے فیصلہ سنایا تو شا کر علی نے مجھ سے کہا
تھا۔ ”بیگ صاحب! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے پھر
دیت کی رقم کو ہم یکمشت کیوں نہ ادا کر دیں۔ اس ذلیل
انسان سے جتنی جلدی جان چھوٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“
ذلیل آدمی سے اس کی مراد ”عدنان“ تھا۔ میں نے
زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”شا کر صاحب! ہماری نہیں، اس کیس کی جان
ہمارے پاس پھنسی ہوئی ہے۔ اگر ہم نے اسے یکمشت ایک
لاکھ کی رقم ادا کر دی تو اس کی جان آسانی سے چھوٹ جائے
گی اور میں یہ نہیں چاہتا۔“
”پھر آپ کیا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟“ اس نے
سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ عدالتی فیصلے کے عین مطابق وہ دو
سال تک عدالت کے چکر لگاتا رہے اور ہر ماہ اپنی قسط وصول
کر کے جاتا رہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”میں ایسا بندوبست کر دوں گا کہ عدنان کا آپ سے کوئی
واسطہ نہ رہے۔ آپ عدالت میں ہر ماہ رقم جمع کرادیا کریں
اور وہ وہاں سے وصول کر لیا کرے۔ عدنان جیسے انسان دشمن
کتوں کے سامنے ایک ساتھ بہت سارا گوشت نہیں پیچیک
دینا چاہیے۔ انہیں ہڈی ہڈی، بوٹی بوٹی کو ترسا کر مارنا
چاہیے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بیگ صاحب! وہ اسی
سلوک کا مستحق ہے۔“ شا کر علی تائیدی انداز میں بولا۔ ”میں
نے یکمشت ادائیگی کی بات اس لیے کی تھی کہ ہر ماہ اس کم ظرف
کے منہ نہ لگنا پڑے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق
بڑا شافی بندوبست کر دوں گا۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں
کہا۔ ”عدالت کے ذریعے کی جانے والی ادائیگی سب سے
زیادہ محفوظ تصور کی جاتی ہے۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گیا۔
نادرہ کو عدالت نے دو سال قید محض کی سزا سنائی تھی۔ دو
سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ قلیل مدت پر لگا کر اڑ جاتی
ہے لیکن اس کیس کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ یہ قلیل
مدت پوری ہونے سے پہلے ہی نادرہ کی روح نفسِ عنصری سے
پرواز کر گئی تھی۔ اسے جیل گئے صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ
موسم سرما میں اسے نمونیا ہو گیا۔ چیٹ انٹیکشن اتنا شدید تھا کہ
وہ جانبر نہ ہو سکی اور جیل کی چار دیواری سے نکل کر سیدھی
قبرستان چلی گئی۔

میرے حساب سے یہ اس کی جسمانی موت تھی۔ اس کی
روح تو بہت پہلے اس وقت ختم ہو گئی تھی جب کامران نے اس
کے جذبات، احساسات اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ وہ ایک زندہ
لاش کی طرح اپنے بدن کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار رہی تھی۔ جیل
میں اسے اس بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔

(تحریر: حسام بٹ)

Downloaded From
Paksociety.com



اپ ڈیٹ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اپ ڈیٹ رہنا عہدِ جدید کی ضرورت تو ہے مگر... انسان زندگی کے کن کن معاملات میں الٹ رہ سکتا ہے... رشتوں اور تعلق کے حوالے سے کبھی علم اور کبھی لاعلمی انسان میں بے چینی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بھی عجیب شخص تھا جو اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے نکلا تھا... اور لمبے عرصے تک بے خبری میں زندگی سکون سے گزارتا رہا مگر ایک مقام پر حقائق کے ادراک نے اس کی روح تک کو گھائل کر دیا۔ ایسے میں بھلا چین کیسے ممکن تھا۔

دل میں پھانس بن کر اتر جانے والی یادوں کا دلفریب احاطہ

لیکن ہم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا کہ جو ہمارے ساتھ ہونے والا ہوتا ہے..... اس بارے میں تقدیر ہمیں پہلے سے کچھ اشارے بھی دیتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو بات تقدیر ہمیں سمجھانا چاہتی ہے، وہ اس وقت تو نہیں، البتہ بعد میں سمجھ آتی ہے مگر وہ بھی ایسے کہ بہن کی گیرائی سے اس پر غور کریں..... گزرے ہوئے واقعات کو ایک ترتیب کے ساتھ

آج تک تو یہی سنا ہے کہ تقدیر انسان پر ہمیشہ ہنسی آئی ہے..... مگر یہاں سوال یہ ہے کہ کیا بھی وہ انسان پر روئی بھی ہے؟ شاید نہیں، یا پھر ہاں! ہاں! کسی اور پر تو نہیں، مجھ پر تو ضرور ایک بار روئی ہو گی..... وہ جتنی بھی بے رحم اور بے حس سہی مگر مجھ بد نصیب پر تو وہ بھی دکھی ہوئی ہوگی۔

جنوری 2017ء

149

سسپنس ڈائجسٹ

یاد کر کے دیکھیں تو آپ ایک دم چونک پڑیں گے..... تقدیر کی شکل آپ کو جیتی جانتی دکھائی دینے لگے گی۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔ نکتہ بہت باریک ہے، امید ہے میری یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ کو یقین آجائے۔

تقدیر کو ہم اکثر کوستے ہیں کہ یہ نامہربان ہوتی ہے مگر یہ عجیب ہے کہ تقدیر نے میرے ساتھ ایک بے رحمی کی میں اس سے بہت خوش ہوا..... ہاں! اس کی بے رحمی پر خوش ہونے والا شاید میں ہی ایک واحد انسان ہوں۔

اس واقعے کو آج پورے پچیس برس بیت چکے ہیں میں نے کسی سے محبت کی تھی۔ بڑی عجیب محبت تھی میری یہ..... جو بچپن سے شروع ہوئی تھی، کھیل کھیل میں، ہنسنے ہوئے..... ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے..... پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے، بچکانہ انداز میں ایک دوسرے کے کپڑے کھینچتے ہوئے اور دھکیلتے ہوئے۔ آہ..... یہ یادیں بھی کتنی غالم ہوتی ہیں۔

پچاس برس نے بڑی تیزی سے زقند بھری ہے۔ آج بھی مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ کل ہی کی تو بات ہے۔

آج پچیس برس بعد میں ایک خوش حال اور کامیاب زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اگر کامیابی اسے کہتے ہیں تو سچے..... میں ایک بڑے سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر فائز ہوں۔ گزینڈ آفیسر ہوں جسے عرف عام میں ”کلاس ون آفیسر“ کہا جاتا ہے۔ اب میری عمر پچاس برس ہے۔ صوبہ سندھ کے ایک دور افتادہ اور ایشیا کے گرم ترین مشہور تاریخی شہر جیکب آباد کا رہنے والا ہوں۔ یہی میری جنم بھومی ہے۔ جاب وغیرہ کے سلسلے میں، آج کل مستقل طور پر کراچی کے ایک پوش علاقے میں مقیم ہوں۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے آخری سال میں ہے، بیٹی... این ای ڈی یونیورسٹی میں سافٹ ویئر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا ہے۔ میری بیوی ہے، نسرین.....

غرضیکہ میرے بچے، میری بیوی..... اب یہی میری کل کائنات ہیں۔

بہ ظاہر دنیا کی نظروں میں ایک کامیاب اور خوش باش انسان ہوں لیکن میرے اندر دکھ کی آغچ رہتی ہے۔

میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے، میں ہر شے میں ”اپ ڈیٹ“ کا قائل ہوں۔ پرانی شے فوراً ترک کر دیتا ہوں، نئی شے اپنا لیتا ہوں، چاہے وہ نئے ماڈل کی

گاڑی ہو یا دوسرا کوئی سامان۔ گھر کا پینٹ ہو، خواہ صحیح حالت میں ہی کیوں نہ ہو، فوراً نیا کروا لیتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نئے پن میں ایک خوشی اور راحت ملتی ہے۔

مگر ہاں! ایک چیز کو میں ”اپ ٹو ڈیٹ“ نہیں کر سکا ہوں اور وہ ہیں میری یادیں..... گزری ہوئی یادیں بھلا.....

یادیں بھی اپ ڈیٹ ہوتی ہیں؟ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ ایک سودا ساسر میں سا گیا تھا کہ ہاں! اگر میری وہ یادیں جو میرے لیے ایک طرح سے سرمایہ حیات رکھتی ہیں، وہ بھی تو اپ ڈیٹ ہو سکتی ہیں..... اس کا خیال مجھے ایک امید پر آیا تھا..... ایک ایسی امید جس کے ”بر آنے“ کا مجھے بالکل بھی یقین نہ تھا، یہ ناممکن تھا۔ اس واقعے کو اب پچیس سال بیت چکے تھے مگر یہ بات بھی تو تھی کہ میں پچیس سالوں میں کب شکار پور گیا تھا۔

پھر ایک وعدہ بھی تو تھا، اس وعدے کو یاد کر کے مجھے خود پرندامت بھی ہوئی کہ وہ اب تک میں پورا نہیں کر سکا تھا یا پھر شاید مایوسی اور زندگی کی مصروفیات نے مجھے اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہاں! ایک اور بات بھی تھی، وہ ایک عجیب ہی وعدہ تھا، بچوں جیسا یا پھر خطبوں والا۔

بس! یہی وہ لمحہ تھا میرے سوچنے کا جس نے مجھے ہمیز کیا تھا کہ میں کشاں کشاں شکار پور نکل جاؤں، ایک چکر ہی لگا آؤں..... کیا خبر وہ یادیں جو اس شہر سے وابستہ تھیں، وہ ”اپ ٹو ڈیٹ“ ہو چکی ہوں مگر اسے اپ ٹو ڈیٹ کرنے والا اب کہاں تھا۔ وہ تو عرصہ دراز سے اپنے شوہر کے ساتھ پہلے ساؤتھ افریقا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے امریکا جاسٹیل ہوا تھا اب تو اس کے بھی تین بچے ہو چکے تھے۔

اب کہاں دنیا کا ایک کونا اور کہاں دوسرا اور دور افتادہ کونا..... امریکا سے شکار پور..... ہنسنے والی ہی بات ہے لیکن پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں کیا سالی تھی کہ میں اس دن سے کچھ زیادہ بے چین سا رہنے لگا تھا۔

میں اب تقریباً فارغ البال ہوں بڑے بیٹے کے لیے رشتے ڈھونڈے جا رہے ہیں، اس کے علاوہ میری اور کوئی خاص مصروفیات نہیں ہیں۔

ایک دن میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ جانا چاہیے۔ وہ وعدہ بچوں والا سکی، کیا خبر وہی سچا ثابت ہو۔ اس روز میں نے نسرین سے کہا۔

”مجھے ایک ضروری کام سے اندرون سندھ جانا پڑ رہا ہے..... اپنے آبائی شہر جیکب آباد.....“

”ارے.....! خیریت؟ یہ آپ کو اتنے عرصے بعد

وہاں کیا کام پڑ گیا؟“ نسرین کا چہرہ کھنکھاتا تھا۔ وہ پانچ چھ برس ہی چھوٹی تھی مجھ سے، چالیس کے پینے میں بھی وہ ایک خوبصورت تھی۔ گورارنگ، درمیانہ قد اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا۔

”مگر..... وہاں تو اس وقت قیامت خیز گرمی پڑ رہی ہوگی۔ یہ جون کے مہینے میں تمہیں کیا سوچھی وہاں جانے کی؟“ وہ آگے بولی۔

میں نے جواب میں ایک گہری ہنسی بھری تھی۔ میں نے اس سے بہت جھوٹ بولے تھے، مگر وہ ایسے نہیں تھے جس سے مجھے فائدہ اور اسے نقصان ہوا ہو..... یہ روزمرہ اور عمومی نوعیت کے تھے۔ یہ بھی ایسا ہی جھوٹ تھا جو میں نے اس سے بولا۔

”ہاں! وہ پنشن کا ایک پرانا مسئلہ تھا جو ملتا آرہا تھا اب تک لیکن اب معاملہ گلے پڑ گیا ہے۔ ایل پی سی میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ غلطی تو اے جی آفس والوں کی ہے مگر بھگتی مجھے پڑ رہی ہے۔ جیکب آباد ٹریڈری آفس خود جا کر ہی حل کرانا پڑے گا..... ورنہ پنشن اس ماہ نہیں ملے گی، دوبارہ بحال کرانے کے لیے لمبے چوڑے پروکس میں پڑنے سے زیادہ بہتر ہے کہ جیکب آباد کا ایک چکر لگا ہی آؤں۔“

”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ..... جیکب آباد میں بچپن کے دن یاد آرہے ہوں؟“

نسرین نے آخر میں شرارت بھرے لہجے میں کہا اور میں اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

”ارے بھئی تم بھی کیا بات لے کر بیٹھ گئی ہو..... مجھے جیکب آباد جانے سے ہول آرہا ہے مگر جانا تو پڑے گا ہی۔“ میں نے بات ٹال دی، ہمیشہ کی طرح۔

☆☆☆

ایک سوٹ کیس لیے میں رات آٹھ بجے والی لکڑی انٹرکڈیشن کوچ میں سوار ہو گیا جس نے اگلے دن مجھے جیکب آباد کے بجائے شکارپور پہنچا دیا۔ ہاں! میں اسی شہر میں ہی اترنا چاہتا تھا۔ یہاں سے صرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تو جیکب آباد تھا، جو میرا آبائی شہر اور جنم بھومی تھا۔

جیکب آباد کے علاوہ شکارپور کے ساتھ بھی میرا تعلق رہا ہے اور یہی اہم رہا ہے..... کراچی جیسے ایک بڑے اور بھرے پڑے ماڈرن شہر سے اندرون سندھ کے اس دور افتادہ شہر میں آنا مجھے بالکل بھی عجیب نہیں لگا تھا مگر افسوس ہوا کہ یہ آج بھی ویسا ہی پسماندہ اور غریب سا ہی شہر رہا۔ یہاں مجھے کوئی ترقی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی وہی

دھول اڑاتے راستے، تنگ گلیاں، بکھرے بکھرے سے بازار اور بے ہنگم شور مچاتی مارکیٹیں..... سب کچھ ویسا ہی تو تھا جیسا کہ بچپن میں پہلے تھا۔ فقط اتنا ضرور ہوا تھا کہ کچھ کچی عمارتوں کا اضافہ ہو چلا تھا کچھ کچے راستے، پختہ سڑکوں کا منظر پیش کرنے لگے تھے۔ باقی سب ویسا ہی تھا، بھینسوں کی قطاریں اور ان کے پیچھے ڈنڈا اٹھاتے بھاگتے بچے۔

میں نے شکارپور کے ایک معروف چوک بازار ”لکھی در“ میں ایک ہوٹل میں کمرالیا۔ تھوڑا فریش ہوا، ناشتا کیا، اس کے بعد سفر کی ٹکان اتارنے کے لیے سو گیا۔

جاگا تو سہ پہر کی خبر لایا۔ بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ جون کا مہینا تھا، اندرون سندھ میں تو یوں بھی بہت گرمی پڑتی تھی مگر اس گرمی میں مجھے گم گشتہ یادوں کی آنچ آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں جب ہوٹل سے باہر نکلا تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ فضا جس زدہ سی تھی۔ میں لکھی در سے نکلا اور پھر میرے قدم اس راستے پہ ہو لیے جو پرانے قبرستان کی طرف جاتا تھا لیکن میری منزل یہ نہ تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ ایسے میں میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیات ہونے لگیں۔ میرے اندر کچھ دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کا زیروم بھی بے ترتیب سا ہونے لگا تھا۔ قبرستان کی بجلی گارے مٹی والی پاؤں ڈھری وال سے آگے مجھے دائیں جانب ایک بڑا سادہ پوکھل چوٹی گیٹ نظر آ گیا۔ میں اس کے سامنے چٹھرا..... اور بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری تھر تھرائی ہوئی ہنسی خارج ہو گئی۔ میں یک ٹک اس بند چوٹی گیٹ کو دیکھتا رہا۔ اس کے برابر میں، جو اس سے ملحقہ ہی تھی، بڑی سی دو دروازوں والی دکان بھی ہوا کرتی تھی۔ اس کے دروازے بھی بند تھے۔ وہاں ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ ایسی خاموشی جس کے پیچھے خوشیوں اور محبت بھرا طوفان سا چھپا ہوا ہو۔ گیٹ اور دکان کے اطراف کی دیواریں سال خوردہ سی نظر آ رہی تھیں۔ اندر کے باغات اور رہائشی عمارت کی کیا حالت ہوگی، اس کا بھی میں نے اسی طرح کا اندازہ لگایا۔ میں جانتا تھا کہ اندر اب کچھ بھی نہیں تھا، نہ وہ محبت، نہ وہ رفاقت، نہ وہ لوگ..... اور نہ وہ خود..... صرف ماضی کی وہ گم گشتہ یادیں ہوں گی، جواب یہاں کی مکین ہو کر رہ گئی تھیں..... لیکن پھر بھی میں یہاں آیا تھا، اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے تاکہ میری یادوں کی پٹاری میں کچھ نیا ہو۔

مجا میں چونکا۔ گیٹ کا بغلی دروازہ ہلکی سی چرچاہٹ

بھی عجیب ہو..... یہ کوئی عجائب خانہ تو نہیں ہے کہ آپ اس کے گھومنے کے اتنے سارے پیسے دے رہے ہو۔ آپ ویسے ہی گھوم لو۔“

”نہیں..... نہیں، یہ رکھ لو..... ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر آخر میں پوچھا۔

وہ ابھی تک حیرت اور الجھن میں تھا، جھٹ بولا۔

”میرا نام مختیار علی ہے سائیں! اور آپ.....؟“

”میرا نام زمان خان ہے۔ میں جیکب آباد سے تعلق رکھتا ہوں اور اب کافی عرصے سے کراچی میں مقیم ہوں۔ میرا یہاں بھی بہت سا بچپن گزرا ہے..... شکار پور ایک سرکاری کام سے آیا تھا، سوچا ایک نگاہ اس جگہ کو بھی دیکھتا جاؤں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے تو میں چلا جاتا ہوں، یہ پیسے بھی تم بے شک رکھ لو بس ایک خواہش تھی۔“

میں نے دیکھا وہ ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا لیکن پھر فوراً بولا۔

”ارے سائیں! مجھے کیا اعتراض ہوگا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا آپ کی بات..... بعض انسانوں کو اپنی بچپن کی جگہوں سے بہت عشق ہوتا ہے۔ اللہ سائیں بخشے میرے بابا کو..... وہ کہتا تھا کہ انسان کتنا بھی دور چلا جائے، اسے اپنی پرانی جگہوں کی یاد آتی ضرور ہے۔ آجاؤ سائیں..... آجاؤ.....! بھلی کری آئیہ (خوش آمدید) اس نے مجھے راستہ دیا اور میں نے بظنی گیٹ سے اندر قدم رکھ دیا۔

☆☆☆

برات آچکی تھی جیکب آباد سے۔ پرانا زمانہ تھا، مسافر لاری بک کرائی گئی تھی۔ دونوں گھرانے پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے تھے۔ بڑی فیملیز تھیں۔ براتیوں سے بھری لاری دیو پھل چوبی گیٹ سے اندر داخل ہو کر ایک وسیع و عریض احاطے کے ایک کونے میں کھڑی ہو چکی تھی۔ براتی اترنے لگے۔ دلہا تو بھی اتارا گیا۔ دلہائے نوبہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا ان کے گھر کی یہ پہلی شادی تھی، اس لیے خوب دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ سب آئے تھے۔ ان میں دلہے کا سب سے چھوٹا بھائی زمان بھی تھا۔ اس کی عمر چھ سات سال کی تھی۔ اسے بھی رنگ برنگ لباس پہنایا گیا تھا، وہ شاہ بالا بنا ہوا تھا۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اچھل کود رہا تھا۔

احاطے کے بعد ایک ہزار گز پر باغ پھیلا ہوا تھا۔ بہت وسیع اراضی تھی اس گھر کی جو کسی حویلی کا ہی

کے ساتھ کھلا۔ اس کی آواز کراہتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی مجھے..... اندر سے ایک چچی سا شخص برآمد ہوا۔ یہ کوئی ملازم یا چوکیدار نائپ کا ہی نظر آیا۔ اس نے عام سی شلوار قمیص اور کاندھوں پر اجرک رکھی ہوئی تھی۔ سر پہ پرانی سی شیشوں کے کام والی سندھی ٹوپی تھی۔ رنگت خاکستری تھی اور چہرہ قدرے لمبوتر۔

وہ میری وضع قطع سے کچھ مرعوب سا ہوا اور بولا۔

”سائیں! خیریت؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ اس کالب و لہجہ سندھی تھا۔ ”ویسے یہاں اب کوئی نہیں رہتا ہے۔“ اس نے جیسے مجھے سوچتا پا کر اپنا جملہ مکمل کیا تو میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ یہاں اب وہ لوگ نہیں رہتے جو پہلے یہاں رہا کرتے تھے۔ اس بات کو بچپن برس بیت چکے ہیں۔ کیا ان کے بعد کوئی یہاں رہنے کو اب تک نہیں آیا ہے؟“

وہ میری بات پر ذرا چونکا اور اپنی آنکھیں قدرے پیچے پیچے مجھے یہ غور ٹکنے لگا۔ اس کے بعد بولا۔

”ہاؤ سائیں! پچھلوں کا تو مجھے پتا نہیں، پر مجھے یہاں کی چوکیداری سنبھالے ہوئے، پندرہ برس ہو چکے ہیں۔“

”یہ جگہ کن لوگوں نے خریدی تھی ان سے؟“

میں نے اس کی کالی کانام بتایا..... وہ جواب میں بولا۔

”مراد شاہ نے خریدی تھی۔ وہ یہاں کما د (گنا) اور کٹی (پھونس) کا کارخانہ لگانا چاہتا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا یہ منصوبہ ایسے ہی پڑا رہ گیا۔ بڑے لوگ ہیں جی، ابھی سیاست تو بھی جاگیردارانہ معاملات..... بس! اسی میں لگے رہتے ہیں۔“

”تم مستقل ادھر ہی رہتے ہو؟“

”ہاؤ سائیں! اندر ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے وہیں میری زال (بیوی) اور تین بچے رہتے ہیں۔ باقی سائیں! اندر سارا پلاٹ خالی پڑا ہے۔ بے آباد اور ویران..... جیسے برسوں سے ادھر کوئی نہیں رہتا ہو۔“ اس نے کہا۔

میں نے اپنی جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا..... وہ حیرت اور کچھ خوشی کے طے جلتے تاثرات سے نوٹ کو اور مجھے دیکھنے لگا، پھر اسی لہجے میں بولا۔

”یہ..... یہ کیا سائیں؟“

”یہ رکھ لو..... اور اگر برا نہیں مناؤ تو میں ذرا ایک نظر یونہی اس عمارت کو اندر سے گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ میری بات پر ہنس پڑا اور بولا۔ ”سائیں! آپ

شادی امرود کے درخت کی جھکی جھکی شاخوں سے چند امرود توڑ کر اپنی جھولی میں بھر لائی اور اس کے قریب آ کر ایک امرود بڑھاتے ہوئے معصوم سے لہجے میں بولی۔
زمان نے اس کی آنکھوں میں اداسی دیکھی تو ایک دم گھبرا سا گیا۔ فوراً اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔

”نن..... نہیں تو۔ پپ..... پتا نہیں مجھے..... امی اور گھر والے تو یہی کہہ رہے تھے کہ ہم آج دلہن کو لینے جا رہے ہیں.....“ زمان کو اور کوئی جواب نہ سوجھا تو یہی بتا دیا۔

”ہاں تا..... ہماری باجی تمہارے بھائی جان کی دلہن جو ہیں۔“ شازی نے کہا۔

”اچھا.....“ زمان کچھ سوچنے لگا پھر اس کا دل رکنے کے لیے جو سر میں سا پابول پڑا۔

”تم اگر کہو تو میں امی جان سے ضد کر کے تمہاری باجی کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیتا ہوں۔“ اس کی بات پر شازی کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں سے جھانکتے موتیوں جیسے سفید دانت زمان کو بھلے محسوس ہوئے۔ وہ اسے ہنستی ہوگی بہت اچھی لگی۔ ابھی اس ”اچھا“ گانے میں محبت کی جواں سالی قائم نہیں ہوئی تھی اور اس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

بس ایک بچہ گانہ سی، نامعلوم سی معصومیت تھی، انسیت تھی اور بے نام سی اپنائیت..... بھری دوستی تھی..... جیسے کسی بچے کو کوئی کھلونا اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی اسے کھلونے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ایک پیاری سی اور بولنے والی مڑیا کے روپ میں.....

”بدھو! بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے.....“ وہ بچے باجی کہہ رہی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد ہم سب لوگ بھی تمہاری طرف جیکب آباد آئیں گے۔“

”اچھا.....!“ زمان ایک دم خوش ہو گیا۔

تھیوڑا سنانے کے بعد دونوں ایک بار پھر کھیل میں
مگن ہو گئے۔ دو گھرانوں میں رشتے داری استوار ہو چکی
تھی، اسی لیے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تو یہ دونوں بھی خوب جم
کر دوستی لگاتے۔

باغ کے ایک گوشے میں ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ وہاں سے ٹھنڈا پانی نکلتا تھا۔ دونوں گرمی کی دوپہروں میں آم توڑ کر ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانیوں میں گھس جاتے اور کھیلتے رہتے۔ انہیں بھیگنے کی پروا بھی نہیں ہوتی مگر یہ دھیان ہوتا تھا کہ کپڑے بھیگ جانے سے کہیں بڑوں کی فائنٹ نہ بڑ جائے، اسی لیے دونوں کپڑے خشک کرنے

کے بعد ہی گھر کی طرف جاتے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن زمان کے بھائی شہریار کا ولیمہ تھا۔ ان دنوں شادی ہال نہیں ہوا کرتے تھے۔ بس گھر کے باہر ٹینٹ لگا کر کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جاتا تھا۔

شکار پور سے دلہن کے گھر والے آئے تھے۔ ان میں شازی بھی تھی۔ زمان، شازی کو اور شازی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ دونوں سارا دن خوب کھیلتے رہے۔ جب جانے لگے تو دونوں اداس ہو گئے۔ شازی کے دماغ میں کیا سائے کہ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور ضد کر کے رونے لگی کہ وہ یہیں رہے گی۔ مجھے زمان سے اور بھی کھیلتا ہے..... میری بھی اس سے شادی کر دو، جس طرح باجی کی کی ہے..... میں ادھر ہی رہوں گی، مجھے کہیں نہیں جانا ہے.....

بڑے اس کی بچکانہ بات پر بے اختیار ہنس دے تھے۔ ہم بچے تھے، ہمیں کیا پتا تھا کہ شادی کیا ہوتی ہے مگر اتنا ضرور جان گئے تھے کہ شادی کے بعد ساتھ رہا جاتا ہے اور اسی ”ساتھ“ کے لیے ہی تو شازی نے یہ بچکانہ ضد کی تھی جو مجھے بھی اچھی لگی تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی..... دونوں گھرانوں میں یہ رشتہ بنیادی طور پر ”وڈے سٹ“ تھا مگر کسی وجہ سے دلہن کے بھائی کی دلہا کی بہن سے شادی ٹال دی گئی تھی اور ایسا دلہن والوں کی طرف سے ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد دلہا والوں کے، یعنی زمان کے ماں باپ شکار پور پہنچے اور دلہن کے امی ابو کو ان کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی تو وہ پہلے تو ادھر ادھر کھسکے لگے، یعنی مطلب کی بات سے آنا کافی کرتے رہے اس کے بعد..... اپنی یہ مجبوری بتا کر جان چھڑائی کہ ہمارا بیٹا ہمارے کہنے میں نہیں ہے، اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ زمان کے ماں باپ اس وعدہ خلافی پر چراغ پا ہو گئے پھر رواجی جھگڑوں کا آغاز ہوا..... دلہا پر ماں باپ کی طرف سے یہ دباؤ ڈالا جانے لگا کہ چونکہ ان لوگوں نے اپنے وعدے کے مطابق تمہاری بہن کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے، لہذا اب تم ان کی نوبیاہتا بیٹی کو بھی اس کے گھر بھیج دو۔ دلہے میاں ذرا اور طبیعت کے تھے، پتا نہیں یہ اصول پرستی تھی یا خدا خوفی..... انہوں نے یہ کہہ کر حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ اس میں میری بیوی کا کوئی قصور نہیں۔ بات صحیح بھی تھی لیکن ماں باپ اور دیگر بہن بھائیوں نے سمجھایا کہ ہم خدا ناخواستہ ایسا کچھ نہیں چاہ رہے ہیں۔ یہ محض ان پر ایک دباؤ ڈالنے کے مترادف ہو گا وغیرہ مگر دلہے میاں نہیں مانے۔

وقت گزرتا گیا، جھگڑے چلتے رہے۔ دلہے میاں اپنی بیوی کو لے کر سرال شکار پور جا بے۔ وہیں ان کے سر نے انہیں ایک گھر دے دیا تھا، جو ان کے حویلی نما مکان سے ملحقہ ہی تھا۔ بس درمیان میں ایک چھوٹا سا احاطہ تھا اس طرف دلہا کا سرال یعنی دلہن کا میکا اور اس طرف ان کا گھر.....

بعد میں ان کے بھی بچے ہوئے۔ دلہے میاں جیکب آباد آتے جاتے رہتے تھے، بیوی بچوں کے ساتھ.... بہ ظاہر سب ٹھیک چل رہا تھا، نہیں چل رہی تھی تو رشتے داری۔ دلوں میں کدورتیں موجود تھیں مگر جو ان پود کاری میل جول جاری رہتا تھا۔ ظاہر ہشتے داری تو بھی ہی چاہے برائے نام سہی۔

جھگڑوں کے بعد دلہا کے سرال یعنی ان کے گھر جانے کی سب سے پہلے روایت زمان نے ہی ڈالی تھی۔ وہ لڑکپن میں قدم رکھ چکا تھا، عنفوان شباب تھا۔ شازی کے ساتھ بتایا ہوا بچپن اور دوستانہ اب بچکانہ پن سے آگے سرک چکا تھا اور یوں ایک تعلق خاطر کا جذبہ بھی پودے سے بڑھ کر تناور درخت بن چکا تھا۔

زمان اب میٹرک میں تھا۔ شازی بھی میٹرک میں تھی۔ زمان خاصا خوب رو تھا۔ رنگت سانولی تھی، سینہ چوڑا اور دراز قامت تھا۔

وہ دھڑکتے دل سے بھائی بھابی کے گھر پہنچا۔ بھائی جان اور بھابی اس سے مل کر خوش ہوئے۔ وہ شام کو جیکب آباد سے شکار پور پہنچا تھا۔ اکیلا تھا۔ بھائی جان کے تین بچے تھے جو زمان کے ساتھ کافی مانوس تھے۔

چائے وغیرہ پینے اور دیگر گھریلو حال احوال کے بعد اس کے بھائی نے اس سے کہا کہ وہ انکل والوں (دلہا کا سرال) کے ہاں جا کر ان سے سلام دعا کر آئے۔ زمان اسی کا تو خطر تھا۔ اسے شازی کے دیدار کا انتظار تھا۔ عرصہ بھی تو بہت ہو گیا تھا اسے دیکھے ہوئے۔ بچپن کے بعد یہ لڑکپن سے عنفوان شباب تک کے ماہ و سال جھگڑوں اور بڑوں کی آپس کی ناراضگی میں ہی بیت گئے تھے۔

اس کی آمد سے بھابی بہت خوش ہوئی تھیں۔ بھائی جان بھی خوش تھے کہ ان کے گھر سے کوئی ان کے سرال آیا تھا۔

بھائی جان اسے خود اپنے ساتھ حویلی لے کر گئے تو وہاں سب نے زمان کا پرتپاک استقبال کیا۔ زمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ کسی نے بھی اسے دیکھ کر منہ نہیں بنایا

تھا۔ سب ہی خوش تھے۔ اس کی خاطر داری بھی اچھی ہوئی غرضیکہ وہی گھریلو ماحول بن گیا جو آج سے چند سال پہلے تھا۔ بھائی جان اسے وہاں چھوڑ کر پلٹ گئے تھے کہ ان کا چھوٹا بھائی یہاں مگن ہو گیا۔ زمان نے شازی کو بھی دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ سرو قد، صورت خوب تو تھی ہی اس کی..... اب تو دراز قامت اور شباب کی آمد نے اس کے حسن و لفریب کو الگ ہی چاشنی بخش دی تھی۔ خوب کس کے پاندھی ہوئی کھنے بالوں کی چوٹی اس کی پشت تک لہرائی نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں ویسی ہی شوخی تھی جو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اب تو اور ہی بات تھی، اس شوخی میں ایک اور جذبے کی دھیمی دھیمی آواز سی بھی آتی محسوس ہوتی تھی۔ آنکھوں میں اس کی اب ایک معنی خیز تیرتی نظر آتی تھی۔

وہ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ زمان کو یہ سارا ماحول خوشگوار اور راحت آمیز محسوس ہوا، کیونکہ اس ماحول کی ”رگینی“ ہی اور تھی۔

”کتنی بڑی ہو گئی ہے اور کس قدر خوب صورت بھی۔“ وہ بہ ظاہر اس کے بڑے بہن بھائیوں سے باتیں کر رہا تھا اور اندر ہی اندر اپنے، شازی کے حسن دل آرا پر تبصرے بھی کیے جا رہا تھا۔ اگرچہ خود اس کے لیے بھی وہاں یہی تبصرہ ہوا تھا۔

”ماشاء اللہ زمان بڑا ہو گیا ہے۔“

اس کا وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ سب موجود تھے، اسی لیے وہ شازی سے کوئی چھوٹی سی عمومی نوعیت کی بات کرتے ہوئے بھی کتر رہا تھا، کچھ اس کی اپنی شرمیلی طبیعت بھی تھی۔ اس کے بعد کھانا وغیرہ لگائے جانے کی بات ہونے لگی تو زمان وہاں سے جانے لگا۔ اسے کھانا کھانے کا کہا گیا مگر اس نے شکر یہ کہا اور نیچی نظریں کیے وہاں سے بھائی کے ہاں آ گیا۔ بھائی کے گھر کا دروازہ ان کے گھر کے دروازے سے ہی نظر آ جاتا تھا، درمیان میں فقط ایک چھوٹا سا بیرونی احاطہ تھا۔

بھائی نے اس کے لیے کچھ خاص پکا رکھا تھا، جو اس نے بڑے شوق سے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے تین چھوٹے بھتیجیوں سے کھیلنے اور باتوں میں لگ گیا مگر چور چور سی اور بے چین نظروں سے دروازے کے اس جالی دار شتر کے پار بھی دیکھتا جاتا، جہاں سے بیرونی احاطے کے پار..... بھائی جان کے سسرال کے گھر کا دروازہ نظر آتا تھا۔ احاطے میں حق جل رہی تھی۔ وہ بھتیجیوں کے ساتھ ہی

مذاق اور بھائی جان سے باتوں میں مگن ہو گیا۔ اچانک اسے شتر کی چر چراہٹ سنائی دی۔ اس کا دل بے طرح دھڑکا۔ اندر ہی دونوں گھروں کا الحاق ہونے کے باعث بھائی کے بہن بھائیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، مگر زیادہ تر شازی ہی آتی جاتی تھی۔ وہ اپنی ”باجی“ سے بہت مانوس ہو گئی۔ شتر کھلنے کی محسوس چرچراہٹ اور ٹھک سے بند ہونے کی آواز سن کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ کمرے میں تھا اور وہاں سے لاؤنج قریب تھا۔ اس کی نظریں اسی طرف کسی کے شوق دیدار کے لیے ٹھہر گئیں۔

”باجی! تھی آپی لہسن اور اورک کا پیسٹ مانگ رہی ہیں، کل شامی کباب بنانے ہیں۔ تھوڑا کم بڑ گیا تھا۔“

اس کی مترنم آواز گونجی۔ زمان بھتیجیوں کے ساتھ کمرے میں بیڈ پر لوڈ و کھیل رہا تھا، کمرے کے دروازے سے لاؤنج صاف نظر آتا تھا۔ زمان گردن موڑے بے غلغلہ نظروں سے اسی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے ہوا کا خوشگوار جھونکا محسوس ہوا، اس کی جھلک ایسی ہی تھی۔ وہ سامنے سے گزری اور اس طرف دیکھتی ہوئی بچن کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں کی نظریں بس فقط ایک لمحے کو چار ہوئی تھیں اور بس..... وہ گزرتی چلی گئی۔

”فریج میں رکھا تو تھا، دیکھتی ہوں.....“ اسے اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔

”چچا جان! آپ کی باری ہے، جلدی سے چھکا نکالیں اور گوٹ بھگائیں، ورنہ پٹ جائے گی۔“ اچانک اس کے بڑے بھتیجے نے اس سے کہا۔ وہ چونکا۔

”یہ مارا..... واہ چچا جان! آپ نے صبح وقت پر چھکا مارا۔“ زمان کے واقعی چھکا نکل جانے پر بڑا ہتھیاجوش سے چلا یا۔

”کیا شور مچایا ہوا ہے؟ کون جیت رہا ہے؟“ اسی وقت شازی ہاتھ میں ایک چھوٹا سا باؤل تھا، مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اپنے بھائیوں سے بولی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر زمان کا بے طرح دھڑکا دل جیسے رک گیا..... وہ سر اٹھا کلاس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔ شازی نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ چلی۔

”شازی آئی! میں اور زمان چچا جیت رہے ہیں۔“ بڑے بھتیجے نے خوش ہو کر اسے بتایا۔ زمان کو جانے کیوں ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کا گلا خشک ہونے لگا تھا، بس وہ اب لوڈ و بورڈ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی

طبیعت میں بڑی جھجک تھی۔ بہت احتیاط تھی۔

اچھا بھئی، مبارک ہو..... تمہیں اور تمہارے چچا کو.....“ وہ شوخی سے بولی۔ زمان کو اس کی آواز نغمے نکھیرتی محسوس ہونے لگی تب ہی اس کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔

”خیر مبارک.....“

”شازی آنٹی! آپ بھی آئیے نا، آپ ہماری ساتھی بن جائیں۔“ مخالف گروپ کے ایک چھوٹے بچے نے اس سے فرمائش کر ڈالی۔

”ابھی تو مجھے کام ہے، پھر آتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ زمان کو پل کے پل یوں لگا جیسے..... اس کے وہاں سے جاتے ہی سب کچھ ایک دم بجھ گیا ہو مگر اس کی سوتی..... ”ابھی تو مجھے کام ہے، پھر آتی ہوں۔“ پرانک کر رہ گئی۔ اس کا مطلب تھا وہ دوبارہ آئے گی۔ اس نے خوش امید اور بے پایاں مسرت سے سوچا اور اسی خوشی کے لذت بھرے انتظار میں وہ بھی کھلتا رہا۔ اس دوران میں بھائی اندر داخل ہو گئیں۔

”زمان! چائے پیو گے، تمہارے بھائی جان کے لیے بنا رہی ہوں۔“ بھائی نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔

”جی بھائی! آدھا کپ پی لوں گا۔“ بھائی چلی گئیں۔

چائے آنٹی۔ زمان چائے کا گگ تھا۔ اٹھ کر کمرے سے باہر لاؤنج میں آ گیا۔ وہاں ایک صوفہ بچھا ہوا تھا، بھائی جان کھل رہے تھے۔ وہ بیٹھ گیا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان چائے پینے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زمان کو شازی کا انتظار تھا۔ چائے ختم ہوئی اور باتیں بھی۔

بھائی جان کو ٹہلنے کی عادت تھی، وہ لاؤنج میں ٹہلنے رہے اور بھائی سے باتیں کرتے رہے۔ بچوں نے زمان کو اپنے کمرے میں بھیج لیا اور یہی وہ چاہتا بھی تھا۔ وہ ایک بار پھر لوڈ میں مصروف ہو گئے مگر زمان کا دھیان کھیل میں کہاں تھا۔ وہ اپنے پیارے بچوں کا دل رکھنے کے لیے ہی کھیل رہا تھا۔ اس کی بے چین ساعتیں..... جالی دار شتر کے دروازے کی آواز پر لگی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر اور گزری۔ اس دوران زمان، شازی کے آنے کی دعا میں مانگتا رہا۔

”شازی آنٹی نے آنا تھا، وہ نہیں آئیں ابھی تک؟“ چھوٹے بچے نے انہیں یاد دلایا۔

”میں انہیں بلا کر لے آتا ہوں۔“ ٹھٹھلے نے کہا اور

اٹھنے لگا۔ زمان کی عطا پسندی آڑے آگئی کہ نہ جانے بھائی جان کے سسرال والے کیا سمجھیں، اس نے ٹھٹھلے کو منع کر دیا۔

کھیل شروع ہو گیا مگر زمان کو اپنی جان جاناں کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر اور گز گئی۔ وہ اب غیر دلچسپی سے کھیلنے لگا پھر کچھ سوچ کر پانی پینے کے لیے اٹھا۔ فرنیج لاؤنج میں ہی ایسی جگہ رکھا تھا کہ وہاں سے جالی دار شتر کے پار دوسرے گھر کے دروازے کو دیکھا جاسکتا تھا جو کھلا ہی رہتا تھا۔ یہاں سے اس کا بڑا صاف نظر آتا تھا۔ زمان نے فرنیج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور پانی پینے لگا، ساتھ ہی اس کی نظریں ادھر جی ہوئی تھیں۔ جب وہ بوتل واپس رکھنے لگا تو اسے سامنے والے گھر کے صحن کی روشنی بجھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ مایوس ہو گیا اور بے دلی سے پلٹا۔

اس کا اب کھیل میں بالکل بھی جی نہیں لگ رہا تھا۔ ابھی وہ گیم ختم کرنے ہی والا تھا کہ اچانک شتر کھلنے اور بند ہونے کی آواز ابھری۔

عاشق بھی کیسے سر بھرے ہوتے ہیں، وہ کتنا کچھ اپنے محبوب پر وارد دیتے ہیں۔ اپنے پل پل کا سکون، اپنی ساری توجہ، اپنا سارا دھیان، سب ہی کچھ اس ”منہر آہٹ“ پر فدا کر دیتے ہیں۔ محبوب کی ایک ذرا سی آہٹ پر دل کیسے خوشی و مسرت سے دھڑک اٹھتا ہے۔ زمان کی بھی کچھ یہی کیفیات تھیں اس وقت..... یہ اس کے لیے آہٹ نہیں تھی، یہ اس کے لیے دنیا جہان کی ایک دولت تھی جو اسے ملنے والی تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ضروری تو نہیں کہ وہی ہو۔ اس کی بڑی بہن بھی آتی تھی، کبھی اس کی بھابی کی بھی آمد ہو جاتی تھی۔

”شازی آنٹی آئیں.....“

بڑے بچے بچے نے جیسے زمان کو مڑدہ جاں فزا سنا یا..... وہ واقعی آگئی تھی۔ دروازے پر کھڑی تھی۔ زمان کے ہونٹوں پہ شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے من میں پھلجھوٹیاں پھوٹ رہی تھیں۔ رگ رگ میں سرور و محبت کا ایک نشہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ ایک بچے نے اسے بیٹھنے کو جگہ دی اور وہ بیٹھ پر بیٹھ گئی۔

لوڈ کا پورڈ ان کے درمیان میں رکھا تھا۔ چونکہ وہ مخالف گروپ میں تھی اسی لیے اسے زمان کے دائیں ہاتھ کی جانب بیٹھنا پڑا تھا۔ اس سے زمان کے دل و دماغ کی کیفیات ناقابل بیان ہو رہی تھیں۔ وہ وہاں اس کے گھر میں اسے جی بھر کے نہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ وہاں اس کے بھائی

لیے بے چین تھا۔ بچپن میں دوستی اور کھیل کود کر جوان ہونے کی اور بات بھی مگر اب اس رشتے کو وہ ہمیشہ کا ایک معتبر نام دینا چاہتا تھا۔ جس کی ابھی تک اس میں ہمت نہیں پڑی تھی۔ کیونکہ حالات بھی ایسے تھے۔
تھوڑی دیر بعد بھائی آگئیں۔

”جلو بھئی اب آرام کر لو، بہت رات ہو گئی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ گیم ختم کر دیا گیا اور وہ بھی چلی گئی۔
زمان وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ اگلے دن صبح وہ دیر سے جاگا تو شازی وہاں بھابی کے پاس کچن میں موجود تھی۔ زمان کا غسل کرنے کا ارادہ تھا مگر شازی کو وہاں پا کر اس نے منہ ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا کیا کہ کہیں وہ اس کی دید سے محروم نہ رہے۔

بھابی نے ناشا بنایا اور سروشازی نے کیا۔ وہ اسے نظریں بھر بھر دیکھتا رہا، مگر اس بات کا بھی خیال رکھا کہ بھابی وغیرہ کو شہ نہ ہو۔

وہ دونوں کے لیے آیا تھا، جو پورے ہو چکے تھے، مگر اس کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ سو وہ دل پر جبر کر کے جیکب آباد لوٹ آیا۔
دن گزرتے چلے گئے۔ اس کا شکار پور جانے کے لیے ہر وقت جی لپٹا رہتا تھا مگر اتنی جلدی جلدی جانا اس کے اپنے گھر والوں کو برا لگتا۔ دو ایک ماہ بعد پھر اس نے موقع بنایا اور بھائی جان اور بھیبھوں سے ملنے کے لیے شکار پور جا پہنچا۔

پھر وہی بے چینی اور اظہارِ منشاء دیدارِ منش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس بار اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شازی سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کر کے رہے گا۔

مگر جب وہاں جاتا تو نہ جانے کیوں اس کی زبان گنگ ہو جاتی پھر اسے ایسا کوئی موقع بھی نہ ملتا کہ وہ دونوں تنہا ہوتے، بھیبھے ساتھ ہوتے، بھائی جان نہیں تو بھابی تو ہوتی ہی تھیں۔ دو دن پھر سے گزر جاتے اور اسے مجبوراً دل پہ بھاری پتھر رکھ کر لوٹنا پڑتا۔

اس نے ایف ایس سی کر لیا۔ شازی بھی ایف ایس سی کر چکی تھی۔ آگے جا کے اُس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا جبکہ شازی بی اے اور ایم اے کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی۔

کچھ سال اور سرک گئے۔ ایک دن وہ شکار پور پہنچا۔ وہ شام کو ہی جاتا تھا۔ جیکب آباد سے شکار پور ان دنوں مسافر لاریاں چلا کرتی تھیں جو ایک گھنٹے میں شکار پور

پہن بھی موجود تھے اور یہ معیوب ہی لگتا مگر یہاں وہ اسے بڑی تسلی اور خوب جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ بھیبھے ابھی چھوٹے اور معصوم تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ان کے چچا جان ان کی شازی آنٹی پر کس قدر فریفتہ تھے۔ تاہم اس نے اپنی فطرت کے مطابق یہاں بھی خیال رکھا تھا کہ..... بھیبھے لاکھ بچے سہی مگر اس طرح کے ”غیر معمولی پن“ کو محسوس نہ کریں۔

وہ بڑے سلیقے سے اپنے گھٹنے سیڑھے بیٹھی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا عام سا گھریلو لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا کھلی کھلی رنگت والا چہرہ زمان کی پُرشوق نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے سیم تن وجود کے ایک ایک حصے کو بہت احتیاط اور لذتِ قرب کے ملے جلے احساس تلے دیکھ رہا تھا۔ گھٹنے سیڑھے کر بیٹھنے سے شازی کا شاخ گل جیسا بدن بڑا قیامت خیز خم کھائے ہوئے تھا اور وہ اسی خم کی بھول بھلیوں میں جیسے آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کی موجودگی اس کمرے میں زمان کے لیے ایسی ہی تھی جیسے یہ کمرہ انہیں کوئی بت کدہ ہو اور وہ ایک مقدس مورتی تھی، وہ اس کا پجاری تھا۔

شازی اس کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی مگر اس کی بورڈ پر جھکی جھکی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے پھول سی پگھلویوں سے نرم و گداز ہونٹوں پر جی رہنے والی مسکراہٹ سے صاف لگتا تھا کہ وہ زمان کی دلی کیفیات سے واقف تھی اور شرارتاں اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، اسے بے چین کر رہی تھی اور جیسے کہہ رہی تھی۔

”اچھی طرح دیکھ لو..... تمہارے قریب بیٹھی ہوں میں جانتی ہوں کہ تم اپنے بڑوں کو ناراض کر کے صرف میری وجہ سے یہاں آئے ہو۔“

”چچا جان! آپ کی باری ہے۔“
اچانک بھیبھے کی آواز نے اسے چونکا دیا، یہی وہ وقت تھا، جب شازی نے اس کی طرف اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر دیکھا تھا اور اسے اپنی طرف متوجہ پا کر اپنی مسکان گہری کر لی تھی۔

زمان نے باری چلائی اور یوں کھیل آگے بڑھتا گیا کئی مواقعوں پر زمان کو شازی کی گوٹ پینے کا موقع ملا مگر وہ چھوڑ دیتا، کبھی بھول جانے کا بہانہ کرتا اور شازی مسکرا دیتی۔

عورت کو خدا نے اس صلاحیت سے نوازا ہے کہ وہ نگاہ مرد کا مقصد بغیر اس کے کہے یا پوچھے سمجھ لیتی ہے۔ شازی کو بھی اس کا اندازہ تھا۔ زمان اظہارِ محبت کے

پہنچا دیتی تھیں۔ ”میرے لیے وہی بچپن اہم ہے شازی! جو تمہاری

سگت میں بیٹا، گرمی کی دوپہروں میں باغ میں کھیلتے ہوئے، تین پہیوں کی سائیکل چلاتے ہوئے اور ٹیوب ویل کے پانیوں میں نہاتے ہوئے۔“ زمان نے ایک جذب کی سی کیفیت میں کہا تو شازی یہ کاچہرہ سرخ ہو گیا۔

”کل ہم اکٹھے باغ کی سیر کریں گے اور ٹیوب ویل کی طرف بھی چلیں گے۔ چلو گی نا؟“ زمان نے اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو شازی نے ایک دم اپنا سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سارنگ اٹھ آیا تھا۔

اسی دوران بھابی آگئیں اور گفتگو کا سلسلہ وہیں موقوف ہو گیا۔

اگلے دن دوپہر کو زمان کھانا کھا کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ اس کی بے چین اور منتظر نظریں شرکی طرف بار بار اٹھ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ شازی آئے گی اور وہ واقعی آگئی۔ باہر ہی کھڑے کھڑے اس نے اسے آنے کا اشارہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دونوں باغ میں تھے۔ ماحول اور فضا ایسی تھی کہ گرمی بھی گنتی تھی مگر خشک ہوا بھی محسوس ہوتی تھی۔ دونوں گھوم پھر کر بچپن کی باتیں اور یادیں تازہ کرنے لگے۔ اس کے بعد ٹیوب ویل کی طرف آگئے جس کے موٹے فولادی پائپ سے ٹھنڈا پانی موٹی دھار کی صورت میں گر رہا تھا اور سینٹ کے بنے ایک چوڑے کھالے میں جمع ہو رہا تھا۔

”یاد ہے نا..... شازی! ہم دونوں یہاں آیا کرتے تھے اور ہماری جھولیاں آموں سے بھری ہوتی تھیں۔ ہم یہاں نہاتے بھی تھے اور آم بھی کھایا کرتے تھے، بیجا بھی کرتے تھے۔“

”ہاں! بہت اچھی طرح یاد ہے مجھے.....“ اس نے بھی گویا ایک خاص کیفیت کے زیر اثر کہا تو جیسے زمان کے دل میں نشہ سا چھانے لگا۔ اس نے اسی وقت شازیہ کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور بہت ڈوبے لہجے میں بولا۔

”شازی! میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر.....“

”م..... مجھے مل جاؤ..... تم مجھے مل جاؤ..... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے شازی کی نرم ملائم جلد والی مخروٹلی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ شازی نے جیسے خود کو اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ زمان کے ہونٹ اس کی گردن سے

حسب معمول شام کو وہاں پہنچا۔ شکار پور جا کر وہ جیسے جی اٹھتا تھا۔ ابھی بھابی کے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی بے چین اور منتظر نگاہیں، شر والے دروازے کی طرف اٹھنا شروع ہو گئیں۔ شازی کو زیادہ دیکھنے کا موقع اسے اپنی بھابی کے گھر میں ملا کرتا تھا۔

اگرچہ وہ سلام دعا کے لیے بھائی کے سر راہ ”گوشتے“ میں بھی چلا جاتا تھا، وہ ادھر ادھر مصروف تو ہوتی تھی مگر وہ اس کی فقط ایک ہی جھلک دیکھ سکتا تھا۔

بھابی کے گھر آ کر وہ اس کا ہی منتظر رہتا۔ وہ اس روز رات میں آئی۔ اس بار وہ اپنے ساتھ اسکرہیل کا بورڈ لائی تھی۔ زمان جیسے خوشی سے جھوم اٹھا۔

”آؤ..... آج اسکرہیل کھیلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔

زمان آج خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا کیونکہ آج صرف وہ دونوں تھے..... آج تقدیر اسے خود پر غیر معمولی طور پر مہربان ہی محسوس ہو رہی تھی۔

بچپن کی کوئی اپنا ٹھیل ٹھیل رہے تھے۔ سب سے چھوٹا سوچا تھا۔ بھائی جان اپنے دتی ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے اور بھابی اپنے میکے والے گوشے میں گئی ہوئی تھیں۔ ٹی وی وغیرہ وہیں دیکھا جاتا تھا۔

اسکرہیل میں لیٹر جوڑ کر انگریزی میں جملے بنائے جا رہے تھے۔ زمان نے ایک موقع پر Love کا جملہ بنایا تو شازی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”کیسا لگا یہ لفظ؟“ زمان کو موقع ہاتھ آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ دیر سے سے بولی۔

”صرف ٹھیک ہے؟“

”تو اور کیا کہوں؟“

”مجھے تو یہ لفظ بہت دلنشین اور پیارا لگتا ہے کیا تمہیں نہیں لگتا؟“ زمان نے مخموری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لگتا ہے۔“

”شازی! تمہیں بچپن یاد ہے اپنا؟“ زمان نے اچانک پوچھا۔

”ہاں! بھلا بچپن کسے بھولتا ہے؟“

”وہ والا بچپن جو ہماری دوستی اور جان پہچان کی ابتدا بھی بنا تھا۔“

”ہاں! وہ بھی یاد ہے۔“

تھرمامیٹر

سرکس میں شیشے کے کٹڑے کھانے کا مظاہرہ کرنے والا فنکار بیمار پڑا تو اسے ایک قریبی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ نرس نے نمبر پچر کی نیت سے اس کے منہ میں تھرمامیٹر رکھا، سر ہانے لگا ہوا چارٹ اتارا تا کہ اس میں مریض کا نمبر پچر درج کیا جاسکے پھر وہ مریض کی جانب متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت و خوف کے باعث سر سے پاؤں تک لرز گئی کہ مریض تھرمامیٹر کو چہرہ پر رکھا تھا۔

مریض نے نرس کو اپنی جانب متوجہ دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ ”تم نے بہت مزیدار چیز کھلائی ہے سسٹر! دو چار ایسی ہی چیزیں اور دے دو۔“

قلبی تعاون امتیاز احمد۔ منڈی بہاؤ الدین

رہا تو.....؟“

”نہیں، میں جانتا ہوں، خواہ کچھ بھی ہو جائے، یہاں کے لوگ برگد کے درخت کو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹاتے..... عمارت کا زاویہ بدل لیں گے مگر اس درخت کو نہیں اکھاڑیں گے..... یوں بھی برگد کے درخت کی عمر لمبی ہوتی ہے۔“

تقدیر کتنی مہربان ہوتی ہے۔ کہاں تو اتنی بار زمان آتا رہا مگر شازی سے بھی اس قدر تفصیل اور فرصت سے ملنے کا موقع نہیں ملا اور آج اس بار آیا تو جیسے اس کا محبوب پورا اس کی دسترس میں رہا تھا مگر وہ اس کی رضا چاہتا تھا اور وہ اس کی.....

اب ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ زمان کو اپنے گھر جیکب آباد لوٹنے کی جلدی پڑ گئی۔ وہ ماں کو شازی کا رشتہ مانگنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔

گھر کالا ڈلا تھا۔ اس کی بات پر بھونچال تو آیا مگر پڑھا لکھا خاندان تھا۔ اس کی ضد کے آگے خاموش ہو گیا۔ ماں بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اپنی جھولی پھیلائے ”دشمن“ گھرانے جا پہنچی مگر وہاں سے صاف انکار ہو گیا۔

پھر تو گھر والے خوب زمان کے لئے لینے لگے کہ اس نے اپنی غرض کی خاطر خاندان بھر کی ناک کٹوا دی۔ باپ

ہوتے ہوئے شازی کے کان کی لوٹک پہنچے تو وہ اسے، اس کے ہونٹوں کی حرارت کی طرح ہی تپتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اسی وقت کہیں قریب ہی کسی کی آواز ابھری..... اور دونوں ایک جھٹکے سے الگ ہو گئے۔ کسی مزدور نے اپنے ساتھی کو آواز لگائی تھی۔ کیونکہ وہاں اندر ہی کچھ فاصلے پر ڈھلائی کا کارخانہ چل رہا تھا۔

دونوں سنبھل گئے۔ شازی نے اقرار محبت سے پہلے کچھ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”زمان! جانتے ہونا، ہمارے بڑوں کے آپس میں کس قدر اختلافات ہیں بس میں اسی بات سے ڈرتی ہوں۔“

”اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے شازی!“ زمان نے اپنے لہجے کو باوثوق بنا کر کہا۔

”ہم تم تو ایک ہیں نا....! بڑوں کے اختلاف بڑے جانیں۔“

”نہیں زمان! میں ایک بیٹی اور ایک بہن بھی ہوں۔“ وہ جیسے زمان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے آزرہ سے لہجے میں بولی زمان دہل گیا۔

”نہیں شازی! ایسا مت کہو.....“

”تم رشتہ تو سمجھو، کیا پتا مان لیا جائے۔“ اسے بے حوصلہ پا کر شازی نے مشورہ دیا۔

دونوں اور آگے بڑھے تو ایک برگد کے درخت کے پاس آ کر زمان کو جانے کیا سوچھی کہ وہاں رک گیا۔

وہاں دھاتی کارخانہ ہونے کی وجہ سے..... جا بجا لوہے کے اوزار بھی بکھرے رہتے تھے۔ زمان نے ایک بیخ اٹھائی اور برگد کے اس درخت کی چھال اتارنے لگا تھوڑی چھال اتارنے کے بعد اس نے اس کی ت

میں اپنا اور شازی کا نام لکھ دیا۔

”یہ کیا؟“ شازی اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولی۔

”شازی!“ زمان نے عجیب سے لہجے میں اس سے کہا۔ ”شازی! وعدہ کرو..... ہم ایک ہو گئے تو اس نام

کو روزانہ دیکھا کریں گے۔ یہ ہماری اس دن کی باقاعدہ اعتراف محبت کی نشانی کہلائے گا اور اگر ہمیشہ کے لیے

جدا ہو گئے تو بھی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہوں، یہاں ایک بار ضرور آئیں گے اور ہم میں سے جو بھی یہاں آیا، وہ ایک

دوسرے کے نام پر ایک کیل ضرور ٹھونکے گا۔“

شازی نے مسکراتے ہوئے اپنا سراشبات میں ہلا دیا۔ تاہم بولی۔ ”اور اگر یہ درخت یہاں تک قائم نہ

بھی سخت ناراض ہوا۔
 ”ہم سے پہلے تو وعدہ خلائی کی گئی تھی۔ ہمارا ان پر قرض بھی بنتا تھا، لڑکا نہ دیا، دوسری بیٹی ہی دے کر یہ قرض چکا دیتے۔“

اندھ بھرا سا گیا۔ آج پچیس سال بعد میں نے یہاں قدم رکھا تھا..... ایک فلم سی تھی ماضی کی جو یادوں کی اسکرین پر اچانک ہی ری وائنڈ ہو کے چل پڑی تھی۔
 ”آہ.....“ اسی کراہ نما غیر مرئی صوتی آواز کو میں نے یہاں بکھرے ہوئے محسوس کیا تھا۔

زمان اپنا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اس نے بھائی جان اور بھابی کی بھی خوب فٹیں کیں، مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکے۔
 نہ ہی وہ خود کچھ کر سکا تھا۔ وہ شاید بزدل بھی تھا، یا پھر اسے شازی نے پہلے ہی یہ اشارہ دے دیا تھا کہ وہ ایک بیٹی اور بہن بھی ہے، اسی لیے مجبور ہے۔

وقت گزرا..... ظاہر ہے اب اس کا بھی شکار پور آنا جانا بند ہو گیا تھا کیونکہ دوبارہ سے لڑائی تازہ ہو گئی تھی۔ بھائی جان کو بھی کوٹنے اور زن مریدی کے خطابات سے نوازا جانے لگا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو پتا چلا کہ شازی کی شادی کر دی گئی ہے۔ وہ پہلے کوئٹہ اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امریکا چلی گئی تھی۔ زمان کی تو دنیا ہی ویران ہو گئی..... اسے یاد آیا کہ شازی سے آخری ملاقات کس قدر تفصیل سے ہوئی تھی۔ شاید تقدیر خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جدا ہونے سے پہلے یہ دودھ پلانے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیں..... اور وہی ہوا تھا۔ تقدیر نے انہیں خوب موقع دیا تھا ملنے کا۔

وہ اپنی تقدیر کے اس ”چلن“ کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا کہ آیا وہ اس کے لیے ”اچھی“ ثابت ہوئی تھی یا ”بری“۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ خاندان کے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لڑکوں بالوں کی شادیاں ہو گئیں، حالات بدلنے لگے تھے۔ ہر پڑھالکھا شخص اندرون سندھ سے کوچ کر کے بڑے شہروں میں جا بسا تھا۔ زمان کا بھی دل خراب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا پور یا بستر سمیٹا اور جیکب آباد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

ٹرین شکار پور کے راستے ہی سے گزرتی تھی۔ رات کا وقت تھا جب ٹرین شکار پور کے باغوں اور جنگلوں سے گزرنے لگی تو کھڑکی کی طرف بیٹھے بیٹھے، زمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

وہ کراچی آ گیا اور پھر ادھر ہی کا ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

اندھ قدم رکھتے ہی ایک عجیب سے احساس تلے میرا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاڈ چلے گا بخارہ اک ویرانی سی ویرانی تھی کہ ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا..... کی تفسیر بنایہ مقام اب جیسے ایک شہر خموشاں کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ شام کی بکھری بکھری سرخ لالی میں اجڑا منظر بڑا ہوک زدہ دکھائی دیتا تھا۔

باغ تو اجڑ چکا تھا۔ خشک مٹی والی رویشیں جو باغ کے مختلف گوشوں تک جاتی تھیں، وہ اب دھول زدہ بھر بھری مٹی میں بدل چکی تھیں۔ ان کی ترتیب بھی میدان کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بچپن میں شازی اور میں تین بہیوں والی سائیکل چلایا کرتے تھے۔

میں اس جگہ کھڑا رہا۔ ٹنڈ منڈور خست، لکڑی کی وہ بیچیں جہاں میں اور شازی بیٹھے کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے، ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ دیواریں خستہ حال ہو چکی تھیں، بلکہ ان روزنوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔

”سامیں! اس طرف میری کوٹھری نما رہائش گاہ ہے، اگر ضرورت محسوس کرو تو وہیں آ جانا۔ چائے پانی مل جائے گا.....“

مختیار علی کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔
 ”آں..... ہاں! ٹھیک ہے، میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں سامیں! بے شک سارا گھوم لو۔“ اس نے کہا اور اپنے کاندھے پر دھری اجرک کو جھٹکا، پھر ایک طرف چلا گیا۔

میں بوجھل بوجھل قدموں اور بھرے بھرے دل کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

مجھے یاد تھا کہ میں نے کہاں جانا تھا مگر ابھی میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ جہاں بھابی بھائی جان کا گھر تھا، جہاں وہ جالی دار شر والادروازہ تھا جس کی آہٹ پر ہر وقت میرے کان گئے رہتے تھے۔ وہاں پہنچا تو جیسے وہ بھی ایک کھنڈر اور اجڑے دیار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا ان پچیس برسوں میں.....

میں اس درمیانی اجاٹے میں آ گیا جہاں میرے

سیدھے ہاتھ پر شازی کا گھر ہوتا تھا اور اگلے ہاتھ پر بھائی اور بھائی جان رہتے تھے۔ اس طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ گوارث نما گھر اب بھی قائم تھا۔ بے شک خستہ حال ہو چکا تھا مگر اپنی جگہ قائم تھا۔ اگرچہ وہاں بھی مجھے چھدری چھدری خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

میں سب سے پہلے دائیں ہاتھ والے مکان کی طرف بڑھا تو اس کی سال خوردہ چوکھٹ کے قریب جا کر ہی رکا، اندر سخت لعفن سا اٹھ رہا تھا، شاید آوارہ کتوں، چوہوں اور بلیوں نے اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی۔

باہر سے ہی اندر جا بجا جالے اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ اور الا بلا پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہول سا اٹھتا تھا دل و دماغ میں کہ کبھی یہاں بھی ایک بھرا پڑا خاندان آباد تھا۔

میں پلٹا اور اس طرف آ گیا جہاں بھابی بھائی جان کا گھر تھا، وہ کچھ بہتر حالت میں لگتا تھا۔

میں قریب آیا تو وہ شر والادروازہ ٹوٹا پڑا تھا اور چوکھٹ سے الگ ہو کر ایک طرف کو جھول رہا تھا۔ اندر کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھ دیا۔

برآمدے کی چھت گر چکی تھی اور بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا جہاں سے ڈھلتے شفق کی سرخی اندر پڑ رہی تھی، بائیں ہاتھ پر جو دو کمرے تھے، وہاں گرد و غبار کا ملبا سا پڑا نظر آیا میں آگے ہی بڑھتا رہا اور اس کمرے کے ٹوٹے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کمرے کو نظر بھر بھر کر دیکھتا رہا..... جہاں کبھی میں اور شازی بیٹھ کر لوڈ و کھیل کرتے تھے۔

میری یادیں خوب ”اپ ڈیٹ“ ہو رہی تھیں..... میں آج پچیس برس بعد یہاں ایسے ہی نہیں آیا تھا۔ اپنی سرمایہ حیات یادوں کو ”رنگین“ بنانے آیا تھا۔

اسی وقت شر والادروازہ ”ٹھک“ سے بجا، بالکل اسی طرح جیسے شازی کی آمد پر پچیس سال پہلے بچتا تھا اور میرا دل بری طرح دھڑک اٹھتا تھا، اب بھی ایسا ہی ہوا.....

مگر..... اس بار شریعت سے میرا دل ہی نہیں پورا وجود دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور ایک گہری ہکاری بھری اور وہاں سے پلٹ آیا۔

اب میرا رخ ٹیوب ویل کی طرف تھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا، سوائے لمبے کے ڈھیر کے۔ ایک درد آمیز یادوں کی ٹیس سی ابھری دل میں کہ وہ بھی کیا دن تھے، جب میں اور شازی یہاں آم توڑ کر لاتے تھے اور نہاتے، شرارتیں

کرتے تھے۔ وہاں سے میں اس طرف کو مڑا جہاں برگد کا وہ درخت میری اور شازی کی محبت اور اس وعدے کا امین بھی تھا کہ بچھڑنے کے بعد ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کی یاد ستائے گی تو وہ یہاں آ کر ایک دوسرے کے نام پر کیل ضرور ٹھونکنے لگا۔

وہی درد انگیز ٹیس ابھی میرے سینے میں، جس نے مجھے رنجور سا کر دیا۔

آج میں سوچ رہا تھا، کیسی بچکانہ خواہش کی تھی میں نے بھی..... بھلا ایسا کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ اب شازی یہ کومرہ ہوا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا میں مقیم تھی، بھائی اور بھابی والے بھی کئی سال پہلے کینیڈا شفٹ ہو چکے تھے۔ اب کہاں امریکا اور کہاں یہ شکار پور.....

میں بے اختیار ہنس دیا مگر ایک خیال کے تحت دل بھی بے طرح دھڑک رہا تھا، سوچتے لگا۔

”کیا شازی یہاں آئی ہوگی؟ کیا اس نے وعدے کے مطابق میرے نام پر کیل گاڑی ہوئی؟ اگر ایسا ہوتا تو مجھے چوکیدار مختیار علی تو ضرور بتاتا..... سائیں! آپ کی طرح ایک خاتون بھی یہاں اسی طرح آئی تھیں۔ اس جگہ کو دیکھنے کے لیے..... جس طرح آپ آئے ہیں.....“

اس دلیل نے مجھے اداس کر دیا۔ میری یادوں کو ”اپ ڈیٹ“ کرنے کی خواہش مانند پڑنے لگی..... لیکن اب میں ایک نگاہ برگد کا وہ حصہ دیکھے بغیر پلٹ کر کیسے جا سکتا تھا۔ اس کے لیے تو میں نے کراچی سے یہاں تک کا سفر کیا تھا۔ میں دھڑکتے دل سے آگے بڑھا۔ سامنے مجھے وہ درخت نظر آ گیا۔ وہ بھی یوڑھا ہو چکا تھا مگر اسی طرح اب تک تکا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے رخ کا اندازہ کیا اور وہاں جا کھڑا ہوا، جدھر میں نے ایک فولادی اوزار کی مدد سے اس کی چھال اتاری تھی، وہاں اب ایک اور چھال نکل آئی تھی۔ چونکہ اس طرف ڈھلائی کا کارخانہ ہوا کرتا تھا، جس کی درود یوار اب بھی قائم تھیں، اگرچہ بیشتر ڈھچکی تھیں مگر میں وہاں سے ایک لوہے کا سریا تلاش کر کے اسی جگہ شکاف ڈال کر چھال اتارنے لگا تو اچانک میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ سریا کسی ٹھوس فولادی شے سے ٹکرایا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہاں ایک کیل گڑی ہوئی تھی۔

”مائی گاڈ! مائی گاڈ!“

میرا دل ہولنے لگا۔ میں نے کیل نکال لی اور اس کا جائزہ لیا، کیل زیادہ پرانی نہیں لگتی تھی۔ ورنہ اسے خوب

جنوری 2017ء

سپنس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

زنگ لگ چکا ہوتا۔

”سائیں! میں نے آپ کو اس پیری درخت کی طرف جاتے دیکھا تھا.....“

”تم کہیں اس برگد کے پرانے درخت کی بات تو نہیں کر رہے ہو جو ٹیوب ویل کی طرف بنا ہوا ہے؟“

”ہاؤ سائیں! وہی درخت، ہم لوگ اسے پیری درخت کہتے ہیں۔ آپ وہاں کیوں گئے تھے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ اسے ہی دیکھنے آئے تھے۔“

”ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں صرف وہی دیکھنے نہیں آیا تھا خیر! یہ بتاؤ تم نے یہ کیوں پوچھا؟“

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”سائیں! آپ نے وہاں پیری درخت کے پاس اور کچھ دیکھا.....“

اس کا لہجہ پل کے پل اسرار بھرا ہو گیا۔ ”کیا مطلب؟ نن..... نہیں تو..... مجھے تو اور کچھ نظر نہیں آیا؟“

”آئیں میرے ساتھ.....“ اس نے کہا اور اسی طرف چل پڑا جدھر وہی برگد کا پرانا درخت تھا۔ میں حیران و پریشان سا اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ چلتے چلتے بولا۔

”یہ بات میرے ذہن میں گئی، میں اسی لیے چونکا تھا مگر اب آپ کا یہ اشتیاق اور پیری درخت کی طرف آپ کو جاتے دیکھا تو سوچا آپ کو اس بات سے آگاہ کر دوں۔ شاید وہ عورت آپ کی کوئی رشتے دار ہی گئی تھی۔“

اس کی ”عورت“ والی بات پر میں چونکا اور اس کے عقب میں چلتے چلتے پوچھا۔

”عورت؟ کون سی عورت؟“

”آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو سب بتائے دیتا ہوں۔“ وہ بولا۔

شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم خود رو جھاڑیوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور وہاں پہنچ کر رک گئے۔ مختیار علی نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک ٹارچ نظر آرہی تھی جو اس نے جلادی۔

”ذرا اس طرف آئیں سائیں!“ اس نے کہا اور برگد کے موٹے تنے والے درخت کے عقب میں آگیا۔ میں بھی اسی طرف بڑھا۔ یہاں جا بجا خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں..... اس نے روشنی ڈالی تو میں دہل گیا۔

سامنے ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ

”اوہ! میرے خدا!..... کیا وہ بھی اتنے سال بعد یہاں آئی تھی؟ اپنی یادوں کو“ آپ ڈیٹ“ کرنے..... شاید چند ماہ پہلے یا پھر چند سال پہلے.....“ میں اس کیل کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا پھر وہ وہیں ٹھونک دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے تھوڑی اور کیل نکالی جو میں اپنے ساتھ ہی لا رہا تھا۔

اس کیل کے ساتھ میں نے وہ کیل بھی ٹھونک دی اور تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور مجھے اس میں کسی کی شوخ سی سرگوشیاں سنائی دیتی محسوس ہونے لگیں۔

شام خاصی جھکنے لگی تھی اور اطراف میں اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ میں ایک عجیب سی سرخوشی محسوس کر رہا تھا، اس مسرت کی..... میں ادا سی بھی گئی ہوئی تھی۔ ایک دکھ تھا اور گم گشتہ یاد ماضی کا درد بھی کروٹیں لے رہا تھا۔

میرے اندر بس ایک ہی گردان ہوئے جا رہی تھی۔

”آہ..... وہ آئی تھی، وہ آئی تھی۔ اس نے اس وعدے کو تو پورا کرنے کے لیے امریکا سے یہاں تک کا سفر کیا تھا مگر کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا..... اس لیے کہ وہ ایک بیٹی بھی تھی اور بہن بھی..... وہ دو پاٹوں کے درمیان میں پس گئی تھی اور جانے کب تک پستی رہی تھی۔ خوش تو اب تک میں بھی نہیں رہا تھا اس کے بغیر.....“

میری آنکھیں آبدیدہ سی ہو گئی تھیں۔ میں پلٹ گیا۔ مجھ میں اب وہاں کھڑے رہنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ میں بوجھل بوجھل سے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اسی....

ڈیوہیکل چوٹی دروازے کی طرف بڑھنے لگا، جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کر لیا تھا۔

مگر نہیں..... ابھی تو اپ ڈیٹ ہونے کے لیے اور بھی کچھ رہتا تھا۔ کاش! یہ والی شے اپ ڈیٹ نہ ہوتی.....

ہوا یوں کہ جب میں پلٹنے لگا تو وہی مختیار علی وہاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونا چاہا تو وہ بولا۔

”سائیں! معاف کرنا، ایک بات آپ سے پوچھنا تھی۔“

”ہاں..... ہاں کہو، کیا بات ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا تو وہ بولا۔

مجھے چکر سا آگیا۔
میں نے بہ مشکل خود کو سنبالا اور خشک پڑتے حلق
سے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... یہ کس کی قبر ہے؟“
”سائیں! یہ اسی عورت کی قبر ہے جو ایک سال پہلے
ہی یہاں آئی تھی۔“ وہ بتانے لگا اور میں اپنی جگہ سن
کھڑا رہا۔ وہ آگے بتا رہا تھا۔

”سائیں! یہ عورت بھی آپ کی طرح یہاں آج سے
ایک سال پہلے ہی آئی تھی۔ آپ ہی کی عمر کی تھی، مگر خاصی
بیمار اور بہت زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ شاید کچھ غموں کی ماری لگتی
تھی گریب..... خیر! میری بیوی سے ملی تھی، وہ بھی یہاں
آپ کی طرح سیر کرنے آئی تھی۔ میری بیوی اس کے ساتھ
تھی۔ اس نے برگد کے اس درخت کو بھی دیکھنے کی خواہش
کا اظہار کیا تھا۔ وہاں اس نے ایک کیل ٹھونکی اور پتا نہیں
پھر کیا ہوا کہ اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ ایک
چھوٹا سوٹ کس تھا اس کے ہاتھ میں۔ میری بیوی خیراں
نے ہی اسے سنبالا اور خدا ترسی کی خاطر اسے گھر لے آئی۔
سائیں! پھر وہ یہاں سے گئی نہیں، بہت بیمار تھی، اس کے
پاس پیسے بھی تھے، وہ اس نے ہمیں دے دیے تھے۔ وہ
یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ادھر ہی رہنے لگی، یوں
لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار تھا..... پھر وہ ایک دن
مر گئی۔ اس نے مرنے سے پہلے خیراں سے کہا تھا کہ اسے
اسی برگد کے درخت کے پاس ہی دفن دیا جائے۔ بات
مشکل تھی، میں یہ نہیں چاہتا تھا مگر کیا بات تھی کہ خیراں اس
سے بہت لگا کھانے لگی تھی۔ اس نے ضد کر کے اسے ادھر ہی
دفن دیا۔ خیراں تو کہتی ہے کہ اسی قبر کی وجہ سے شاید اس اتنی
بڑی جگہ کا کچھ نہیں ہو پا رہا ہے۔ جب بھی اسے ڈھانے
یا مسمار کرنے کی باتیں ہوتی ہیں، وہ کسی وجہ سے التوا کا شکار
ہو جاتی ہیں۔“

”اس عورت نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“ میں نے گم صم
سے لہجہ میں پوچھا۔ میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے
اترنے لگے تھے۔

”شازی..... شاید شازی۔“
”اور اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ اس
حال کو کیسے پہنچی تھی؟“ میں نے بھرے بھرے دل سے پوچھا۔
”بتایا تو تھا خیراں کو کہ وہ امریکا میں رہتی تھی اپنے
شوہر اور بچوں کے ساتھ۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو بچوں نے
اسے وہاں کسی ادارے میں ڈال دیا۔ پتا نہیں کوئی مشکل

ساتھ لے رہی تھی۔ پھر یہ وہاں سے یہاں چلی آئی، سب
چھوڑ چھاڑ کر..... بچے بھی اسے نہیں پوچھتے تھے۔ بس
سائیں! اتنی سی کہانی تھی اس بے چاری کی۔“
وہ اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔
”یہ اتنی سی کہانی نہیں ہے مختیار علی!“ بے اختیار
میرے لبوں سے گو گو انداز میں نکلا تھا۔
”جی سائیں؟“ وہ بولا۔
”نہیں..... نہیں، کچھ نہیں۔“ میں نے اپنے حلق میں
اترنے والی رقت پر بہ مشکل قابو پایا اور اس سے آخر میں کہا۔
”مختیار علی! اگر تم اعتراض نہ کرو تو میں یہاں کبھی کبھار
اس بد نصیب عورت کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آ جایا کروں؟“
”ہاؤ سائیں! برابر آؤ، جب بھی آؤ..... آپ کو کوئی
نہیں روکے گا۔“ اس نے کہا اس کے بعد میں نے اپنی جیب
سے ایک اور نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”یہ رکھ لو، اس کی قبر کی دیکھ بھال کرتے رہا کرو۔“
”ٹھیک ہے سائیں! آپ فکر نہ کرو۔“
”اب تم ایک کام کرو، جلدی سے جا کر پھول لے
آؤ وہ میں اس قبر پر چڑھا کر اپنا راستہ لوں تب تک میں
وہیں جا کر فاتحہ پڑھتا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ میرا وہم نہیں
تھا اور نہ ہی وہ شر والا دروازہ ایسے ہی بجاتھا، جبکہ ہوا بھی بند
تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہوئی ہوگی اور اس نے
اپنی آمد کے لیے ہی شر بچایا ہو، جس طرح پچیس سال پہلے
وہ بجا کر آئی تھی۔

☆☆☆
وہاں سے لوٹنے کے بعد ہوٹل میں آکر میں نے
اپنا مختصر سا سامان سنبالا اور نکل گیا۔
کراچی جانے والی کوچ تیار کھڑی تھی۔ مجھے کھڑکی
والی سیٹ ملی تھی۔ میری یادیں ”اپ ڈیٹ“ ہو چکی تھیں
مگر ایک گہرے دکھ کے ساتھ کہ شازی اب اس دنیا میں
نہیں رہی تھی۔
اپنی جس خواہش کو میں عجیب اور سر پھری سمجھے ہوئے
تھا..... وہ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پوری ہو چکی تھی۔
کوچ جب روانہ ہوئی اور شکار پور کے باغات
کے درمیان بنی سڑک سے گزرنے لگی تو بے اختیار
شازی سے ملنے والا وہ پہلا دن بے اختیار میرے تصور
میں اتر آیا۔

==

محفلِ شہر و سخن



✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک روز کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور
مزاجِ شمع میں کچھ ذوق پروانہ بھی ہوتا تھا
کسی کا نام اس محفل میں دیوانہ بھی ہوتا تھا
جہاں الفت نبھانے کے حسین اقرار ہوتے تھے
قرب شہر یارو! ایک ویرانہ بھی ہوتا تھا
✽ مہتاب احمد..... حیدرآباد
تمام ہیتر جلا کے خود اپنے ہاتھوں سے
عجیب شخص ہے سایہ تلاش کرتا ہے

✽ محمد اسحاق انجم..... سنگن پور، قصور
سندر با تھ سنہری زلفیں
کوئی تو ان کو چھوٹا ہوگا
پھول سے لب کچھ کہتے ہوں گے
قسمت والا سنتا ہوگا

✽ ظہیر احمد..... لاڑکانہ
دیکھیں گے اسے پردہ افلاک سے آگے
اک نقش قدم سرحد اوراک سے آگے
✽ رعنا رضوی..... یو کے

یہ نفس ہی مجھ کو عزیز ہے یہاں جی تو لوں گا قرار سے
مجھے اب چمن میں نہ لے چلو میں ڈرا ہوا ہوں بہار سے
✽ وزیر محمد خان..... بل ہزارہ
تمہیں خبر ہی نہیں تم تو لوٹ جاؤ گے
تمہارے بھر میں لمحہ بھی سال ہوتا ہے
✽ گلہت علی..... بہاولپور

ہل جائیں گے ایک بار تو عرشوں کے دروہام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن
آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ ”بیشیں گے کسی دن!“

✽ محمد کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
تک آ کے جو ہم بچنے نکلے وفا قرار
لوگوں نے پھر خلوص کے بجائے گرا دیے
✽ ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مقیم
ہر کوئی سنگ بکف ہے تو تعجب کیسا
دوست بھی تو نے مرے یار، بتائے تھے بہت
✽ طلحہ کمال..... نارتھ کراچی، کراچی
خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبیم کی طرح، صبح کے میلے میں رہیں گے!
دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ، جھیلے میں رہیں گے
✽ مدحت..... کراچی
سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا میرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل میرا

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
میں مجھ تو گیا ہوں پھر بھی مجھ میں
روشن تیرے نام کا دیا ہے

✽ ناہید اعوان..... میانوالی
شمار گردش کیل و نہار کرتے ہوئے
گزر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہوئے
تمام اہل سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

✽ محمد اسلم..... نواب شاہ
ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں، فرصت رہتی ہے
کرتی ہے تو کھل کے کرو، انکار وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

✽ حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری..... میانوالی
شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیجا ہے

✽ شاعظیم..... کراچی
اس دشت بے وفا کی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہوئے
دیکھو تو کتنے چین سے! کس درجہ مطمئن
بیٹھے ہیں ارض پاک کو آدھا کیے ہوئے

✽ مشتاق انصاری..... راولپنڈی
ہم تو اسیر خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر جو بھی تھی
ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مل جل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

✽ وسیم اکرم..... مہر شاہ، خانیوال
پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

✽ محمد شہباز اکرم نوٹی..... ڈھپٹی، پاک پتن
پچھلے برس تھا خوف کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانیوال
تصویر شاہکار وہ لاکھوں میں بک گئی
جس میں بغیر روٹی کے بچہ اداس ہے

✽ نورین منصور..... میرپور خاص
آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!
کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہوا کہ خود مرا چہرہ بدل گیا

✽ محمد الیاس..... فیصل آباد
سارے دھنک کے رنگ تھے اس کے لباس میں
خوشبو کے سارے انگ اسے سوچنے میں تھے
ہر بات جانتے ہوئے دل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کس مرطے میں تھے

✽ اعجاز احمد..... سرگودھا
ظاہر شمال میں کوئی تارا ہوا تو ہے
اذن سفر کا ایک اشارہ ہوا تو ہے
وہ جانے، اس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہوا تو ہے

✽ ملک محمد یونس..... ضلع خانیوال
دب جاتی ہیں بھوکے بچوں کی سسکیاں
اس شہر میں ایوانوں کا شور بہت ہے
✽ رانا بشیر احمد ایاز..... احسان پور، ضلع رحیم یار خان
اوس دل کی ویرانیوں میں بکھر گئے ہیں خواب سارے
یہ میری بستی سے کون گزرا ہے گھر گئے گلاب سارے

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
وہ بھی عجیب شخص تھا الزام لے گیا
قدیل لے کے آیا تھا اندھوں کے شہر میں
✽ انعم کمال..... کراچی
لفظوں کی شرارت ہے
سنجیدہ کر کچھ بھی لکھتا تم!

✽ محبت ایک لفظ ہے لیکن
یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے
✽ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف، بانی یاس
کچھ اس ادا سے میرے ساتھ بے وفا کی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
شیشے کا جسم اوڑھ کے نکلے تھے شہر میں
اب کیا کریں گلے کہ ہوئے پاش پاش ہم

✽ ڈاکٹر ناہید شہین سرگودھا

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

✽ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زور پشیمان کا پشیمان ہونا

✽ امتیاز علی..... سرگودھا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

✽ مابین فاطمہ..... حجرہ شاہ مقیم

ہر کوئی دیتا ہے زخم گن گن کے بے وجہ
میں کس کس زخم کو اپنا نصیب سمجھوں

✽ داؤد اشفاق..... حجرہ شاہ مقیم

بیٹے دنوں کے زخم کر دیتا ہوں رات بھر
آئے نہ جن کو نیند، وہ کیا خواب دیکھیں

✽ اشفاق شاہین..... لاہور

یوں خود فریبوں میں سفر ہو رہا ہے طے
بیٹھتے ہیں پل پر اور نظر ہے بہاؤ پر

✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی

خزاں رکھے گی ٹہنیوں کو بے شمر کب تک
یہ دن بھی گزر جائیں گے حوصلہ رکھنا

✽ اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

✽ شاکر علی..... اسلام آباد

حسن خود تیرا تعارف ہے زمانے کے لیے
خس و خاشاک سے کچھ دور نہیں ہے شعلہ

✽ محمود اختر..... سیالکوٹ

بدن کو خاک کیا اور لہو کو آب کیا
پھر اس کے بعد مرتب نیا نصاب کیا

✽ شمیمہ ایاز..... پشاور

چاہے جس رستے سے آئے شہزادی
ہم نے شہر دل سے دھوپ اٹھالی ہے

✽ ورداء آریز ملک..... کراچی

تیری خواہش پہ خود میں سمنا تھا
دیکھ لے اب کہاں کہاں ہوں میں

✽ صغیر آفاق..... لاہور

اشک آنکھوں سے یہ کہہ کر نکلا
تیرے ضبط کی یہ حد ہے؟ حد ہے

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ناؤن، خانیوال

اپنا بنا کے رکھ لو مجھے تم کہ
سب نے چھوڑ دیا ہے تیرا سمجھ کر

✽ دانش عمیر..... کراچی

یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب رہ سکا نہیں تو بہانے سے آگیا

✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی منڈی ساہیوال

کیا کہیں اس سے کہ جو بات سمجھتا ہی نہیں
وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

✽ محمد امجد ریاض..... چیچوٹنی

میں بھاگ آیا بڑا بے گانہ پن تھا اس کے لہجے میں
میں کچھ دیر اور اس سے بات کر لیتا تو مر جاتا

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف

سفر میں بوجھ اٹھانا محال تھا سو ہم
تمام خواب تمہارے ہی در پہ چھوڑ آئے

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ڈاہرانوالہ

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

✽ جبران احمد ملک..... کراچی

خاک پر سوتے ہوئے یاد مجھے آتا ہے
جاگتے ہوں گے مکین اپنے مکانوں میں کہیں

مَحْفَل شِعْر و سَخَن

نام :

پتا :

کوین

برائے

شمارہ

فروری

2017

جنوری 2017ء

166

سپیس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM



میں کیا کروں؟

شہم؟ سہل

شادی سے پہلے بیوی کی ہر ادا دل کو بھاتی ہے اور حسن تو جیسے گویا شوکیس میں سجا کوئی شو پیس لگتا ہے مگر... دعویٰ یہ ہوتا ہے ”تمہارا دل کتنا خوب صورت ہے“ اور شادی کے بعد دل تو وہی رہتا ہے پر شوکیس میں رکھا حسن خاوا شو پیس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے عشق کی داستان میں بھی کچھ ایسی ہی سنسنی خیزی کار فرما رہی جس نے اس کے تمام جذبات کو جرم کی دلدل میں دھکیل دیا۔

ایک ہی طریقہ واردات پر ہیک وقت دو مختلف جرائم کا ارتکاب

ویٹرس کو دیکھا۔ اس کے جسم کے سچ و خم دیکھ کر اس کے منہ سے ایک سرد آہ سی نکلی۔ اگر اس کی بیوی میکی، اس ویٹرس کی نسبت آدمی بھی خوبصورت اور پُرکشش ہوتی تو اسے بھی قتل جیسے جرم کے بارے میں غور نہ کرنا پڑتا۔ پانچ سال پہلے اس

وہ جمعے کا دن تھا۔ ابھی صرف دوپہر ہوئی تھی لیکن جارج ابھی سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آج رات اپنی بیوی کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے غور سے نئی

جنوری 2017ء

167

سپینس ڈائجسٹ

کی ملاقات میگی سے کیلئے فوراً ایک بستی میں ہوئی تھی جہاں وہ تعطیلات گزار رہا تھا اور خود کو وہاں بے حد تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت میگی نے اپنی عمر چونتیس سال بتائی تھی لیکن وہ اسے پچیس سال سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ خود اس کی عمر تیس سال تھی۔ میگی کے چہرے پر اس قدر رونق اور خشک تھی کہ وہ اسے پچیس سال سے زائد تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ ایک ہفتے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ شادی میں اس قدر عجلت کی وجہ جہاں اس کا احساس تنہائی اور میگی کی خود پسندی اور شباب تھا، وہیں میگی کی دولت اس کے لیے باعث کشش تھی۔ میگی کو ترکے میں پچاس ہزار ڈالر کی مالیت کے بانڈ حصص اور نقد رقم ملی تھی۔ جارج نے پانچ سال کے عرصے میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لے کر پچاس ہزار ڈالر کی رقم کو تقریباً ڈھائی لاکھ ڈالر بنا لیا تھا۔ معاشی طور پر اس کی زندگی بے حد خوشحال اور پرسکون تھی لیکن.....

پانچ سال کے دوران اس کی بیوی آہستہ آہستہ اپنی ذات کی طرف سے بے پروا ہوتی چلی گئی۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے شادی سے پہلے میگی نے اپنی ذات پر شکر کا خول چڑھا رکھا تھا۔ جیسا کہ بادام والی مٹھائی پر شکر کی تہ چڑھی ہوئی ہوتی ہے اور اب اس کا خول اتر گیا تھا اور اس کی صحیح عمر اس کے سامنے آگئی تھی جو اسے پچاس سال نظر آتی تھی۔ وہ اپنے بالوں کی جانب سے بے پروا رہنے لگی تھی اور اب سرخ بالوں میں بھورے رنگ کے بالوں کی جڑیں چپکنے لگی تھیں۔ اس نے بیوٹی کلینک بھی جانا چھوڑ دیا تھا اور اب تو وہ اکثر چہرے پر کریم لگانا بھی بھول جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد جھریاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ اکثر ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی جس کا رخ عموماً اس طرح ہوتا تھا۔

”کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جارج کہ تم نے میری دولت کے لیے مجھ سے شادی کی تھی۔“ میگی تلخ لہجے میں کہتی۔ جارج کہتا۔ ”پیسہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ایک مڑے ترے عمر رسیدہ پچاس ڈالر کے نوٹ کی قیمت اور اہمیت وہی ہوتی ہے جو ایک نئے پچاس ڈالر کے نوٹ کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے تم سے شادی تمہاری دولت کی وجہ سے کی تھی تو یہ مت بھولو کہ میں نے اس رقم کو پانچ گنا کر دیا ہے۔ اس مکان ہی کو دیکھ لو۔ اس مکان اور اس کے قیمتی فرنیچر اور ان نوادرات کی قیمت جن سے اسے سمجایا گیا ہے، پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ ہے اور شادی سے پہلے تمہارے پاس کل

پچاس ہزار ڈالر تھے۔ آیا کچھ کچھ میں؟“ ”میں جانتی ہوں۔“ میگی نے چلا کر کہا۔ ”تم مجھے بیوقوف مت سمجھنا۔ ذرا مجھے طلاق دینے کی کوشش کرو۔ قانون مجھے سب سے پہلے میرے پچاس ہزار ڈالر واپس دلوائے گا اور اس کے بعد جو دولت اور جائیداد بچے گی، مجھے اس میں سے آدھا حصہ ملے گا۔ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“ میگی نے شراب کے نشے میں دانت کھوستے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ جارج نے جواب دیا۔ ”میرا انتظار مت کرنا۔ تمہیں اپنا حسن برقرار رکھنے کے لیے نیند کی اشد ضرورت ہے۔ جب نیند آئے تو سو جانا۔“

وہ زور سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ کبھی میگی کو طلاق نہیں دے سکے گا۔ ایسا کرنے کی صورت میں اسے میگی کے پچاس ہزار ڈالر واپس کرنے ہوں گے۔ اس کے بعد اسے اپنی جائیداد اور دولت میں سے آدھا حصہ دینا ہوگا۔ یعنی ایک لاکھ ڈالر۔ اس کے بعد اسے عدالت میں مقدمہ لڑنے پر میگی کے وکیل اور خود اپنے وکیل کی فیس ادا کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس کے پاس کیا بچے گا؟ میگی کو طلاق دینے سے خود کشی کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس مسئلے نے اسے پریشان کیا ہوا تھا اور اس مسئلے کا حل اچانک ہی اس کے ذہن میں چھ ماہ قبل آیا تھا۔

وہ تعطیلات گزارنے چند دوستوں کے ہمراہ مچھلی کے شکار کے لیے جمیل پر گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور وہ سب کیمپ میں تین روز کے لیے قید ہو کر رہ گئے۔ وقت گزاری کے لیے اس نے رسالے پڑھنے شروع کر دیے۔ اسے ایک کہانی بہت پسند آئی۔ ایک شخص اپنی بیوی کو قتل کرنے کا بے حد عمدہ منصوبہ بناتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے ایک مخصوص دن ایک مخصوص کلب میں پکر کھیلنے لگتا ہے۔ وہ کلب میں اپنے مخصوص وقت پر داخل ہوتا ہے اور ہمیشہ مقررہ وقت پر اٹھتا ہے۔ اس طرح وہ کئی ماہ تک اپنے اس ٹائم ٹیبل پر عمل کرتا ہے۔ کھیل کے دوران جو کھیلنے والے کمرے سے ملحق آرام کرنے والے کمرے میں دس پندرہ منٹ کے لیے ضرور جاتا ہے۔ آرام کرنے والے کمرے کا ایک بغلی دروازہ ہوتا ہے جس کی مدد سے باہر نکلا جاسکتا تھا۔ وہ کئی ماہ تک اپنے ٹائم ٹیبل پر سختی سے عمل کرتا ہے اور سب لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ ایک روز جب وہ حسب معمول آرام کرنے والے

کھیلنے کے دوران عام طور پر ہر شخص کچھ دیر کے لیے کمرے میں آرام کرنے جاتا تھا لیکن جارج نے کبھی کسی کو بغلی دروازہ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سواکی کے جوئے خانے میں آنے والے سب شرفا ہوتے تھے اور وہاں ... بازی بھی ہزاروں کی لگتی تھی۔ عام طور پر وہاں جو کھیلنے کے لیے کم از کم دو ہزار ڈالر جیب میں ڈالنے ضروری ہوتے تھے۔ پچھلے پانچ ماہ کے دوران کھیل میں وہ کبھی ہار جاتا اور کبھی اس کی جیت ہوتی تھی۔ اب تک وہ مجموعی طور پر سات ہزار ڈالر نفع میں تھا۔

جہاں وہ باقاعدگی سے ایک مقررہ وقت پر جمعے کی رات کو جوئے خانے میں داخل ہوتا تھا اور رات گئے وہاں سے اٹھتا تھا، وہیں وہ دوسرے کھلاڑیوں کی طرح آرام کرنے والے کمرے میں جا کر آرام بھی ضرور کرتا تھا۔ آرام کا تو صرف بہانہ ہوتا تھا۔ وہ دراصل آنے والے وقت کی ریہرسل کرتا تھا۔ آرام کرنے والے کمرے میں داخل ہو کر وہ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ کر بغلی دروازے سے باہر نکل جاتا اور اپنے پیچھے بغلی دروازے کو بھیڑ دیا کرتا تھا پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر تک سفر کرتا۔ تمام راستے وہ ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیتا۔ کتنے ٹریفک سگنل آتے ہیں۔ کانشیل کہاں کھڑا ہوتا ہے؟ سگنل کی جی کب سرخ ہوتی ہے اور کتنی دیر سرخ رہتی ہے؟ سفر کے دوران کون سی ممکنہ رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں؟ وہ دس منٹ سے پہلے ہی واپس آ جاتا اور بغلی دروازے سے اندر داخل ہو کر دروازے کو دوبارہ بند کر دیتا اور دوبارہ کھیل میں شریک ہو جاتا۔ اس نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ اگر کبھی اسے اپنے منصوبے میں کوئی رکاوٹ آنے کا احساس ہو تو وہ فوراً اپنے منصوبے کو خیر باد کہہ دے گا اور غیر ضروری خطرہ مول نہیں لے گا۔

پانچ ماہ کے دوران کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اسے اپنا منصوبہ ہر طرح ممکن نظر آیا اور آج کی رات اس نے اپنے منصوبے پر آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو اس کی بیوی اپنے معمول کے مطابق مشروب کا آخری گلاس پینے کے بعد نو بجے شب سو جائے گی۔ اگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا تو جوئے خانے میں وہی مخصوص سا بھی موجود ہوں گے جو عام طور پر ہر جمعے کو ہوتے ہیں۔ یعنی وہ خود جوئے خانے کا مالک سواکی، بشی، منگمری، گورڈن، بلیک، پال کورس اور ایک دھنیا آدمی۔ ساتھ کھیلتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان ایک قسم کا دوستانہ تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے جمعے

کمرے میں سنانے کے لیے داخل ہوتا ہے تو بغلی دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے اور دس منٹ کے اندر اپنی بیوی کو قتل کر کے واپس اسی بغلی دروازے سے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ حسب معمول کھیل میں دوبارہ ... شریک ہو جاتا ہے۔ بعد میں پوچھ گچھ کرنے پر جوئے کی میز پر بیٹھنے والے تمام لوگ شہادت دیتے ہیں کہ وہ ... ایک لمحے کے لیے بھی کلب سے باہر نہیں گیا پھر بھی قاتل پکڑا جاتا ہے کیونکہ جب وہ اپنی بیوی کو قتل کر کے واپس آ رہا ہوتا ہے تو وہ عجلت میں ٹریفک سگنل کی سرخ جی کو نظر انداز کرتا ہوا ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک کانشیل اس خلاف ورزی پر اس کا چالان کر دیتا ہے۔ وہ چالان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ قاتل اس مخصوص وقت پر کلب کے اندر موجود نہیں تھا۔

جارج کو یہ کہانی بہت پسند آتی ہے اور اسے اس کہانی میں اپنے مسئلے کا حل بھی مل جاتا ہے۔ وہ ہو بہو اسی منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا اپنا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی والے قاتل کی طرح عجلت میں ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے جیسی حماقت نہیں کرے گا۔ یہ چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔

اسے احساس تھا کہ کسی شادی شدہ عورت کے قتل پر پولیس سب سے پہلے اس کے شوہر پر قاتل ہونے کا شبہ کرتی ہے لیکن اگر جائے واردات سے غیر حاضری کی شہادت دینے والے تھ سات گواہ موجود ہوں تو پھر پولیس شوہر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جیسا کہ کہانی سے ثابت ہوتا تھا۔ بشرطیکہ شوہر کوئی احمقانہ غلطی نہ کرے۔ اس نے پکارا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ خود ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گا جو اس کے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو۔

جارج کو کبھی جو کھیلنے سے رغبت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایسے کئی جوئے کے اڈوں کے بارے میں سنا ہوا تھا جہاں شرفا بند کمروں میں جو کھیلتے تھے۔ مثلاً ایک ایسا ہی اڈا یا کئی اسٹریٹ پر واقع تھا جو ایک حجام کی دکان کے اندر تھا۔ ایک اور خفیہ اڈا سواکی کولڈ اسٹاک کے پیچھے تھا۔ جارج نے ان دونوں اڈوں پر جا کر پوچھ گچھا۔ وہ ایک ماہ تک ہر جمعے کو دونوں جگہ جاتا رہا۔ پھر اس نے محل وقوع اور اپنے منصوبے کو مد نظر رکھتے ہوئے سواکی کے اڈے کو منتخب کر لیا۔ کیونکہ سواکی کے خفیہ جوئے خانے میں آرام کرنے کا ایک کمرہ بھی تھا جس کا ایک بغلی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کو کبھی کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔ پوکر

کو ایک نیا آدمی آیا تھا اور اس رات وہ پوکر کھیلنے میں پندرہ سو ڈالرز ہار گیا تھا۔ جارج کو امید تھی کہ اب وہ کبھی اس جوئے خانے کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ خود اس نئے آدمی سے آٹھ سو ڈالرز جیتا تھا۔

شام کو دفتر سے گھر آنے کے بعد جارج نے کھانا کھایا اور پھر اخبار پڑھتا رہا۔ مگی کو اس کے معمول کا علم تھا چنانچہ جب وہ آٹھ بجے جوئے خانے جانے کے لیے اٹھا تو مگی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جارج نے اپنی گاڑی حسب معمول گلی کی طرف کھڑی کی تاکہ جب وہ بغلی دروازے سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو گلی سنان ہونے کی وجہ سے کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ وہاں چند ایک گاڑیاں اور بھی کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ گاڑی لاک کر کے وہ گھوم کر سڑک پر آیا اور پھر داخلی دروازے سے سوانگی کولڈ اسپاٹ میں داخل ہو کر ایک دروازے سے جس کے اوپر بڑے بڑے حروف میں "آفس" تحریر تھا، جوئے خانے کے اندر داخل ہو گیا۔ "ہیلو جارج!" اس کے اندر داخل ہوتے ہی ہشٹی نے چلا کر کہا۔

"ہیلو!" جارج نے سر ہلا کر جواب دیا اور کمرے میں موجود دوسروں کو دیکھا۔ ابھی کھیل شروع نہیں ہوا تھا اور صرف چار آدمی ہی آئے تھے۔ "اب ہم پانچ ہو گئے ہیں۔" ہشٹی نے کہا۔ "اب کھیل شروع کیا جاسکتا ہے۔"

سب نے کھیل شروع کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور فوراً ہی کھیل شروع کر دیا گیا۔ جارج نے بلف شروع کر دیا اور بازی پچاس پچاس ڈالرز بڑھانے لگا۔ اس کا ارادہ آج چند ہزار ڈالرز ہارنے کا تھا لیکن قسمت اس پر حد درجہ مہربان تھی اور وہ برابر جیتے جا رہا تھا۔ جارج نے نوٹ کیا کہ رات کے بارہ بجے تک تمام کھیلنے والے کم از کم دو دو مرتبہ آرام کرنے والے کمرے میں سنانے کے لیے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ ایسی صورت حال میں بعد میں پولیس کے دریافت کرنے پر کوئی بھی یہ نہیں بتا سکے گا کہ کون کس وقت اور کتنی دیر کے لیے کھیل کی میز سے غیر حاضر رہا۔

نئی بازی شروع ہونے پر جارج نے اپنے پتے دیکھے۔ اس کے پاس تین اکیس آئے تھے۔ ظاہر ہے وہ بازی اس کی تھی۔ اس نے اپنے پتے میز پر الٹ کر رکھ دیے کیونکہ وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی طرف سے یہ گمان کرے کہ آج جارج کھیل ختم کر کے جلد ہی گھر واپس

چلا گیا۔ جب تک کہ اس کے پتے میز پر موجود تھے کھیلنے والے یہی سمجھتے کہ وہ ضروریات سے فارغ ہونے یا سنانے کے لیے برابر والے کمرے میں گیا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جلد از جلد گھر جا کر اپنی بیوی کو مل کر کے اس سے پہلے ہی واپس آجائے جب اس کی باری آنے والی ہوتا کہ کسی کو بھی اس کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو سکے اور شکری جو اس کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا، بعد میں پولیس کو حلفیہ بیان دے سکے کہ جارج نے کھیل کے دوران ایک ہاتھ بھی نہیں چھوڑا۔

پتے میز پر الٹ کر وہ مختصر سی راہداری عبور کرتا ہوا آرام کرنے والے کمرے میں پہنچا اور فوراً ہی بغلی دروازہ کھول کر گلی میں نکل آیا۔ بغلی دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھالیے تاکہ دروازے کے پینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ بننے پائیں۔ اس نے اپنے پیچھے آرام کرنے والے کمرے کا داخلی دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اگر کوئی دوسرا شخص اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو دروازہ بند پا کر ہی سمجھ جائے کہ اندر کوئی موجود ہے۔ اس نے دروازے کے لاک میں ایک تنکا پھنسا دیا تاکہ اس کے پیچھے خود کار قفل بند نہ ہو جائے اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب وہ گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آیا تو اس نے نوٹ کیا کہ گلی بالکل سنان ہے۔ وہاں کوئی دوسری کار یا راگبیر موجود نہیں تھا۔

کار چلاتے ہوئے اس نے رفتار پچیس میل فی گھنٹہ سے آگے بڑھنے نہیں دی۔ وہ اس اہم موقع پر تیز رفتاری کے جرم میں چالان کروانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے سیٹ کے نیچے سے پلاسٹک کور میں لپٹا ہوا ریوالور نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے ہاتھوں پر بدستور دستانے موجود تھے۔ اس نے گاڑی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر روک دی اور باقی فاصلہ اس نے تیز تیز قدموں سے پیدل چلتے ہوئے طے کیا۔ رات بہت ہو چکی تھی۔ گلی بالکل سنان تھی۔ جب وہ اپنے مکان کے قریب پہنچا تو اسے پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ کسی بھی مکان میں روشنی نہیں تھی۔ دستانے پہنے پہنے اس نے چابی سے مکان کا داخلی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے یہ یقین کر لیا کہ تمام کھڑکیوں پر پردے کھینچے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے خواب گاہ کی روشنی جلائی اس کی بیوی بے ڈھنگے انداز میں بے حد خوبصورت گاؤن پہنے بستر پر خوابیدہ تھی۔ جارج نے

جیب سے ریوالور نکال کر میگی کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کی بیوی آواز نکالے بغیر آنجھانی ہو گئی۔

ریوالور جیب میں واپس رکھنے کے بعد اس نے میگی کے جسم پر پڑی ہوئی چادر کو الٹ دیا تاکہ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہو جیسے مقتولہ نے مرنے سے پہلے کسی قسم کی آواز سن کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی پھر اس نے اپنی بیوی کی انگلی سے ہیرے کی انگلی نکالی اور پھرتی سے زیورات رکھنے والا ڈبا ڈریسنگ ٹیبل پر الٹ دیا۔ ڈبے سے تمام زیورات باہر نکل پڑے۔ اس نے ان میں سے صرف وہی زیورات اٹھائے جو واقعی قیمتی تھے اور انہیں اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ جب وہ مکان سے باہر نکلا تو اس نے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ اپنی کار تک پہنچنے سے پہلے اسٹریٹ لائٹ کی زد میں نہ آئے۔ پڑوس کے کچھ مکانوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی۔ غالباً انہوں نے گولی چلنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ہیڈ لائٹ جلائے بغیر کار ڈرائیو کرنے لگا۔ وہاں سے کافی دور نکلنے کے بعد اس نے اپنی کار کی بتیاں روشن کیں۔

کار چلاتے ہوئے وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہ مقام اس نے پہلے ہی سے منتخب کیا ہوا تھا۔ وہاں رک کر اس نے گٹر کی مین لائن میں اپنا ریوالور، دستاں اور زیورات ڈال دیے اور پھر کار میں بیٹھ کر جوئے خانے کی طرف چل دیا۔ اس تمام عمل کے دوران وہ بے حد نروس ہو گیا تھا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ یہ واقعی خطرناک بات تھی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس کا کوئی پڑوسی اندھیرے ہی میں جاگ رہا ہو اور وہ گولی چلنے کی آواز سن کر فوراً اپنے مکان سے باہر نکل آیا ہو اور اندھیرے میں اس کے باہر آنے کا اقتدار کر رہا ہو اور جب وہ اپنے مکان سے باہر نکلا ہو تو اس نے اسے مکان سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو؟ اگر ایسا ہوا بھی تو وہ کیا کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے قتل جیسی حرکت حساب کی غلطی تو تھی نہیں جسے دوبارہ صحیح کیا جاسکتا ہو۔ اب جب وہ اپنے بے حد ممکن منصوبے پر عمل کر چکا تھا تو اسے اس میں بے شمار خامیاں نظر آنے لگی تھیں۔

جب اس نے جوئے خانے کے پاس گلی میں اپنی کار گھڑی کی اور گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس سارے کام میں اسے صرف آٹھ منٹ ہی لگے تھے۔ حالانکہ یہ وقفہ عین اس کے منصوبے کے مطابق تھا لیکن وہ آٹھ منٹ اس پر آٹھ صدیوں کی طرح ہی گزرے تھے۔ گاڑی لاگ کر کے وہ بھٹی دروازے سے

آرام کرنے والے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ بدستور خالی تھا۔ اس نے تالے میں پھنسا ہوا تنکا نکال دیا اور خود کار قفل بند ہو گیا پھر اس نے آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا۔ یہ ظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا، کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو قتل کر کے آ رہا ہے۔ اس لیے اسے کسی چیز سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ آرام کرنے والے کمرے سے باہر نکلا اور جوئے کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ کھیل اسی طرح جاری تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی نے بھی اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے مشتبہ نظروں سے نہیں گھورا۔

دس منٹ بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ کسی کو بھی یہ یاد نہیں رہے گا کہ کھیل کے دوران میز پر سے اٹھ کر گیا تھا تو اندرونی طور پر اس نے بے حد سکون محسوس کیا اور پھر وہ تندی سے کھیل میں مشغول ہو گیا۔ اس نے دو ہاتھ بڑی بے پروائی سے کھیلے لیکن وہ دونوں ہاتھ جیت گیا۔ قسمت اس پر بے حد مہربان تھی۔

سیکنڈ منٹوں میں اور منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ جارج نے تصوراتی نظروں سے میگی کو خون میں لت پیت بستر پر پڑے دیکھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد پولیس سرجن قتل کے وقت کا تعین کر لے گا اور وقت وہی ہو گا جس کے بارے میں سات گواہ حلفیہ بیان دیں گے کہ وہ اس شام کھیل کے دوران ایک منٹ کے لیے بھی اٹھ کر باہر نہیں گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ آزادی کے احساس سے خود کو کسی پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس احساس میں شاید اس کی مستقل جیت کا بھی اثر تھا۔ وہ آزادی کے نشے میں مخمور ہوتا جا رہا تھا لیکن ابھی سب سے مشکل کام باقی تھا۔ یعنی اپنی بیوی کی لاش کو دریافت کرنا..... اور پھر پولیس کو اطلاع دینا۔ ان کی مشتبہ نظروں اور ان کے بے شمار سوالوں کا سامنا کرنا۔

ساڑھے چار بجے تک جوئے کی میز پر جیتنے والا وہ واحد کھلاڑی تھا اور تو اور منقری کے بھی چند سوڈا لڑز اس کی جیب میں تھے۔ بخشی تقریباً ایک ہزار ڈالرز خسارے میں تھا۔ سوائگی بھی پانچ سو ڈالرز ہار چکا تھا۔ ساڑھے چار بجے اس نے آخری بازی پر لگے ہوئے چھ سوڈا لڑز بھی سمیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیے۔

”آج کی رات میری تھی۔“ جارج نے ایک گہری

سائنس لے کر کہا۔ فرار مجرم کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔

جوئے خانے سے اس کے مکان کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ جارج آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا ہوا گھر کے قریب پہنچا۔ جب اپنے گھر کے سامنے اسے پولیس کی جیب کھڑی ہوئی نظر آئی تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کیا میگی کی لاش دریافت کی جا چکی ہے؟ کیا کسی پڑوسی نے گولی چلنے کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دے دی تھی؟

چلو اچھا ہی ہوا۔ اس نے سوچا۔ جن کٹھن لمحات سے وہ اس قدر خوفزدہ تھا، وہ بیت چکے تھے۔ اب اسے میگی کی لاش دریافت کرنے کا کام نہیں کرنا پڑے گا۔ اس نے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھے بغیر ہی گاڑی اپنے مکان کے احاطے میں داخل کر دی اور بٹن دبا کر گیراج کا دروازہ کھولا پھر وہ گاڑی گیراج کے اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے گیراج کا دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔

گاڑی سے نکل کر جارج نے چابی کی مدد سے وہ دروازہ کھولا جو کچن میں کھلتا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ اندر چپے چپے پر پولیس والے موجود ہوں گے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اندر تاریکی اور سانپ کا راج تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے معمولات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک کیتلی میں کافی کا پانی بھر کر ٹیس کے چولہے پر رکھ دی۔ فوراً اسے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ باہر پولیس والے کال بیل بجا رہے تھے۔ وہ کمروں میں روٹنی کرتا ہوا دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا۔ باہر دو پولیس والے کھڑے تھے۔

”صبح بخیر۔“ جارج نے خوش دلی سے کہا۔ ”اندر آ جائیں کچن میں، میں نے ابھی ابھی کافی کا پانی گرم ہونے کے لیے رکھا ہے۔ میری بیوی ابھی بیدار نہیں ہوئی۔“ پھر اس نے ایک معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں ابھی ابھی گھر واپس آیا ہوں۔“

”ہم جانتے ہیں۔“ ایک پولیس والے نے کہا۔ ”ہم باہر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ باہر کافی سردی تھی۔ کافی کا ایک ایک کپ پینے میں کوئی حرج نہیں۔“

وہ دونوں جارج کے پیچھے پیچھے کچن میں داخل ہوئے۔ کیتلی میں پانی ابل رہا تھا۔ اس نے سمکڑ شوہروں کی طرح تین بیالیاں اٹھائیں۔ پھر کریم اور چینی نکالی اور پھر چمچے پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈبل روٹی نکالی اور ریفریجریٹر کی طرف بڑھا تا کہ اندر سے کھن نکال سکے۔ اس دوران میں پولیس والے خاموش رہے۔ جارج

”کیا خیال ہے اب کھیل بند کیا جائے؟“ جوئے خانے کے مالک سوانکی نے کہا۔

”کیوں؟“ جارج نے کہا۔ اچانک ہی گھر جانے کے خیال سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ آخر وہ کس طرح میگی کی لاش کا اور پھر پولیس والوں کا سامنا کر سکے گا۔ وہ زیادہ وقت اس بلا کوٹلنا چاہتا تھا۔ ”ابھی بجا ہی کیا ہے؟ رات ابھی جوان ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو یہی سہی۔“ بھٹی نے کہا۔ ”تم کب تک جیتے رہو گے؟“ چنانچہ کھیل پھر شروع ہوا۔ منگھری البتہ اٹھ کر گھر چلا گیا۔

ساڑھے پانچ بجے سوانکی نے پھر کہا۔ ”تمہارا خیال غلط تھا بھٹی۔ آج کی رات واقعی جارج کی ہے۔ آج اسے کوئی بھی نہیں ہراسکتا۔ مزید کھینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری جیبیں بھکی ہوئی رہیں اور اس کی جیب بھاری ہوتی رہے۔ ممکن ہے آئندہ جمعے کو قسمت اس پر مہربان نہ رہے اور ہم آج کا حساب بے باق کر لیں۔“

جارج بھی مرے ہوئے دل سے کھیل ختم کرنے پر تیار ہو گیا۔ اب مجھے میگی کی لاش کو دریافت کرنا ہی پڑے گا۔ جارج نے سوچا اور بے دلی سے نوٹ جیب میں ٹھونٹے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح چھ بجے پولیس کوفون کر کے بلانے کا خیال کچھ ایسا خوش کن نہیں تھا اور پھر ان نظروں کا مقابلہ کرنا اور ان کے سوالوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا لیکن یہ سب کچھ تو اسے کرنا ہی تھا۔

”تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے؟“ جارج نے سوانکی کو دعوت دی۔ ”ہم وہاں آج رات کی خوشی میں ایک ایک جام پئیں گے۔“

”نہیں، میں نہیں جاسکتا۔“ سوانکی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صبح دکان بھی کھولنی ہے۔ اس لیے چند گھنٹے نیند لینا ضروری ہے۔“

”اچھا۔“ جارج نے مُردہ دلی سے کہا اور داخلی دروازے سے باہر نکل آیا پھر وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا سڑک پر سے گھوم کر گلی میں پہنچا اور گاڑی میں بیٹھ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ صبح صادق ہونے لگی تھی اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ چھٹی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس شہر سے اپنے کاروبار اور اپنی دولت کو سمیٹ کر کسی دوسرے شہر بھاگ جائے اور نئے سرے سے نئی زندگی شروع کرے لیکن اب ایسے کسی فیصلے کا وقت نکل چکا تھا۔

کوان کی خاموشی سے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔
آخر یہ لوگ کیوں خاموش ہیں؟ یہ سوالات کیوں نہیں کرتے؟ کیا میگی کی لاش مردہ خانے لے جانی جا چکی ہے؟ اور کیا یہ دو پولیس والے اس لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تاکہ وہ اسے یہ اندوہناک خبر سنا سکیں؟

”آج قسمت مجھ پر مہربان تھی۔“ جارج نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ ”تمام رات میں چند دوستوں کے ساتھ پوکر کھیلتا رہا اور اتنی رقم جیت کر اٹھا کہ اپنی بیوی کے لیے ایک منگ کا کوٹ خرید سکوں۔ میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ فوراً میگی کو جگا کر یہ خوشخبری سنا دوں لیکن نہیں، وہ اس طرح جگانے پر مجھے کچا کھا جائے گی۔ اگر میں اس سے یہ کہوں کہ آج میں بری طرح ہار کر آیا ہوں تو کیسا رہے گا؟“

پولیس والے جواب میں خاموش رہے۔ اس نے کافی بنائی اور پھر ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر ان کے سامنے سلائس رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ تشریف رکھیں اور اب بتائیں آخر آپ کا آنا کیسے ہوا؟ سلائس کیسے تکلف کی بات نہیں۔“

”شکریہ۔“ ایک پولیس والے نے کہا اور دونوں نے ہاتھ بڑھا کر مکھن لگے ہوئے سلائس اٹھا لیے۔

”تو تم آج ساری رات پوکر کھیلتے رہے؟“ ایک پولیس والے نے کہا۔

”ہاں!“ جارج نے جواب دیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے پوکر کھیلتا قانون کے خلاف ہو لیکن آج کل ہر شخص پوکر کھیلتا ہے۔“

”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔“ پولیس والے نے جواب دیا۔ ”یہ بتائیے کہ آج کھیل کس وقت شروع ہوا تھا اور کب ختم ہوا؟“

”کھیل پچھلی رات تقریباً نو بجے شروع ہوا تھا۔“ جارج نے جواب دیا۔ ”اور ابھی کوئی دس منٹ پہلے ختم ہوا ہے۔“

”کیا تم تمام وقت وہاں موجود رہے؟“ دوسرا سوال ہوا۔

”ہاں!“ جارج نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

”کیوں؟“

اس نے بھولپن سے ایک پولیس والے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہ بھی کہہ دے کہ وہ یہ سب کچھ ثابت کر سکتا ہے۔ جوئے خانے میں تمام وقت موجود رہنے کی گواہی سات آدمی دے سکتے ہیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔

”خوب!“ پولیس والے نے کہا۔ ”تمہارے علاوہ دوسرے کھیلنے والے کون کون تھے؟“ تیسرا سوال ہوا۔

”اوہ چھوڑیے جناب۔“ جارج نے اس طرح کہا جیسے وہ اس سوال کا مطلب غلط سمجھ رہا ہو۔ ”ہم لوگ کوئی جوان نہیں کھیل رہے تھے۔ بس وقت گزاری کے لیے پوکر کھیل رہے تھے۔ ہم ہر جمعے کی رات پوکر کھیلتے ہیں۔ اگر آپ میرے ذریعے دوسروں کو پھنسانا چاہتے ہیں تو میں ہرگز اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ پولیس والے نے اسے یقین دلایا۔ ”ہمیں ان تمام لوگوں کے نام پہلے ہی معلوم ہیں جو آج رات کھیل رہے تھے۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا مسٹر منگمری اس وقت وہاں موجود تھے جب کھیل شروع ہوا تھا۔ یعنی نو بجے؟“

”منگمری!“ جارج نے قدرے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں! بلکہ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے اور میرے آنے ہی پر کھیل شروع ہوا تھا۔“

”اچھا تو وہ کس وقت وہاں سے گئے؟“

”کون منگمری؟“ جارج نے دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ سوالات کا رخ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”جی ہاں۔ ہم مسٹر منگمری ہی کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔“

”منگمری.....“ جارج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ کھیل ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی گھر چلا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ساڑھے چار بجے تھے لیکن آپ یہ سوالات کس لیے پوچھ رہے ہیں؟“

”کیا کھیل کے دوران کسی وقت وہ اٹھ کر باہر گئے تھے؟“ پولیس والے نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

”نہیں۔“ جارج نے جواب دیا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی اٹھ کر باہر نہیں گیا۔“

”کیا تم عدالت کے سامنے حلف اٹھا سکو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ جارج نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ہر وقت وہاں موجود رہا اور ہم میں سے کوئی بھی کھیل کے دوران اٹھ کر باہر نہیں گیا۔ میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں لیکن ان تمام سوالوں کا مقصد؟“

”تو ٹھیک ہے۔“ پولیس والے نے مکھن لگے ہوئے سلائس کا آخری لقمہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اتنے ہی پُر یقین ہو تو یقیناً دوسرے بھی یہی بیان دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ منگمری کا بیان درست ہے۔ ہمیں اس کے بیان پر یقین تھا لیکن پھر بھی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی تصدیق کرتے۔“ دونوں پولیس والے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کھڑے ہو گئے۔

”لیکن..... لیکن یہ سب کیا ہے؟ آپ لوگ کس بات کی تصدیق کرنا چاہتے تھے؟“ جارج نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں..... منگمری کی بیوی کو آج رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔“ پولیس والے نے جواب دیا۔

”نہیں!“ جارج کو یقین نہیں آیا۔

”اب تمہارے بیان کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اس کی بیوی کو ہلاک کرنے والا کوئی چور تھا۔“ پولیس والے نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ”لیکن گھر میں سے صرف زیورات ہی غائب ہیں، چور نے اور کوئی چیز چرانے کی زحمت نہیں کی۔ اس کے علاوہ ہمیں ایسی کوئی نشانی نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ چور زبردستی کسی کھڑکی کے ذریعے مکان کے اندر داخل ہوا تھا۔ ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارا یہ سوچنا قدرتی امر تھا کہ قاتل دراصل منگمری ہے۔ لیکن جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنے والے سات گواہوں کی موجودگی میں ہمیں اپنے اس خیال سے دستبردار ہونا پڑے گا۔“

جارج نقاہت سے کڑی پر گر گیا۔

”تمہیں یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔“ دوسرے پولیس والے نے کہا۔ ”کیا منگمری تمہارا بہت گہرا دوست ہے؟“

”ہاں!“ جارج نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”چھ ماہ قبل ہم دونوں ساتھ ہی مچھلیوں کا شکار کھیلنے جھیل پر گئے تھے اور بارش کی وجہ سے تین روز تک کیمپ میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر ہم نے ایک ساتھ پوکر کھیلنا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے آج تک ہم دونوں ہر جمعے کو باقاعدگی سے پوکر کھیل رہے ہیں۔“

”اور چھ ماہ قبل کیمپ میں قید ہونے کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی رسالے میں ایک ہی کہانی پڑھ کر ایک ساتھ اپنی بیویوں کو قتل کرنے کے لیے ایک ہی جیسا منصوبہ بنایا تھا۔ جارج نے مٹی کے ساتھ سوچا۔ وہ یہ سب کچھ پولیس والوں کو کیسے بتاتا؟

”اوہ..... بڑا افسوس ہوا۔“ پولیس والا کہہ رہا تھا۔

”آپ تشریف رکھیں، ہم خود ہی باہر نکل جائیں گے۔“

سینس ڈائجسٹ

چند لمحوں بعد جارج کو دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ یہ مشکل تمام وہ کرسی پر سے اٹھا اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ پولیس والے مکان سے باہر جا چکے ہیں، وہ اندھوں کی طرح فرنیچر سے ٹکراتا ہوا دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے خواب گاہ میں پہنچا۔

خواب گاہ کی روشنی بجلی ہوئی تھی۔ مگی اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جس طرح وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب خواب گاہ کے دروازے میں گھستے ہی دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جاتا کہ مگی مر چکی ہے اور خون سے لت پت چادر خشک ہو چکی تھی۔

”خدا تمہارا بیڑا غرق کرے منگمری۔“ جارج نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی آج ہی کی رات ملی تھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے۔“ وہ لڑکھڑاتا ہوا بستر کی طرف بڑھا۔ اس کی نظریں اپنی بیوی کی لاش پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا ذہن اس لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے بے شمار منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے اصلی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے پولیس کو فون کر کے بلا لے لیکن..... وہ یہ کس طرح ثابت کرتا کہ منگمری کی بیوی اور اس کی بیوی کا قاتل ایک ہی چور تھا جس نے پہلے منگمری کی بیوی کو قتل کیا اور پھر اس کی بیوی کو۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ دونوں عورتوں کا قتل ایک ہی ریوالور سے چلائی ہوئی گولیاں برآمد ہوں۔ شاید پہلے ایسا ممکن ہوتا لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

سب سے نیز حاسمہ جو اس کے سامنے تھا، وہ یہ تھا کہ وہ دو شوہروں کی دو بیویاں ایک ہی رات میں قتل ہوتی ہیں۔ دونوں کا قتل ہو ہوا ایک جیسا ہے۔ دونوں شوہروں کی جائے واردات سے غیر موجودگی ایک ہی قسم کی شہادت مہیا کرتی ہے۔ بلکہ اس کی اپنی شہادت نے منگمری کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر کر دیا تھا اور پھر دونوں قتل ایک ہی رات ہوتے ہیں۔ دونوں شوہر ایک ہی رات ایک ہی جوئے خانے میں ایک ساتھ جوا کھیل رہے تھے۔ البتہ منگمری کو اس پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ اس نے اپنی بیوی کی لاش کو اس سے پہلے ہی دریافت کر کے اپنی جان بچالی تھی لیکن کیا پولیس اس قدر مشابہت محسوس کرنے کے بعد بھی منگمری کو چھوڑ دے گی؟

”مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں؟“ جارج نے سرگوشی میں اپنی بیوی کی لاش کو گھورتے ہوئے کہا۔



جنوری 2017ء



محی الدین نواب

از تیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک پھرہ کی روپ، محی چھاؤں کی دھوپ، محبت کی مائتوں، رقابتوں اور قابضوں کا ایک دل ربا سلسلہ



Downloaded From
Paksociety.com

Downloaded From
Paksocietyty.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ داستان ہے دو برہمنوں کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی مکی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جھرو اور چاچی مکی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرا حشت جلالی ایک بدیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گولہ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، ڈیرا حشت کی منگی گیری کرتا تھا۔ ڈیرا حشت جلالی اور اس کے بیٹے رواجی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنا یا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضائقہ علاقے مین گولڈ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ تاکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برہادر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تجزیاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف محلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکرٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مہم لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرا حشت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سبکی کی شادی میں شرکت کے لیے گولڈ مینی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کورہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ، جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے گلے سے فرار ہو گیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کر لیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو یو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دو بارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مرینہ دوبارہ TINET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قایم کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیل شین گلوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر کٹر جزل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہو گئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھاتا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالئے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے لگا یا پہنچ گیا۔ تمام تقیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیل جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ ٹھاکر کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ ٹھاکر سے نکاح پڑھوایا اور بشری اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور ٹھاکر اس اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں جتے چھوئے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور مکی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک

حیات بتالیا۔ مراد اور ہم زادی کا دیدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ اور ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ بچو بہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس بچو بہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہو گیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کر گئی۔ اور ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کو یو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرا لیے۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمہ داری عابی کے سپرد کر دی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھ لیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دین اسلام کی طرف مائل ہو کر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلماں نے عابی کی مدد کر کے ان نون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ بارودا اسے عابی کے ہتھکے سے نکال کر لے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے چھانٹ کر مراد سے نکاح کر لیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سامنے پیش نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگئی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سامنے آ گئی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آ سکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کر دیا۔ مراد دھوکا کھا گیا۔ وہ لاوارث بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کی پرورش کرنے لگا۔ ماروی کو حقیقت کا علم تھا مگر اس نے رضائے الہی سے یہ بات عیاں نہیں کی۔ عابی نے ریسرکار روپ دھار کر ٹیلی ویشن جاننے والوں بارودا اور امی مالا کو ہلاک کیا۔ دشمن عابی کو ٹریپ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور ہم زیان نے دو جادو گروں کے ذریعے اپنے اور لارا کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ عابی کو ایک لڑکی پسند آ گئی اور اس نے اس سے شادی کر لی ان پر حملہ ہوا مگر وہ دونوں محفوظ رہے۔ دراصل وہ لڑکی علوم فلکیات کے ماہر کی بیٹی تھی۔ ادھر لارا کی خدمات پر مامور جادوگر نے لارا کو ہتھکے میں لے لیا۔ اس نے عابی اور ماروی سے مدد مانگی۔ عابی نے جادوگر کو ہلاک کر دیا۔ لارا اور ہم زیان آپس میں بات کر رہے تھے کہ ماروی اچانک وہاں پہنچ گئی۔ وہ ماروی کی آواز پر چونک گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی وہاں موجود تھی۔ اس کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ پراسرار انداز سے حواس پر چھاری تھی۔ وہ بڑی توجہ سے متحرک کر سی کو دیکھ رہے تھے۔

ماروی نے کہا۔ ”ہمارا یا شیطان کا اپنا اپنا علاقہ کہاں ہے؟ ساری دنیا ساری کائنات اللہ کی ہے۔ ہم اللہ کی زمین پر جہاں چاہتے ہیں، آتے جاتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں، وہاں شیطان ضرور آتا ہے اگر تم زمین کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک اللہ والوں کو اور دوسری شیطان والوں کو دینا چاہتے ہو تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ یہ دنیا صرف انسانوں کے لیے ہے۔ شیطان تو جبراً اپنی من مانی کرتا آ رہا ہے۔ تم لارا جیسی

ٹیلی ویشن جاننے والی کا ہاتھ پکڑ کر کتنے دن جیو گے؟ کب تک اس جزیرے میں چھپے رہو گے؟ بھائی جان تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک اس جزیرے سے باہر نہیں جاؤ گے، میں یہاں آتی رہوں گی اور تمہارا سکون برباد کرتی

پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”اللہ نے چاہا تو ہم شیطان کے پرستاروں کو اور ان کی مدد کرنے والوں کو پھینک نہیں دیں گے۔ اگر ایمان اور شیطان کی جنگ کو قیامت تک جاری رہتا ہے تو ہماری سلسلیں ایمانی اور روحانی قوتوں سے جنگ جاری رکھیں گی۔“

بن زیان نے کہا۔ ”پلیز نظر آؤ۔ ہم تمہاری طاقت کے آگے جھکنے کی بات کریں گے۔“

”میرا نظر آنا ضروری نہیں ہے۔ صرف خدا کے آگے جھکنے کی بات کرو۔“

بن زیان نے کہا۔ ”جب یہ طے ہے کہ ایمان اور

رہوں گی۔“
تھا۔ یہ میرا پہلا اور آخری دن ہے۔ آج کے بعد یہاں نہیں آؤں گا۔“

وہ بھائی بہن باتیں کرتے ہوئے جم خانے سے باہر آ گئے۔ دانش نے کہا۔ ”یہ مار پیٹ، یہ دنگا فساد میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں کبھی کسی سے ہاتھ پائی کرنا نہیں چاہتا۔“

ماروی نے کہا۔ ”نہ چاہنے کے باوجود دشمن اس طرح چھیڑتے ہیں کہ ہم لڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”آپ نے تو خطرناک جادو گروں کو خاک میں ملا دیا ہے لیکن ان سے ہاتھ پائی نہیں کی۔ مجھے عابی بھائی جان کے مقابلے میں ٹیلی پتھی کی ایک اضافی صلاحیت حاصل ہے۔ میں اس کے ذریعے امن وامان سے اور بڑی خاموشی سے دشمنوں سے نمٹ لیا کروں گا۔“

”بے شک تم ایسا کر سکو گے۔ یہ اچھا ہے کہ خون خرابے سے دور رہو گے۔“

ماروی اسے یہ حقیقت بتا چکی تھی کہ وہ مراد علی منگی کا بیٹا ہے۔ یہ فراڈ بھی بتایا تھا کہ اس کی ماں لارائے نے کس طرح دھوکے سے بچے تبدیل کیے تھے۔

ماروی نے کہا۔ ”میں بابا جانی کو پہلے ہی دن حقیقت بتا دیتی لیکن جب بھی بتانے کی کوشش کی تو نامعلوم سی رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ اللہ کو منظور نہیں ہے کہ جولا وارث بچہ بابا جانی کے پاس آیا ہے، وہ لاوارث رہے۔ جب تک اللہ کو منظور نہیں ہوگا، وہ بچہ بابا جانی کا وارث بن کر رہے گا اسی لیے میں نے اس کا نام وارث علی منگی رکھا ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا آپنی! یہ وارث بھی اسی ریاست کا شہزادہ اور بابا جانی کا بیٹا کہلاتا رہے گا۔“

یہ خبر مراد تک پہنچی تھی کہ ریاست کی اسلامی یونیورسٹی میں ایک ایسا طالب علم آیا ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ کلام پاک کو حفظ کیا ہے بلکہ اس کلام کے الفاظ، فقروں اور ہدایات کی کما حقہ تشریح بھی بیان کرتا ہے۔ وہ پرنس عابی کی طرح جنگجو بھی ہے۔ اپنی عمر کے ساتھ ساتھ اس دنیا کا دوسرا قابلِ شکست انسان کہلائے گا۔

یہ معلوم ہوا کہ اسے ماروی یونیورسٹی میں لائی ہے۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔ ”یہ گوبر نایاب کہاں سے لائی؟“

”میں نے اپنے اطراف حصار بندی کرائی ہے، تم مجھے چھو بھی نہیں سکو گی۔“

”عارضی حصار بندی نے خوش ہوتے رہو۔ کلام پاک کی آیتیں پہاڑوں کا سینہ چاک کر سکتی ہیں لیکن میں تلاوت نہیں کر رہی ہوں۔ اس کے بغیر ہی تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی اچانک اس کمرے کے ایک گوشے میں آگ کا شعلہ بھڑکا پھر وہ تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگا۔ لارا اور بن زیان اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ شعلے اس کمرے سے نکل کر پوری رہائش گاہ میں پھیلنے والے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے ہانپتے ہوئے اس محل نما بجٹلے سے باہر دوڑ چلے آئے۔ مسلح فوجی اپنی ڈیوٹی کے مطابق مستعدی دکھا رہے تھے۔ آگ بجھانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ پوچھ رہے تھے کہ آگ کیسے لگی؟

اس گھر کو اپنے ہی اعمال سے آگ لگی تھی۔ انہیں ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھو تم حصار بندی میں ہو آگ تم تک نہیں پہنچے گی لیکن تمہیں دوڑاتی دوڑاتی ایک دن جریرے کے باہر بھائی جان کے پاس پہنچا دے گی۔ اس دن کا انتظار کرو۔“

وہاں سے دانش کے پاس آ گئی۔ وہ یونیورسٹی کے جم خانے کے اس حصے میں تھا جہاں جوڈو کرائے سکھائے جاتے تھے۔ وہاں بڑی عمر کے بچے خطرناک فائٹنگ سیکتے تھے۔ دانش اگرچہ آٹھ برس کا تھا تاہم اپنے بھائی عابد کی طرح قد نکال رہا تھا۔ اس ادارے کے ماہر استادوں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا۔ ”اسے ہم کیا سکھائیں گے۔ یہ تو سیکھا سکھایا آیا ہے۔ پرنس (ماروی!) آپ خود ہی دیکھیں۔“

ماروی کے سامنے دانش کے مقابلے میں چار فائٹر آ گئے۔ دو استاد بھی آ کر پینٹر ابدلنے لگے پھر ایک نے اچانک حملہ کیا تو دانش طرح دے گیا۔ دوسرے نے پھر تیسرے نے مختلف سمتوں سے اپنے داؤ پیچ آزمائے۔ وہ کبھی اچھل کر کبھی فضا میں قلابازی کھا کر بچ رہا تھا۔ پھر جب ایک فائٹر کے منہ پر ہاتھ مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ مقابلہ روک دیا گیا۔

دانش نے کہا۔ ”آپنی! آپ کے حکم سے یہاں آ گیا

دھڑکنوں سے لگ کر اپنے جائز حقوق حاصل کر رہا تھا۔

☆☆☆

”بابا جانی! اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکوں گی۔ لارا اپنی تاریک دنیا میں اس بچے کو شیطان کا پرستار بنا رہی تھی۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ وہی بچہ ہوگا جسے اس نے دوسری شادی کے بعد جنم دیا ہے؟“

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گی۔“

”جبکہ تم دوسروں کے اندر کے راز معلوم کر لیتی ہو۔“

”بے شک اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے مجھے بہتری روحانی قوتیں عطا کی ہیں۔ میں اس معبود کے حکم سے بس اتنا ہی بولتی ہوں جتنی مجھے اجازت ملتی ہے۔ میں اللہ کے حکم سے لارا کے بیٹے دانش کو دین اسلام میں لے آئی ہوں لیکن بیٹے کو ماں سے جدا کرنے کا ظلم نہیں کیا ہے۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ لارا نے بھی مجبور ہو کر ہی سہی، وارث کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے بیٹے کو باپ سے جدا نہیں کیا۔ تم نے بھی نہیں کیا..... شاباش! لیکن لارا تمہاری دشمن ہو گئی ہوگی۔ تم نے اسے ماں کے پاس تو رہنے دیا مگر شیطان سے چھین لیا ہے۔“

ماروی اپنے بابا جانی کو پوری روداد سنانے لگی کہ جب دانش پیدا ہوا تھا تب اس کے کانوں میں اس نے اذان سنائی تھی۔ تب سے اب تک کی محنت رنگ لائی ہے۔ اسے ماں کی ٹیلی ویشن ملی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اسے بھائی جان (عابی) کی جگہ صلاحتیں حاصل ہوئی ہیں۔

مراد نے پہلی بار یونیورسٹی میں آ کر اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کر دل کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اسے سینے سے لگایا پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ”تم ماروی کو آپ ہی کہتے ہو۔ اس کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہو تو مجھے بھی بابا جانی کہہ سکتے ہو۔“

دانش خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ باپ کے قدموں میں گر کر لیٹ کر بولا۔ ”آپ میرے دل کی مراد پوری کر رہے ہیں۔ مجھے بہت اونچا مقام دے رہے ہیں۔“

مراد اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تم قدموں میں نہیں، ہمارے دلوں میں رہو گے اور ہمارے دین اسلام کا بول بالا کرتے رہو گے۔“

آگے وہ نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ فی الحال باپ کی

نہ بھاگنے والے پاؤں رہے تھے، نہ تحفظ دینے والی کوئی جگہ رہی تھی۔ بن زیان کن پیروں سے بھاگ کر کہاں جاتا؟ جہاں جاتا، وہاں ماروی آ جاتی اور اس کے پیچھے عابی کھڑا رہتا۔ اگر کہیں بھاگ کر نہ جاتا تو اس جزیرے کی زمین بھی غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ ماروی اس کے ایک بچکے کو آگ لگا کر یہ جتا کر گئی تھی کہ وہ جہاں جائے گا، وہاں آگ لگتی رہے گی۔ وہ ہزاروں مسلح فوجیوں کی پناہ میں بھی نہیں رہ سکے گا۔

اس کا بنگلا جل کر کھنڈر ہو چکا تھا۔ وہ شکست خوردہ ہو کر گھاس پر گر پڑا تھا۔ لارا اس کے سامنے دوڑا تو ہو کر بیٹھ گئی، ماروی ایسا تماشا کر گئی تھی کہ مسلح سپاہی بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سب دور کھڑے خشک تھے کہ بن زیان انہیں کیا حکم دینے والا ہے۔

وہ بڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تم یہاں سے جاؤ۔“
لارا نے پوچھا۔ ”مجھے جانے کو کیوں کہہ رہے ہو؟“
”یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے کہ تم تمام ٹیلی ویشن جاننے والوں سے دوستی اور اتحاد ختم کروں گا، تب ہی وہ عابی مجھے جینے دے گا۔“
”کیا تم ٹیلی ویشن جیسے زبردست ہتھیار سے محروم ہو جاؤ گے؟“

”تمہارا یہ ہتھیار مجھے سلامتی نہیں موت دے رہا ہے اور ابھی مجھے اپنی پوری زندگی گزارنی ہے۔ تم مجھے جیسے کسی اور شاطر سے دوستی کر لو۔ وہ تمہاری راہنمائی کیا کرے گا۔“
”میں نہیں جانتی، تمہارے بعد مجھے کس پر بھروسہ کرنا چاہیے کیا تمہاری نظروں میں کوئی ہے؟“

”مجھ سے نہ پوچھو، عقل سے سوچو، ماروی یہاں ہوگی۔ ہماری باتیں سن رہی ہوگی۔“

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس نے بری طرح دہشت طاری کر دی ہے۔“

”یہ دہشت عابی کی بات مان کر ہی ختم ہوگی۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا ہے۔ تم چپ کر بھی میرے دماغ میں نہیں آ سکو گی۔“

”ہاں۔ ہم ماروی سے چپ کر عابی کو دھوکا نہیں

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

دے سکیں گے۔“ خون کے رشتوں سے ان کے منگے ہو، جو میرے مذہب کے اور میری جان کے دشمن ہیں۔“

دانش نے ماں کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ ”ایک دن یہ ہونا تھا۔ اس لیے ہو رہا ہے۔ مام! آپ ایک اکیلی جان ہیں۔ زندگی گزارنے کا محفوظ راستہ اختیار کریں۔ پھر سمجھاتا ہوں۔ دین اسلام قبول کریں اور آخری سانسوں تک سلامتی سے رہیں۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ میں مرتے دم تک شیطان کے قدموں میں رہوں گی۔ غم و خوشی، ناکامیاں اور کامیابیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ شیطان بڑی قوتوں والا ہے۔ وہ مجھے جھکنے، ٹوٹنے اور گرنے نہیں دے گا۔“

”تو پھر تنہا اور بے یار و مددگار ہونے کا ماتم نہ کریں۔ جائیں شیطان مردود سے مدد مانگیں۔“

”یوشٹ اپ! شیطان کو مردود نہ کہو۔“

”اگر میں یہاں بٹھارہ گیا تو اور بہت کچھ کہوں گا۔ آپ برداشت نہیں کر سکیں گی اس لیے جارہا ہوں۔“

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انسان اپنے خیال اپنے نظریے اور اپنے عقیدے کے مطابق جس بات سے چپک جاتا ہے، اس سے آخری دم تک الگ نہیں ہوتا۔ لارا کا عقیدہ تھا کہ شیطان سب سے زیادہ قوی ہے اور اس پر مہربان ہے۔ اس نے اسے غائب ہونے اور خیال خوانی کی صلاحیتیں دی ہیں۔ مراد جیسے ناقابل شکست انسان سے نجات دلائی ہے۔ اس شیطان نے اس کے بیٹے کو اب تک اس کے باپ سے دور رکھا ہے۔

لارا اپنے حالات کے مطابق موجودہ نقصانات اٹھا رہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ شیطان جلد ہی پھر کوئی بن زیان اس کے لیے بھیج دے گا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق تاریک دنیا کے معبد میں شیطان کے مجسمے کے سامنے آگئی۔ اس کے سامنے سجدہ کرتے کرتے اوندھے منہ لیٹ گئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہاں کا بن اور ٹیلی بیجی جانے والوں کے علاوہ بے شمار شیطان کے پجاری موجود تھے۔ وہ روٹی اور گڑ گڑائی ہوئی اپنی روداد بیان کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ آئندہ پرنس عابی کے خوف سے بن زیان ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ مسلمانوں کے مخالفین جو اب تک مراد اور عابی کے خلاف ان کا ساتھ دیتے آ رہے تھے، وہ سب ہم گئے ہیں۔

اس نے فون کے ذریعے عابی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے حکم کے مطابق شیطانی ٹیلی بیجی جانے والوں سے دوستی اور اتحاد ختم کر رہا ہوں۔ میں اور میری تنظیم کے تمام شاطر بھی ان سے فون پر بھی گفتگو نہیں کریں گے۔ اگر ٹیلی بیجی کے ذریعے بغیر رابطہ رکھنا چاہیں گے تو ماروی سے ان کا فراڈ چھپا نہیں رہے گا۔ مختصر یہ کہ میں کسی پہلو سے تمہیں دھوکا نہیں دے سکوں گا۔ پلیز مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں جزیرے سے باہر آنا چاہتا ہوں۔“

عابی نے کہا۔ ”جب یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ کسی پہلو سے بھی مجھے دھوکا نہیں دے سکو گے تو میں تمہاری دشمنی کو نظر انداز کرتا ہوں۔ جب تک ان ٹیلی بیجی جانے والوں کی دوستی کو بھولتے رہو گے، تب تک میں تم سے دشمنی کو بھولتا رہوں گا۔“

عابی نے فون بند کر دیا۔ لارا نے پوچھا۔ ”کیا وہ تم پر بھروسہ کرے گا؟ دشمنی بھول جائے گا؟“

”ہاں۔ مجھے سلامتی مل گئی ہے۔ پلیز ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر یہاں سے جاؤ۔ ایک لفظ نہ بولو۔ فوراً جاؤ۔“

اس نے پلکیں جھپکائیں پھر دوسری سانس میں اپنی رہائش گاہ کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔ ان لمحات میں وہ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہو گئی تھی۔

بن زیان جیسا شاطر ساتھی جس نے اسے مراد سے نجات دلائی تھی اور بڑی مکاری سے بیٹے کو ماں کی ہی آغوش میں رہنے دیا تھا، جادوگروں کے مقابلے میں بھی اس کا ساتھ دیتا رہا تھا، آج وہ ہمیشہ کے لیے بکھڑ گیا تھا۔

اور تو اور جس بیٹے کو مکاری سے حاصل کیا تھا، اسے ماروی نے چھین لیا تھا۔ وہ صرف بیٹے کے رشتے سے ماں کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ الفاظ دیگر بیٹے کا بھی کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اپنے مسلمان باپ، بھائی اور بہن کے خلاف کبھی ماں کے شیطانی ارادوں کو پورا نہ کرتا۔

اس نے بیٹے کے دماغ میں آ کر کہا۔ ”کہاں ہو؟“

میں آدمی مرہنگی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئی ہوں۔ عابی نے بن زیان کو بھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ تم بھی رسی طور پر بیٹے کا رشتہ ناپنے چلے آتے ہو پھر چلے جاتے ہو۔ تم

موسم سرما کے سنہرے، روپے شب و روز کو پُر لطف بناتا پاکیزہ دسمبر 2016ء کا شمارہ



پاکیزہ

انجم انصار اور رفعت سراج نے ہاش ناموں کی پُر لطف اقسام

سحر ساجد کی اچھوتی تحریر من جانبازم کی اعلیٰ قلم

سیمارضاردا نے غمoli پتھر میں اپنے خوب صورتی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں

اللہ تعالیٰ پر عمل توکل و یقین کی پُر حیرت داستان میمونہ صدف کے قلم سے

نگہت سیماس نے لپے پ اماقات کا مزید احوال جانیں وہ آنے بزم میں

کسبِ حلال پر اضر شجاعت کا ایمان افرام مضمون

نفسہ سعید اور رفاقت جاوید کی نمونہ سی تحریریں

شائستہ زریں نے لی بھر پور

میزبانی وہ بھی معروف فی وی اسٹر حنا نقوی کی

پاکیزہ کے مہمان میں

اس کے علاوہ

فرحین اظفر، سلمیٰ غزل، بشریٰ ماہا، نور عین، سنبل،

تنزیلہ زاہرہ افضل، دیگر معروف قلم کاروں کی حسین تحریریں

دوستوں! یہ سب متنوع مضامین و شاعری معروف قلم کاروں کی اعلیٰ ذوق کی علامت ہے

خادمہ لیلیٰ کے پاس گئی پھر واپس آ کر بولی۔ ”آپ چھتری کھول کر بیٹھے ہیں اور آسمان نے برسنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ میاں بیوی تو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر رہے ہیں۔“

وہ غصے سے اچھل پڑا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟ شادی سے پہلے لیلیٰ کو پیش آنے والی باتیں بتادی تھیں۔ وہ میرے لیے عالی جیسا عجیب و غریب نواسہ پیدا کرے گی۔ صرف وہی نہیں، اس کے بعد مزید چھ بیٹیاں بھی چھ عجیب و غریب نواسوں کو جنم دیں گی۔ ان کے ذریعے پوری دنیا میں میری حکمرانی قائم رہے گی۔ کہاں ہے لیلیٰ؟“

وہ براہ راست بیٹی سے خاندانی منصوبہ بندی والی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے کہا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا تم میرے لیے ایک نواسے کو جنم نہیں دو گی؟“

اس نے کہا۔ ”آپ کے علم نجوم کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ جب یہ قدر میں لکھا ہے اور آپ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر اولاد ہوگی۔ لیکن آپ عالی کی شادی اور ازدواجی زندگی کی پوری ہسٹری پر نظر ڈالیں۔ اس کی پہلی بیوی سہاگ کی بیچ پر یکخت مر گئی تھی۔ میڈیکل رپورٹ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ آئندہ جو بیوی بن کر آئے گی وہ ماری جائے گی۔ لیکن دوسری بیوی زندہ رہی۔ اس نے ازدواجی سرگرمیاں حاصل کیں کیونکہ اس نے خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق عمل کیا تھا۔ میں بھی اس کے مطابق عمل نہیں کروں گی تو اس کی پہلی بیوی کی طرح ماری جاؤں گی۔“

”میرا علم کہتا ہے تم نہیں مرو گی۔ باپ کو دھوکا نہ دو۔ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کرو۔“

”آپ کی پیش گوئی اگرچہ صحیح ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی کوئی پیش گوئی کسی پہلو سے کمزور ہو جاتی ہے۔ آپ خود نہیں جانتے کہ آپ کے علم کی کون سی کمزوری میری جان لے لے گی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کی غلطی نہیں کروں گی۔“

دونوں باپ بیٹی میں ٹھن گئی۔ درویش پوری دنیا پر حکمرانی کرنے اور ہمیش و عشرت سے بھرپور زندگی گزارنے کے بڑے جذباتی اور دلچسپ خواب دیکھتا آیا تھا۔ وہ اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے نقصان کی کبھی پروا نہیں کرتا تھا۔

اس نے لیلیٰ سے کہا۔ ”جو کہتا ہوں، وہ کرو۔ اگر جلد

پھر یہ کہ اس کے بیٹے دانش کو اس سے چھین لیا گیا ہے۔ انہوں نے زومبی گانا سے اس کی عزت و آبرو بچا کر اس پر مہربانی کی ہے لیکن بیٹے کو شیطان سے دور کر دیا ہے۔ پرنس عالی کی وہشت ایسی طاری ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے ممالک کے حکمران بھی ان ٹیلی بیٹھی جاننے والوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔

وہ بولتی رہی دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ پھر کاہن نے کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ اٹھو اور آنسو پونچھ لو ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ مجھے آگئی ملی ہے شیطان معظم نے مراد، عالی اور ماروی کے زوال کا وقت مقرر کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ بازی پلٹنے والی ہے۔ اس دنیا میں کبھی کسی کو دائم اور قائم رہنے والی قوت نہیں ملی۔ عالی کی قوت بھی قائم نہیں رہے گی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھنے والا ہے۔“

وہ انسانی زندگی کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ازل سے دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ مسلمان ہو یا کافر، اسے زوال کے بعد عروج حاصل ہوتا ہے پھر عروج کے بعد زوال سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کاہن کو آگئی ملی تھی، نہ ملتی تب بھی عالی ایک انسان تھا۔ اسے بھی کامیابیوں کے بعد ناکامیوں سے گزرنا ہی تھا۔ ایسا وقت سب پر آتا ہے۔ اس پر بھی آنے والا تھا۔

☆☆☆

وہ لیلیٰ کے ساتھ بہت ہی پرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ دشمنوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ مختلف ہتھکنڈوں سے نقصان پہنچانے والے فی الحال ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ایسی خوشحالی کے باوجود اس کا سر درویش نجومی پریشان ہو رہا تھا۔ اس کے علم کے مطابق بیٹی کو جلد ہی ماں بننے کی خوشخبری سنانا تھی اور وہ نہیں سن رہی تھی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ درویش نے گھر کی بوڑھی خادمہ سے کہا۔ ”لیلیٰ سے پوچھو۔ اتنے دن ہو گئے، وہ ماں کیوں نہیں بن پارہی ہے۔“

بوڑھی خادمہ نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کبھی مہینوں اور کبھی برسوں گزر جاتے ہیں اور عورت کے پاؤں بھاری نہیں ہوتے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”مجھ سے بحث نہ کرو۔ جاؤ اس سے پوچھو۔ وہ ماں کیوں نہیں بن رہی ہے؟“

لیکن ایک برس گزر گیا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ لیلیٰ کمزور ہو گئی۔ بیمار رہنے لگی۔ دوسرے برس کے اختتام پر اس کی زندگی کا اختتام ہو گیا۔

یہ خیال آرائیاں ہونے لگیں کہ کوئی لڑکی پرنس کی بیوی بن کر زیادہ دنوں تک جی نہیں پاتی۔ اکثر خیال آرائی کرنے والے کے دلوں کو یہ بات لگ رہی تھی۔ وہ دعوے سے کہہ رہے تھے کہ آئندہ بھی دیکھ لیتا، جو لڑکی عالی کی زندگی میں دلہن بن کر آئے گی وہ موت کی سچ پر سونے کے لیے ہی آئے گی۔

عالی کا حال بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔ اب وہ ایک شریک حیات کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے لیلیٰ کی وفات کے چالیس دن بعد پھر ایک لڑکی سے نکاح پڑھ لیا لیکن مزاج میں اور جذبات میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ پہلے جیسا عالی نہیں رہا تھا۔ اس کی طلب میں شدت آ گئی تھی۔ ایک شریک حیات ناکافی ہو گئی تھی۔

اس نے دوسری شادی کی پھر تیسری کی پھر چوتھی بھی لے آئی۔ یوں ذہنی طور پر وہ پرسکون اور آسودہ رہنے لگا۔

وقت گزر رہا تھا اور دنیا دیکھ رہی تھی۔ یہ خیال درست ہو رہا تھا کہ اس کی کوئی بیوی برس ڈیڑھ برس سے زیادہ سہاگن کی سرستیں حاصل نہیں کرتی تھی۔ بیمار اور کمزور ہو کر وفات پا جاتی تھی۔

تب اس کے ضمیر نے پوچھا۔ ”وہ کب تک شادیاں کرتا رہے گا اور اپنی شریک حیات بننے والیوں کو قتل کرتا رہے گا؟“

لیلیٰ کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں سات عدد شریک حیات اسے گلے لگا کر موت کو گلے لگا چکی تھیں۔ یہ سب نے مان لیا تھا۔ وہ خود مان رہا تھا کہ اس سے ازدواجی سرستیں حاصل کرنے والیاں رفتہ رفتہ بیمار اور کمزور ہو کر اپنی جان سے جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد وہ جان بوجھ کر عورتوں کو اپنے حرم میں لا کر انہیں موت کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ کنواری لڑکیوں کا قاتل ہے، انہیں سہاگن بنا کر مار ڈالتا ہے۔ اسے شادی نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی نہیں کرنا چاہیے اور لڑکیاں بھی دیوانی ہیں۔ اس قاتل کی سچ پر جانے کے لیے موت سے ڈرنا بھول جاتی ہیں۔

ہی ماں بننے کی خوش خبری نہیں سناؤ گی تو تمہاری زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے۔ تم کسی دن بھی اچانک ہی ابدی نیند سو جاؤ گی۔“

یہ دھمکی نہیں تھی۔ ارادہ خطرناک تھا۔ جو بیٹی کام آنے والی نہیں تھی، اس غلطی کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ کیا عالی اس کی دوسری بیٹی سے شادی کر کے اس کی پیش گوئی کو درست ثابت کرتا؟

وہ تو کبھی اس کی دوسری بیٹی سے شادی نہ کرتا۔ اس نے فون کے ذریعے عالی سے کہا۔ ”تم میرے علم نجوم کے خلاف عمل کر رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”تمہاری بیٹی کی سلامتی اسی میں ہے۔“

”میری بات کا یقین کرو۔ لیلیٰ جان سے نہیں جائے گی۔ وہ ایک بیٹے کی ماں ضرور بنے گی۔“

”میں اپنی پہلی بیوی سے اب تک ذاتی تجربات سے گزر رہا ہوں۔ لیلیٰ کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق زندگی گزارتی رہے۔ بس اور زیادہ بے حیائی کی باتیں مجھ سے نہ کرو۔“

عالی نے فون بند کر دیا۔ وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔ غصے سے چیخنے لگا۔ وہ کوئی عام سا مادہ ہوتا تو اسے اپنے قدموں میں لا کر اپنی بات منوالیتا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے خلاف کسی طرح کی سازش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن ماروی سے نہ کوئی دشمن چھپ سکتا ہے، نہ اس کی کوئی سازش چھپ سکتی ہے۔

اس نے عالی کا زانچہ درست بنایا تھا۔ اسے عالی کے سات عجیب و غریب نواسے حاصل ہو سکتے تھے لیکن زانچے اور پیش گوئی میں ایک خامی رہ گئی تھی۔ درویش کو یہ تو معلوم تھا کہ پرنس غیر معمولی جسمانی قوتوں کا حامل ہے لیکن یہ پہلو نظر انداز ہو گیا تھا کہ ازدواجی سرستیں حاصل کرنے کے دوران یہی قوت کسی بھی بیوی کے لیے قاتل بن جایا کرے گی۔

بہر حال درویش سے غلطی ہو گئی تھی۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، اسے ناکام و نامراد رہنا تھا۔

وقت خاموشی سے گزرنے لگا۔ کہتے ہیں سمندر کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ بھی اچانک ہی توقع کے خلاف کوئی طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔

اعتراض نہ ہوگا۔

ایک خاتون سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے شریک حیات کی فہرست سے نکل گئی۔ دو خواتین اپنا مذہب چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اس لیے وہ بھی فہرست سے خارج ہو گئیں۔ صرف چار رہ گئیں۔

ایک خاتون مسلمان تھی۔ پہلے اسی سے نکاح پڑھایا گیا۔ پچھلی تمام بیویاں وفات پا چکی تھیں۔ اب ایک شہ زور آئی تھی۔ لاکھوں، کروڑوں افراد تجسس میں مبتلا تھے۔ عالی نے کہا تھا کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے کسی اصول پر عمل نہیں کریں گے۔ جلد ہی صاحب اولاد کہلائیں گے۔

دوسرے دن سب حیران ہوئے۔ عالی کے محل سے کوئی ماتی خبر نشر نہیں ہوئی۔ اس شریک حیات نصیبہ خاتون نے ثابت کر دیا کہ اللہ کسی کو تنہا اور لاشریک نہیں رہنے دیتا۔ نصیبہ خاتون اس کی کامیاب شریک حیات ثابت ہو رہی تھی۔

دوست اور دشمن خطر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آئندہ چند دنوں میں کس طرح کا متغی رد عمل سامنے آئے گا۔ نصیبہ بیمار ہوگی یا رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جائے گی۔

لیکن ان میاں بیوی نے احتیاطی تدابیر یہ اختیار کی کہ عالی نے ایک ماہ بعد ہی دوسری شادی کی پھر دو ماہ بعد تیسری بھی کر لی۔ فہرست کے مطابق ایک رہ گئی تھی۔ وہ بھی کیوں رہتی۔ وہ چھ ماہ بعد چار بیویوں کا خاوند بن گیا۔ یوں اس کی قوتیں تقسیم ہو گئیں۔ وہ ایک بار پھر مکمل اطمینان اور آسودگی سے دن گزارنے لگا۔

یہ بات حیران کن تھی کہ دشمن بھی بڑے اطمینان اور آسودگی سے اپنے اپنے معاملات میں یوں مصروف تھے جیسے دشمنی بھول گئے ہوں۔ وہ عالی کے کسی معاملے سے دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔

کیا دشمن ایسے نیک اور صالح ہوتے ہیں؟

☆☆☆

تاریک دنیا کے تین ہی ٹیلی پیٹھی جاننے والے تھے۔ ان کے حالات اچانک بدل گئے تھے۔ وہ خیال خوانی کرنا بھول گئے تھے۔ اپنے دشمن مراد، عالی اور ماروی کو بھول گئے تھے۔ جبکہ وہ کبھی انہیں بھول نہیں سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔

شیطان نے عالی کو سمجھایا۔ کسی کے ساتھ مسلسل راتیں گزارو گے تو تمہاری قوت اسے اندر سے کھوکھلا کر دے گی۔ اس کے ساتھ ایک رات گزارو پھر اسے چھوڑ دو، کسی دوسری کو پکڑو۔ اس طرح وہ آنے والیاں سلامت رہیں گی اور تم بھی قاتل نہیں کہلاؤ گے۔ لڑکیوں کی سلامتی اور تمہاری نیک نامی کا یہی ایک راستہ ہے اور یہ راستہ دینی احکامات کے خلاف تھا۔

شیطان کے راستے پر چلتے رہنے سے لڑکیوں کی سلامتی تھی پھر عالی کسی کا قاتل نہ کہلاتا۔ ہاں مگر گناہ گار کہلاتا۔ دین ایمان سے جاتا۔ اس نے کہا۔ ”فی الحال میں شادیاں نہیں کروں گا، یہ آزمائشوں کا کہ کتنی مدت تک ایک شریک حیات کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ اللہ نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ انسان ہوں، حیوان ہوں یا حشرات الارض ہوں..... مجھے یقین ہے کہ میرے معبود نے میری جسمانی قوتوں کو برداشت کرنے والی عورتیں ضرور پیدا کی ہوں گی۔ وہ بھی میری طرح غیر معمولی قوتوں کی حامل ہوں گی۔“

مراد اپنے بیٹے کے موجودہ حالات سے پریشان تھا۔ اس نے تمام پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کہا۔ ”ہماری دنیا میں بے شمار جنگجو اور کشتیاں لڑنے والی خواتین ہیں۔ ان میں کئی غیر معمولی قوتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی خواتین کا رشتہ طلب کر رہا ہوں۔ وہ مجھ سے یا عابد علی سنگی سے براہ راست گفتگو کر سکتی ہیں۔ ان خواتین کو ترجیح دی جائے گی جو حیرت انگیز جسمانی قوتوں کی حامل ہوں گی۔“

بے شک صرف اللہ تعالیٰ ہی ایک ہے اور تنہا رہنے والا ہے اور لاشریک ہے، باقی کوئی تنہا نہیں رہ سکتا۔ لاشریک نہیں کہلا سکتا اس لیے شریک حیات بننے کے لیے عورت لازمی ہے۔

ایسی لازمی خواتین درجنوں نکل آئیں جو جسمانی طور پر حیرت انگیز قوتوں کی حامل تھیں۔ انہوں نے عالی سے رابطہ کیا۔ پہلے فون کے ذریعے ان سے باری باری گفتگو ہوئی۔ ان میں سے کئی نااہل تھیں۔

صرف سات خواتین نے خود کو اہل ثابت کیا۔ عالی نے شرائط پیش کیں کہ جو بھی منکوحہ بنے گی، وہ پہلے دین اسلام قبول کرے گی۔ دوسری شرط یہ پیش کی کہ وہ حسب ضرورت ایک کے بعد دوسری شادی کرے گا۔ اس پر کسی کو

وہ آگئی۔ لارا کے خیالات پڑھنے لگی پھر بولی۔ ”یہ کوئی شیطانی چال ہے۔ اسے سمجھنا ہوگا۔“
وہ کاہن کے دماغ میں پہنچ کر بولی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ لارا کا دماغ کیوں پھر گیا ہے؟ وہ بیٹھے بٹھائے خود کو کیسے بھول گئی ہے؟“

کاہن نے کہا۔ ”شیطان نے صرف لارا کے ہی نہیں آئینوں اور طاغوتا کے دماغوں کو بھی واش کر دیا ہے۔“
”کیا ان تینوں پر شیطان نے تو یہی عمل کیا ہے؟“
”ہاں، یہی سمجھو۔“

دانش نے کہا۔ ”بکو اس نہ کرو۔ شیطان کبھی کسی کے سامنے نہیں آتا۔“

”وہ ایک عامل کے بجائے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے ہی پرستاروں کی صلاحیتیں اور قوتیں چھین لی ہیں۔ کوئی اپنے پیروں پر کھلاڑی نہیں مارتا۔ شیطان نے ماری ہے۔ وہ بڑا شاطر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“

دانش نے کہا۔ ”تمہارے شیطان کی ایسی کی تھیں..... ہم ابھی تو یہی عمل کا توڑ کریں گے۔ میں اپنی مام کی یادداشت واپس لاؤں گا۔“

اس نے ماروی کے ساتھ خیال خوانی کی پرواز کی۔ لارا کے دماغ میں پہنچنا چاہا تو وہ لاکھ ہو چکا تھا۔ ان کی سوچ کی لہریں واپس آ گئیں۔ وہ بہن بھائی ریاست کی یونیورسٹی کی رہائش گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماروی زیر لب کچھ پڑھتی رہی پھر اس نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ اپنی روحانی صلاحیتوں کو طرح طرح سے آزمایا۔ آخر واپس آ کر سر جھکا کر بولی۔ ”اللہ کو منظور نہیں ہے۔ ہم شیطانی عمل کو توڑ نہیں سکیں گے۔“

”آہی.....! ٹیلی پتھی ان کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ شیطان نے اسے ہی ان کے دماغوں سے واش کر دیا ہے۔ وہ ہمارے خلاف ایسی چال چل رہا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہم بھائی جان (عابی) کے آس پاس رہنے والوں کے دماغوں میں جاتے آتے رہتے ہیں۔ کوئی کبھی ٹیلی پتھی جاننے والا کسی کو آلہ کار بنا کر بھائی جان کے قریب نہیں جاسکے گا۔ ہم ہمیشہ محتاط رہتے ہیں۔ آؤ

شیطان کی عبادت گاہ میں، اس کے مجسمے کے سامنے لارا، آئینوں اور طاغوتا پر زبردست توہمی عمل کیا گیا تھا۔ اس عمل کے نتیجے میں وہ تینوں ایک نامعلوم عامل کے زیر اثر آ گئے تھے۔

جب تک وہ عامل اجازت نہ دیتا وہ خود کو نہ پہچانتے۔ جب تک وہ حکم نہ دیتا وہ خیال خوانی نہ کرتے۔

وہ پراسرار عامل شیطان ہی ہوگا یا اس کا بہت ہی... خطرناک چیلہ ہوگا۔ اب تک مسلسل شکست کھاتے رہنے کے باعث شیطان شاید خود میدان جنگ میں آنے پر مجبور ہو گیا ہوگا۔

بہر حال اس پراسرار عامل نے اپنے ہی ٹیلی پتھی جاننے والوں کو کسی زبردست منصوبے کے تحت عارضی طور پر ناکارہ بنا دیا تھا اور انہیں شیطان کی ہی عبادت گاہ میں ایسا بنایا گیا تھا۔

دانش اپنی ماں سے ملنے آیا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ تاریک دنیا میں کیوں آئی ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ یہاں نہیں آیا کروں گا۔“

اس نے چونک کر سر گھما کر بیٹے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ میری اجازت کے بغیر کمرے میں کیوں آئے ہو؟“

اس نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔ وہ ناگواری سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ سختی سے بولی۔ ”کون ہو تم.....؟“

وہ تعجب سے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”مام! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ بیٹے کو نہیں پہچان رہی ہیں؟“
”بکو اس مت کرو۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔“

دانش فوراً ہی خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس کے خیالات کہنے لگے کہ وہ لارا ہے۔ شیطان کی ہجارت ہے۔ اس کا کوئی شوہر کوئی بچہ نہیں ہے۔ وہ اپنی تاریک دنیا میں بہت عیش و آرام سے ہے۔ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔

دانش نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ کسی نے آپ پر توہمی عمل کیا ہے۔ آپ کا برین واش کیا ہے۔ آپ کے دماغ سے پچھلی تمام زندگی کی یادیں مٹا دی ہیں۔“

اس نے ماروی کو آواز دی۔ ”آہی! فوراً آئیں.....“

ایسی شکست نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پہلے کبھی اسپتال کا راستہ اور کسی ڈاکٹر کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلی بار دنیا کے چار مشہور و معروف ڈاکٹروں کو طلب کیا۔ انہیں اپنے حالات بتائے۔ ان تجربہ کار ڈاکٹروں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ لیبارٹری سے تمام ضروری ٹیسٹ کرائے پھر رپورٹ سامنے آئی۔ اس کے خون میں ایسی مضر رساں دوا کے اثرات پائے گئے جو آہستہ آہستہ گوشت کو گھاتی رہتی ہیں۔

مراد اپنے بیٹے کی یہ رپورٹ سنتے ہی لرز گیا۔ تمام دنیا پر چھا جانے والا بیٹا جسے تیر تلوار اور بندوق کی گولیاں بھی نہیں مار سکتی تھیں، اس کا قاتل شکست شدہ زور کا گوشت اندر ہی اندر گل رہا تھا۔

مرنے کے بعد قبر میں کیڑے کھاتے ہیں۔ یہاں زندگی میں شیطان اس کا گوشت نوچ رہا تھا۔ کسی خطرناک پسلو پوائزن کے ذریعے پہاڑ جیسے جسم کی دیوار سے گوشت کو کھرچ رہا تھا۔

کون ایسا شاطر تھا؟ شیطان براہ راست کچھ نہیں کرتا، کراتا ہے۔ اس نے کسے آواز کار بنایا ہے؟ وہ آواز کار کس طرح ایک پہاڑ کے اندر سرنگ بنا کر دوا میں پہنچا رہا ہے؟

اور وہ ایسی سست رفتار دوا میں کس سات برسوں میں اس کے مجموعی نتائج ظاہر ہو رہے تھے۔ دشمن سات سالہ منصوبوں پر بڑے صبر و استقامت سے گپت مار رہا تھا۔ آ رہے تھے۔ ان کی طویل خاموشی اب سمجھ میں آرہی تھی۔

ماروی اور دانش بڑی برق رفتاری سے محل کے کچن والوں کے دماغوں میں جانے لگے۔ ان جاں نثاروں کے بھی چور خیالات پڑھے جو کچن میں سکیورٹی کے ذمے دار تھے۔ وہ جانے انجانے میں کسی بھی دشمن ٹیلی فنی جاننے والے کے زیر اثر نہیں آئے تھے۔ کوئی دشمن کھانے پینے کی چیزوں تک ان کے ذریعے نہیں پہنچا تھا۔

انہوں نے عالی کی چاروں شریک حیات کے خیالات پڑھے وہ اس معاملے میں معصوم تھیں۔ کسی شک و شبہ کے بغیر عالی کی وقادار تھیں۔ اگر کبھی انجانے میں کسی ٹیلی فنی جاننے والے کے زیر اثر آجائیں تو ماروی اور دانش کو بعد میں بھی ان کے چور خیالات سے حقیقت معلوم ہو جاتی۔

وہ بہن بھائی عالی کے محل میں آگئے۔ وہاں زبردست حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ دونوں پھر ایک بار ان کا اچھی طرح جائزہ لینے لگے۔ بے شک تمام جاں نثار عالی کے اطراف لوہے کی دیوار بن کر رہتے تھے۔

وہ دونوں خیال خوانی کے ذریعے وہاں کے ایک ایک فرد کے چور خیالات پڑھتے رہے۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ شیطان نے واقعی ان تینوں ٹیلی فنی جاننے والوں کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ عالی کے آس پاس اور محل کے اندر اور باہر کوئی خیال خوانی کرنے والا نہیں آتا تھا۔

عالی ٹیلی فنی کے پہلو سے پوری طرح محفوظ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب پہلی شدہ زور خاتون نصیب اس کی شریک حیات بن کر آئی تھی۔ ماروی اور دانش نے نصیب اور اس کے تمام رشتے داروں کے خیالات پڑھے تھے۔ ان میں سے کوئی عالی کے دشمنوں سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ نصیب بے شک وقادار اور خدمت گزار بیوی تھی۔

پھر وقت گزرنے لگا۔ عالی نے ایک کے بعد دوسری تیسری پھر چوتھی شادی کی۔ ماروی اور دانش ان چاروں کے دماغوں میں جاتے آتے رہتے تھے۔ وہ سب ہی شک و شبہ سے بالاتر تھیں اور بہت ہی مستند شریک حیات تھیں۔

یوں سات برس گزر گئے۔ دانش پندرہ برس کا ہو گیا۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف آنے لگا۔ وہ ماں کے لیے پریشان تھا۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی وہ ٹیلی فنی سے محروم تھی۔ اپنے آپ کو بھولی ہوئی تھی۔ بیٹے کو نہیں پہچانتی تھی۔

وہ تینوں ٹیلی فنی جاننے والے برسوں سے ناکارہ تھے۔ تاریک دنیا سے باہر نہیں جاتے تھے۔ اس کے باوجود عالی کی شامت آچکی تھی۔

اب بھید کھلنے والا تھا۔ پچھلے سات برسوں میں وہ بہت ہی غیر محسوس طریقوں سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ابتدائی چند برسوں میں اسے محسوس نہیں ہوا تھا پھر معلوم ہونے لگا کہ وہ دوڑنے کے بعد ہانپنے لگا ہے جبکہ وہ تھکنا اور ہانپنا جانتا ہی نہ تھا۔

ایک بار اس نے دیوار پر گھونسا مارا تو تکلیف ہوئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو فولا دھتا۔ اسے ہتھکڑیاں

نہیں دے سکتے تھے کیونکہ پورے یقین کے ساتھ انہیں سات برسوں سے ناکارہ دیکھ رہے تھے۔

دنیا کے تمام جاسوس بھی عالی کے خلاف ہونے والی واردات کی تحقیقات کر رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس فولادی جسم کے اندر کس نے دوا پہنچائی ہے اور کیسے پہنچائی ہے؟ گھوم پھر کر یہی خیال قائم ہوتا تھا کہ یا تو جادو کے ذریعے ایسا کیا گیا ہے یا پھر بڑا ہی شاطرانہ ٹیلی میٹھی کا حربہ استعمال کیا گیا ہے۔

وہ گوشت گلانے والی دوا اسے رفتہ رفتہ کمزور کرتی جا رہی تھی۔ دنیا کے تمام تجربہ کار ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے۔ بڑے جی جان سے معرر سار دواؤں کا توڑ کر رہے تھے۔ بس اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس کے خون میں تیزابیت کم ہونے لگی تھی لیکن معرر سانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ختم ہونے میں برسوں لگنے والے تھے۔

وہ غیر معمولی قوت برداشت کا حامل تھا اس لیے زہریلی دواؤں کے اثرات کو جھیل رہا تھا۔ ایک بیمار کی طرح بستر پر نہیں تھا۔ ایک ہی سوال گردش کرتا تھا کہ کیا اس خطرناک دوا کا توڑ ہو جائے گا؟

دشمنوں کے دماغوں میں بھی تجسس بھرا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس کا کتنا گوشت گل چکا ہے؟ وہ کتنا کھوکھلا ہو چکا ہے؟ سب ہی جلد سے جلد اس کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم نے مشورہ دیا کہ اسے لندن سے نکل کر سویٹزر لینڈ کے صحت افزا مقام میں رہنا چاہیے وہاں اس کا علاج ہوتا رہے گا۔

وہ بھی جگہ تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میونخ کے ایک بڑے اسپتال کے ایک بڑے حصے کو ریزرو کر لیا گیا۔ تمام حفاظتی انتظامات کے بعد عالی اپنے شاہی طیارے کے ذریعے وہاں پہنچ گیا۔ خفیہ منصوبے کے مطابق دشمن ایک طویل عرصے کے بعد اس سے ٹکرانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

جب وہ طیارے سے اتر کر ایئر پورٹ کی عمارت میں آیا تو کسٹم والوں نے اس کے سامان کو چیکنگ کے لیے روک لیا۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ پوری دنیا کا شہنشاہ کہلا رہا تھا۔ کوئی اس کے کسی معاملے میں رکاوٹ بننے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پہلی بار چھ قوی اور قد آور ریسلرز اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

ایک افسر نے کہا۔ ”مسٹر عابد علی مگلی! آپ اپنا

بیدار رہتے ہیں کہ شیطان انسان کے اندر ہوتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا مگر اسے جو کرنا ہوتا ہے، اندر بیٹھ کر کرتا رہتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں اس کا ایک دست راست عذر باد مصروف عمل تھا۔

عذر باد نے سب سے پہلے لاراء، آبنوس اور طاغوتا کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ ماروی اور دانش پچھلے سات برسوں سے دن رات ان تینوں کے دماغوں میں جاتے آتے رہے تھے اور انہیں ناکارہ ہی پایا تھا۔

عذر باد نے ان بہن بھائی کو پوری طرح یقین دلایا تھا کہ وہ ناکارہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے عالی سے دشمنی نہیں کی ہے جبکہ وہی خیال خوانی کے ذریعے اس پہاڑ کو کھود رہے تھے۔ عذر باد یقین ضرورت کے وقت ان کے سامنے آکر چکی بجا کر کہتا۔ ”ویک اپ (جاگو)!“

اور وہ چونک جاتے تھے۔ اگر نیند میں ہوتے تو فوراً آنکھیں کھول دیتے۔ اگر جاگتے رہتے تو اپنے عامل کا حکم سنتے ہی خود فراموشی کے ظلم سے نکل آتے تھے۔

پھر عامل عذر باد کہتا کہ محل کے کچن میں باورچی گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کے دماغ کو گرفت میں لے کر اس دودھ میں دو املاؤں جیسے عالی صبح ناشتا کے وقت پینے والا ہے۔

لاراء حکم سن کر فوراً اس باورچی کے دماغ میں پہنچ جاتی۔ اسے نیند کی حالت میں ٹریپ کرتی۔ حکم دیتی۔ ”تم بدستور نیند میں رہو گے۔ آنکھیں کھول کر نیند کی حالت میں اس دوا کے پاس پہنچو گے جو تمہارے ٹوٹھ پیسٹ کے ٹیوب میں رکھی ہوئی ہے۔“

وہ باورچی اس کے احکامات کی تعمیل کرتا اور پھر واپس اپنے بیڈ پر آکر گہری نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ دوسری صبح آنکھ کھلنے کے بعد اسے یاد نہ رہتا کہ وہ پچھلی رات اپنے آقا عابد علی مگلی سے دشمنی کر چکا ہے۔

ایسے وقت لاراء بھی خیال خوانی سے محروم ہو جاتی تھی۔ یہ بھول جاتی تھی کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے؟ صرف ایک باورچی ہی ان کا آلہ کار نہیں تھا۔ عذر باد کچن کے اسٹاف میں سے کسی کو بھی حالات اور ضرورت کے مطابق استعمال کرتا تھا۔ وہ خود خیال خوانی کے ذریعے ایسا کر سکتا تھا لیکن فی الحال زبردست پلاننگ میں مصروف رہتا تھا۔ ان تینوں کو آئندہ بھی اپنے زیر اثر رکھنے والا تھا۔

وہ تینوں اپنے آپ کو بھول کر لاچار سے ہو گئے تھے۔ عذر باد کے رحم و کرم پر رہنے والے تھے۔ ویسے وہ مراد اور ماروی سے محفوظ تھے۔ وہ انہیں کسی طرح کا الزام

پاسپورٹ اور اہم کاغذات دکھائیں۔ قانونی اجازت نامے کے بغیر آپ کو یہاں کی زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے گا۔

وہ پہلی بار بڑی دلیری سے چیلنج کر رہے تھے۔ مراد، ماروی، عالی اور دانش اتنا تو سمجھ گئے کہ دشمن عالی کی شہزادی کو تاپنے اور تولنے کے لیے بے چین ہیں۔ انہیں اس حد تک اندازہ تھا کہ وہ پہلے کی طرح پوری فوج سے لڑنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اسی لیے وہ بڑی بے پالی سے اس کے مقابلے پر آگئے تھے اور عالی پچھلے دنوں سے کچھ زیادہ ہی کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دور چل کر تھک جاتا تھا۔ بیٹھ کر ہانپنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ دشمنوں کے درمیان آکر بیٹھ گیا تھا جبکہ اسے تن کر مخالفین کو متاؤز جواب دینا چاہیے تھا۔

اس نے چھ قد آور فائٹروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا رائیو نہ روکو۔ مجھے کمزور نہ سمجھو۔ میں ابھی اس انرپورٹ کو کھنڈر بنا سکتا ہوں۔ تم سب ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاؤ گے۔“ ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پہلے تم بولتے نہیں تھے، کر گزرتے تھے۔ اب کچھ کر نہیں سکتے۔ اس لیے دھمکیاں دے کر دھونس بھار رہے ہو۔“

دوسرے نے کہا۔ ”تم نے قانون کے خلاف ہماری زمین پر قدم رکھا ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔“ ایک افسر نے سپاہی کو علم دیا کہ وہ عالی کو تھکڑیاں پہنائے۔ وہ علم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھا تو عالی نے ایک اٹا ہاتھ اس کے منہ پر رید کیا۔ وہ مار لھا کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اسے کچھ زیادہ پوٹ نہیں لگی۔ اب سے پہلے اس کا ایک ہاتھ پڑتے ہی مقابل کا منہ ٹوٹ جاتا تھا۔

انہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ خطرناک مقابل نہیں رہا ہے۔ دور بٹلر نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ لیا۔ تیسرا بٹلر اب اسے تھکڑی لے کر اسے پہناتا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک بھونکا سا لگا۔ وہ نہیں مارتا وہ اچھل کر فرش پر گر پڑا۔

ماروی بھائی نے لیے ڈھال اور ہتھیار ہٹے آگئی تھی۔ اسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ انہوں نے عالی کو اطراف سے جکڑ رکھا تھا۔ ان کے دماغوں میں بھی زلزلے پیدا ہوئے۔ ان کی حالت دیکھ کر سب ہی ہم کر پیچھے چلے گئے۔ وہ بنیاد اور کمزور مقابل گرفت بن گیا تھا۔ اسے پڑنا تو آیا، پھو بھی نہیں ملنے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ عالی پہلے کی طرح تہا بہنگ لڑے گا۔

تو حرام موت مرے گا لیکن ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ناقابل شکست کہلانے والا اپنی جنگ آپ نہیں لڑ رہا تھا۔ اس کی بہن مقابلے پر آگئی تھی۔ وہ بہن کا ہی کسی محتاج ہو گیا تھا۔ دشمنوں کو ابھی ذرا شکست اور ناکامی ہوئی تھی۔ تاہم یہ دیکھ کر حوصلہ بڑھ گیا کہ عالی اب مرد میدان نہیں رہا ہے۔ ٹیلی پیشی کا محتاج ہو گیا ہے۔ خیال خوانی کا ہتھیار اگرچہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے لیکن وہ اس ہتھیار کا محتاج رہ کر پہلے کی طرح پوری دنیا کا بے تاج شہنشاہ نہیں کہلا سکے گا۔ اب دنیا کے ہر ملک میں اس کی طاقت کا سکہ چلنے والا نہیں تھا۔

ایسے وقت عذرباد نے سپر پاور اور اس کے اتحادیوں سے کہا۔ ”تم سب یہودی، عیسائی، ہندو، آتش پرست وغیرہ ہو اپنے گاؤں سے زیادہ شیطان کے وفادار اور تابعدار ہو۔ تم سب کو تابعداری کا سلسلہ رہا ہے۔ شیطان نے اس ناقابل شکست عالی کو نیم مردہ بنا دیا ہے۔ وہ میدان جنگ میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ابھی وہ ٹیلی پیشی کے سہارے کھڑا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو شیطان کے راستے پر چلے رہو۔ ان مسلمانوں کو بچانے کے منصوبوں پر عمل کرتے رہو۔ ہم ماروی کی ٹیلی پیشی کو تم پر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ ہم ٹیلی پیشی کا جواب ٹیلی پیشی سے دیں گے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”وہ تین ٹیلی پیشی جاننے والے پچھلے سات برس سے کہیں کم ہو گئے ہیں۔ شاید مر گئے ہیں۔ کیا شیطان ہمارے لیے خیال خوانی کرے گا؟“

عذرباد نے کہا۔ ”وہ تو کرتا ہی رہتا ہے۔ عورتوں مردوں، بچوں بوڑھوں کے دلوں اور دماغوں میں کھسار پتا ہے۔ وہ تمہاری مشکل آسان کرنے کے لیے کچھ بھی کرے گا ابھی کرے گا۔“

اس نے اسی وقت ملاخوتا کے سامنے آکر ٹپکلی بجائی۔ وہ روٹی کھا رہا تھا۔ اچانک ایسے چوٹک گیا جیسے خند سے ہڑبڑا کر جاگ گیا ہو۔ اسے یکذلت یاد آ گیا کہ وہ ملاخوتا ہے اور ٹیلی پیشی جانتا ہے۔

اسے اپنے عامل عذرباد کے اکامات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ فوراً ہی عالی کے کمزور دماغ میں پہنچ گیا۔ اس وقت عالی وہیں انرپورٹ میں تھا۔ دشمنوں سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھ سے دور رہو۔ ورنہ خیال خوانی کے بھٹکے لکھا کر مرتے رہو گے۔“

ان سب پر عالی کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ اسے تھکڑی پہنانے کی کوشش کرنے والے دماغی بھٹکے لکھا کر

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک لمحے نے اپنے کنجوس پڑوسی سے پوچھا۔
”ارے کیا ہو گیا..... اتنے لال پیلے کیوں ہو رہے
ہو؟“

کنجوس نے جواب دیا۔ ”میرے چھوٹے بیٹے
نے آج نیا جوتا پہنا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ایک
کے بجائے دو سیزھیاں طے کر کے اوپر جانا تا کہ جوتے
کا تھلا کم گھسے لیکن وہ کمبخت دو کے بجائے تین سیزھیاں
چڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پتلون پھٹ گئی۔“

گوہر نایاب

ہذا بخیل شخص کی دولت اس وقت زمین سے نکلتی
ہے جب وہ زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔
ہذا مجھے پتا چلا کہ محل کے گدوں اورنگی زمین پر
سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں تو مجھے خدا
کے انصاف پر یقین آ گیا۔
ہذا اعتماد و محبت کی پہلی سیزھی ہے۔
ہذا مرد کا امتحان عورت سے اور عورت کا رویتے
سے ہوتا ہے۔

ہذا پستی کو حقیر مت جانو، اس نے بلندی کا بوجھ
اٹھا رکھا ہے۔

ہذا وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ ہرگز
نہیں ملتا۔

ہذا برے دوستوں کی صحبت سے بچو کیونکہ بُرا
دوست اس کو نکلے کے مانند ہوتا ہے جو اگر گرم ہو تو ہاتھ
جلا دیتا ہے اور اگر ٹھنڈا ہو تو تب بھی ہاتھوں کو کالا کر دیتا
ہے۔

ہذا لوگ اونچے پہاڑوں سے نہیں اکثر چٹکتی مٹی
سے پھسل جاتے ہیں۔

سبق

ایک پنواری اپنی زمین کا معائنہ کرنے گیا۔
راتے میں کتوں نے گھیر لیا۔ اس نے بڑی مشکل سے
اپنی جان بچائی اور کچھ دور جا کر نہایت غصے سے بولا۔
”کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں تمہیں
سبق سکھا دیتا۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، نٹل ہزارہ

فرش پر تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی
ٹیلی فنی کی اذیت میں مبتلا نہیں ہوتا چاہتا تھا لیکن اچانک
ہی ان کی مشکل آسان ہو گئی۔

طاغوتا نے عالی کے اندر پہنچتے ہی زلزلہ پیدا کیا۔ یہ
اچانک ایسا حملہ تھا کہ عالی کے ہوش اڑ گئے۔ وہ حلق کے بل
چختا ہوا فرش پر گر کر مایہ بے آب کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔
اے ایسا لگ رہا تھا جیسے جان نکلی جا رہی ہے۔
یہ کیا ہو جاتا ہے؟ بد نصیبی کے ایک ہی جھٹکے سے پہاڑ
زمین بوس ہو جاتا ہے؟

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پوری دنیا میں ایک ہی
شہر زلزلہ لانے والا یوں خاک میں لوٹنے لگے گا۔ ان لمحات
میں ایسی دماغی اذیتیں پہنچ رہی تھیں کہ کلام پاک کی آیتیں
بھی ذہن سے نکل گئی تھیں۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ
ہوتا جا رہا تھا۔

ماروی تڑپ کر بلند آواز سے پڑھنے لگی۔ سات برس
گزر چکے تھے۔ یہ آٹھواں برس تھا۔ دشمن خیال خوانی کرنے
والے نابود رہے تھے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی وجود
میں نہیں آئیں گے۔ لیکن غضب ہو گیا۔ ان میں سے کوئی
اچانک زندہ ہو گیا تھا اور ایسا حملہ کر چکا تھا کہ عالی کو سنبھالنا
مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی حالت کہہ رہی تھی کہ اس پر دوسرا
حملہ ہوگا تو وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔
وہ بھائی کے دماغ پر روحانی ٹیلی فنی کے استحکام
کے ساتھ چھا گئی۔ اذیت ناک درد کی لہریں یکبارگی دھیمی
پڑتی چلی گئیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک آیت
پڑھنے لگا۔ ایسے وقت طاغوتا نے پھر حملہ کیا۔ اس بار ماروی
کی سوچ کی لہروں سے ٹکرا کر واپس چلا گیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھید کھل جائے۔ اس نے فوراً ہی اس
کے سامنے چٹکی بجا کر خود فراموشی کے اندھیرے میں پہنچا دیا۔
طاغوتا پھر غائب ہو گیا۔ اپنے آپ کو بھول گیا۔
ادھر دانش نے خیال خوانی کی چھلانگ لگائی تھی۔
عالی کے دماغ میں آنے والے کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن دیر
ہو چکی تھی۔ طاغوتا اس کی پہنچ سے دور چلا گیا تھا۔

اس نے کہا۔ ”آپنی! یہ کون ٹیلی فنی جانتے والا پیدا
ہو گیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”دانش! یہ شیطانی چال ہے۔ اپنی مام کی خبر
لو۔ وہ شاید پھر خیال خوانی کرنے لگی ہیں۔“

وہ فوراً ہی اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ لارائے اسے
اپنے اندر محسوس کرتے ہی کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تو پھر آ گیا

ہے۔ میرے سر میں بے چینی سی ہونے لگی ہے۔ کتنی بار سمجھاؤں کہ تیری ماں نہیں ہوں۔ آخر کب میرا پیچھا چھوڑے گا؟

”مام! آپ جھوٹ بولتی آرہی ہیں کہ خیال خوانی نہیں جانتی ہیں۔ ابھی آپ نے دشمنی کی ہے۔ بھائی جان کو دماغی تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ ذرا خاموش رہیں۔“

وہ ماں کو چپ رہنے کے لیے کہہ کر اس کے چور خیالات پڑھنے لگا۔ وہ ہز بڑا رہی تھی۔ ”جسہیں تھوڑی دیر کے لیے دماغ میں برداشت کر رہی ہوں۔ ابھی سانس روک کر بھگا دوں گی۔“

اس کے بھگانے سے پہلے ہی وہ ماروی کے پاس آکر بولا۔ ”مام نے خیال خوانی نہیں کی ہے۔ میں نے ان کے چور خیالات پڑھے ہیں۔ وہ واقعی برسوں سے خود کو بھولی ہوئی ہیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”تو پھر آبنوس یا طاغوتا نے ابھی دشمنی کی ہوگی۔ ہماری دنیا میں اور کوئی ٹیلی پتھی جاننے والا نہیں ہے۔ یہی تاریک دنیا میں شیطان کے چیلے ہیں۔ میں ان کے پاس جا رہی ہوں تم بھائی جان کے دماغ میں رہو۔ کسی بھی پرانی سوچ کی لہروں کو بھائی جان کے پاس نہ آنے دو۔ ان کی شیطانی چالبازی کا کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ آبنوس اور طاغوتا کے اندر گئی۔ ان کے چور خیالات کو اچھی طرح پڑھا۔ پھر مایوس ہو کر بھائی کے پاس آگئی۔ عالی کو اگرچہ آرام آگیا تھا تاہم اس کی حالت قابل رحم تھی۔ شدید کمزوری کے باعث اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ جاں باز فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے وہاں سے اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن مسلح فوجی انہیں روک رہے تھے۔ دونوں طرف سے بندوقیں تن گئی تھیں، فائرنگ کے تبادلے سے عالی کا بھلا نہ ہوتا۔ وہ کسی اسپتال یا ڈاکٹر تک پہنچ نہ پاتا۔ اس کی نقاہت کو جلد سے جلد دور کرنا اس کی توانائی کو بحال کرنا ضروری تھا۔

تب ماروی اور دانش فوجیوں کے اندر پہنچے اور دماغی زلزلے پیدا کرنے لگے۔ اعلیٰ افسران ذہنی اذیتیں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ علاج کے لیے عالی کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ماروی نے عذر باد کو جانتی تھی نہ اس کی چالبازی کو سمجھ پارہی تھی۔ عقل یہی کہہ رہی تھی کہ ٹیلی پتھی جاننے والے دشمن اور کہیں نہیں ہیں۔ اسی تاریک دنیا میں شاید دوسرے پیدا ہو گئے ہیں۔

وہ کاہن کے پاس آکر بولی۔ ”تم لوگوں کی چالبازی اب ہم سے چھپی نہیں رہے گی۔ تمہارے کسی عامل نے لارا، آبنوس اور طاغوتا کو بظاہر ناکارہ بنا رکھا ہے۔ تم لوگ تقریباً آٹھ برسوں سے ہمیں دھوکا دیتے آرہے ہو۔ شیطان رازداری سے بڑی کامیاب چال چل رہا تھا لیکن آج ایک ٹیلی پتھی جاننے والے نے بھائی جان کو دماغی تکلیف پہنچا کر سارا بھید کھول دیا ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم پچھلے آٹھ برسوں سے دشمنی بھول گئے ہیں۔ امن و امان سے رہتے آرہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے جب ہمارے پاس ٹیلی پتھی جاننے والے ہی نہیں رہے ہیں تو ہمیں اپنی دنیا میں امن و امان سے ہی رہنا ہوگا۔“

”باتیں نہ بناؤ۔ یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ تینوں ٹیلی پتھی جاننے والے بیک وقت ناکارہ ہو گئے ہیں۔ نہیں، انہیں ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ تم لوگ وقت ضرورت پھر انہیں کام میں لے آتے ہو۔“

عذر باد کاہن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ماروی سے بولا۔ ”میرا نام عذر باد ہے۔ میں اپنے شیطان معظم کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تمہارا بہت چرچا سنا ہے۔ آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ تم زبردست روحانی قوتوں کی حامل ہو۔ میں بھی تم سے کم نہیں ہوں۔ ٹیلی پتھی جانتا ہوں۔ ابھی میں نے ہی عالی کو دماغی جھٹکا پہنچایا تھا۔ وہ تین ٹیلی پتھی جاننے والے زیر و ہو چکے ہیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”جھوٹ بول رہے ہو۔ انہیں ہماری دشمنی اور انتقامی کارروائیوں سے بچائے رکھنے کے لیے برسوں سے یہ ڈراما چارہ ہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”جسہیں یقین نہیں ہے تو جاؤ۔ ان تینوں کو مار ڈالو۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمارا کھیل جاری رہے گا۔ تم کب تک بھائی کی حفاظت کرو گی۔ میں پھر کسی وقت اس پر حملہ کروں گا۔ کیا تم دن رات پہریدار بن کر اس کے اندر رہا کرو گی؟ یہ لکھ لو کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگر اس کا آخری وقت نہیں آیا ہے تو تم ان کی پرچمائیں تک بھی نہیں پہنچ سکو گے۔ تمہاری خیال خوانی کی لہریں میری روحانی قوتوں سے مات کھاتی رہیں گی۔“

وہ عالی کے پاس آگئی۔ ڈاکٹر اسے ایڈمٹ کر رہے تھے۔ اسے ذرا ہوش آگیا تھا لیکن وہ پوری طرح حواس میں نہیں تھا۔ اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ واقعی اس کا آخری

اس نے کہا۔ ”تم میں سے جتنے اہم حکمران، سیاست دان، فوجی افسران اور دیگر اہم شعبوں کے اہم عہدیداران ہیں، میں ان سب کے دماغوں کو مقتول کر دوں گا۔“

یہ سنتے ہی وہ سب خوشی سے اچھل پڑے، کہنے لگے۔ ”پھر تو ہم محفوظ رہیں گے۔ عابی کی طرح ماروی بھی ہمارے لیے بے ضرر ہو جائے گی، ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں آج ہی سے جادوئی عمل کے ذریعے تم سب کے دماغوں کو پتھر بنا دوں گا۔ ماروی کی خیال خوانی کی لہریں پتھروں سے ٹکرا کر واپس جایا کریں گی۔“

اس سے زیادہ مطمئن کرنے والی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ سپر پاور اور اتحادی ملکوں کے حکمران ایمان اور شیطان کے درمیان سینڈ وچ بننے والے نہیں تھے۔ ان کی جان و مال کو کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں تھا۔

عذر باد نے کہا۔ ”ہمارا ایک ہی مقصد رہا ہے۔ دین اسلام کو ختم کرنا یا دین داروں کو غلام بنا لینا۔ ہمیں اپنے مقاصد میں کبھی کامیابی ہوتی ہے، کبھی ناکامی لیکن اب ناکامی نہیں ہوگی۔“

آری کے ایک اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ”اب کیا کرو گے؟“

”اب مسلمانوں کو بھی مسلمانوں کا دشمن بناؤں گا۔ ویسے تو ان کے اندر سوطر کے فرتے ہیں۔ ان کے اندر فتنے اور فسادات پنپتے رہتے ہیں۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے اور کمزور بناتے رہتے ہیں۔ موجودہ پلاننگ کے مطابق تمام اسلامی ممالک کو پہلی بار مراد اور ماروی کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ جو مسلمان حکمران ہم سے تعاون کریں گے، ہم ان کے دماغوں کو بھی لاکڑ کر دیں گے، ماروی انہیں بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔“

یہ واقعی زبردست پلاننگ تھی۔ آئندہ صرف یہودی اور عیسائی ہی نہیں، مسلمان حکمران بھی مراد اور ماروی کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے والے تھے اور یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ باہر والوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا گھروالوں سے گھروالوں کو پہنچتا ہے۔

کچھ عرصے تک خیر و شر کے درمیان خاموشی رہی۔ ان کا ایک دوسرے سے کسی طرح کا رابطہ نہ رہا۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اپنے حالات کے مطابق منصوبے بنا رہے تھے۔ آدمی سکون سے رہنا نہیں چاہتا۔ ہنگامہ آرائی کے اسباب پیدا کرتا رہتا ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جو قوتیں دیتا ہے پھر ان قوتوں پر زوال لے آتا ہے۔ کسی فرعون کو تاحیات فرعون نہیں رہنے دیتا۔ کسی عابد علی منگی کو مسلسل شہ زوم نہیں رکھتا، تسلسل توڑ دیتا ہے۔ یہ دستور قدرتی ہے۔ خوشی کے بعد غم، مشکل کے بعد آسانی، جوانی کی شہ زوری کے بعد بڑھاپے کی کمزوری، یہ تمام عوامل ایک چرخے کی طرح گول گھومتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں۔

عابی پر بھی زوال آچکا تھا۔ مراد اسی دن بیٹے کے پاس آیا پھر اسے اپنے ساتھ ارض اسلام لے گیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے زیر علاج رکھنا چاہتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ عابی اب کسی ملک میں محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اب اسے اپنے ہی ملک، اپنے ہی محل میں باقی ماندہ سانس لینی تھیں۔ ماروی نے بھرپور روحانی صلاحیتوں سے اس کے دماغ کو مقتول کر دیا تھا۔ عذر باد اور تینوں ٹیلی پیٹھی جاننے والے بھی اس کے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ یوں عابد علی منگی کا باب ان کے لیے بند ہو چکا تھا۔ اب شیطان۔۔۔ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے دھرم کے لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے رہا تھا۔ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا۔ ”تم سب نے دیکھا ہے، عابی پوری دنیا پر چھا گیا تھا۔ تمہارے ملکوں کا حکمران بن کر تم سب کو کٹھ پتلی بنا چکا تھا۔ میں نے اس ناقابل شکست فولاد کو پھلکا کر پانی کر دیا ہے۔“

سپر پاور کے حکام اور ان کے اتحادیوں نے کہا۔ ”بے شک تم نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ ہم تمہاری عبادت تو نہیں کرتے لیکن تمہارے تابعدار رہیں گے۔ تم دن کو رات کہتے ہو، ہم بھی رات کہتے ہیں۔ جو چاہتے ہو ہم سے منواتے ہو۔ ہم مانتے ہیں۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”لیکن عابی کے بعد ماروی کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ وہ اپنی روحانی قوتوں کے باعث عابی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔“

عذر باد نے کہا۔ ”ہم عبادت گزاروں کی روحانی قوتوں سے نہ ڈرتے ہیں، نہ ان سے کمزور ہیں۔ ماروی دوسرے ضرور بنے گی لیکن ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ نمٹنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے تم سب کو ماروی کے حملوں سے بچائے رکھنا ہوگا۔“

ان سب نے فوراً کہا۔ ”بے شک ہم اس کی دشمنی سے محفوظ رہیں گے تو پوری آزادی سے کل کر شیطان کے کام آتے رہیں گے۔“

سپر پاور اور اس کے اتحادیوں نے اشتعال انگیزی شروع کی۔ انہوں نے ریڈیو، ٹی وی چینلز اور اخبارات کے ذریعے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ مراد، اس کی بیٹی اور بیٹے کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ روپوش رہ کر اچانک ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ہم اپنی ریاست ارض اسلام میں ہیں۔ اپنے گھر میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم چھپ رہے ہیں۔ امن و امان قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم لوگوں سے غیر ضروری تعلقات نہ رکھے جائیں۔ دور کی دوستی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ ہم یہاں اپنی اسلامی یونیورسٹی کی ترقی اور عروج کے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ آپ حضرات ہماری طرف سے کسی اندیشے میں نہ رہیں۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہم یہ اعلان کر رہے ہیں کہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک تمہاری ریاست ارض اسلام سے عارضی طور پر سیاسی تعلقات ختم کرنے والے ہیں۔ تمہاری ریاست کے کسی باشندے کو کسی ملک میں بھی جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا نہیں دیا جائے گا۔ تم بھی اپنی ٹیلی کے ساتھ ہمارے کسی ملک میں نہیں آ سکو گے۔“

”ایسا احمقانہ اعلان نہ کرو۔ ارض اسلام کے تقریباً چالیس ہزار باشندے مختلف بیرون ممالک میں ہیں۔ وہاں ہمارے سفیروں کو رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو ہم ان ملکوں میں اپنے لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کو کیسے حل کریں گے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہم اپنے ملک کے باشندوں کو تمہاری ریاست سے واپس بلا رہے ہیں۔ تم اپنے لوگوں کو بلاؤ۔“

”صرف انہیں بلانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ دنیا کے تمام ممالک میں لاکھوں مسلمان رہائش پذیر ہیں۔ وہ وہاں اسلام دشمن عناصر سے نمٹتے رہتے ہیں۔“

”یہ تمہارے مسائل ہیں تم سمجھو۔ ہمیں جو کہنا تھا کہہ چکے ہیں۔“

”تکبر سے باز آ جاؤ۔ یہ زمین ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی ہے۔ جہاں جہاں اذانیں گونجتی ہیں اور سجدے کیے جاتے ہیں، وہاں ہم ضرور پہنچتے رہتے ہیں۔ تم لوگ غلط اور عداوتی فیصلے بنا کر ہمیں مشتعل نہ کرو۔ امن و امان سے سفارتی تعلقات بحال رکھو گے تو سب کا بھلا ہوگا۔“

وہ فی الحال دوستانہ تعلقات قائم رکھنے سے انکار کر رہے تھے۔ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مراد اور ماروی مشتعل ہو کر ان کے خلاف کیا کریں گے۔ کیا شیطان واقعی انہیں

تحفظ فراہم کرتا رہے گا؟

انہوں نے آزمائش کے طور پر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اپنے کئی ملکوں میں اذان پر پابندی عائد کرنے لگے۔ حکم دیا کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان نہ دی جائے۔ اپنے دین کو اپنے گھر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر نہ لایا جائے۔

ایک موذن نے پابندی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے بدستور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان سنائی تو ایک پولیس افسر نے اسے گولی مار دی۔ وہاں کے مسلمان طیش میں آ گئے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پھیل گئی۔ اگرچہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینا اس ملک کے قانون کے خلاف تھا۔ تاہم یہ ایسا جرم نہیں تھا کہ موذن کو سزائے موت دی جاتی۔ اس ظلم کے خلاف کئی اسلامی ممالک میں جلوس نکالے جا رہے تھے۔ مراد نے اس ملک کے حکمرانوں سے کہا۔ ”یہ مذہبی جذبات کو چھیڑنے اور مسلمانوں کو طیش دلانے والی شیطانیت ہے۔ موذن کے قاتلوں کو فوراً سزائے موت دی جائے اور وہاں کے تمام مسلمانوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔“

جواباً کہا گیا۔ ”یہ ہمارے ملک کے معاملات ہیں۔ تم تمام مسلمان انتہا پسند، بد دماغ اور جذباتی ہو۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے بیٹے کی لاعلاج بیماریوں اور کمزوریوں نے تمہارے حوصلے بڑھا دیے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ اس کے بستر علالت پر رہنے سے ہم کمزور ہو گئے ہیں۔ ہم آج بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔“

حقارت سے کہا گیا۔ ”ہم دیکھیں گے کہ تم ہمارے ملک میں اپنی من مانی کیسے کرو گے؟ یہاں تمہیں پہلے کی طرح پھولوں کا بستر نہیں ملے گا۔“

”اچھا تو پھر انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ اشتعال انگیزی تمہیں کتنی مہنگی پڑنے والی ہے۔“

مراد نے ماروی سے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ یہ دشمن تمہاری ٹیلی پیٹھی سے اور روحانی قوتوں سے خوف زدہ کیوں نہیں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”بھائی جان انہیں جسمانی قوتوں سے زیر کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں لیکن وہ لوگ میری غیر معمولی قوتوں کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔ انہیں کچھ تو محتاط رہنا چاہیے۔ اپنے رویے میں کچھ تو چلک پیدا کرنی چاہیے۔“

”معلوم تو کرو کہ ان میں بلا کی بے باکی کیسے پیدا

پولیس فورس کے ایک افسر نے موذن کو ہلاک کیا تھا۔ ماروی اس افسر کے پاس پہنچ گئی لیکن اس کے دماغ میں نہ پہنچ سکی۔ اس نے فوراً ہی سانس روک لی تھی۔ یوں معلوم ہوا کہ اسے ٹیلی پتھی کے حملوں سے بچانے کے لیے اس کے دماغ کو لاکڈ کر دیا گیا ہے۔ یعنی وہ مراد اور ماروی کو مستقل کرنے، چیلنج کرنے سے پہلے وہاں حفاظتی تدابیر پر عمل کر چکے تھے۔

اس افسر نے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا: ”میں سمجھ گیا۔ یہ جو میرے دماغ میں آنا چاہتی ہے، یہ مراد کی بیٹی ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم شیطان کے چلے ہیں۔ اس نے ہم پر ایسا جادو کیا ہے کہ تم اپنی خیال خوانی سے بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکو گی۔“

دوسرے افسر نے خلا میں تکتے ہوئے کہا: ”ہائے ماروی! آؤ ہمیں بھی آزما لو۔“

اس نے دوسرے افسروں کے دماغوں میں جانا چاہا۔ ان سب کے دماغ بھی مقلد ہو چکے تھے۔ اس نے کئی چھوٹے بڑے حکام اور فوجی افسران کے اندر بھی جانا چاہا۔ اسے ناکامی اور مایوسی ہوتی رہی۔ جہاں تک شیطان کے تابعدار تھے، وہاں تک رکاوٹیں تھیں۔ وہ کسی کو اپنے زیر اثر نہیں لاسکتی تھی۔

انہوں نے اسکاٹپ کے ذریعے مراد کو اسکرین پر دیکھا پھر طنز یہ انداز میں کہا: ”تمہاری بیٹی ہمارے درمیان ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اسے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ آئندہ بھی دیکھو گے، شیطان اسے ٹھوکروں میں اڑاتا رہے گا۔“

مراد نے کہا: ”یہ دماغی دروازے کب تک بند رکھو گے؟ شیطان نے تم لوگوں کے لیے عارضی حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ جادو کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ کچھ ہی دنوں میں تم سب کے دماغی دروازے کھلنے لگیں گے۔ شیطانی امداد جلد ہی ہوا ہو جائے گی۔“

”تمہارے کہہ دینے سے شیطانی امداد کمزور نہیں ہو جائے گی۔ وہ ازل سے دین و ایمان کے خلاف اپنے تابعداروں کو سلامتی دیتا آ رہا ہے۔ اب تم لوگوں کا زوال آچکا ہے۔ دیکھ رہے ہو کہ ہم نے دنیا کے تمام ملکوں سے تمہیں بھاگ کر اپنی ریاست کے اندر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”خوش فہمی میں نہ رہو۔ سیلاب کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔ ماروی پلک جھپکتے ہی کسی ملک میں بھی پہنچ جاتی ہے۔“

اب میں بھی آ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے میرے عالی کے ساتھ جیسی بھیانک اور لرزہ خیز دشمنی کی ہے، اس دشمنی کا انتہائی عبرت ناک انجام تم سب کے سامنے ہوگا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کسی دشمن کے سامنے مراد آیا ہو اور وہ زندہ رہ گیا ہو۔“

ان سب کو بہت مضبوط سیکورٹی مل رہی تھی۔ وہ مراد کی دھونس میں آنے والے نہیں تھے۔ ویسے انہیں دھونس میں لانے، مرعوب کرنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ ماروی ان کے آرمی ہیڈ کوارٹر میں آگئی۔ وہ ان کے اسلحے کے گودام کو تباہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان کی آرمی پہلے کی طرح تباہ ہو جاتی۔ عالی انہیں تباہی کے تماشے دکھا چکا تھا۔ پھر یہی ہوتا تو وہ جھکنے پر مجبور ہو جاتے لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ شیطان نے تمام شعبوں کے کلیدی حکام کو اور آرمی ہیڈ کوارٹر کے ایک ایک ڈیپارٹمنٹ کو اپنی سخت حفاظتی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسلحے کے گودام کے کسی افسر اور سپاہی کے اندر نہ پہنچ سکی۔

یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ٹیلی پتھی کے ذریعے کسی بھی دشمن ملک کے حکمرانوں اور فوجی افسروں کے اندر نہیں پہنچ سکے گی۔

ان کی ناکامی پر دشمن جشن منانے لگے۔ بے شک انہوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ شاید پہلی بار مراد علی منگلی کو ناکام و نامراد بنا کر اسے کونے سے لگا دیا تھا۔ یہ خیال تھا کہ عالی جیسے شہزادہ اور ناقابل شکست بیٹے کے ٹوٹ جانے سے وہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ آئندہ عذاب بن کر نازل نہیں ہوگا وہ پہلے کی طرح ایکشن سے بھرپور زندگی نہیں گزار سکے گا۔

ان حکمرانوں نے بڑے فخر سے کہا: ”لو مراد! ہم نے تمہیں اچھی طرح نچوڑ ڈالا ہے۔ ایک پھٹے ہوئے ٹھکن آلود کپڑے کی طرح لگتی پر پڑے رہو۔“ دوسرے حاکم نے کہا: ”تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی بیٹی کو ہمارے ملکوں میں آنے سے روکو۔ اگر اب وہ ادھر آئے گی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“

”کیا ہوگا؟“ ”وہ یہاں آ کر خیال خوانی کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا چاہے گی تو ہم تمہاری ریاست پر فوج کشی کریں گے۔“ ”اونہہ۔ کیا ہے وہ تمہاری ریاست؟ ایک ناخن سے بھی چھوٹی ہے۔ دنیا کے نقشے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ ہمارے ایک ہی فضائی حملے سے ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گی۔“

”وہاں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی

بنانے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ ایک حملے میں کھنڈر ہو جانے والی یونیورسٹی میں تم اپنی ٹیکلی کے ساتھ دفن ہو جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر وہ سب ہنسنے لگے۔ بڑی سی اسکرین پر سب ہی برتری کے نشے میں مست دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بہت بڑا چیلنج کیا تھا۔ مراد کے لیے صرف اس کی ریاست ہی نہیں، اسلامی یونیورسٹی بھی بہت زیادہ اہم تھی۔ اس نے، اس کے ہم زاد نے، زیب النساء، بشری اور بے نے دن رات کی محنت سے چار میل کے رقبے پر اس وسیع و عریض یونیورسٹی کو ایک مضبوط قلعے کی طرح تعمیر کیا تھا۔

وہ یونیورسٹی مراد کے لیے اس لیے بھی جان سے زیادہ اہم تھی کہ اس کی بنیاد ڈالنے سے پہلے اس نے خواب میں بابا صلاح الدین اجیری کو دیکھا تھا۔ وہ کھودی ہوئی جگہ پر بنیاد کی پہلی اینٹ اپنے ہاتھوں سے رکھ رہے تھے۔ گویا اس یونیورسٹی کی بنیاد بابا اجیری نے رکھی تھی۔

پچھلے چھ برسوں میں یونیورسٹی کی تعمیر اور ترقی کے دوران میں اس نے کئی بار بابا اجیری کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ جیسے ایک ایک شعبے میں جاتے تھے اور وہاں کام سنبھال کر رہتے تھے۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ ان شعبوں میں جو خامی، کمی یا کوتاہی رہ گئی تھی، وہ دور ہو گئی ہے۔ پیچیدہ مسائل آپ ہی آپ حل ہو جایا کرتے تھے۔

بعض اوقات بندہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ اس کے مسائل کس طرح آسانی سے حل ہو گئے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے مستند علماء کرام بڑے ایمانی جذبوں سے کہتے تھے کہ وہاں کے ہر کام میں روحانی عوامل کارفرما ہیں۔ بصارت سے حقیقت نظر نہیں آتی۔ بصیرت سے ان عوامل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

مراد کو پچھلے چھ برسوں میں اپنا سیرنگا نظر نہیں آیا۔ اسے ایسا ہی لگتا رہا جیسے بابا صاحب سایہ فلک ہیں پھر اس کی دیکھیری کے لیے کسی دن اچانک آئیں گے۔

وہ یونیورسٹی جو مراد کے لیے جان سے زیادہ عزیز تھی، اسے تباہ کرنے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ وہ اس کا پ کے ذریعے ان فرعونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اٹھ کر اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔ اس نے چیلنج کا جواب نہیں دیا۔ ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ کیا دم دبا کر بھاگ رہے ہو؟“

انہیں جواب نہیں ملا۔ وہ انتظار کرنے لگے پھر کئی ممالک کے حکمرانوں اور فوج کے افسروں نے اپنے اپنے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ”جواب

اسی فون کی اسکرین پر دکھائی دے گا۔ انتظار کرو۔“ ایک اعلیٰ افسر نے اپنے فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ پہلی بار دہشت زدہ ہوا ہے۔ جواب دینے سے کتر رہا ہے۔ ابھی رو برو کچھ کہہ نہ سکا۔ منہ چھپا کر کچھ کہنے والا ہے۔“

ایک اور افسر نے کہا۔ ”اس کے میسج پر غور کریں۔ اس نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ہم اس کا میسج پڑھیں گے۔ یہ لکھا ہے کہ میسج دیکھیں گے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”یہ دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ کسی طرح کا جواب بھلا دکھائی کیسے دے گا؟ تحریری جواب تو پڑھا جاتا ہے۔“

ایک افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ ہماری حیثیت سے اس کی کھوپڑی گھوم گئی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”لغت سمجھو اس پر۔ ہم اس کی ریاست پر حملہ ضرور کریں گے۔ اسے جلد سے جلد تابد کر دیتا ہے۔“

مراد نے اپنا جواب سنانے کے لیے انہیں ایک ذرا تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ناگواری سے انتظار کرنے لگے۔ شام سے رات ہو گئی پھر دوسرا دن نکل آیا۔ آرمی کے اعلیٰ افسر نے جھنجھلا کر کہا۔ ”لغت ہے اس پر۔ وہ ہم سے منہ چھپاتا رہے گا۔ ہمیں اس ریاست کے باہر کسی بھی ملک میں ماروی کی موجودگی کا اور اس کی خیال خوانی کا ثبوت ملے گا تو ہم ارض اسلام پر حملہ کر کے وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“

وہ اینٹ سے اینٹ کیا بجاتے؟ اب اس کی دہشت سے ان کے دانت بچنے والے تھے۔ وہ اچانک ہی ان کے سروں پر آ پہنچا تھا۔ سب ہی نے رنگ ٹون سن کر اپنے اپنے فون کا بٹن دبا کر دیکھا تو انہیں مراد علی منگی نظر آیا۔ اس نے درست میسج دیا تھا کہ وہ لوگ اسے پڑھیں گے نہیں، دیکھیں گے۔

اور وہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں اسکرین پر تھا، وہاں اس کے پیچھے ایک شاندار ررہائش گاہ کے مین گیٹ پر لکھا ہوا تھا۔ ”پرائم منسٹر ہاؤس۔“

یہ یقین نہ کرنے والی، چونکا دینے والی بات تھی۔ پرائم منسٹر حیرت سے اچھل کر بولا۔ ”یہ..... یہ مراد میرے پیلس کے سامنے ہے۔ کیا یہ ابھی یہاں ہے؟ اسے پکڑو۔ فوراً گرفتار کرو۔“

اس پیلس کے اندر اور باہر یکلخت بھگدڑ مچ گئی۔ وہ

وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ نکتے لگے۔ شیطان بھی نہیں جان سکتا تھا کہ ہزاروں حفاظتی انتظامات ہوں تب بھی مراد علی منگی کیسے سرنگ بنا کر ان کے اندر پہنچ جاتا ہے؟

پھر انہیں میسج ملا۔ ”میں تمہارے آرمی ہیڈ کوارٹر میں ہوں۔“ یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کے باوجود جھگڑا مچ گئی۔ دس منٹ میں تلاش بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کہاں ہے، کس بھیس میں آیا ہے اور ہیڈ کوارٹر کے کس حصے میں ہے؟

مراد کا یہ طریقہ کار دشمنوں کو پاگل کر دینے کے لیے تھا۔ وہ مارنے سے پہلے اسی طرح دوڑاتا تھا۔ وقت بھلا کہاں رکتا ہے۔ دس منٹ گزر گئے۔ واقعی زلزلہ آ گیا۔ ایسا فلک شکاف دھماکا ہوا کہ زمین میں گڑھے پڑ گئے۔ بھاگنے والوں کے لیے قبریں بنتی چلی گئیں۔ وہاں کے رہائشی بچکے اور بیکس کی دیواریں اور چھتیں ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں اڑنے لگیں۔ دور تک آگ ہی آگ، دھواں ہی دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے زیادہ دھواں ان کے دماغوں میں بھر گیا تھا۔ وہ ہیڈ کوارٹر سے دور رہنے کے باعث بچ گئے تھے۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے بھی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

یہ خبر دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچ گئی۔ سوالات گونجنے لگے۔ یہ کیسے ہو گیا؟ پرنس عالی تو بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے پھر پورے ایک آرمی ہیڈ کوارٹر کو کس نے تباہ کیا ہے؟ ایسا تو صرف جادو سے یا ٹیلی پتھی کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوا۔ ”پھر ماروی نے اب تک ایسی تباہی کیوں نہیں بچائی تھی؟“

بات یہی سمجھ میں آ رہی تھی کہ ماروی ابھی بچی ہے۔ جنگ لڑنے کے جھکندوں اور چال بازیوں کو نہیں سمجھتی ہے۔ صرف اسلحے سے جنگ نہیں جیتی جاتی۔ اسلحے کو استعمال کرنے کی ذہانت اور حاضر دماغی لازمی ہوتی ہے۔ اسے ابھی باپ سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

دشمن دیکھ لیں، شیطان بھی سمجھ لے کہ بٹی اسلحہ ہے اور باپ سپاہی ہے۔ بیٹی کا دماغ اسلحہ ہے اور باپ خطرناک اسلحہ کا ناقابل شکست کھلاڑی ہے۔ دیکھو کہ میدان جنگ سے پہلی گونج سنائی دی ہے۔ ارض اسلام جو ناخن کے برابر ہے، وہ تمہارے گوشت میں گڑ گیا ہے۔ بسم اللہ ہو چکی ہے۔

سب چیخ چیخ کر پولیس اور آرمی کے مسلح گارڈز کو احکامات دینے لگے۔ ہر سو خطرے کے الارم گونجنے لگے۔ وہاں سے دور دور تک ہنگامی کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ادھر کے تمام راستوں اور علاقوں کو عارضی طور پر بند کر دیا گیا۔

میسج تصویر کے مطابق مراد اب وہاں نہیں تھا۔ کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اسے دور دور تک تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس دوران پرائم منسٹر نے اپنے فون سے رنگ ٹون سنئی۔ شن کو دبا کر اسے کان سے لگا یا تو مراد کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے ڈھونڈو کہ میں دلوں کو دھڑکانے والی دھڑکن ہوں۔ مجھ سے مایوس نہ ہونا۔ میں منہ چھپا کر جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ ارض اسلام کو ایک نقطہ کہہ کر اسے مٹانے کا ناپاک ارادے کرنے والو.....! تمہارے ملک کی ایک عبرت ناک تاریخ لکھتے آیا ہوں۔“

اس فون کال نے سبھی کو دھلا دیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ وہ اپنی ریاست سے نکل کر وہاں آ گیا ہے۔ اسے آنے میں دیر لگی۔ اس نے چالیس گھنٹے پہلے میسج دیا تھا۔ ہزاروں میل کا سفر کرنے میں خاصا وقت لگا تھا مگر آ گیا تھا۔

بے شمار سیاسی اور فوجی عہدیدار اس کے نمبر پر کال کرنے لگے۔ جواباً اسکرین پر تحریر ابھر رہی تھی۔ ”کوئی اور بات نہیں ہوگی۔ آخری موقع دے رہا ہوں۔ خود کو تباہی سے بچاؤ، تو بے کرو اور موذن کے قاتلوں کو قتل کر واقعی مزادو۔“

اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسی ملک اسی شہر میں موجود ہے اور اسی طرح کی بڑی تباہی مچانے والا ہے۔ وہ سب جھنجھلا رہے تھے۔ اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اس کی کوئی بات ماننے والے نہیں تھے۔ شیطان انہیں حوصلہ دے رہا تھا۔ ”اس کی دھونس میں نہ آؤ۔ میں نے تمہاری تباہی کے تمام راستوں کو لاکھ کر دیا ہے۔ ماروی کی ٹیلی پتھی کو بے اثر کر دیا ہے اور مراد سے کیا ڈرنا؟ وہ نہ تو ٹیلی پتھی جانتا ہے اور نہ ہی نادیدہ ہو کر کہیں تباہی لاسکتا ہے۔“

حالات نے باپ بیٹی کو مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ ماروی نے شیطانی چالوں کا توڑ کرنے کے لیے مجبوراً گن پکڑی اور مراد کی ہدایت کے مطابق نادیدہ ہو کر آرمی ہیڈ کوارٹر کے اسلحہ خانے میں پہنچ گئی۔

اس نے پھر ان دشمنوں کو میسج دیا۔ ”تم لوگ نقصان اٹھائے بغیر ہمارا مطالبہ نہیں مانو گے تو پھر لو اور دیکھو۔ دس منٹ کے بعد تم سب کے پاؤں تلے زمین لرزنے والی ہے۔ گھڑی دیکھو۔“

اب سے پہلے پرنس عالی کی غیر معمولی قوتوں کا مظاہرہ ایسا زبردست ہوتا تھا کہ دشمن اس کے سامنے باپ کو بھول گئے تھے۔ وہ جسمانی قوت میں بیٹے کے برابر نہیں تھا لیکن دشمنوں سے کم بھی نہیں تھا، اپنی ذہانت سے ہمیشہ ان پر بھاری پڑتا آ رہا تھا۔

اس ہیڈ کوارٹر کی تباہی انہیں سمجھا رہی تھی کہ شیر کو نیند میں مردہ نہ سمجھو۔ وہ سوتا ہے تو جاگتا بھی ہے۔ وہ اپنی ریاست میں رہ کر اسلامی یونیورسٹی کے معاملات میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا والوں کے لیے سوراہا تھا۔ یہ شیطان کی کبھی بھی۔ اس نے اپنے طور پر بڑی کامیاب چالیں چلنے کی خوش فہمی میں خوابیدہ شیر کو جگا دیا تھا۔

انہوں نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ ایک چکی برابر ریاست ارض اسلام کو ایک ہی فضائی حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے نابود کر دیں گے۔ اس سے زیادہ خطرناک حملہ ان کی اپنی زمین پر ہو گیا تھا۔ منہ توڑ جواب ملنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اب اس ملک کو سیاسی و عسکری اور اقتصادی طور پر پھر سے مضبوط ہونے میں برسوں لگنے والے تھے۔

دوسرے تمام ممالک اس ملک کے عبرت ناک انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ مراد اور ماروی کو جواباً چیلنج نہیں کر رہے تھے۔ عذر باد سے پوچھ رہے تھے۔ ”تم خاموش کیوں ہو؟ ایک ملک کی معیشت اور فوجی قوت تباہ ہو گئی ہے اور تم جوابی کارروائی نہیں کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ذرا صبر کرو۔ وکٹ مگر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے کھلاڑی کے آنے اور دوسرا کھیل شروع ہونے تک ایک ذرا وقفہ رہتا ہے۔ مراد کی اور شیطان کی جنگی حکمت عملی مختلف ہے۔ مراد جب ایکشن میں آتا ہے تو دہشت طاری کرنے کے لیے بڑی تیزی سے حملے کرتا رہتا ہے اور شیطان بہت خاموشی سے اور پراسرار طریقوں سے مقابل کے اندر سرگ بنا تا ہے۔ جیسا کہ عالی کے سلسلے میں دیکھ چکے ہو۔ ہم پچھلے آٹھ برسوں سے اس کی قبر کھودتے آ رہے ہیں۔ اسے بستر مرگ پر پہنچا دیا ہے۔ وہ آج کل میں دنیا سے جانے والا ہے۔ اب مراد کی شامت آگئی ہے اسی لیے وہ ریاست سے باہر آ رہا ہے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”اگر اسے بھی بستر مرگ پر پہنچانے میں آٹھ برس لگاؤ گے تو کیا وہ تب تک ہمیں زندہ رہنے دے گا؟“

”میں نے تم سب کے دماغوں کو فولادی قلعہ بنا دیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انہوں نے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا ہے۔ تم میں

سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے اور نہ آئندہ پہنچا سکیں گے۔“ یہ درست ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ شیطان کی پناہ میں اطمینان ہے لیکن مراد کے موجودہ حملے نے ہمارے ملک کو اپناج بنا دیا ہے۔ ہم بھی اس کی ریاست کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس کی اسلامی یونیورسٹی کو کھنڈر نہیں بنا سکو گے؟“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”فی الحال ممکن نہیں ہے۔“

ایک حاکم نے حیرانی سے پوچھا۔ ”مسٹر عذر باد! کیا ہمارے شیطان کے لیے بھی کوئی بات ناممکن ہوتی ہے؟“

”ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے ممکن بنالیتا ہے۔ ابھی

رکا وٹیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ میں کئی بار اس یونیورسٹی میں داخل ہونے کی کوششیں کر چکا ہوں۔ مجھے راستہ نہیں ملتا

ہے۔ جب بھی اس یونیورسٹی کے صدر دروازے کو کھول کر اندر جاتا ہوں تو کسی جنگل میں پہنچ جاتا ہوں۔“

”تجربہ ہے۔“ آرمی کے ایک افسر نے کہا۔ ”ہمیں

معلوم ہونا چاہیے کہ اس یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر کیا

ہے؟ کیا تم نا دیدہ ہو کر دیوار پھاںد کر اندر نہیں جا سکتے؟“

”میں ایک بار دیوار پر چڑھ کر اندر جانا چاہتا تھا۔“

وہ ذرا چپ ہوا۔ ایک نے پوچھا۔ ”ہاں تو پھر؟“

”پھر میں دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر اور اوپر

چڑھتا رہا۔ وہ دیوار آسمان کی بلندیوں پر لے جا رہی تھی پھر

جب تھک کر رک گیا تو دیکھا، جہاں سے دیوار پر چڑھنا

شروع کیا تھا، وہیں پر کھڑا ہوں۔ اندر جانے کے لیے مجھے

پھر دیوار پر چڑھنا ہوگا۔“

وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ ایک افسر نے کہا۔

”انہوں نے احاطے کی دیوار پر کسی طرح کا جادو کیا ہے۔“

”ضرور کیا ہے۔ مسلمان اسے جادو نہیں، روحانی عمل

کہتے ہیں۔ شیطان جلد ہی اس کا توڑ کرنے والا ہے۔“

ایک افسر نے کہا۔ ”طیارے کے ذریعے اس

یونیورسٹی پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہی بم گرایا جائے تو ان کا

وہ قلعہ ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گا۔“

عذر باد نے کہا۔ ”انہوں نے ہوائی حملوں سے بھی

بچنے کے لیے کوئی جادو کیا ہوگا۔ وہ نادان نہیں ہیں۔ میں

دیوار پر چڑھتا ہوا زمین پر سے وہاں نہ جاسکا اگر آسمان کی

طرف سے کوئی ہوائی جہاز ادھر نہیں جاسکے گا یا ہوائی حملہ

کرنے سے پہلے وہ اسے تباہ کر دیں گے تو اس کے بعد وہ

اور زیادہ خطرناک دشمن بن جائیں گے، ہمیں سنبھل کر جوابی

کارروائی کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔ دانش مندی یہ ہوگی

کہ ان کی یونیورسٹی کو نہ چھیڑا جائے۔ ان پر کھل کر کسی طرح

و دنیا کے تمام علوم و فنون کی ایک مکمل، مستند اور جامع درس گاہ ہے۔ ہماری دنیا میں سرفہرست رہنے والی درس گاہوں میں اس کا نام آگیا ہے۔ اس دنیا کے عالم فاضل، دانش ور اور زندگی کے تمام شعبوں کے ماہرین وہاں اکثر دورہ کرنے، معائنہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں کے دینی اور روحانی ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔“

عذر بادل نے کہا۔ ”دانش اپنی مسلمان ماں کو ضرور اس یونیورسٹی میں لے جائے گا۔ ایسے وقت میں آسانی سے اس کے دماغ میں چھپ کر اس فولادی قلعے کو دیکھ سکوں گا۔“

”ہاں، تم کئی بار وہاں جانے کی کوشش کر چکے ہو اور ناکام رہے ہو۔ لارا تمہیں اپنے دماغ میں چھپا کر لے جایا کرے گی۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ ہوگی ہماری کامیاب چال۔ اس یونیورسٹی کے اندر ان کا کوئی دشمن اور شیطان کا کوئی پرستار جانے میں ناکام رہتا ہے۔ اب ہمارے راستے میں ان کی کوئی جادوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ میں ابھی جا کر لارا کا برین پھر سے دانش کروں گا۔“

مراد اور ماروی کو پھر ایک بار برسوں تک فریب میں مبتلا رکھنے کے لیے ایک شیطان کی بیٹی کو دین و ایمان کی چھاؤں میں خطرناک آلہ کار بنا کر رکھنے کے لیے وہ بہت زبردست چال تھی۔ ازل سے ایسے ہی شیطانی ہتھکنڈے مسلمانوں کو کمزور بناتے آئے ہیں۔

☆☆☆

وہ دین اسلام کے تمام مخالفین خلا میں تک رہے تھے اور شیطان کی ہدایات سن رہے تھے، وہ کہہ رہا تھا۔ ”جلد بازی نقصان پہنچاتی ہے۔ مراد نے جو ناقابل برداشت نقصان پہنچایا ہے، اسے برداشت کرو۔ اس سے انتقام لینے کی جلدی نہ کرو۔ انہیں اوندھے منہ گرانے میں تھوڑا وقت لگے گا۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”پھر بھی کتنا وقت لگے گا، ہمیں خبر تھی ہے کہ مراد یورپ کے کسی دوسرے ملک میں ہے۔ وہ ہم میں سے کسی کے ملک میں کسی کی شہرگ قریب پہنچا ہوا ہے۔“

دوسرے حاکم نے کہا۔ ”تم ہمیں مبرا کرنے اور انتظار کرنے کو کہہ رہے ہو۔ کیا وہ دشمن بھی مبرا کرے گا اور ہمیں مزید نقصان نہیں پہنچائے گا؟“

”نہیں پہنچائے گا۔ تم اس کے مطالبات پورے کر دو۔ موذن کے قاتل کو سزائے موت دو گے، انصاف

کا حملہ نہ کیا جائے۔ ہم نے جس طرح رازداری سے عالی کو کھوکھلا کیا ہے، اسی طرح مراد اور ماروی کو کھوکھلا کریں گے۔“

وہ بولتے بولتے رک گیا پھر مسکرا کر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”لارا کا بیٹا دانش ماں کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی رہائش اسی یونیورسٹی میں ہے۔ ان لحاظات میں شیطان مجھے ایک راستہ دکھا رہا ہے۔ میں ادھر جا رہا ہوں۔ تم سب مطمئن رہو۔ جلد ہی ہماری طرف سے انتقامی کارروائی ہوگی۔“

وہ ان کے اجلاس سے نکل کر اپنی رہائش گاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ شیطان اس کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ شیطان نے کہا۔ ”ایک نیا گیم۔ سیاہ سفید نہیں ہو سکتا لیکن ہم اگلے کو کالا اور کالے کو اجلا کر دیں گے۔“

عذر بادل نے کہا۔ ”میں حاضر ہوں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”لارا پر عمل کرو۔ اس کی شخصیت بدل دو۔ اب وہ لارا نہ رہے۔ نہ خود کو بھول جانے والی، نہ خود کو یاد رکھنے والی۔ اسے ایک نئی تیسری شخصیت میں ڈھال دو۔“

”ایسا ابھی کروں گا۔“

”تیسری شخصیت میں وہ ایک ایسی ماں ہوگی، جس کا جوان بیٹا گم ہو گیا ہے۔ وہ دانش کو اپنا بیٹا بنائے گی۔“

”پھر وہ ہوگا، جس کی توقع ان مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوگی۔“

”ایسا کیا ہوگا؟“

”سیاہ سفید ہو جائے گا۔ لارا دین اسلام قبول کرے گی۔“

یہ واقعی چونکا دینے والی، یقین نہ کرنے والی بات تھی۔ وہ شیطان کی بیٹی کبھی ایمان کی چھاؤں میں آنے والی نہیں تھی۔ لیکن شیطان ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ عذر بادل نے کہا۔

”اس کا بیٹا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔“

”ماروی سچ معلوم کرنے جب بھی لارا کے اندر جائے گی، میں وہاں موجود رہوں گا۔ میں نمازوں کے دوران میں عبادت کرنے والوں کو بھٹکا دیتا ہوں۔ ماروی کو بھی بھٹکا تا رہوں گا۔ وہ بھی لارا کے اندر مجھے نہیں دیکھ سکے گی، اسے مسلمان ہی سمجھتی رہے گی۔“

”یہ زبردست چال ہوگی۔ وہ مسلمان بن کر ان کا اعتماد حاصل کرتی رہے گی اور ہمارے لیے بخبری کرتی رہے گی۔“

”ان کی اسلامی یونیورسٹی سائنس اور ٹیکنالوجی اور دین

قانون کے محققوں کے سامنے وقت ضرورت حاضر ہوتا پڑے گا اگر اپنے دشمنوں سے نمٹنا ہو تو اس ملک کو چھوڑ کر جانا ہوگا۔

مراد نے کہا۔ ”میں جس ملک میں جاتا ہوں، وہاں بے باکی اور آزادی سے رہتا ہوں۔ کسی بھی ملک کی پولیس اور آرمی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ میری اولاد بھی میری طرح جس ملک میں چاہے گی، جا کر رہا کرے گی۔ ہم کسی بھی ملک کے پاسپورٹ اور ویزا کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمیں پابندیوں میں جکڑنے کی باتیں نہ کرو۔“

وہ مختلف پہلوؤں سے مراد کو گھیرنا چاہتے تھے لیکن ناکام رہے۔ یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ مراد قانون شکن ہے۔ وہ بعض اوقات مجرموں سے اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے قانون کی حد سے باہر نکل آتا تھا۔ اکثر ممالک کے حکمرانوں کے شاہانہ مزاج پر گراں گزرتا تھا۔ اس لیے بھی کہ اپنے دین کی حمایت اور سلامتی کے لیے ان سے جنگ جاری رکھتا تھا۔ یہ جنگ آئندہ بھی جاری رہنے والی تھی۔

مذہبی اختلافات ہوں تو اپنا ہی مذہب افضل اور برتر لگتا ہے۔ دوسرے تمام دین دھرم کے لوگ کمتر اور بیچ دکھائی دیتے ہیں۔ اختلافات کے بیچ اندر سے پھوٹتے ہیں۔

تمام مخالفین کو موجودہ حالات کے پیش نظر مراد سے سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ لہذا وہ راضی ہو گئے کہ اپنے اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیں گے اور مراد کے مذہبی جذبات کو بھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ عظیم اسلامی یونیورسٹی کا عروج اور شہرت شیطان پر اور اس کے تابعدار حکمرانوں اور فوجی افسروں پر گراں گزر رہی تھی۔ ایسے وقت مراد نے یہ اعلان کیا کہ اس یونیورسٹی سے پانچ تبلیغی جماعتیں مختلف ممالک میں جا کر اپنے دینی فرائض ادا کریں گی۔

بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی ملک کسی بھی دین دھرم کے پرچار کو نہیں روک سکتا۔ ارض اسلام کی تبلیغی جماعتیں جن پانچ ممالک میں جانے والی تھیں، ان ممالک کے حکمرانوں نے کہا۔ ”ہم آپ کے علمائے کرام کو تمام مبلغین کو خوش آمدید کہیں گے لیکن دوسرے درجنوں مذاہب میں کچھ شریک اور تخریب کار ہوتے ہیں۔ وہ مسائل پیدا کریں گے تو ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”اتنی مصیبت سے اپنی مجبوریاں ظاہر نہ کرو۔ جب تم بین الاقوامی قوانین کے مطابق ہماری تبلیغی جماعتوں کو تحفظ فراہم نہیں کر سکو گے، اپنے ہی ملک

کے تقاضے پورے کرو گے تو وہ آگے اور دشمنی نہیں کرے گا اور یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ مراد نے جرائم کی دنیا سے لے کر سیاسی دنیا میں حکمرانی تک کسی سے دشمنی میں پہل نہیں کی۔ اسے اینٹ ماری جاتی ہے تب ہی وہ ہتھ مارتا ہے۔ اسے کچھ عرصے تک فریب میں مبتلا رکھنا ہوگا پھر اسے دوستانہ اور سیاسی تعلقات کا فریب دینا ہوگا۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”اب وہ ہمارے فریب میں نہیں آئے گا۔“

”بڑی آسانی سے آئے گا۔ تم سب اپنے اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو عزت دو گے۔ انہیں ضروری سہولتیں فراہم کرو گے تو وہ ہوم ہو جائے گا۔ اسے اپنی طرف جھکانے پھر سے دوستی کے بہز باغ میں لانے کا یہی طریقہ ہے۔“

ان مخالفین نے کچھ روز پہلے بڑی فرعونیت دکھائی تھی۔ ان ارض اسلام کے باشندوں کو اپنے اپنے ملک سے نکال دینا چاہا تھا۔ تمام ممالک نے سفارتی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کیا تھا اور طاقت کے غرور میں ایک ہی ہوائی حملے سے ریاست ارض اسلام کو نابود کر دینے کا فیصلہ سنایا تھا۔

اب وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ اکڑی ہوئی گردیں جھک گئی تھیں۔ اسی میں دانش مندی دکھائی دے رہی تھی کہ ریاست ارض اسلام سے سیاسی اور عسکری، سفارتی تعلقات کو بحال کریں اور دیکھیں کہ شیطان پھر کس طرح مراد کی کمر توڑنے والا ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان ہارجیت کے کھیل کو قیامت تک جاری رہنا ہے۔ وہ دین کے مخالفین عارضی طور پر جھک گئے۔ انہوں نے موذن کے قاتلوں کو سزائے موت دی اور وعدہ کیا کہ وہاں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ شہری حقوق اور سہولتیں دیتے رہیں گے۔

وہ مراد سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ بڑی رازداری سے تلاش کرنے کے باوجود وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنی ریاست سے بھیس بدل کر آیا تھا۔ ان ملکوں میں اپنی صورت اور شخصیت کو بدلتا رہتا تھا۔ وہ کسی بھی ملک کے حکام سے اور فوجی افسران سے ملنا اور انہیں گھاس ڈالنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

وہ ملاقات نہیں کر رہا تھا لیکن ان کے درمیان مذاکرات جاری رہتے تھے کہ انہوں نے مراد سے اور اس کی ریاست سے جو تعلقات ختم کیے تھے، اسے پھر سے بحال کر چکے ہیں۔ اب ان کی یہ شرط مانی جائے کہ مراد اور ماروی کو کسی بھی ملک میں آکر بھی روپوش نہیں رہنا ہوگا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of
News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”مجھے آپ کے اور آپ کے سائے میں شیطانی چالوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنا آ جائے گا۔“

ماروی نے کہا۔ ”بڑی خون ریزی ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”جب دشمن مجبور کر دیتے ہیں، تب اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے انسانی زندگی سے کھیلنا پڑتا ہے۔“

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ ”بابا جانی! میرا مزاج آپ سب سے ذرا الگ ہے۔ میں کبھی کسی کی جان نہیں لوں گا۔“

باپ نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا، پھر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم دشمنوں سے جنگ نہیں لڑو گے؟“

”ضرور لڑوں گا۔ اپنے دین کے لیے جان پر کھیل جاؤں گا لیکن کسی کی جان نہیں لوں گا۔“

ماروی اور مراد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ بولا۔ ”میں ذرا مختلف انداز میں دشمنوں سے نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ دشمن مجھ سے انجان اور غافل رہیں۔ وہ مجھے دیکھیں لیکن دانش کے نام سے نہ پہچانیں۔ میں کسی کی جان سے نہیں کھیلوں گا، چپ چاپ خیال خوانی کے ذریعے انہیں سزا میں دیتا رہوں گا۔“

وہ باپ بٹی مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔

”آپ یہی چاہتے ہیں تاکہ مخالفین ہم سے دشمنی نہ کریں؟“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”لیکن دشمن کی تعریف یہ ہے کہ وہ دشمنی کے لیے ہی پیدا ہوتا ہے۔ آپ ایک کوجان سے مارتے ہیں تو دوس اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے میں کسی کوجان سے نہیں ماروں گا۔ سزا میں دیتا رہوں گا۔ کیا کیا جائے کہ تب بھی ہماری دنیا میں محبت اور نفرت، دوستی اور دشمنی آنے سے نہیں کریں گی۔ پھر بھی میں اللہ کی دی ہوئی جان کو کسی سے نہیں لوں گا۔ اپنے جیسے انسان کو کبھی چھڑکی طرح مارنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

مراد نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھی اور کھری باتیں کرتے ہو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم اپنے لائن آف ایکشن کے مطابق جیسا بہتر سمجھتے ہو، ویسا کرو۔ ہماری تمہاری یہی کوشش ہوگی کہ دشمن عام بے گناہ اور بے ضرر مسلمانوں کو کسی طرح نقصان نہ پہنچائیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہم تینوں تین الگ طرح سے میدان عمل میں رہیں گے، آپ اپنی جسمانی قوتوں سے اور خداداد ذہانت سے جنگ لڑتے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی اپنے ہی بل پر جنگ جاری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں روحانی صلاحیتوں کی حامل ہوں۔“

کے قانون کی بالادستی قائم نہیں رکھ سکو گے تو ہم ان مخالفین سے نمٹ لیں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں، آپ کس طرح ان سے نمٹیں گے۔ ہمارے ملکوں کا، ہماری شہری آبادیوں کا امن و امان تباہ ہو جائے گا۔“

”وہ تو ہوگا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ حکمران ہوں، قانون نافذ کرنے والے ہوں یا تمہارے ملکوں کے شریک ہوں، وہاں جن کے اندر شیطانی بھری ہوگی اسے ہم ہی نکالیں گے۔“

دوستانہ سمجھوتے اور مخالفانہ مذاکرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر ناخن برابر بھی اعتماد نہیں کریں گے، کسی نہ کسی بہانے فسادات برپا ہونے کی راہیں نکلتی رہیں گی۔ وہ ایک دوسرے کو لاعلمی میں جھوٹ اور فریب سے مات دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

دیکھا جائے تو میدان جنگ میں پوری دنیا ایک طرف تھی اور مراد اور ماروی ایک طرف تھے۔ مراد نے کہا۔ ”ماروی! ہم دونوں تین ہیں۔ ماشاء اللہ دانش بہت ہی ذہین اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ وہ تمہاری طرح ٹیلی پتھی جانتا ہے۔ نا دیدہ ہو کر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہیں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اسے بلاؤ، ہم بات کریں گے۔“

دانش ان دنوں یونیورسٹی میں سائنس و ٹیکنالوجی اور روحانی تعلیمات حاصل کر رہا تھا۔ ماروی نے اسے خیال خوانی کے ذریعے آواز دی تو وہ حاضر ہو گیا۔

مراد نے کہا۔ ”ہمیں تمہاری مصروفیات کا علم ہے۔ اس لیے تمہیں میدان عمل میں نہیں لارہے تھے لیکن حالات سنگین ہونے والے ہیں، ہمیں تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔“

”بابا جانی! میں حاضر ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آپ کے سائے میں رہ کر بہت کچھ سیکھتا رہوں گا۔ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”بیرونی ممالک میں اپنی تبلیغی جماعتوں کی نگرانی کرنی ہے۔“

”آپ کا حکم سر آ نکھوں پر۔ میرا اندازہ ہے کہ ان ملکوں میں ہمارے دین کے خلاف ایسی کیسی شیطانی سازشیں ہوں گی۔“

”تمہارے اندازے سے بھی زیادہ خطرناک سازشیں ہوں گی۔“

دشمن پاتال میں بھی ہوتے ہیں تو وہاں پہنچ جاتی ہوں۔“ وہ دانش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میرا یہ لاڈلا بھائی دستور کے مطابق جنگ نہیں لڑے گا۔ اپنی حکمت عملی سے نئی بازی کھیلے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کیسے نتائج حاصل کرنے والا ہے۔“

مراد بیٹے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اٹھارہ برس کا قد آور گہرو جوان ہو چکا تھا۔ پہلی بار اپنے طریقہ کار کے مطابق تنہا میدانِ عمل میں اترنے والا تھا۔

☆☆☆

یہ روز کا معمول تھا۔ دانش دن میں ایک بار اپنی ماں سے ملنے ضرور آتا تھا۔ اس روز بھی وہ تاریک دنیا کی رہائش گاہ میں پہنچا تو وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے خیال خوانی کے ذریعے اسے پکارنا چاہا تھا۔ یہ نئی بات ہوئی کہ اس کی سوچ کی لہروں کو ماں کا دماغ نہیں ملا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ خیال خوانی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں ملتا، جو مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کے لیے تڑپ گیا۔ ”مام! کہاں ہو؟ یا خدا! میں کہاں ڈھونڈوں؟“

اس نے ماروی سے کہا۔ ”آئی! میری خیال خوانی کی لہروں کو مام کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔ وہ نظر بھی نہیں آ رہی ہیں۔“ بہن نے تسلی دی۔ ”پریشان نہ ہو۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“

اس نے خیال خوانی کی پرواز کی پھر وہ بھی بھٹکنے لگی۔ حیرانی کی بات تھی کہ روحانی ٹیلی پتھی کی صلاحیتیں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔ دانش نے صدمے سے نڈھال ہو کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ جب جسمانی وجود بھی نہ ہو اور دماغ بھی نہ ملے، سوچ کی لہریں خلا میں بھٹکتی رہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مطلوبہ ہستی مر چکی ہے۔

اس نے خشک ویران آنکھوں سے بہن کو دیکھا۔ ”اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے۔ اس کا برین واش کیا گیا ہوگا اس لیے ہماری خیال خوانی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔“

”آئی! وہ تو کہیں بھی نظر آ سکتی ہیں۔ وہ دنیا کے جس حصے میں بھی ہوتی تھیں، میں پلک جھپکتے میں ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ آپ بھی پہنچ جاتی تھیں۔ ان کا وجود کہاں ہے؟“

”یہ کسی طرح کی زبردست شیطانی چال ہے۔ شیطان نے ہماری خیال خوانی کی لہروں کو لارا تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔ یعنی صرف اس کا دماغ ہی نہیں، اس کی شخصیت بھی بدل دی ہے۔ اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ جب

تک ہم تمہاری ماں کے خیالات نہیں پڑھیں گے، ہمیں معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟“ ”وہاں تین ٹیلی پتھی جاننے والے ہیں۔ صرف میری مام کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ میری مام کو مجھ سے دور کیوں کیا ہے؟“

”شاید اس لیے کہ تم مسلمان ہو۔ میرے اور بابا جانی کے سائے میں رہتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری ماں کو ہم مسلمانوں سے کہیں دور پہنچا کر تمہیں بھی وہاں پہنچائیں گے اور تمہارا بھی برین واش کر دیں گے۔“

وہ دونوں مراد کے پاس آگئے۔ اسے لارا کے متعلق بتانے لگے، اس نے کہا۔ ”لارا کے یوں گم ہونے میں اس کی اپنی مرضی ہوگی۔ اس نے شیطان سے کہا ہوگا کہ مراد اس کے بیٹے وارث کو اس سے چھین کر لے گیا ہے۔ اب اس کے اپنے بیٹے دانش کو مسلمان بنا کر یونیورسٹی میں لے گیا ہے، لہذا یہ نئی شیطانی چال چل کر وہ دانش کو ہم سے چھین کر لے جانا چاہتے ہیں۔“

ماروی اور دانش نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ ایسی بات نہیں تھی۔ لارا جانتی تھی کہ دانش مراد کا خون ہے وہ بھلا بیٹے کو چھین کر دنیا کے کس حصے میں جائے گی، کہاں چھپ کر رہے گی؟

ان لمحات میں ماروی کو جیسے آکسی ٹی۔ دل میں بات آئی کہ وہ بابا جانی کو اب دانش کی حقیقت بتا سکتی ہے۔ اب کسی طرح کی نامعلوم قدرتی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

آئندہ شیطانی چال کو سمجھنے کے لیے مراد کا حقیقت سے آگاہ رہنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک لاوارث بچے کو باپ کی بھرپور محبتیں دی تھیں۔ آئندہ بھی ایک باپ کے تمام فرائض ادا کرنے والا تھا، وہ وارث کو موجودہ قدر و قیمت سے اور بلند سطح سے کبھی نیچے نہیں لائے گا۔

ماروی نے کچھ کہنے سے پہلے مراد کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟“

”بابا جانی! ایک بہت بڑی بات ہے۔ آپ ایک بہت بڑی حقیقت سے آج تک بے خبر رہے ہیں۔“

”ایسی کیا حقیقت ہے کہ میں بے خبر رہا اور تم باخبر رہی ہو؟“

”میں آپ کو اٹھارہ برس پہلے ہی بتا دیتا چاہتی تھی لیکن.....“

مراد نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ ”اٹھارہ برس.....؟ تم

اٹھارہ برسوں سے کوئی حقیقت چھپا رہی ہو؟ میں حیران ہوں۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ بیٹی نے اتنے برسوں سے باپ کو اندھیرے میں رکھا ہے۔
وہ سر پر آچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے نہیں، اللہ نے۔“
”کیا کہہ رہی ہو؟“

”بابا جانی! اللہ کو منظور نہیں تھا۔ میں نے جب بھی آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا تو کچھ بول نہ سکی۔ میری قوت گویائی عارضی طور پر ختم ہوگئی۔ میں آپ سے دوسری باتیں کر سکتی تھی لیکن ایک سچی حقیقت بیان کرتے وقت چپ لگ جاتی تھی۔ میں بولنا بھول جاتی تھی۔“
وہ بولا۔ ”اللہ جل جلالہ وجل شانہ میرے رب کے آگے سرخم ہے۔ کیا ابھی بول سکتی ہو؟“
”جی ہاں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ میں بول پاؤں گی۔“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”بولو! فوراً بولو۔“
”لارائے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ جس بچے کو آپ کے حوالے کیا تھا، وہ آپ کا نہیں تھا۔ وارث آپ کا خون نہیں ہے۔“

وہ شدید حیرانی سے دیدے پھیلائے ماروی کو تنک رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”آپ کا خون یہ ہے دانش.....“
دانش پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایسا انکشاف تھا کہ مراد نے چونک کر تڑپ کر اسے دیکھا پھر بے اختیار اس کے ایک بازو کو جکڑ لیا۔ جذبات کی شدت سے لرزنے لگا۔ بھید کھلتے ہی دانش بھی جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ یکبارگی آگے بڑھ کر باپ سے لپٹ گیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”اللہ تعالیٰ وارث پر مہربان ہے۔ اس معبود نے جب اسے آپ کی گود میں پہنچایا تو وہ ناقابل علاج مریض تھا۔ آپ ہی کے سائے میں اس کا علاج ہو سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اور بہتری فرماتا ہے۔ اس نے آپ کے ذریعے وارث کو صرف زندگی ہی نہیں دی، اسے آپ کا وارث اور ریاست کا شہزادہ بنا دیا۔“
مراد نے دانش کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ”بے شک۔ وارث میرا وارث ہے۔ اس ریاست کا شہزادہ اور میرا جانشین رہے گا۔“

اس نے دانش کے دونوں بازوؤں کو بڑے جذبے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نہ شہزادے ہو، نہ بادشاہ

سلامت بنو گے۔ اپنے باپ کی طرح دین کے لیے اور انصاف کے لیے لڑنے والے سپاہی کہلاتے رہو گے۔“
وہ باپ بیٹے بڑی دیر تک محبتوں سے سرشار ہوتے رہے پھر دانش نے کہا۔ ”بابا جانی! پہلی بار ایسی سرتیں حاصل ہو رہی ہیں کہ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ کلام پاک کی ایک آیت کے مطابق ”یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔“ یعنی غم کے ساتھ خوشی اور درد کے ساتھ دوا بھی ملتی ہے۔ ابھی آپ کی آغوش میں خوشیاں مل رہی ہیں تو صدمہ بھی مل رہا ہے۔ میری مام کہاں ہوں گی بابا جانی؟ وہ زندہ ہوں گی نا؟“

”بیٹے! جن کے اعمال بہتر ہوتے ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ بہتری فرماتا ہے۔ تم ایک سچے دین دار ہو۔ تمہارے دل میں خوفِ خدا رہتا ہے۔ وہ معبود تمہیں صدمات سے بچائے گا۔ ہم تمہاری مام کے لیے دعا بھی کریں گے اور اسے ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں گے۔ تم اور ماروی، کاہن اور عذر باد کے پاس جاؤ۔ وہ کوئی چال چل رہے ہوں گے تو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ پھر بھی ان کی باتوں سے کچھ اندازہ ہوگا۔ کوئی سراغ مل سکے گا۔“

انہوں نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ تاریک دنیا کی شیطانی عبادت گاہ میں پہنچے۔ وہاں کاہن، عذر باد، آنخوس اور طاغوتا بیٹھے ہوئے تھے اور لارائے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ آنخوس اور طاغوتا پچھلے آٹھ برسوں سے نیلی پتھری کی صلاحیتوں سے محروم تھے۔ انہوں نے ماروی اور دانش کی خیال خوانی کی لہروں کو اپنے اندر محسوس نہیں کیا۔ یوں کاہن اور عذر باد کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بہن بھائی وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔

عذر باد کہہ رہا تھا۔ ”پہلے تو میں بھی سمجھتا رہا کہ وہ مر چکی ہے۔ میری خیال خوانی کی لہروں کو نہیں مل رہی تھی پھر میں نے شیطان معظم سے پوچھا۔ وہ اپنے تمام بھید اپنے بندوں کو بھی نہیں بتاتا۔ جتنا ضروری سمجھتا ہے، اتنا ہی کہتا ہے اور اس نے اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

دانش نے یہ سنتے ہی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ماروی کے پاس آکر بولا۔ ”آپنی! میری مام زندہ ہیں۔ شیطان درست کہہ رہا ہوگا نا؟“

وہ بولی۔ ”یہ تو شیطان ہی جانتا ہے۔ اس مردود سے کوئی بات چچی نہیں رہتی۔ عذر باد اس کا قابلِ اعتماد دستِ راست ہے۔ اس پر اعتماد کر کے بتانا چاہیے کہ لارا

زندہ ہے تو کہاں ہے؟ کس حال میں، کس علیے میں اور کس روپ میں ہے؟“ وہ بولا۔ ”ہو سکتا ہے، اسے بتایا ہو اور وہ کاہن وغیرہ سے چھپا رہا ہو۔“

انہوں نے مراد کے پاس آکر کہا۔ ”شیطان جانتا ہے کہ لارا زندہ ہے لیکن وہ بہت سے بھید اپنے پرستاروں اور تابعداروں کو بھی نہیں بتاتا ہے۔“ مراد نے کہا۔ ”ہمیں سمجھنا ہوگا کہ اس مردود نے لارا کو کہاں چھپایا ہے؟ کیوں چھپایا ہے؟ کیا وہ لارا کو آئندہ ہمارے لیے مصیبت بنانا چاہتا ہے؟ یہ سمجھنا ہوگا کہ اسے ہمارے لیے کیسے مصیبت بنائے گا؟“

ماروی نے خیال خوانی کے ذریعے عذر باد سے کہا۔ ”بابا جانی کے پاس آؤ ہم سے باتیں کرو۔“ وہ مراد کے پاس آکر بولا۔ ”لارا کی گم شدگی میرے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ کاہن اور شیطان کے دوسرے اہم پرستار سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اسے غائب کیا ہے۔“ مراد نے کہا۔ ”ہم بھی یہی کہتے ہیں۔“

”میں کیوں اسے غائب کروں گا؟ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ پچھلے آٹھ برسوں سے چپ چاپ تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ نہ کسی کے لینے میں ہے، نہ کسی کے دینے میں ہے۔ تم سب مجھ پر شبہ کر سکتے ہو۔ یہ سوچ سکتے ہو کہ اسے آلہ کار بنا کر تم مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا کروں گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے مسائل پیدا کروں گا؟ اس کی اہمیت ہی کیا ہے؟ اس کے ذریعے تم لوگوں کو کیسے نقصان پہنچا سکوں گا؟ ہاں۔ اس کا بیٹا دانش تم لوگوں کے زیر اثر رہتا ہے اسے کسی تدبیر سے ماں کے زیر اثر لاسکتا ہوں لیکن ایسا کرنے کے لیے لارا کو کہیں غائب کیوں کروں گا؟ اسے بیٹے سے دور کیوں کروں گا؟“

اس کی یہ بات ماننے والی تھی کہ وہ اگر لارا کو کسی مقصد کے لیے آلہ کار بنا رہا ہے تو اسے کہیں چھپائے گا کیوں؟ ماروی نے کہا۔ ”تم نے ایسا نہیں کیا ہے۔ تمہارے شیطان نے کیا ہے۔ تب ہی وہ جانتا ہے کہ لارا زندہ ہے۔“ ”ہمارا شیطان پاتال میں چھپی ہوئی باتیں بھی جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ وہ ابھی کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی لیکن شیطان نے اسے وہاں نہیں پہنچایا ہے۔ اسے لارا سے کوئی دلچسپی ہوگی، اس سے کوئی کام لینا ہوگا تو وہ مجھے اس کے پاس پہنچا دے گا۔“

دانش نے کہا۔ ”اس سے بولو۔ میری ماں کا پتا ٹھکانا

بتائے، ایک بیٹے کو ماں کے پاس پہنچائے۔“

”اسے خدا سے بولو۔ وہ سمجھیں وہاں پہنچائے گا۔ وہ تو عالم الغیب کہلاتا ہے۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ تمہاری ماں ابھی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“

دانش نے مراد اور ماروی کو دیکھا۔ ”انہیں فی الحال قدرت کی طرف سے کوئی سہارا یا اشارہ نہیں مل رہا تھا۔ یوں بھی سنگین مسائل کو حل کرنے کے لیے تو کسی معجزے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔“

عذر باد نے کہا۔ ”تمہارا خدا ہو یا ہمارا شیطان، وہ اپنے بندوں اور پرستاروں کی ضرورتیں ہمیشہ پوری نہیں کرتے، جب ضروری سمجھتے ہیں تب ہماری تمہاری مدد کرتے ہیں۔“

دانش نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرما رہا ہے۔ میرے معبود نے میری ماں کو زندہ رکھا ہے۔ وہ میری عبادت و ریاضت کا صلہ مجھے دے رہا ہے۔ میں اللہ کو راضی کرتا رہوں گا۔ وہ میری ماں تک مجھے پہنچائے گا۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اچانک کہاں گم ہو گئی ہے؟ کیا وہ گم رہے گی؟ پردہ راز سے باہر نہیں آئے گی؟ اور آئے گی تو کیسے آئے گی؟

موجودہ حالات میں صبر کرنا اور انتظار کرنا تھا۔ کوئی جادو یا معجزہ ہی پس پردہ جانے والی کو پیش کر سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ خبر گرم تھی کہ ارض اسلام کی یونیورسٹی کے علما پانچ ملکوں میں تبلیغ دین کے فرائض ادا کرنے آرہے ہیں۔ چونکہ اب مراد سے دوستانہ تعلقات رکھنے تھے، اس لیے ان ممالک کے حکمران تبلیغی جماعتوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وعدہ کر رہے تھے کہ جب وہ دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے آئیں گے تو ان کے لیے بھرپور حفاظتی انتظامات کیے جائیں گے اور انہیں ہر طرح سے سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

وہ یہ اندیشہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ ان ملکوں کے غیر مسلم باشندے دینی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ مراد نے کہہ دیا تھا کہ وہ تمہارے ملکوں کے شریعت اور تخریب کار ہوں گے۔ تم ان سے نمٹنے میں ناکام رہو گے تو ہم ان سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔

دراصل وہاں کے حکمران اور اہم اکابرین ہی اپنے ملکوں میں اسلام کی تبلیغ اور پھیلاؤ نہیں چاہتے تھے لہذا وہ پردہ ایسی سازشیں ایسی تدابیر کی جارہی تھیں کہ جن پر عمل

رشتے داری ہے لیکن اندر سے کھوکھلی ہے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کھوکھلی کیوں ہے؟“

”عرشہ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اربوں کی دولت اور جائیداد اس کے نام ہے۔ اگر وہ مرجائے تو اس کی تمام دولت اور جائیداد عمیر کی ہو جائے گی۔ عمیر کا باپ بھی یہی چاہتا ہے کہ بہو مرجائے اور خزانہ ان کے نام ہو جائے۔ وہ عرشہ کو اس طرح ٹھکانے لگانا چاہتا ہے کہ ان باپ بیٹے پر کوئی الزام نہ آئے۔“

”کیا عرشہ اور اس کا باپ ان کے مذموم ارادوں سے بے خبر ہیں؟ وہ ایسے نادان تو نہیں ہوں گے۔“

”وہ باپ بیٹی جی بکے ہیں۔ عمیر اپنے باپ کا اکلوتا وارث ہے وہ باپ بیٹی چاہتے ہیں کہ عمیر لڑھک جائے۔ وہ بڑے دولت مند گھرانے ہیں۔ ان کے پاس دولت ہے، عزت ہے، شہرت اور عیش و عشرت ہے، صرف محبت اور انسانیت نہیں ہے۔“

وہ تمام اکابرین اپنی معلومات کے مطابق بول رہے تھے۔ ان گھرانوں کی ذہنی چھٹی باتیں شاعری طبع کے چند اونچے لوگ جانتے تھے۔ وہ بہت گہرے تھے۔ ان کی کوئی بات دیوار کے کانوں تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن مجرمانہ ذہنیت سے نکلی ہوئی باتیں مجرموں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی ہیں۔

اس چیف آفیسر نے عمیر کے باپ زبیر کو آفس میں بلا کر کہا۔ ”ہم اسپیشل برانچ کے لوگ اسپیشل معلومات رکھتے ہیں، ہم سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ میں جانتا ہوں، تم اپنی بہو عرشہ کو ختم کر دینا چاہتے ہو۔ کروڑوں اربوں ڈالر کا نیم جیتنا چاہتے ہو۔“

زبیر گھبرا کر حقیقت سے انکار کرنے لگا۔ جواد نے کہا۔

”ڈرتے کیوں ہو؟ میں تمہاری مشکل آسان کر دوں گا۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”پانچ لاکھ ڈالر سامنے رکھو۔ تمہارا خواب

چند گھنٹوں میں سچ ہو جائے گا۔“

”جواد صاحب! عرشہ کو قتل کیا جائے گا تو سب ہی ہم

باپ بیٹے پر شبہ کریں گے۔“

”شبہ کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ تم دونوں نے

اسے ہلاک کیا ہے۔ میں تیس کو چھیدہ بنا دوں گا۔ اس کی

لاش نہیں ملے گی اس کے قتل کا نہ ثبوت ملے گا، نہ تم لوگوں کو

کامل ثابت کیا جاسکے گا۔“

کر کے وہ تبلیغی مشن کو ناکام بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے لیے ایک مسلمان جواد سبحانی پر تکیہ کر رہے تھے۔ جواد سبحانی اس ملک کی اسپیشل برانچ کا چیف آفیسر تھا۔ ایسا درندہ صفت تھا کہ شریف آدمی اس کا نام سن کر لرز جاتے تھے اور بد معاش اس کے نام کی مالا جیتے تھے۔ اس سے محتاط بھی رہتے تھے۔ جب وہ دوست جتنا تو انہیں سزائے موت سے بچا لیتا تھا۔ دشمنی پر آتا تو بیچ چوراہے پر الٹا لٹکا دیتا تھا۔ کسی کو گولی مار دیتا تھا، کسی کو رازداری سے غائب کر دیتا تھا۔

وہ مسلمان فرانسیسی حکمرانوں کا بہت ہی پسندیدہ اور چہیتا افسر تھا۔ وہاں مسلمانوں کو بے جا دباؤ میں رکھتا تھا۔ ان کی دینی آزادی میں رکاوٹیں ڈالتا رہتا تھا۔ اس زمین پر ضمیر فروش مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں ایسے کروڑ پتی اور ارب پتی مسلمان تاجر ہیں جو اپنے مالی منافع کو قائم رکھنے کی خاطر دوغلی زندگی گزارتے ہیں۔

ایسے بااثر امیر کبیر مسلمان تاجران مخالفین کے بے جا رویوں کو نظر انداز کر کے عام مسلمانوں کا سر سہلاتے ہیں۔ ان کی تھوڑی بہت مدد کرنے کے لیے کبھی عارضی روزگار سے انہیں لگاتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے کئی سفیر بھی دوسرے ملکوں میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کی مشکلات اور مسائل کو اہمیت نہیں دیتے۔ ایسے تاجروں اور سرکاری شاعری ملازمین کرنے والے مسلمانوں سے جواد سبحانی کی خوب بھتی تھی۔ جواد ایسے مسلمانوں سے اور اس ملک کے حکمرانوں سے دولت، بدنام شہرت اور رعب و دبدبہ حاصل کرتا رہتا تھا۔

اب موجودہ سازش یہ تھی کہ وہ مخالفین تبلیغی جماعتوں کے لیے مسائل پیدا کرتے تو مسلمان اس پر اعتراض نہ کرتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا ہے؟

اور وہ سازش یہ بھی کہ وہاں مسلمان کو مسلمان سے لڑا

دیا جائے۔ ایک منشر نے کہا۔ ”ان مسلمانوں کے درمیان

فساد برپا کیا جائے۔ یہ آپس میں لڑیں گے تو اپنا کوئی دین

اور روحانی کام نہیں کر سکیں گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”یہ لوگ تو ہمیشہ آپس میں لڑتے

رہتے آئے ہیں۔ ان کے درمیان ماچس کی ایک تیلی سلگانی

ہوتی ہے پھر آگ خود ہی بھڑکتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”یہاں دو ارب پتی مسلمان

ہیں، ان کو آپس میں لڑایا جائے گا تو ان دونوں کی برادری کے

لوگ بھی خون خرابے پر اتر آئیں گے۔ ان میں سے ایک تاجر کا

بیٹا عمیر احمد اور دوسرے کی بیٹی عرشہ میاں بیٹی ہیں۔ اگرچہ بچی

جواد کے رازدارانہ تعاون سے مشکل آسان ہو رہی تھی۔ زیرِ راضی ہو گیا۔ وہ پہلے ہی ارب پتی تھا اب اور بے انتہا دولت مند بننے والا تھا۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ دینی معاملات میں رکاوٹ بننے والا ہے۔

زیرِ وہاں مسجد میں کمیٹی کا صدر تھا اور عرش کا باپ جبار خان سیکریٹری تھا۔ وہ دونوں ارضِ اسلام سے آنے والی تبلیغی جماعت کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ زیرِ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ایسے وقت عرش کا سرور یا اس کی گمشدگی سنگین مسائل پیدا کر دے گی۔ جبار خان اور اس کی برادری کے لوگ زیرِ کی مخالفت میں فساد کریں گے۔ پھر زیرِ کی برادری بھی خاموش نہیں بیٹھے گی۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ایسے بھڑکیں گے کہ تبلیغی فرائض کھانکی میں پڑ جائیں گے۔

جواد نے حکمرانوں کو اور یہودی اکابرین کو خوش خبری سنائی۔ ”میں نے ان کے پیروں تلے بارود بچھا دی ہے جو یہاں اپنے دین کے کرتا دھرتا ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد کمیٹی کا صدر ہے، دوسرا سیکریٹری ہے۔ یہ دونوں مسلمان اپنے ہی گھر کو آگ لگانے والے ہیں۔ بلکہ فسادات میں کئی مارے بھی جائیں گے۔“

اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ تالیاں بجانے لگے۔ دنیا دیکھتی آرہی ہے کہ مسلمان کس طرح اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔

یہ واردات تو ہونی تھی۔ لہذا ہو گئی۔ ایک رات عرش کے بیڈروم سے اس کی چیخ سنائی دی۔ ماں باپ اور بھتیجے دار۔۔۔ دوڑتے ہوئے آئے تو وہ خواب گاہ میں دکھائی نہیں دی۔ بیڈ پر لہو کے دھبے دکھائی دیے۔ اسے پوری رہائش گاہ میں پکارتے ہوئے تلاش کیا گیا۔ اگر اسے مل گیا جاتا تو اس کی لاش وہاں پڑی ہوتی۔ واردات کرنے والے اسے زخمی کر کے لے گئے تھے۔ کوشی کے باہر ایک مسلح گارڈ مردہ پایا گیا تھا۔ دوسرا زخمی اور بے ہوش تھا۔

جبار خان نے فوراً ہی زیرِ اور عمیر پر الزام لگا یا جیسی توقع کی گئی تھی۔ اس کے مطابق برادری کے لوگ بھی ان باپ بیٹے کے خلاف ہو گئے۔ وہاں پہلی بار مسجد کمیٹی اور دینی ادارے میں مسلمان، مسلمان کے دشمن ہونے لگے۔

جواد سبحانی فساد برپا کرنے کے بعد انہیں سمجھا رہا تھا کہ آپس میں نہ لڑیں۔ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ جب تک عرش کی لاش نہیں ملے گی، اس کا مل ثابت نہیں ہوگا۔ وہ ابھی کہیں زندہ ہوگی، اسے جاسوس اور پولیس والے تلاش کر رہے ہیں۔

حقیقتاً اسے نہ مل گیا تھا، نہ اسے تلاش کیا جا رہا۔

تھا۔ جواد نے اسے شہری آبادی سے سیکڑوں میل دور ایک ویران کالچ میں قیدی بنادیا تھا۔ اسے تھوڑا زخمی کیا تھا تا کہ لیبارٹری کی رپورٹ سے ثابت ہو کہ بیڈ پر عرش ہی کا لہو تھا۔ وہ باپ بیٹے عرش کی پراسرار گمشدگی سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے جواد سے کہا۔ ”آپ نے ہم سے پانچ لاکھ ڈالر زلیے لیے ہیں لیکن اسے ہلاک نہیں کیا۔ وہ پھر کسی دن واپس آئے گی اور اپنی دولت اور جائیداد ہم سے چھین لے گی۔“

جواد نے کہا۔ ”اسے بھول جاؤ۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

”آپ نے اسے زندہ کیوں رکھا ہے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مسجد کمیٹی کے دین دار مسلمانوں کا ایمان دیکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے منافع خوری کے لیے ایسے وقت عرش کے مرڈر کا سودا کیا ہے جبکہ دین کی تبلیغ کے لیے ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی سے علما یہاں آ رہے ہیں۔ تمہیں دین کی پروا نہیں ہے۔ مجھے تمہاری منافع خوری سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنا منافع دیکھتا ہوں اور پانچ لاکھ ڈالر زلیے تو تمہارے حریف جبار خان کو اس کی بیٹی کی لاش کسی چوراہے پر ملے گی۔“

وہ باپ بیٹے ہلاکت یا اغوا کی واردات کرانے کے بعد اس بد معاش افسر کو رازدار بنا چکے تھے۔ اس کی مٹھی میں آگئے تھے۔ اس کے مزید مطالبات پورے کرنے سے ہی انہیں عرش کی لاش کہیں نظر آسکتی تھی۔

ابھی اس کھیل کو آگے بڑھانا تھا۔ لہذا جواد سبحانی نے عرش کے باپ جبار خان سے ملاقات کی۔ اس سے کہا۔ ”بیٹی کا سوگ منانے سے وہ واپس نہیں آئے گی۔ اپنے داماد عمیر کو ٹھکانے لگا دو یا عرش کی طرح اسے بھی غائب کر دو تو زیرِ تمہاری بیٹی کی دولت اور جائیداد کا حق دار نہیں بن سکے گا۔“

جبار خان نے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کی دولت کا ایک تنکا بھی ان باپ بیٹے کو چھونے نہیں دوں گا۔“

اس نے جواد کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکیں گے؟“

”میں مدد کرنے ہی آیا ہوں۔ پانچ لاکھ ڈالر زلیوں کا اور آج ہی رات کو صبح ہونے سے پہلے عمیر کو غائب کر دوں گا۔“

جبار خان نے فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔۔۔۔

”یا خدا۔۔۔ کیا آج ہی اس کا منہ کو نکال بھیجیں گے؟ میں اس

چھوڑ دوں گا۔ پھر تم اپنی مقولہ بیوی کی دولت حاصل کر سکو گے بشرطیکہ میری ماہانہ آمدنی کا میٹر آن رکھا کرو گے۔“
وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ کیا ہوگا؟ تم دونوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ زندگی یا موت.....؟ دولت کی ہوس میں تم باپ بیٹی، باپ بیٹے، تم میاں بیوی ایسی جگہ پہنچ گئے ہو جہاں ایک دھکے سے موت کی گہری کھائی میں چلے جاؤ گے۔“

اس نے ان کو بری طرح پھنسا دیا تھا۔ وہ اس کے شکنجے سے کبھی نکلنے والے نہیں تھے۔ جواد اپنے ملک کے اعلیٰ حکام کو خوش کر رہا تھا کیونکہ اس کی چال بازیوں کے نتیجے میں مسلمان آپس میں لڑ پڑے تھے اور دوسرے دن ریاست ارض اسلام سے علمائے دین کی ایک جماعت وہاں پہنچنے والی تھی۔ دین و ایمان کے خلاف کس طرح پیچیدہ سازشیں ہوتی ہیں، یہ پہلے سمجھ میں نہیں آتا۔ اکثر تب سمجھ میں آتا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

دیے مراد اور ماروی بے خبر رہنے والے نہیں تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ شر پسند اپنے تخریبی ارادوں پر عمل کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ماروی بہت پہلے ہی جواد سبحانی کے دماغ میں جگہ بنا چکی تھی۔ وہ جسمانی طور پر طاقتور ہونے کے باوجود اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ نشے کا عادی تھا، شراب نوشی نے اس کے ذہن کو قدرے بے حس کر دیا تھا۔ اگر وہ نشے کا عادی نہ ہوتا، تب بھی ماروی اپنی غیر معمولی روحانی قوتوں سے اس کے چور خیالات پڑھ سکتی۔

مراد اپنی ریاست سے نکل آیا تھا۔ اسی شہر میں جواد سبحانی کے قریب ہی تھا۔ اس سے نمٹنے کے لیے اسی کا ہم شکل بن کر اسی کی چالیں چلنے والا تھا۔ دشمن کی نقل و حرکت کو، اس کی سازشوں کو اور اس کی مجرمانہ واردات کے طور طریقوں کو سمجھ رہا تھا۔

ماروی خیال خوانی کے ذریعے اسے سمجھا رہی تھی۔ جواد کی آواز اور لہجے کو آڈیو کے ذریعے اور حرکات و سکنات کو ویڈیو کے ذریعے دکھا رہی تھی۔ وہ اس طریقہ کار کے مطابق مکمل جواد سبحانی بن چکا تھا۔

اس نے بیٹی سے کہا۔ ”جواد کو چند گھنٹوں کے لیے کہیں غائب کر دو۔ وہ کسی کو نظر نہ آئے۔ میں اس کی جگہ لے کر گیم شروع کروں گی۔“

جواد جیسے کرمیل کی رہائش گاہ میں ایک تہ خانہ تھا۔ ماروی نے اس کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے تہ خانے میں

لا چکی داماد کی لاش دیکھنے کے لیے ابھی رقم ادا کروں گا۔“
جواد نے جبار خان سے بھی سودا طے کر لیا۔ اس کے لیے قتل اور اغوا کی واردات کرنا بچوں کا کھیل تھا۔ عمیر ٹائٹ کلب میں رمی کھیل رہا تھا۔ وہ ٹوائٹ میں آیا تو وہاں ماسک میں چھپے ہوئے دو گمن مینوں نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر اسی ویران کالج میں لے آئے، جہاں عرشہ کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔

وہ میاں بیوی وہاں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک گئے۔ عرشہ نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے اغوا کرایا ہے۔ اب یہاں دیکھنے آئے ہو کہ میں کس حال میں ہوں۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”بکو اس مت کرو۔ مجھے خود اغوا کیا گیا ہے۔ مجھے یہاں گن پوائنٹ پر لایا گیا ہے۔ یہ لوگ یقیناً تمہارے باپ کے زر خرید بد معاش ہیں، ہم نے جس بد معاش (جواد سبحانی) سے معاملات طے کیے تھے، اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔“

ایسے وقت جواد ان کے سامنے آ گیا۔ وہ دونوں اسے حیرانی سے نکلنے لگے۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم دونوں کو اغوا کیا ہے۔“

”تم باپ بیٹے چاہتے ہو کہ عرشہ کو ہلاک کر دیا جائے تو اسی طرح عرشہ کا باپ تمہاری ہلاکت چاہتا ہے۔ خاندانوں میں خون کے رشتوں میں درپردہ کیسی گھینگی چھپی رہتی ہے۔ تمہارے بزرگوں نے تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بڑی رقوم ادا کی ہیں۔“

اس نے اپنی گن نکال کر اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ابھی تک تم دونوں کو زندہ رکھا ہے۔ جب چاہوں گا ایک ایک گولی تمہارے اندر اتار دوں گا۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ”لیکن میں کوئی بچہ کھلاڑی نہیں ہوں۔ مجرم قانون سے کھیلتے ہیں اور میں مجرموں سے کھیلتا ہوں۔ کھیل یہ ہے کہ تم دونوں کو زندہ رکھوں گا اور ہر ماہ تمہارے بزرگوں سے پچاس پچاس ہزار ڈالر وصول کیا کروں گا۔“

وہ عمیر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارا باپ رقم ادا کرنے سے انکار کرے گا تو میں عرشہ کو زندہ اس کے باپ کے پاس پہنچا کر تمہارے باپ کے پاس تمہاری لاش پہنچا دوں گا۔ یوں عرشہ بیوہ ہو کر تمہاری دولت اور جائداد حاصل کر لے گی۔ ٹھیک اسی طرح عرشہ کا باپ ہر ماہ پچاس ہزار ادا کرنے سے انکار کرے گا تو میں تمہاری اس بیوی کو گولی مار کر تمہیں زندہ

پہنچا دیا۔ اس پر تنوعی عمل کر کے اسے اپنی ذات سے غافل بنا دیا۔ وہ عارضی طور پر وہاں سے نکلنے کا راستہ بھول گیا۔
مراد اس رہائش گاہ میں آکر جواد کے ماتحتوں اور سپاہیوں سے بولنے لگا۔ فون کے ذریعے حکمرانوں سے رابطہ کرنے لگا۔ اسے چہرہ تبدیل کرنے اور شخصیت کو بدل دینے میں مہارت حاصل تھی۔ وہاں کوئی اس پر شبہ نہیں کر رہا تھا۔
اس نے بیٹی سے کہا کہ جواد کو تہ خانے میں ہی رہنے دیا جائے۔ جب ضروری ہوگا تو اسے باہر لایا جائے گا۔ ماروی نے کہا۔ ”عمیر کے بھی اغوا ہونے سے دونوں برادری کے درمیان سخت کشیدگی پھیل گئی ہے۔ وہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے علاوہ شام تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ حالات کو جلد سے جلد معمول پر لانا ہوگا۔“
عرشہ اور عمیر ایک چھت کے نیچے قیدی بن گئے تھے۔ وہاں ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کانچ میں تین کمرے تھے۔ مراد نے دو کمروں کو لاکھ کر دیا۔ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں ساتھ رہنے اور سونے پر مجبور ہو گئے تھے۔
ماروی ان کے اندر رہ کر خیالات بدل رہی تھی۔ وہ اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر موت کو سر پہ منڈلاتے دیکھ کر غصے اور نفرت کو بھول گئے تھے۔ دولت کے لالچ اور آپس کی مخالفتوں کو نادانی تسلیم کر رہے تھے۔ ذرا دھیمے پڑ کر ایک دوسرے سے شکایتیں کر رہے تھے۔ صلح و صفائی کی روش اختیار کر رہے تھے۔
ماروی اور مراد کے اس طریقہ کار کے مطابق ان میاں بیوی کی عداوت، محبت میں بدل رہی تھی۔
اب انہیں اندیشہ تھا کہ جواد آکر دشمنی کرے گا۔ انہیں مار ڈالے گا لیکن انہیں میاں بیوی کی حیثیت سے گھر واپس نہیں جانے دے گا۔ ادھر مراد نے طے کر لیا تھا کہ ان دونوں کو اچانک ڈرامائی انداز میں ان کے گھر پہنچا دے گا تو جبار خان اور زبیر کی برادری والوں کو ان سے حقیقت معلوم ہوگی۔ غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ وہ عداوت پر اتر آئے والے مسلمان پھر ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں گے پھر تبلیغی مشن کسی رکاوٹ کے بغیر رواں دواں رہے گا۔
یہ تو دیکھنے میں آیا ہے کہ مشکل بھی آسانی سے آسان نہیں ہوتی۔ آسانی کے لیے بڑے پا پڑ بیٹے پڑتے ہیں۔ کانچ کے بند کمرے میں عمیر نے ہار بچھتا کر عرشہ کو بڑی محبت سے گلے لگایا تو شیطان کا دست راست عذر باد کھٹک گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اچانک دوست کیسے بن رہے ہیں؟
یہ معلوم کرنے کے لیے وہ جواد سبحانی کے دماغ میں

پہنچا۔ ماروی اس کی کھوپڑی کو لاکھ کر چکی تھی۔ اس کا لب و لہجہ اور سوچ کی لہریں مراد کے دماغ میں منتقل ہو گئی تھیں۔
لہذا شیطان بھٹک کر مراد کے اندر آ گیا۔
اس نے مراد سے کہا۔ ”جواد! تم نے عرشہ اور عمیر کے ذریعے بڑی کامیابی سے عداوت پھیلانی ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑایا ہے۔ ان کا تبلیغی مشن ناکام رہے گا لیکن دیکھ رہا ہوں کہ ان میاں بیوی میں دوستی ہو گئی ہے۔ ان کے خیالات بدل گئے ہیں۔ ان کی یہ تبدیلی ہماری کوششوں پر پانی پھیر دے گی۔ ان دونوں کو ختم کر دو۔“
مراد نے کہا۔ ”سوری۔ میں انہیں ہلاک نہیں کروں گا۔ اپنی پلاننگ کے مطابق کام کروں گا۔ انہیں ان کی برادری کے سامنے پہنچا کر کہوں گا کہ وہ میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور رہیں گے۔“
اس نے کہا۔ ”اب نہیں رہیں گے۔ ان کے خیالات بدل گئے ہیں۔ وہ پھر سے محبت کرنے والے میاں بیوی بن گئے ہیں۔ انہیں پھر سے ایک دوسرے سے متنفر کر دو۔“
”تم شیطان کے چیلے ہو۔ ان کے خیالات بدل دو۔“
وہ بولا۔ ”یہی کرنا ہوگا۔ میں ان کی سوچ بدلنے جا رہا ہوں۔“
وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مراد نے ماروی کو کال کی۔ اسے عذر باد کے متعلق بتایا۔ وہ بولی۔ ”میں عرشہ اور عمیر کے اندر رہوں گی۔ دیکھوں گی کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟“
ماروی ان کی طرف چلی گئی۔ وہ باپ بیٹی پچھلے آٹھ برسوں سے شیطان اور تین ٹیلی ویشن جاننے والوں سے دھوکا کھاتے آرہے تھے۔ ایک طویل مدت سے یہی سمجھتے آرہے تھے کہ تینوں شیطانی خیال خوانی کرنے والے ناکارہ اور بے ضرر ہیں۔ اب یہ بھید کھٹنے والا تھا۔
عذر باد اپنے ان خیال خوانی کرنے والوں سے ابھی کام لینا چاہتا تھا۔ لارا گم ہو گئی تھی۔ اب دو ٹیلی ویشن جاننے والے رہ گئے تھے۔ اس وقت آبنوس اپنے بیڈروم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کسی خیال میں محو تھا۔ عذر باد نے اس کے سامنے آکر چپکلی بجائی تو وہ چونک کر فوراً ہی یوں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ ٹیلی ویشن جاننے والا آبنوس ہے۔
اس نے سامنے کھڑے ہوئے عذر باد کو یعنی اپنے عامل کو دیکھا۔ عامل نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک میاں بیوی کے دماغوں میں پہنچا رہا ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ اب اچانک محبت کرنے لگے ہیں۔“

سے محروم نہیں تھا۔ ماروی نے فوراً دانش کو بلایا پھر مراد کے پاس آکر بولی۔ ”بابا جانی! ایک حیران کرنے والا تماشا ہو رہا ہے۔ تاریک دنیا کے تین ٹیلی پیتھی جاننے والے جو ناکارہ ہو گئے تھے، ان میں سے ایک آنکس اب ناکارہ نہیں رہا ہے۔ وہ عرشہ کے دماغ میں پہنچا ہوا ہے۔ میں اس سے نمٹنے کے بعد آپ کے پاس آؤں گی۔“

پھر وہ دانش سے بولی۔ ”جب آنکس خیال خوانی کر رہا ہے تو تمہاری مام کو بھی کرنا چاہیے لیکن وہ ابھی تک لاپتا ہیں۔ ان کا دماغ ان کا وجود نہیں مل رہا ہے۔ ابھی طاغوتا کے پاس گئی تھی۔ وہ فعال نہیں ہے۔ ابھی تک ناکارہ ہے۔ خیال خوانی کی صلاحیتوں کو بھولا ہوا ہے۔ آؤ ہم معلوم کریں کہ آنکس اچانک خیال خوانی کرنے عرشہ کے اندر کیسے پہنچ گیا ہے؟ شیطان کوئی نئی چال چل رہا ہے۔“

دانش بہن کے ساتھ عریشہ کے اندر آ گیا۔ وہ ماں کے لیے جذبات سے سرشار ہو کر سوچ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی ہوں گی، آنکس کی طرح خیال خوانی کر رہی ہوں گی۔ پتا نہیں ان کی موجودہ آواز اور سوچ کالپ ولجہ کیا ہے؟ یا میرے اللہ! میں مام تک کیسے پہنچوں؟

ماروی بڑی خاموشی سے آنکس کے اندر پہنچ گئی تھی۔ وہ روحانی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ماروی کی آمد سے بے خبر تھا۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی کہ وہ عذر باد کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی مرضی سے ضرورت کے وقت خیال خوانی کرتا ہے، اس کے بعد خود سے غافل ہو جاتا ہے۔

اس کے چور خیالات راز کھول رہے تھے۔ یہ بتا رہے تھے کہ پچھلے آٹھ برسوں میں پرنس عابی کو سلو پوائزن دینے کے لیے ان تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے؟

یہ زہریلی حقیقت مراد کو بتائی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ ”یا اللہ.....! یہ کیسی شیطانی سازش تھی۔ میرا پہاڑ جیسا بیٹا بڈیوں کا ڈھانچا بن گیا ہے۔ ہم اپنی ذہانتوں سے اور صلاحیتوں سے معلوم نہ کر سکے اور وہ آہستہ آہستہ گھلتا ہوا ختم ہوتا آ رہا ہے۔“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر کمال کو زوال ہے۔ عالی پر جو زوال آیا ہے، اسے ہم روک نہیں سکتے تھے۔ ہم شہ زور اور ناقابل شکست کہلانے والے قانون قدرت سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ کیسی بے بسی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ دشمن ٹیلی

تم ان کی سوچ کو اور ان کے جذبات کو بدل دو۔ ان کے دلوں میں پھر نفرت اور عداوت پیدا کر دو۔“

اس نے آنکس کو وہاں کے حالات سمجھا کر عرشہ اور عمیر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ باری باری ان کے اندر خاموشی سے جا کر خیالات پڑھنے لگا۔ جب تک خیال خوانی کے ذریعے نہ بولتا تب تک یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کے دماغوں میں کوئی پہنچا ہوا ہے لیکن ماروی نے روحانی ٹیلی پیتھی کی قوت سے معلوم کر لیا کہ اس وقت عرشہ کے اندر پرانی سوچ کی لہریں ہیں۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگی۔ تین ٹیلی پیتھی جاننے والے تو ناکارہ ہیں۔ پھر عرشہ کے دماغ میں یہ کون آیا ہے؟ وہ ابھی خاموش تھا۔ ایک ذرا بھی بولتا تو ماروی اس کے لب ولہجہ کو سن کر اس کے دماغ پر بھی دھاوا بول دیتی۔ ابھی وہ حیرانی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نیا خیال خوانی کرنے والا پیدا ہو گیا ہے۔

آنکس تھوڑی دیر تک عرشہ کی سوچ کو پڑھتے ہوئے اس کے من مزاج کو سمجھتا رہا پھر اس نے مخاطب کیا۔ ”عرشہ! انسان کے اندر منفی اور مثبت سوچیں ہوا کرتی ہیں۔ میں تمہاری ایک اچھی مثبت سوچ ہوں۔ تمہیں فریب اور نقصان سے بچانے آیا ہوں۔“

آنکس کی آواز اور لب ولہجہ سنتے ہی ماروی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ خیال خوانی کا ایک مردہ آٹھ برس بعد زندہ ہو گیا تھا۔ اچانک کیسے زندہ ہو گیا تھا؟

فوراً ہی دماغ نے کہا۔ ”یہ شیطانی چال ہے۔ خیال خوانی کرنے والے کو مدتوں سے مردہ بنا کر رکھا گیا تھا۔ پھر تو لارا اور طاغوتا بھی مردہ بن کر رہتے ہوں گے۔ پھر تو وہ بھی اس وقت خیال خوانی کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان کی بھی خبر لینی چاہیے۔“

لارا جسمانی اور دماغی طور پر گرم تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود اب تک اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ اس کے باوجود ماروی نے پھر ایک بار اس کی سوچ کی لہروں کو اور اس کے لب ولہجہ کو گرفت میں لیا۔ اس کے اندر پہنچنا چاہا تو بھٹکتی رہ گئی۔ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ وہ زندہ تھی اور ٹیلی پیتھی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں مل رہا تھا۔

وہ طاغوتا کے دماغ میں آئی۔ اس نے ماروی کو اپنے اندر محسوس نہیں کیا۔ اس کی سوچ سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آٹھ برس سے خود کو بھولا ہوا ہے اور ٹیلی پیتھی نہیں جانتا ہے۔ یعنی اس وقت صرف آنکس بیدار تھا۔ وہ ٹیلی پیتھی

متحد ہو جاتے۔ دشمنی ختم ہو جاتی۔
اس نے جواد سبحانی (مراد) کے پاس آکر کہا۔
”عرشہ اور عمیر کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ دونوں کی لاشوں کو
ان کے گھر تک پہنچاؤ، تب ہی فسادات برپا ہوں گے۔“
مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”بڑے نیک ارادے ہیں۔
ابھی پریزیڈنٹ ہاؤس میں جا رہا ہوں۔ وہاں اعلیٰ حکام اور
آرمی کے افسران کو ایک تماشہ دکھاؤں گا۔ تم بھی دیکھو گے،
وہاں چلے آؤ۔“

ایک گھنٹے بعد صدر کے محل میں اعلیٰ حکام اور افسران
موجود تھے۔ ماروی جواد سبحانی کے اندر پہنچ کر اسے تہ خانے
سے باہر لے آئی۔ اس کی یادداشت بھی واپس لے آئی۔ وہ
خود کو جواد سبحانی کی حیثیت سے پہچاننے لگا۔ ایسے وقت اس
کے دماغ میں یہ خیال نقش ہو گیا تھا کہ اسے کسی نے محرزہ
کر کے قیدی بنا کر رکھا تھا۔ اب ہوش و حواس میں رہ کر صدر
کے پیلس میں جا رہا ہے۔

وہ وہاں پہنچا تو ایک نہیں دو جواد سبحانی کو دیکھ کر سب
ہی حیران رہ گئے۔ مراد نے جواد کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے
پوچھا۔ ”اے! تو کون ہے؟ بالکل میرے جیسا ہے۔“
جواد ایک ہم شکل کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔
”میں تیرے جیسا نہیں ہوں۔ تو میرے جیسا بن کر آیا ہے۔“
وہ تمام اکابرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کسی نے مجھے
جادو کے یا ٹیلی پتھی کے ذریعے قیدی بنا دیا تھا۔“
مراد نے کہا۔ ”یہ جھوٹ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ
تجھے نہیں، مجھے کسی نے قیدی بنا دیا تھا۔ میں ابھی وہاں
سے آ رہا ہوں۔“

مراد نے تمام اکابرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
”یہ میری جگہ لے کر جواد سبحانی بن کر ہمیں نقصان
پہنچانے آیا ہے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”بات سمجھ میں آرہی ہے۔
ماروی نے ہمیں الجھانے اور ہمارے مشن کو ناکام بنانے کے
لیے ایک جعلی جواد سبحانی پیدا کیا ہے۔ اس جعلی کو اصلی ثابت
کر کے ہمارے جواد سبحانی کو ہم سے بدظن کرنا چاہتی ہے اور
ہمارے ہی ہاتھوں سے اسے نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ہم دھوکا نہیں کھائیں گے۔
یہاں جو فراڈ آیا ہے، وہ سیدھی طرح خود کو ظاہر کر دے۔
ورنہ ہم اس کی گردن دیوچنے کے بعد اسے گولیوں سے چھلنی
کر دیں گے۔“

تمام اکابرین اور جاسوس ان دو عدد جواد سبحانی

تحتقی جاننے والوں کو سزائے موت دیں گے۔ آئندہ بھی
یہی ہوگا، شیطانی قوتوں سے لڑتے رہیں گے لیکن قدرتی
زوال سے اور ناکامیوں سے بھی دو چار ہوتے رہیں گے۔“
وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ”کسی نے مجھ سے ایسی دشمنی
آج تک نہیں کی۔ شیطان میرے بیٹے کو ختم کر چکا ہے۔
میں اسے ختم نہیں کر سکوں گا۔ ہم بھی شیطان کو مار نہیں سکتے۔
میں اس کے چیلوں کو آواز کاروں کو اور ٹیلی پتھی جاننے
والوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔..... اور یہ خیال خوانی کرنے
والے تو بڑے محصوم بنتے رہے۔ خود فراموشی کی آڑ میں
میرے بیٹے کو مارتے رہے۔“

وہ دانش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لارا ماں ہو کر تمہیں پہچاننے
سے انکار کرتی رہی اور عابی کو پہچان کر دشمنی کرتی رہی۔“
وہ سر جھکا کر بولا۔ ”بے شک مام نے ناقابل معافی
جرم کیا ہے لیکن شیطان کے شکنجے میں رہ کر کیا ہے۔ اگر وہ
مردود مام کو سوچتے سمجھنے کی آزادی دیتا تو وہ بھی بھائی جان
(عابی) سے دشمنی نہ کرتیں کیونکہ انہوں نے زومبی گانا جیسے
درندے جادوگر سے ان کی آبرو بچائی تھی۔“

وہ ماں کی صفائی پیش کر رہا تھا۔ ”بابا جانی! آپ کی
روحانی صلاحیتوں سے مام بھی روتی تھیں۔ وہ بھائی جان کو
کبھی اپنی خیال خوانی سے نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں
کر سکتی تھیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ ان کی مجبوریوں کو
سمجھیں۔ کوئی سخت سزا نہ دیں۔ اللہ کرے وہ زندہ سلامت
ہوں۔ واپس آئیں گی تو اب انہیں شیطان کے شکنجے سے
نکلانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“

مراد نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”اللہ کرے
وہ زندہ ہو اور واپس آئے۔ میں ایک ماں کے لیے بیٹے کے
ولی جذبات سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ واپس آئے اور
تمہیں سینے سے لگائے۔“

ادھر عذر باد دیکھ رہا تھا کہ برسوں سے چھپائے رکھنے
والا راز کھل گیا تھا۔ مراد انتقامی کارروائی کی انتہا کر دے
گا۔ اس کے تین ٹیلی پتھی جاننے والوں کی شامت آگئی
تھی۔ ان تینوں کی سلامتی کے لیے آئندہ مراد اور ماروی
سے جنگ لازماً ضروری ہو گیا تھا۔

پھر یہ کہ تبلیغی مشن کو ناکام بنانے کی جو کوششیں
کامیاب ہو رہی تھیں، وہ اب ناکام ہوتی دکھائی دے رہی
تھیں۔ ماروی نے عرشہ اور عمیر کے ضمیر کو جگا دیا تھا۔ ان
میاں بیوی کو جب بھی واپس لایا جاتا تو وہ محبت اور صلح صفائی
کی باتیں کرتے۔ مسلمانوں کے جو دو گروہ بن چکے تھے، وہ

کو بڑی توجہ سے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ ماروی کی ٹیلی جیسی انہیں بچا نہیں سکے گی۔ جو بہرہ و پیا ہوگا، اس کی لاش وہاں سے جائے گی۔

مراد نے کہا۔ ”بچ ابھی سامنے آجائے گا۔“
اس نے ایک منشر سے کہا۔ ”جناب عالی! کل آپ نے عرشہ کے بارے میں فون پر مجھ سے کچھ کہا تھا۔ وہ بات صرف میں جانتا ہوں۔ اگر یہ فراڈ نہیں ہے تو اس سے پوچھیں۔ آپ نے فون پر کیا کہا تھا؟“
منشر نے جواد سبحانی سے پوچھا۔ ”ہاں بولو، کل میں نے فون پر کیا کہا تھا۔“

جواد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں کیسے بتاؤں؟ مجھے تو دشمنوں نے قیدی بنا کر رکھا تھا۔“

ایسے وقت ماروی نے جواد کے دماغ میں تحریک پیدا کی۔ اس نے اپنے لباس سے ریوالور نکال کر مراد کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اصلی ہوں۔ اس نقلی کو زندہ نہیں رہنے دوں گا۔“

سپاہیوں نے فوراً ہی آکر اسے پکڑ لیا۔ آری کے ایک افسر نے اس سے گن چیمین کر کہا۔ ”خود کو اصلی کہہ کر ہمارے اصلی کو گولی مارنا چاہتے ہو۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم نقلی ہو۔“
مراد نے کہا۔ ”میں نے عرشہ اور عمیر کو جہاں چھپا کر رکھا ہے وہاں سے ابھی ان کی لاشیں لا کر ان کے رشتے داروں کے سامنے بھیجیوں گا تو مسلمانوں کے درمیان فسادات کی آگ بھڑک اٹھے گی۔“

جواد کا دماغ ماروی کی گرفت میں تھا۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق بولا۔ ”ہرگز نہیں۔ میں عرشہ اور عمیر کو ہلاک نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے پلاننگ بدل دی ہے۔ وہ زندہ رہیں گے۔ میں ان میاں بیوی کے ماں باپ کو مار ڈالوں گا تو ان کی ہلاکت کے باعث فساد کی آگ بھڑک جائے گی۔ مجھے اپنی پلاننگ پر عمل کرنے دو۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”تم عرشہ اور عمیر کو ہلاک کیوں نہیں کرنا چاہتے؟“

وہ بولا۔ ”عرشہ پر میرا دل آگیا ہے۔ میں اسے داشتہ بنا کر رکھوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”آپ حضرات ابھی طرح جانتے ہیں کہ جواد سبحانی عاشق مزاج نہیں ہے۔ میں حسین عورتوں کو کبھی منہ نہیں لگاتا۔ ہمارا مقصد تبلیغی مشن کو ناکام بنانا ہے۔ ایسے اہم اور سنگین موقع پر یہ بہرہ و پیا عرشہ سے عشق کر رہا ہے۔ میں ابھی جا کر عرشہ کی لاش مسلمانوں کے پاس پہنچا دوں گا۔“

ایک آری افسر نے مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بے شک! تم ہمارے جواد سبحانی ہو۔ یہ بہرہ و پیا ہے۔ اسے یہاں سے جانے نہ دو۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”یہ مراد اور ماروی کا آدمی ہے۔ اسے زندہ نہ چھوڑو۔ اس کی لاش اس روحانی قوت رکھنے والی کے پاس پہنچا دو۔“

ایک افسر نے اپنی گن کے ٹریگر کو دوبارہ انتہائی مکار درندہ کہلانے والا جواد سبحانی گولی لگتے ہی پتھ مار کر ایک صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔ ”میں..... میں تمہارا جواد سبحانی ہوں۔ پچھلے بیس برسوں سے تمہاری غلامی کر رہا ہوں۔ تمہارا نمک حلال چیف آفیسر ہوں۔ میں نے مسلمان ہو کر یہاں کبھی مسلمانوں کو پہنچنے نہیں دیا۔“

ماروی نے اس کے غلامانہ الفاظ کو بدل دیا۔ وہ مراد کی طرف انگلی اٹھا کر بولنے لگا۔ ”تو بھی میری طرح حرام موت مرے گا۔ یہ یہودی اور عیسائی تجھے بھی میری طرح حرام موت ماریں گے۔ یہ جتنے حکمران ہیں، یہ کتنے ہیں۔ میں ان پر تھوکتا ہوں۔“

وہ تمام لوگ یہ گالی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں سنا کہا جائے۔ کئی سمتوں سے تڑا تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ جن کے لیے اپنے مسلمانوں سے غداری کرتا رہا، وہی اسے انعام دے رہے تھے۔

وہ چھلٹی ہو کر جہنم میں چلا گیا۔

مراد نے کہا۔ ”یہ کجبت ماروی کا آلہ کار تھا۔ اب وہ کوئی دوسری چال چلے گی۔ میں اس سے پہلے ہی جا کر عرشہ کو ہلاک کر دوں گا اور اس کی لاش مسجد کے سامنے پھینکوا دوں گا۔“

وہ وہاں سے چلا گیا۔ تمام اعلیٰ حکام اور آری کے افسران اپنے پیروں پر آپ کلبھاڑی مار کر مطمئن تھے۔ اب نئے تماشے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ ریاست ارض اسلام کا حاکم مراد علی منگی اسکائپ کے ذریعے کچھ بولنے والا ہے۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ کیا بولے گا۔ ماروی ہمارے خلاف ناکام رہی ہے۔ وہ غصے سے تھلا کر ہمیں چیلنج کرے گا۔“

ایسے وقت عذریہ باد نے آکر پوچھا۔ ”تم لوگوں نے بہرہ و پیا جواد سبحانی کو مار ڈالا ہے لیکن وہ اصلی کہاں ہے؟ میں اس کے دماغ میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی سوچ کی لہریں نہیں مل رہی ہیں۔“

ہمارے تبلیغی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کر سکے گا؟ اپنے ملک میں میری قوت اور حکمت عملی دیکھو۔ تم میں سے کوئی نہ عرشہ اور عیسر کو قتل کر سکے گا، نہ مسلمانوں کے درمیان نفرت اور فساد پھیلا سکے گا۔ اگر ایک عرشہ یا عیسر کو ہلاک کرنے کی حماقت کرو گے تو میں یہاں کے تمام اعلیٰ حکام اور آرمی افسران کی بیٹیوں اور بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ ایک مسلمان کو ہلاک کیا جائے گا تو میں تمہاری دس نسلوں کو خاک میں ملا دوں گا۔“

دشمنوں کے بیوی بچوں سے کبھی دشمنی نہیں کی جاتی۔ انہیں جانی نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔ مراد محض انہیں دھمکیاں دے رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو مسجد سے اور مسلمانوں سے دور رہو۔ عرشہ اور عیسر گھر واپس آ رہے ہیں۔ انہیں سکیورٹی فراہم کرتے رہو۔

وہ ماروی کی روحانی قوتوں کے آگے دم نہیں مار سکتے تھے پھر یہ کہ مراد ایک طویل مدت کے بعد ریاست سے باہر میدان عمل میں آیا تھا ایک عرصے بعد ان سے ایسے نمٹ رہا تھا کہ تمام مخالفین اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرشہ اور عیسر اسی شام گھر آ گئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ وہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جانی دشمن نہیں ہیں۔ اب وہ دین و ایمان کے مطابق محبت سے زندگی گزاریں گے۔

یوں بازی پلٹ گئی۔ مسلمانوں کے درمیان مضبوط اتحاد پیدا ہو گیا۔ دوسرے دن تبلیغی جماعت وہاں آئی تو بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا گیا۔ مخالفین خاموش تماشا کی بنے دور سے ایمان پرور اجتماع کو دیکھتے رہے۔ حالات سے مجبور ہو کر ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں لیکن سر نہیں جھکے تھے۔

شر پسند جھکنا نہیں جانتے۔ وہ عارضی طور پر خود کو شکست خوردہ تسلیم کرتے ہیں۔ دشمنی سے باز آ جانے کا وعدہ کرتے ہیں پھر وہی چال بے ڈھنگی کے مصداق دوستی کے پردے میں دشمنی کی بارود بچھا کر اچانک دھماکے کرتے ہیں۔

عذر باد نے مراد کے پاس آ کر کہا۔ ”بے شک ابھی تمہارا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔ ان بے چارے حکمرانوں کو اور دیگر مخالفین کو دھمکیاں دے رہے ہو کہ آئندہ دشمنی کے نتیجے میں ان کی بیٹیوں اور بیٹوں کو ہلاک کرو گے۔ وہ بے چارے ہم گئے ہیں، تم سے دشمنی کی جرأت نہیں کریں گے۔“

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ مراد نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ

ایک افسر نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ زندہ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گیا ہے۔ پھر اس کا دماغ تمہیں کیوں نہیں مل رہا ہے؟“ وہ بولا۔ ”تم لوگ دھوکا کھا چکے ہو۔“

”کیا؟“ سب نے چونک کر عذر باد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”اس کا دماغ اس کی سوچ کی لہریں نہیں ملتیں، جو مردہ ہو جاتا ہے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ جواد یہاں سے جا کر مردہ ہو گیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”کچھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ یا تو یہاں سے جانے والا جواد مر گیا ہے یا پھر وہ جواد نہیں ہوگا۔ تم لوگوں نے اسلی کو یہاں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔ بہر حال جو مر چکا ہے، وہی اسلی تھا اسی لیے مجھے اس کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”جو جواد یہاں سے گیا ہے، اسے فون پر کال کرو۔ وہ زندہ ہوگا تو جواب دے گا۔“

ایک افسر نے اس کے نمبر سچ کیے۔ فون کو کان سے لگا یا۔ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”آپ کے مطلوبہ نمبر پر فی الحال رابطہ نہیں ہو رہا تھوڑی دیر بعد کال کریں۔“

اسی وقت اسکاٹ کے ذریعے رابطہ ہو گیا۔ جب اسکرین روشن ہوئی تو سب ہی چونک پڑے۔ وہاں مراد کی جگہ جواد سجانی دکھائی دے رہا تھا جبکہ یہ کہا گیا تھا کہ ارض اسلام کا حکمران مراد علی منگی بولنے والا ہے۔

چند لمحوں تک جیسے سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر ایک افسر نے پوچھا۔ ”جواد ایہ تم ہو؟ ہم سے کہا گیا تھا کہ.....“ مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”میں جواد نہیں ہوں۔ یہ درست کہا گیا تھا کہ ابھی یہاں سے مراد بولنے والا ہے اور میں بول رہا ہوں۔“

وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ ان کے سامنے جواد کی صورت میں مراد علی منگی بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے وقادار غلام چیف آف انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو بری طرح حرام موت مارا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے مجھے ریاست سے باہر آنے پر مجبور کر دیا، لو میں آ گیا ہوں۔ تم سب شیطان کے تابعدار ہو۔ اس سے پوچھو، کیا وہ تمہاری مشکل آسان کرے گا؟ مجھے یہاں سے بھاگتے پر مجبور کر سکے گا؟ میں جواد بنا بیٹھا ہوں۔ کیا مجھے پکڑ کر تمہارے سامنے جھکا سکے گا؟ کل میری ریاست سے تبلیغی جماعت آرہی ہے۔ کیا

بڑے مزے میں بولا۔ ”شیطان کی نہ کوئی بیوی ہے، نہ بیٹی بیٹے ہیں۔ تم اسے کیسی دھمکیاں دو گے؟ اسے تو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکو گے؟“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”جیت تب ہوتی ہے جب دشمن مات کھاتا ہے، شیطان کو کیسے مات دو گے؟ اسے موت نہیں آتی۔ کیسے مارو گے؟ زیادہ سے زیادہ اس کے چیلوں کو، تابعداروں کو ہلاک کرو گے۔ ایسا کرنے سے شیطان کا نہ کبھی کچھ بگڑا ہے، نہ تم اس کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ تمام ممالک کے حکمران اور دیگر اکابرین میری پناہ میں ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ وہ تم سے دشمنی کرنے کے لیے سامنے نہیں آئیں گے۔ سامنے صرف شیطان رہے گا یعنی میں اس کا دست راست تم سے نمٹنے کے لیے کافی ہوں۔ تم حکمرانوں کو اور دیگر مخالفین کو کسی ثبوت کے بغیر الزام نہیں دے سکو گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے، ہر ملک ہر علاقے میں شیطان آدمی کے ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کا ہر فرد اپنی ذات میں ایک شیطان ہے اور ہر شیطان میں ایسی بارود بھری ہے کہ ان سے ٹکراتے ہی تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”بہت بول رہے ہو۔ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے اور کتنا بولو گے؟ میں تم لوگوں کا طریقہ کار اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ مجھ سے مخالفت رکھنے والے حکمران اور یہودی لابی کے اکابرین دشمنی کرنے کے لیے بھی کھل کر سامنے نہیں آئیں گے۔ بظاہر دوستی، بھائی چارگی اور سفارت کاری ہوگی۔ دشمنی کے تمام حربے شیطان کے ذریعے جاری رکھے جائیں گے۔ وہ مردود و بچھلے آٹھ برسوں سے تین ٹیلی فنی جتنے والوں کو بڑی مکاری سے ہمارے خلاف استعمال کرتا رہا ہے۔ اس نے میرے پہاڑ جیسے بیٹے کو ریزہ بنا دیا ہے۔ میں ان تینوں کو ابھی ہلاک کر سکتا ہوں لیکن جس طرح میرے بیٹے کا جسم رفتہ رفتہ ٹکٹا آیا ہے، اسی طرح میں ان تینوں کو دن رات اذیتوں میں مبتلا کر کے ماروں گا۔ آئندہ تم انہیں استعمال نہیں کر سکو گے۔“

عذر باد نے کہا۔ ”ہمارا شیطان ان خیال خوانی کرنے والوں کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایسی قوت والا ہے کہ کسی کے بھی دل و دماغ میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ نمازی، متقی، پرہیزگار بھی اسے اپنے اندر آنے سے روک نہیں پاتے۔“ مراد نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے۔ وہ مجھ پر خیال خوانی کے حملے نہیں کر سکے گا۔ بظاہر سیاسی و سماجی محرمانہ حملے کرتا رہے گا۔ وہ

اپنی شیطانی فطرت سے باز نہیں آئے گا اور ہم اپنے ایمانی فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ ثابت قدم رہیں گے۔“

عذر باد نے کہا۔ ”ہمارے ٹیلی فنی جتنے والوں کے سلسلے میں سمجھوتا کرو۔ انہوں نے کبھی ہوش و حواس میں رہ کر پرنس عالی سے دشمنی نہیں کی۔ میں ضرورت کے وقت انہیں استعمال کرتا رہا اور وہ سحر زدہ رہ کر میرا کام کرتے رہے۔ انہیں سزا نہیں دے دو۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہم ان تینوں کو چھ ماہ کے لیے تمہارے حوالے کر دیں گے، تم انہیں اپنا محکوم اور تابعدار بنا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکو گے۔ وہ غائب دماغ رہ کر تمہارے وقادار رہیں گے۔ انہیں دھوکا اور بے ایمانی یاد نہیں رہے گی۔ اگر میں کبھی ان کے اندر جا کر کوئی چال چلوں گا تو ماروی خیال خوانی کے ذریعے ان کی چوری اور غداری کو سمجھ لیا کرے گی۔“

”یہ مشورہ اپنے ہی پاس رکھو۔ ہمیں کسی ٹیلی فنی جتنے والے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بے شک! وہ تمہارے لیے ضروری نہیں ہیں لیکن انہیں سزائیں دینے کے طور پر اپنا قیدی اور محکوم بنا کر ان سے مشقت لے سکتے ہو۔ ہم دانش کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ یہ جانتے ہیں کہ تم نے اسے پٹا بنایا ہے جبکہ وہ لارا کا بیٹا ہے۔ وہ اپنی ماں کی بہتری اور سلامتی تم سے چاہے گا۔“

مراد نے دل ہی دل میں تسلیم کیا۔ پٹا بھی چاہتا تھا اور وہ دانش کے دل کو بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

عذر باد نے کہا۔ ”دانش چاہے گا کہ اس کی ماں چھ ماہ تک تمہاری قید میں ہی رہے، زندہ سلامت رہے۔“

لارا دانش کی وجہ سے اہم ہو گئی تھی۔ اگرچہ ابھی لاپتا تھی لیکن کبھی واپس آ سکتی تھی۔ مراد جانتا تھا کہ اسے سزائیں دے گا تو پٹا خاموشی سے برداشت کرتا رہے گا۔ انصاف کے تقاضوں کو ماننا رہے گا لیکن اندر سے ٹوٹ جائے گا۔

اس نے عذر باد سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں مجھے دانش کی خاطر سمجھوتا کرنا چاہیے۔ اس کی ماں لاپتا ہے مگر کسی دن کسی وقت آ سکتی ہے۔ وہ تین خیال خوانی کرنے والے چھ ماہ تک میرے قیدی اور غلام بن کر رہیں گے۔ اگر وہ چھ ماہ تک سچائی اور دیانتداری سے رہیں گے تو انہیں قید سے رہائی دوں گا لیکن پوری آزادی نہیں دوں گا۔ انہیں شیطان کی پناہ میں واپس نہیں جانے دوں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ

www.paksociety.com

میں پھڑپھڑا کر مرجاتا لیکن وہ بہت ہی سخت جان تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا تھا پھر بھی روح نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑا رہتا تھا۔ کچھ بول نہیں پاتا تھا۔ اس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ ساعت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اسے اذان بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

مراد اپنے ذاتی طیارے میں واپس آ گیا تھا۔ محل میں بیٹے کے پاس تھا۔ اس کے کمرے میں عبادت کر رہا تھا۔ رب کریم سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ زندگی ہے تو اسے مل جائے۔ نہیں ہے تو سکون سے اس کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ ایک دن سب کو جانا ہے۔ پہلے باپ کو جانا تھا لیکن بیٹے کا بلاوا آ رہا تھا۔ ایسے وقت عذر باد نے آ کر کہا۔ ”تمہارا بیٹا آسانی سے نہیں مرے گا۔ جب یہ صحت مند اور شہ زور تھا، تب بھی موت آ کر اسے ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ اب بھی یہی نظر آ رہا ہے۔ موت اسے نہیں چھو رہی ہے۔ شیطان اور اس کے تابعدار خوش خبری سننے اور جشن منانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے راستہ دو۔ میں اسے ابھی اوپر پہنچا دوں گا۔“ وہ اجازت کے بغیر عالمی کے کمزور دماغ میں گھس کر اسے ہلاک کر سکتا تھا لیکن راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ماروی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تو کسی کے بھی دل و دماغ میں گھس جاتا ہے لیکن میں بھائی جان کے اندر ہوں۔ تجھے قریب نہیں آنے دوں گی۔“

وہ بولا۔ ”اس طرح تم بھائی سے دشمنی کر رہی ہو۔ یہ جاکتی کے عذاب میں ہے۔ نہ جان جا رہی ہے، نہ رہ رہی ہے۔ جاتے جاتے انک رہی ہے۔ اسے مرجانے دو۔ مجھے اس پر احسان کرنے دو۔“

وہ غصے سے بولی۔ ”چلے جاؤ یہاں سے.....“ ایسے وقت شیطان نے عذر باد کے ذریعے ہتے ہوئے کہا۔ ”میں ازل سے ناقابل شکست ہوں۔ کوئی مجھے مار سکتا ہے نہ میرا راستہ روک سکتا ہے۔ خدا نے مجھے قیامت تک آزاد اور بے لگام رکھا ہے۔“

”صرف وہی خدا مجھے روک سکتا ہے اور تمہارا وہ معبود جانتا ہے کہ مجھے شہ پسند اور بے لگام کیوں رکھا گیا ہے۔ بہر حال تمہارے بھائی کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ نہیں ہوا ہے تو میں پورا کر رہا ہوں۔ میں اس کی ناک میں گھس کر سانسوں کو الجھا کر تڑپاؤں گا۔ اسے جی بھر کے اذیتیں پہنچاؤں گا پھر اسے زندگی کی چوکھٹ سے باہر پھینک دوں گا۔“

وہ بول رہا تھا۔ ماروی، مراد اور دانش وہاں عذر باد کو

وہ تینوں ہمارے دین کی چھاؤں میں آ جائیں۔“ دانش وہاں دوسرے کمرے میں بیٹھان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ عذر باد اور شیطان کے کسی چیلے کے سامنے نہیں آتا تھا۔ کوئی دشمن اسے صورت شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

عذر باد نے آنسو اور طاغوتا کو مراد کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں اس کے سامنے آ کر ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ عذر باد نے کہا۔ ”شیطان تم دونوں کو مراد علیٰ منگی کی انتقامی کارروائی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس لیے تمہیں اپنی بندگی اور تابعداری سے آزاد کر رہا ہے۔ تم دونوں ابھی اس لمحے سے مراد کے قیدی اور تابعدار ہو۔“ آنسو نے کہا۔ ”شیطان ہمارا خالق ہے۔ ہم اس کی پرستش کرتے رہیں گے، اسی کے تابعدار رہیں گے۔“

طاغوتا نے کہا۔ ”ہمیں سزا میں منظور ہیں لیکن یہاں غلامی منظور نہیں ہے۔ ہم صرف شیطان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہیں گے۔“

عذر باد نے کہا۔ ”یہ شیطان کا حکم ہے۔ تعمیل کرو اور کرتا ہی ہوگی۔ اگلے چھ ماہ تک ان مسلمانوں کے غلام بن کر رہنا ہوگا۔“

مراد نے کہا۔ ”غلام بن کر رہو گے یا پھر حرام موت مرو گے غلام بن کر رہو گے تو میں تم لوگوں کی وقاداری کو آزماؤں گا۔ اگر شیطان کو خوش کرنے کے لیے ہمارے خلاف کوئی حرکت کرو گے تو میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

عذر باد نے ان سے کہا۔ ”مراد سے بحث نہ کرو۔ شیطان کے حکم کی تعمیل کرو۔ چھ ماہ تک زندہ رہو گے۔“ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے چھ ماہ تک سانس لیتے رہنے کے لیے مراد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

ان دنوں وہ برہمگم میں تھے۔ ریاست ارض اسلام کی دوسری تبلیغی جماعت وہاں آئی ہوئی تھی۔ دشمنوں کو اچھا سبق حاصل ہو گیا تھا۔ اس لیے اب مسلمانوں کے دینی معاملات میں کسی لابی سے بھی کسی طرح کی سازش نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

دشمنوں کی طرف سے عارضی طور پر ایک ذرا اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن آج نہیں تو کل جو نامی حالات پیش آنے والے تھے، وہ پیش آ گئے۔ پہاڑ جیسا فولادی بیٹا بستر مرگ پر تھا جس پر زہریلی سازشیں کی گئی تھیں۔ جس طرح اس کا گوشت گلایا گیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک ہی دن

دیکھ سکتے تھے۔ شیطان کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پتا نہیں وہ مردود کمرے میں کہاں تھا۔ عالی سے کتنی دور تھا۔ ماروی اور دانش، عالی کے دماغ میں جم کر بیٹھ گئے۔ وہ دشمنی کرنے آتا تو انہیں معلوم ہو جاتا۔ تب وہ اسے روکنے اور بھگانے کی کوشش کرتے۔

بڑی پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ عالی کے دماغ میں نہیں جاسکتا تھا، اس کے سر کے پاس بابا صاحب جھک رہے تھے۔ وہ حملہ کرنے کا دعویٰ اور غرور بھول گیا تھا۔ حیرانی اور بے یقینی سے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔

عالی کو کھلی آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سنا بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ تب اس کے حلق سے بہت ہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ سب نے اور قریب ہو کر اس کی طرف جھک کر سنا۔ وہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔ بابا صاحب کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ وہ اسے کلمہ پڑھانے آئے تھے پھر انہوں نے ہاتھ ہٹالیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ گہری ابدی نیند سو گیا تھا۔

ایک اللہ ہی رہنے والا ہے۔ ہم سب جانے کے لیے آتے ہیں۔ ماروی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ارض اسلام سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ہی اللہ کو پکارنے اور عالی کی مغفرت کے لیے گڑ گڑانے لگے۔ پورا شہر بند ہو گیا، سڑکیں گاڑیوں سے خالی ہو گئیں۔ سب جنگے پاؤں چلتے لگے۔ مسجدوں، مدرسوں اور گھروں میں قرآن خوانی ہونے لگی۔ تمام سوگوار خاموش تھے۔

تمام حکمران اور تمام سیاسی اور مذہبی اکابرین کی طرف سے اظہارِ تعزیت کے پیغام آنے لگے۔ تمام حکمران اور تمام سیاسی اور مذہبی اکابرین اظہارِ تعزیت کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیس سیکنڈ کے لیے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ قتل کی سازشوں میں شریک رہنے والے بڑی مصومیت سے سر جھکائے ہوئے تھے۔

مراد، ماروی اور دانش گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ تمام دنیاوی مصروفیات کو چھوڑ دیا تھا۔ عذر پاد نے حکمرانوں اور اکابرین سے کہا۔ ”مراد اور ماروی پتا نہیں کتنے دنوں کے لیے ہم سے کٹ گئے ہیں، وہ فی الحال نہ تمہاری طرف آئیں گے، نہ ماروی تمہارے چور خیالات پڑھ کر دوستی کے پیچھے چھپی ہوئی دشمنی کو سمجھ سکے گی۔ تم سب ایزی ہو جاؤ۔ انجی میدان صاف ہے۔ آزادی سے بے خوفی سے آپس میں سر جوڑ کر سوچو کہ کہاں ایسی بارود بچھائی جائے کہ وہ واپس آتے

ہی تمہارے خلاف کچھ کیے بغیر فنا ہو جائیں۔“ یہ واقعی حکمرانوں کے اور دیگر اکابرین کے شیطانی ارادوں کے لیے اچھا موقع تھا۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”وہ تین دنوں تک یا سات دنوں تک ضرور سوگ منائیں گے۔ ویسے کوئی دن رات ماتم نہیں کرتا، وہ باپ بیٹی کھاتے پیتے گھومتے پھرتے ہوں گے۔ اپنے دشمنوں کو یعنی ہم کو نقصان پہنچانے کی پلاننگ کرتے ہوں گے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہم سے غافل ہوں گے۔“

جب تک عداوت جاری رہتی ہے، طرح طرح کے اندیشے سکون برباد کرتے رہتے ہیں۔ کئی شیطانی اداروں کے سربراہ باپ بیٹی کی واپسی کے خستہ تھے۔ وہ تمام چالباز سربراہ ماروی کی روحانی ٹیلی پتھنی سے محفوظ رہنے کے لیے روپوش رہتے تھے وہ کسی کو نہ اپنی آواز سناتے تھے اور نہ ہی اپنی صورت دکھاتے تھے۔ جس طرح لارا کہیں گم ہو گئی تھی، اسی طرح وہ شاطر سربراہ بھی ناویدہ ہو گئے تھے۔

دشمن کہہ رہے تھے کہ وہ تمام عمر سوگ نہیں منائیں گے۔ امن وامان آج نہیں تو کل ختم ہوگا۔ کوئی کسی کے لیے عمر بھر نہیں روتا، چاہے وہ کتنا ہی جان سے پیارا ہو۔

مراد اور ماروی کو بھی بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کرنے تھے۔ انہوں نے عالی کو اپنے دلوں میں رکھ لیا، پھر گوشہ نشینی سے نکل آئے۔

☆☆☆

افریقا کے ٹیکرو سیاہ قام باشندے پچھلی صدی تک جنگلوں میں رہ کر جانوروں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ آج بھی جنوبی افریقا کے جنگلوں میں کئی سیاہ قام قبیلے ایسے ہیں جو برہنہ جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ صرف جانوروں کو ہی نہیں، انسانوں کو بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر یا آگ میں بھون کر کھاتے ہیں۔ شیطان کا مجسمہ بنا کر اسے پوجتے ہیں اور جادو ٹوٹنے کے ذریعے دکھ بیماریوں اور دشمنوں سے لڑتے رہتے ہیں۔

بیشتر قبائل صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ مہذب بنتے آئے ہیں۔ وہ جن جنگلوں میں رہتے تھے، انہیں شہری آبادی بناتے آئے ہیں۔ زومبی گانا بھی خود کو اور اپنے تابعداروں کو رفتہ رفتہ مہذب بنانا آیا تھا۔ اپنے پراسرار علوم کے ذریعے دنیا کے تمام مہذب انسانوں کو متاثر کرتا اور انہیں مرعوب کرتا آیا تھا۔

اس نے ایک ناقابلِ شکست جادوگر کی حیثیت سے

جنوری 2017ء

سپینس ڈائجسٹ

بڑا نام کما یا تھا۔ یہ غرور سا گیا تھا کہ شیطان اسے کسی سے شکست کھانے نہیں دے گا۔ وہ پرنس عابد علی منگی کو بھی چل کر رکھ دے گا۔

اب وہ تمام جسمانی اور جادوئی قوتوں کے ساتھ فنا ہو گیا تھا۔ شیشے کے ایک تابوت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی لاش کو مختلف مرکبات سے حنوط کیا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں اور تمام محکوم تابعداروں کا خیال تھا کہ وہ اپنی جادوئی قوتوں سے پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اسے کیڑے نہیں کھا رہے تھے۔

وہ اپنی زندگی میں عورت کے بغیر نہیں رہا تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے لیے عورت کو ضروری سمجھا گیا۔ اس کے تابوت کو ڈبل بیڈ بنا یا گیا تھا۔ ایک زندہ عورت اس کی ہم بستر رہتی تھی اور وہ لارہ تھی۔

زومی کا نانا اسے حاصل کرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ وہ اس کی آخری آرزو تھی۔ لاش کے پاس اٹھتی بیٹھتی، کھاتی پیتی اور سوتی رہتی تو وہ شاید زندہ ہو جاتا۔

اور وہ جو زندہ تھی، ایک مردے کی طرح خود کو بھولی ہوئی تھی۔ زندہ تھی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اس کے ذہن میں یہ باتیں نقش تھیں کہ اس کا ایک جوان بیٹا گم ہو گیا ہے۔ وہ زومی کا نانا کے ساتھ دن رات گزارتی رہے گی تو جلد ہی بیٹا اسے مل جائے گا۔

وہ ایک لاکٹ پہن کر رہتی تھی۔ اس لاکٹ میں دانش کی تصویر تھی۔ اسے بڑی محبت اور ممتا سے دیکھتی رہتی تھی۔ خواب اپنی مرضی سے دیکھے نہیں جاتے۔ یہ خود ہی بند آنکھوں کے پیچھے آتے ہیں۔ لارہ کو جادو کے ذریعے خواب میں دانش کی جھلکیاں دکھائی جاتی تھیں۔ ایک بار اس نے خواب میں کہا تھا۔ ”مام! زومی کا نانا کے قریب رہا کرو۔ وہ مہاشکتی مان ہے۔ مجھے تمہاری آغوش میں پہنچا دے گا۔ میں آنے ہی والا ہوں۔“

اس نے کہا تھا۔ ”بیٹے! میں کون ہوں؟ تمہارا باپ کون ہے؟ میں ساری دنیا کو اور خود کو بھول گئی ہوں۔ صرف تم ہی دل و دماغ میں نقش ہو۔ میرے خوابوں میں خیالوں میں آتے رہتے ہو۔“

”مام! میں اپنے پورے وجود کے ساتھ سر سے پاؤں تک تمہارے پاس آؤں گا۔ انتظار کرو۔“

پھر وہ خواب ٹوٹ گیا تھا۔ بیٹا کئی راتوں سے نیند میں نہیں آ رہا تھا۔ گم رہ کر ممتا کو تڑپا رہا تھا۔ جدائی کا یہ سلسلہ ایک دن ختم ہونے والا تھا۔ ایک دن اچانک پرنٹ میڈیا

اور انیکٹر ونک میڈیا والوں نے فون کالیں سنیں۔ کوئی عورت بول رہی تھی۔ ”لارہ زندہ ہے اور میرے شکبے میں ہے۔“

یہ ایسی چونکا دینے والی اطلاع تھی کہ تمام خبر رساں ایجنسیاں لارہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ خبریں نشر کرنے کے لیے تڑپ گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کون ہو؟ ہم سے ابھی ملو۔ ہمیں اپنا نام اور پتا پتاؤ، ہم ابھی تمہارے پاس آئیں گے۔“

جواب ملا۔ ”کیسے آؤ گے؟ میں آکاش میں ہوں، پاتال میں مجھے کہاں پاؤ گے؟“

”تم نے ہم سب سے رابطہ کیا ہے۔ ہم سے بول رہی ہو تو اس کی وجہ ہوگی؟“

”ہاں۔ خاص وجہ ہے۔ میں تمہارے کانوں میں بول رہی ہوں۔ تم مراد علی منگی کے کان میں بولو۔ اس کے بیٹے نے میرے بھائی زومی کا نانا کو مار ڈالا تھا لیکن وہ آدھا زندہ ہے۔ وہ پیاسا کیسے مر سکتا ہے؟ لارہ کا پیاسا تھا۔ پیاس بجھائے بغیر اس دنیا سے نہیں جائے گا۔ اس لیے میں زومی کی بہن کیبلی کا نانا اس چھلکتے ہوئے جام کو اٹھا کر لے آئی ہوں۔“

کسی نے پوچھا۔ ”اوہ گاڈ! تم زومی کا نانا کی بہن ہو؟ لارہ کو یہاں سے کیسے لے گئیں؟“

وہ بولی۔ ”صرف اور صرف جادو کی شکتی سے۔ جادو ہماری کھٹی میں پڑا ہے۔ یہ ہماری رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ دنیا کا کوئی گرد و غبار جادو گر نہیں جان سکے گا کہ میں لارہ کو کس طرح تمہاری دنیا سے چرا کر لے آئی ہوں اور یہ روحانی تماشے دکھانے والے مسلمان کیا ہیں میرے سامنے؟ سنا ہے میرے بھائی کے قاتل عابی کی بہن بڑی روحانی شکتی والی ہے۔ اگر ہے تو پھر دکھائے اپنی شکتی۔ یہاں آئے اور لارہ کو لے جائے۔“

ایک نے کہا۔ ”ایک عرصہ ہوا، مراد نے لارہ کو طلاق دے دی تھی۔ وہ لارہ سے نفرت کرتا ہے پھر اسے حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس کیوں آئے گا؟ مراد کو چیونچ کرنے اور للکارنے کے لیے اس کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہیے تھا۔ تب وہ اس کی محبت میں تمہارے چیونچ کو قبول کرتا۔“

وہ بولی۔ ”میں روحانی شکتی رکھنے والی بیٹی کو اغوا نہ کر سکی۔ اس لیے اس کے بیٹے دانش کی ماں کو اغوا لیا۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ دانش مراد کا اپنا بیٹا ہے۔ لارہ نے برسوں پہلے بچے تبدیل کر کے مراد سے دھوکا کیا تھا۔ مراد فریب میں آ کر ایک لاوارث بچے کو اپنا سمجھ کر لے گیا تھا۔“

جبکہ دانش لارا کی گود میں ہی رہا تھا۔“

وہ بول رہی تھی اور ساری دنیا کو معلوم ہو رہا تھا کہ پرنس عابد علی منگی کے بعد دانش ہی مراد کا اپنا لہو ہے۔ کمبلی گائنا کہہ رہی تھی۔ ”مراد کے ایک بیٹے پرنس عالی نے میرے بھائی کی جان لی۔ ہم نے عالی پر جادو کیا ہے تو وہ بھی مرنے والا ہے۔ میں مراد کے دوسرے بیٹے دانش کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ وہ اپنی گم شدہ ماں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ اس کے بعد مراد اپنے بیٹوں سے محروم ہو جائے گا۔ بس وہی بیٹی ماروی رہ جائے گی۔ میں اپنے منستروں کی شکتی سے اسے بھی جلا کر بھسم کر دوں گی۔“

اس کی باتیں مراد کے کانوں تک پہنچیں۔ دانش اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کسی حد تک ماں کا سراغ مل گیا تھا۔ آگے اور بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ ماروی نے کہا۔ ”زوہبی گائنا جنوبی افریقا کی جادوگری کے ایک علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ اس کی بہن نے لارا کو وہیں کہیں چھپایا ہے۔“ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ باپ بیٹی اور بیٹا اپنے محبوب کے آگے دست بستہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ لارا کے متعلق تجسس تھا کہ وہ کہاں ہوگی۔ اب معلوم ہوا کہ اسے کالے جادو کی کالی دنیا میں چھپایا گیا ہے اور یہ روحانیت کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔

وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگے۔ سیاہ جادو کی تاریکی میں روشنی پانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے جو ہوتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتا۔ سراسر فریب نظر ہوتا ہے۔ وہ زوہبی گائنا کی بہن کمبلی گائنا کا چانک کہاں سے آگئی تھی؟ بے شک وہ جادو گروں کا قبیلہ تھا لیکن زوہبی کی موت کے بعد وہاں کوئی خطرناک چیلنج کرنے والا جادوگر نہیں رہا تھا۔ کمبلی گائنا بھی ڈھول کا پول تھی۔ اوپر سے بچ رہی تھی۔ اندر سے کھوکھلی تھی۔

اس کے باوجود وہ باپ بیٹی اور بیٹا وہاں تک پہنچ نہیں پارے تھے۔ اس کھوکھلی کو سمجھ نہیں پارے تھے۔ وہ خود ہی جادو کے زیر اثر تھی۔ عذرباد اپنی شیطانی اگلیوں پر اسے نچا رہا تھا۔ اس نے پراسرار علوم کے ذریعے کمبلی کے دماغ کو اپنے شکنجے میں رکھا تھا۔ وہ اس کے احکامات کی تعمیل کر رہی تھی۔ لارا کو اس نے اغوا نہیں کیا تھا۔ عذرباد نے اسے وہاں پہنچایا تھا۔

وہ چاہتا تھا لارا کی گمشدگی کا الزام اس پر اور شیطان

پر نہ آئے۔ اگر ماروی بھی روحانی صلاحیتوں سے لارا تک پہنچے تو یہی معلوم ہو کہ کمبلی نے اسے اغوا کر کے اپنے بھائی کی حنوط شدہ لاش کے پاس رکھا ہے۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق لارا کے دماغ میں یہ نقش کیا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہے۔ بیٹا اس سے بچھڑ گیا ہے لیکن جلد ہی ماں کی دھڑکنوں سے لگنے آ جائے گا۔

منصوبے کے مطابق لارا بیٹے سے ملنے کے بعد دین اسلام قبول کر کے اپنے بیٹے کا، مراد اور ماروی کا اعتماد حاصل کرنے والی تھی۔ عذرباد عظیم اسلامی یونیورسٹی کے اندر جانے میں ہمیشہ ناکام رہا تھا۔ جب بیٹا اپنی ماں کو اس یونیورسٹی کی اپنی رہائش گاہ میں لے جاتا تو عذرباد بڑی رازداری سے لارا کے اندر رہ کر اس فولادی قلعے میں جاسکتا تھا۔

یہ کمیل وہ بہت سوچ سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ انہیں نتائج حاصل کرنے کی جلدی نہیں تھی۔ یقین تھا کہ وہ ماں بیٹے کے ذریعے اسلامی یونیورسٹی کے نہایت رازدارانہ معاملات کی تک پہنچ جائیں گے۔

مراد اور ماروی کے خلاف بظاہر کسی ملک کے حکمران اور کسی مذہب کے پیشوا، عالم اور سیاسی اکابرین نہیں تھے۔ وہ مراد کے ہاتھوں زبردست نقصان اٹھا کر مگر چھ کے آنسو بہا کر دوست بن گئے تھے۔ عذرباد نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے دوستی کرے گا نہ دشمنی۔ لارا کی موجودہ گمشدگی کے معاملے میں بھی وہ محسوم اور بے ضرر بنا ہوا تھا۔

اس محسومیت کے پیچھے کئی شیطانی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ کئی ملکوں میں یہ مختلف ادارے مراد کا جینا حرام کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ادارے کا نام ”دی کچر“ تھا۔ اس کا سربراہ راجر ہارڈی بہت ہی مکار اور شاطر تھا۔ اس نے عذرباد سے کہا۔ ”لارا جب بن زیان کے زیر اثر رہتی تھی، تب ہی سے وہ میری نظروں میں ہے۔ اب میں اس کی ٹیلی فون سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے میری طرف مائل کر دو۔“

عذرباد نے کہا۔ ”جسمیں بہت رازداری سے مراد کے مقابلے پر رہتا ہے۔ نہ اپنی صورت دکھاتی ہے، نہ اپنی آواز اور لب و لہجہ سنانا ہے۔ ہم لارا اور دانش کے ذریعے بہت بڑا ٹیم کھیل رہے ہیں۔ ایسے وقت ماروی اپنی صلاحیتوں سے معلوم کر لے گی کہ لارا اور پردہ تم سے تعلق

اپنی روحانی قوتوں سے اس علاقے تک پہنچتی تھی لیکن
شیطانی حصار بندی کے باعث بھٹک جاتی تھی۔
مراد سوچ رہا تھا۔ ”کھلی گاتنا نے لارا کو اپنے
علاقے میں چھپا کر رکھا ہوگا۔ کیا مجھے وہاں جانا چاہیے؟“
ماروی نے کہا۔ ”میں ادھر جاتی ہوں پھر ایک جگہ پہنچ
کر بھٹک جاتی ہوں۔ میری سوچ کی لہریں آگے جاتے
جاتے رک رک جاتی ہیں۔ اس حصار کو توڑنا ہوگا۔“
”کیسے توڑو گی؟“

”چالیس دنوں تک گوشہ تنہائی میں عبادت کروں گی
انشاء اللہ وہ شیطانی حصار بندی ٹوٹ جائے گی۔ ہمیں وہاں
تک پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔“

اسی وقت کالنگ ٹون نے مراد کو پکارا۔ اس نے بٹن
دبا کر اسے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی
دی۔ ”ہیلو! میں راجر ہارڈی بول رہا ہوں۔ تم مجھے نہیں
جانتے۔ ابھی جاننے کے بعد بھی بھول نہیں پاؤ گے۔ اگر
زندہ رہو گے۔ باقی داوے میں اس سے بولتا ہوں جس کی
زندگی مختصر ہو جاتی ہے۔“

مراد نے اپنی طرف سے کوئی تاثر نہیں دیا۔ خاموش
رہا۔ وہ بولا۔ ”تین ٹیلی فنی جاننے والوں کا معاملہ ہے۔
اسکا پ کے ذریعے بات کرو اگر منظور ہو۔ لارا تو لپتا ہے۔
اب آہنوس اور طاغوتا کو بھی چھ ماہ تک اپنا غلام بنا کر نہیں رکھ
سکو گے؟ کم آن۔ ہری اپ آن اسکا پ.....“

تھوڑی دیر بعد اسکا پ کے ذریعے رابطہ ہو گیا۔
دوسری طرف اسکرین پر راجر ہارڈی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ
کہہ رہا تھا۔ ”میری کوئی صورت شکل نہیں ہے۔ میں کسی کو نظر
نہیں آتا۔“

وہ ہنستے ہوئے بول رہا تھا۔ ”میرے منہ میں زبان
ہے مگر میں بولتا نہیں ہوں۔ کوئی اور بولتا ہے۔ میری اپنی
آواز اور لب و لہجہ نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو اپنی بیٹی اور بیٹے
سے بولو کہ وہ اس آواز اور لب و لہجہ کو گرفت میں لے کر
میرے دماغ میں آئیں۔“

ماروی نے فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ اس
بولنے والے کے اندر پہنچی۔ وہ ایک ریوا لونگ چیئر پر بیٹھا اسکا پ
کے ذریعے بول رہا تھا۔ ”ابھی اپنے دماغ میں سوچ کی لہروں کو
محسوس کر رہا ہوں۔ یقیناً ماروی اور دانش آئے ہیں۔“
ماروی نے کہا۔ ”میں آئی ہوں۔“

”تو پھر میرے چور خیالات پڑھو اور بولو میں کون ہوں؟“
وہ چند لمحوں تک پڑھتی رہی پھر بولی۔ ”تم راجر

رکھتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں بہت محتاط رہنا چاہتے ہیں۔“
”بے شک محتاط رہو۔ لارا پر ایسا تو نمی عمل کرو کہ میرا
نام میری شخصیت اس کے ذہن سے مٹتی رہے۔ وہ میرے اندر
آکر خیال خوانی کرنا بھول جائے۔ صرف میری ضرورت کے
مطابق دوسروں کے دماغوں میں جایا کرے۔“
وہ قائل ہو کر بولا۔ ”تم لارا کی خیال خوانی سے بہت
فائدہ اٹھا سکو گے۔ میں اسے تمہاری طرف مائل کر رہا
ہوں۔ محتاط رہنا۔“

عذر باد نے لارا پر عمل کیا۔ وہ ایک مردے کے ساتھ
دن رات گزار رہی تھی۔ ایک زندہ جوان مرد کو اس کے دل
اور دماغ میں پہنچا دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اس کی زندگی میں
بھر پور تبدیلی آ گئی تھی۔

راجر ہارڈی بڑی رازداری سے کھلی گاتنا کی خفیہ
رہائش گاہ میں آ گیا۔ وہاں ایک تہ خانے میں زومی گاتنا کی
لاش پڑی رہتی تھی۔ لارا وہاں رات کو جا کر سوتی تھی۔
اس نے ہارڈی کو دیکھ کر کہا۔ ”میں پہلی بار ایک چلتے
پھرتے زندہ مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ
رہو گے؟“

”ہاں۔ ہمیشہ ساتھ رہوں گا اور جلد ہی یہاں سے
تمہیں لے جاؤں گا۔“

پھر اس نے عذر باد سے کہا۔ ”میں لارا کی ٹیلی فنی کو
صرف اپنے استعمال میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ
میرے معاملات میرے راز تمہارے یا دوسرے لوگوں تک
پہنچیں۔ لارا میری پرسنل لائف میں بھی اہم رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ صرف تمہارے لیے ریزرو ہے گی۔“
”میں اپنے اطمینان کے لیے اسے قانونی شریک
حیات بناؤں گا۔ مجھے اپنا اطمینان کرنے دو۔“

راجر ہارڈی کی طرح شیطانی اداروں کے اور جتنے
سربراہ تھے، وہ سب شیطان کے لیے بہت اہم تھے۔
عذر باد ہر ایک کی ضرورت اور خواہش پوری کرتا تھا۔ ہارڈی
کی یہ خواہش بھی پوری کر دی، لارا مسز ہارڈی بن گئی۔

وہ اپنی دنیا سے اپنی ذات سے کم ہو کر شیطانی کھیل
تماشے میں ایک کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اب اس کی زندگی میں دو
اہم ہستیاں تھیں ایک تو راجر ہارڈی تھا، دوسرا دانش۔ وہ بیٹا اس
کے گلے کے لاکٹ میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ لگا رہتا تھا۔
اور بیٹے کی دھڑکنیں تڑپ تڑپ کر پوچھتی رہتی تھیں۔
”مام! کہاں ہیں؟ میں آپ کو ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟“

ماروی بھی خیال خوانی کی پرواز کرتی رہتی تھی۔ وہ

ہمارے ہیں اور ہم دوسروں کی طاقت چھین لینا جانتے ہیں۔ جیسا کہ پرنس عالی جیسے ناقابل شکست شہ زور کو چھین لیا۔ وہ تین ٹیلی ٹیٹھی جانتے والے جنہیں تمہارے خوف سے برسوں تک ناکارہ بنا کر رکھا تھا، ان میں سے دو کو ابھی چھین لیا ہے۔ لاراجب بھی واپس آئے گی تو اسے بھی تمہارے ہاتھ لگنے نہیں دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”بڑی دیر سے بولتے ہی جا رہے ہو۔ تمہیں بولنے کی بیماری ہے۔ یہ سن کر خوش ہو جاؤ کہ تم نے اپنی باتوں سے دہشت طاری کر دی ہے۔ میں خوف سے لرز رہا ہوں۔ تم نے ایسا خوف طاری کر دیا ہے کہ میں بولنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ اس لیے رابطہ ختم کر رہا ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ ”میں آبنوس اور طاغوتا کو تلاش کر رہی ہوں۔ خدا جانے انہیں کہاں چھپا رکھا ہے؟ یہ پراسراریت بتا رہی ہے کہ راجر ہارڈی کے پیچھے عذربادی کی شیطانی قوتیں کام کر رہی ہیں۔“

”ہاں۔ وہ آبنوس اور طاغوتا کو مجھ سے چھین کر لے گیا ہے، ایسی شیطانی قوت اسے عذرباد سے ہی حاصل ہو رہی ہوگی۔ بہر حال راجر ہارڈی یو کے میں کہیں ہوگا۔ لندن، اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ میں کہیں چھپا رہتا ہوگا۔ کہیں بھی اس کا وجود کسی بہروپ میں ہوگا۔ اپنی پیدائشی آواز اور لب و لہجہ میں بولتا ہوگا اور ہم تو اس کے دست راست کے لب و لہجہ کو سن رہے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہے۔ تم اس کے آس پاس لاکھوں افراد کے دماغوں میں نہیں جاسکوگی۔ لاکھوں دماغوں میں جاتے جاتے زندگی گزر جائے گی، میں فی الحال یو کے جا رہا ہوں۔“

دانش ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بابا جانی! میں ابھی یہاں آیا تھا۔ راجر ہارڈی کی باتیں سننے ہی آبنوس اور طاغوتا کو تلاش کرنے چلا گیا۔ وہ میری تو کیا روحانی ٹیلی ٹیٹھی کی گرفت میں بھی نہیں آ رہے ہیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”میں حیران ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں تاریکی میں زیادہ نہیں بھٹکوں گی۔ مجھے روشنی ملے گی۔ ابھی جا رہی ہوں۔ دور کعت نفل نماز پڑھوں گی۔ پھر کشدہ کو تلاش کرتے رہنے کے لیے وظیفہ پڑھتی رہوں گی۔“

وہ مراد اور دانش کے پاس سے اٹھ کر مصلے پر آ کر بیٹھ گئی وہ باپ بیٹے وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ اسے عبادت کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ دانش نے کہا۔ ”میں مام کے لیے پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، وہ زندہ ہیں تو آپ کی روحانی قوتوں کے زیر اثر کیوں نہیں

ہارڈی نہیں ہو۔ اس کے دست راست ہو۔ وہ کہیں روپوش ہے۔ وہاں سے تحریر کے ذریعے تم سے بول رہا ہے۔ وہی باتیں تم میرے بابا جانی سے کہہ رہے ہو۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے مراد سے بولا۔ ”سنا تم نے؟ میں تم سے بول رہا ہوں مگر میں بولتے ہوئے بھی نہیں بول رہا ہوں۔ نہ مجھے دیکھا جاسکے گا۔ نہ سنا جاسکے گا۔ میں ہوں۔ کبھی تمہاری اور ٹیلی ٹیٹھی کی مٹھی میں نہیں آؤں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم نے منوالیا کہ بہت شاطر ہو۔ ہم تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ آگے بولو؟“

وہ بولا۔ ”تم نے شیطان سے کہا تھا کہ دانش کی خاطر اس کی ماں لارا کو سزائے موت نہیں دو گے۔ وہ تو لا پتا ہے۔ پتا نہیں زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ تم نے آبنوس اور طاغوتا کو چھ ماہ کے لیے اپنا قیدی اور تابعدار بنایا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم خدائی فوجدار ہو؟ جسے چاہو گے، سزائیں دو گے۔ تمہیں یہ پاور، یہ حقوق کس نے دیے ہیں؟ وہ پتا جو دنیا کا سب سے طاقتور شخص کہلاتا تھا۔ تنہا پوری فوج کو مار بھگاتا تھا۔ وہ مٹی وھول ہو چکا ہے۔“

وہ حقارت سے بولا۔ ”تمہارے اندر بیٹے جیسا دم ختم نہیں ہے۔ تمہارا قانون اور تمہاری دی ہوئی سزائیں کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ تم چھ ماہ تک ان دو ٹیلی ٹیٹھی جاننے والوں کو سزائیں دینا اور انہیں غلام بنائے رکھنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارے اس حکم کو رد کر دیا ہے۔ تم ان دونوں کو اپنا غلام نہیں بنا سکو گے۔ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔ انہیں دیکھ بھی نہیں سکو گے۔ جو میری مٹھی میں آ جاتے ہیں، وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ جاؤ دیکھو، وہ کہاں ہیں؟ انہیں تلاش کرو۔ یہ بتا دوں کہ وہ زندہ سلامت ہیں۔ آئندہ ان کی خیال خوانی میرے کام آتی رہے گی۔ جب انہیں نہ پاسکو تو تسلیم کر لینا، یہ راجر ہارڈی تمہیں مات دے رہا ہے۔ تم پر حاوی ہو رہا ہے۔ تمہارے برے دن آ گئے ہیں۔ ٹلنے والے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے آخری دن تک تمہیں پہنچائیں گے۔ آئندہ تم اور ماروی جس ملک میں جاؤ گے، وہاں تمہاری طاقت، چالبازی اور ماروی کی روحانی قوتیں کام نہیں آئیں گی۔ میں گیم کھیلنا جانتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو کس طرح ذلیل کرتے رہنا چاہیے۔“

وہ پھر حقارت سے بولا۔ ”لعت ہے تم پر۔ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کو الزام دیتے ہو کہ ہم تمہارے دین کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور تمہیں اندر سے توڑتے بکھیرتے رہتے ہیں۔ اونہہ! تم لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟“

”یہ دنیا ہماری ہے۔ یہاں طاقت کے تمام ذرائع

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



آری ہیں؟“

”بیٹے! آجائیں گی۔ ذرا صبر کرو اور ایسے حالات میں صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”میرے اندر بے چینی بھری ہے۔ مجھے اجازت دیں۔ میں برنگھم جانا چاہتا ہوں۔ مام آخری بار وہیں تھیں۔“

”وہاں جانے سے دل کو تسلی ہوتی ہے تو ضرور جاؤ۔“

وہ پلک جھپکتے ہی اس رہائش گاہ میں آگیا، جہاں لارا کم ہونے سے پہلے تھی۔ وہ رہائشی بنگلا خالی تھا۔ باہر سے مقفل تھا۔ اندر اس کے ملبوسات اور ضرورت کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔

اس نے بڑے جذبے سے سوچا۔ ”کیا مام یہاں چھپ کر آتی ہوں گی؟ اپنی یہ چیزیں استعمال کرتی ہوں گی؟“

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں سے نہ جائے۔ وہاں نا دیدہ ہو کر رہے۔ دن رات ماں کا انتظار کرتا رہے۔

وہ ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اگر ہلکی سی آہٹ یا سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تو سمجھ لیتا کہ ماں وہاں نا دیدہ ہو کر آئی ہے۔

وہ وقفے وقفے سے پلکیں جھپک کر نا دیدہ ہو جاتا تھا پھر اس بنگلے سے باہر دور تک جاتا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والیوں کو ٹوٹی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جس پر شبہ ہوتا تھا کہ وہ خیال خوانی کرتی ہوگی، اس کے دماغ میں پہنچ جاتا تھا۔

ایک اندھی تلاش تھی۔ ناکامی ہوتی تھی۔ وہ واپس بنگلے میں آ جاتا تھا۔

ادھر ماروی عبادت کرتی رہتی تھی۔ مراد جنوبی افریقا میں اس جادوگری کی سست جانا چاہتا تھا جہاں ماروی کی خیال خوانی پہنچ کر بھٹک جاتی تھی۔ وہ تینوں باپ بیٹی اور بیٹا بھٹک رہے تھے۔ انہیں بھٹکایا جا رہا تھا۔ شیطان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جان سے نہیں مارتا، ہلکان کرتا رہتا ہے۔ ایمان والوں کا جینا حرام کرتا ہے۔ اپنے تابعداروں کو اپنے ماننے والوں کو تماشے دکھا کر خوش کرتا ہے۔

اور اس وقت بھی وہ دانش کی وجہ سے مراد اور ماروی کی پریشانیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اپنی خوشیاں چھپا کر ان سے ہمدردی کر رہے تھے۔ ویسے ان کے تمام جاسوس بھی لارا کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کہیں اس کا سراغ کیوں نہیں مل رہا ہے؟

یہ یقین ہو گیا تھا کہ لارا کو جنوبی افریقا کے ایک علاقے میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ وہ جادوگری ہے۔

براسرار منتروں کی حصار بندی کے باعث ماروی وہاں تک پہنچ نہیں پاریں گی اور وہاں تک کسی طرح بھی پہنچنا تھا۔

مراد نے کہا۔ ”میں جاؤں گا۔ معذرتیں، پڑھتا جاؤں گا۔ بابا صلاح الدین اجیری بھی میرے ساتھ نمازیں پڑھا کرتے تھے، میں انہیں پکاروں گا۔ میرا رب چاہے گا تو وہ میری مدد کے لیے آئیں گے۔“

وہ ریاست سے نکل پڑا۔ اسے رات کی تاریکی میں کسی نے نہیں دیکھا۔ اسے شیطانی آنکھوں سے بھی چھپ کر ہزاروں میل دور افریقا کے آخری کنارے تک جانا تھا۔ سفر کی ابتدا ایک ہیوی موٹر سائیکل پر کی تھی۔ آگے چہرہ بدل کر ہوائی جہاز کے ذریعے جاسکتا تھا۔ ماسٹر کو بوبو اس کے نئے چہرے اور پاسپورٹ وغیرہ کے انتظامات کر رہا تھا۔

ابھی وہ عارضی میک اپ میں ریاست سے باہر آیا تھا۔ دوسری صبح ایک شہر نو پانا میں پہنچا۔ وہاں ناشتا کرنے کے لیے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ آگے ایک اور شہر میں اس کا چہرہ اس کی شخصیت تبدیل ہونے والی تھی۔ اپنی ریاست سے باہر آتے ہی کو بوبو کے چار شوٹرز اس کے آگے پیچھے پہنچ گئے۔ اس سے بہت فاصلہ رکھا تھا تا کہ وہ دشمنوں کو تباہ دکھائی دے۔

یہ خیال تھا کہ دشمن اس سے بے خبر ہوں گے۔ اگر کسی سے سامنا ہوگا تو وہ اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ لیکن شیطان کی آنکھیں زمین کی تہ میں بھی پہنچ جاتی ہیں اور وہ زمین کے اوپر تھا۔

سڑک کے کنارے اوپن ریسٹورنٹ کی میز پر بھی ہوئی تھیں۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد کافی پی رہا تھا۔ ایسے ہی وقت چھپے کئے افراد وہاں آگئے۔ دو اس کے سامنے کرسیاں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ چار اس کے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

مراد نے انہیں دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر دل میں کہا۔ ”کتوں نے میری بوسو گھلی ہے۔“

سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے مسکرا کر کہا۔ ”سنا تھا بادشاہ فقیروں کا بھیس بدل کر نگر نگر گھومتے ہیں۔ آج آنکھوں سے بادشاہ سلامت مراد علی منگی کو دیکھ رہے ہیں۔“

پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ”میرے کوٹ کی جیب میں ریوالور ہے۔ ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو یہیں مارے جاؤ گے اور ہم یہاں ہنگامہ نہیں کرنا چاہتے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”چپ چاپ اٹھو اور ہماری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“

اس نے پوچھا۔ ”جان سے نہیں مارو گے تو کیا کرو

مے؟ کہاں لے جاؤ گے؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“
ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کوئی سوال نہ کرو۔ اٹھو یہاں سے۔“

مراد نے ان کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تمہاری دو گاڑیوں کے آگے پیچھے دوسری گاڑیاں آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔ مجھے گولی مار کر فرار نہیں ہو سکو گے۔ یہاں پولیس والے پہنچ جائیں گے اور اگر پولیس والوں کے سائے میں آئے ہو تو تمہاری گاڑیوں کا راستہ روکنے والی گاڑیوں سے فائرنگ ہوگی۔“

انہوں نے پریشان ہو کر راستہ روکنے والی گاڑیوں کو دیکھا۔ اس کے اندر کچھ لوگ جھلک رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بڑی رازداری سے ایک شاٹ گن کی جھلک دکھائی۔ یہ سمجھا دیا کہ مراد علی منگی نہ تنہا ہے، نہ نہتا ہے۔ ان میں سے کوئی وہاں سے زندہ نہیں جاسکے گا۔

مراد نے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔ ”اب بولو تمہارے کس باپ نے یہاں بھیجا ہے؟“
اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے وہ بولا۔ ”ہم کرائے کے شوٹرز ہیں۔ کوئی ضرورت مند ہم سے آکر ملتا ہے یا فون پر ڈیٹنگ کرتا ہے۔ بینک کے ذریعے ہیمنٹ کرتا ہے۔ ہم اس کا کام کر دیتے ہیں لیکن.....“

وہ کچھ اور پریشان ہو کر بولا۔ ”تم یقین نہیں کرو گے، وہ کوئی جادوگر ہے۔ میرے دماغ میں آکر بولتا ہے۔ اس نے تمہارے مرڈر کے لیے بہت بڑی ہیمنٹ کی ہے۔ ہم ابھی یہیں تمہیں مار ڈالتے لیکن قانون کی گرفت میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ اب تو تمہاری گرفت میں آ گئے ہیں۔“

”اوہ گاڈ! ہم نے آپ کے متعلق سنا تھا کہ تم آگ کا مجسمہ ہو۔ تم پر دھاوا بولنے والے تمہیں چھونے والے جل جاتے ہیں۔ تمہارے وجود میں کانٹے بھرے ہیں۔ تمہیں جدھر سے پکڑا جائے ادھر سے چھتے ہو۔ جانے دو۔ ہم اس معاملے کو ختم کر رہے ہیں۔ تم زندہ رہو۔ ہم جارہے ہیں۔“
وہ جانے کے لیے اٹھ رہا تھا۔ مراد نے میز کے نیچے

سے ایک لات ماری تو وہ کرسی سمیت نیچے گر پڑا۔ وہ ایسی پچویشن کا پکا کھلاڑی تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ پیچھے سے اور دائیں بائیں سے حملے ہوں گے۔ اس نے سامنے والے کولات مارتے ہی اپنی کرسی پیچھے کی طرف ماری۔ آس پاس والے ذرا لڑکھڑائے۔ وہ چیم زدوں میں میز کے نیچے گھس کر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایک دائرے میں گھوما تو سب ہی میز سے ٹکراتے ہوئے پیچھے چلے گئے۔ اتنی دیر میں ماسٹر

کو بوبو کے فائٹر گاڑیوں سے نکل کر وہاں پہنچ گئے۔
ان میں سے کوئی بھی ہتھیار استعمال کر کے حالات کو سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لات کھا کر گرنے والے نے جلدی سے اٹھ کر چیختے ہوئے کہا۔ ”رک جاؤ۔ ہمیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیے۔ ہم دشمن نہیں ہیں۔ رک جاؤ۔ ہم دوستی کریں گے۔“
وہ سب رک گئے۔ ایک پولیس افسر سیاہیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”سر! کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے۔ ہم دوست بن رہے ہیں۔ یہاں محبت سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

عذر باد خیال خوانی کے ذریعے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ مراد کی دلیری اور جنگ بازی پر غصے سے کڑھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مراد وہاں سے زندہ سلامت آگے نہ جائے۔ اگر وہ نہ مرے تو کم از کم ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے۔

پولیس افسران سب کو وارننگ دے رہا تھا کہ اب اگر فساد ہوگا تو انہیں حوالات میں پہنچا دے گا۔ وہ لوگ میز کرسیاں سیدھی کر کے پھر بیٹھ گئے تھے۔ عذر باد کے آلہ کار اب مراد سے لڑنے کی جرات نہیں کر رہے تھے۔ وہاں سے جانا چاہتے تھے۔ مراد نے کہا۔ ”جو تمہارے دماغ میں آتا ہے، اس سے بولو یہاں آئے۔ تب میں تمہیں جانے دوں گا۔“

عذر باد نے مراد کے دماغ میں آنا چاہا تو اس نے سانس روک کر بھگا دیا۔ وہ اپنے آلہ کار کے دماغ میں آ گیا پھر بولا۔ ”میں عذر باد بول رہا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”ابھی کچھ عرصے تک ہمارے درمیان امن و امان اور سکون تھا پھر یہ شیطانی حرکت کیوں شروع کر دی؟ یہ تم سمجھ گئے ہو کہ میں بھی بدل کر ریاست سے نکل کر لارا کی طرف جانا چاہتا ہوں اور تمہارا شیطان نہیں چاہتا کہ میں ادھر جاؤں۔ کیا میں درست سمجھ رہا ہوں؟“
”ہاں۔ ہم نہیں چاہتے۔“

”تم لوگوں نے کہا تھا کہ لارا کی گمشدگی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم بھی اور تمہارا شیطان بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔“

عذر باد نے کہا۔ ”کمبلی گمانا نے مجھ کو کھول دیا۔ تم لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ لارا کو جنوبی افریقا کے کسی علاقے میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ماروی اور دانش خیال خوانی کے ذریعے وہاں تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب تم جارہے ہو۔“

مراد نے کہا۔ ”اور تم نہیں چاہتے کہ میں ادھر جاؤں؟ یعنی لارا کو غائب کر کے کمبلی کی جادوگری میں پہنچانے میں تمہارا ہاتھ ہے اور تم ہمیں دھوکا دینے کے لیے اس کمبلی سے

انکار کرتے رہے ہو۔“

”اپنے فائدے اور کامیابی کے لیے ایسی چالیں چلنا کیونگی نہیں ہے۔ یہ شیطان کا فرمان ہے۔ تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو واپس جاؤ۔ ورنہ یہاں تمہاری لاش گرنے والی ہے۔“

”چلو اپنی حسرت پوری کرو۔ میں تو تمام چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے اس جادوگری میں جاؤں گا اور لارا کو وہاں سے لاؤں گا۔“

”تم سمجھ رہے ہو، میرے یہ آلہ کار تم سے ڈر گئے ہیں۔ یہاں ہتھیار نکال کر حملہ نہیں کریں گے۔ میں ابھی ان کے دماغوں پر قبضہ جھاتا ہوں۔ تم فوراً ہی نہیں مرو گے۔ پہلے زخمی ہوتے رہو گے۔“

اس نے یہ کہہ کر اپنے ایک آلہ کار کے دماغ پر قبضہ بجایا۔ آلہ کار نے اس کی مرضی کے مطابق اپنے لباس سے ریوالت نکال کر مراد کا نشانہ لیا۔ ٹریگر کے دبے ہی گولی اس کے اپنے ساتھی کو لگی۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا پھر ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

عذر باد چونک گیا۔ سمجھ گیا کہ ماروی وہاں موجود ہے۔ اس نے موت کا رخ بدل دیا ہے۔ ادھر ماسٹر کو بوبو کے فائٹروں نے ہتھیار نکال کر فائرنگ کی تو وہ تمام آلہ کار وہاں سے بھاگنے لگے۔ اس علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس والے بھی ادھر ادھر چھپ کر فائر کرنے لگے۔

مراد گولیاں چلاتا ہوا دوڑتا ہوا اپنی موٹر سائیکل پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ماسٹر کے فائٹر بھی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے لگے۔ سپاہیوں نے ان کا پیچھا نہیں کیا۔ وہ خطرات سے کھیل کر اپنی جان مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ دور نکلتے چلے گئے۔ دوپہر تک دوسرے شہر ٹرینڈا پہنچ گئے۔ وہاں عذر باد نے اس کے روبرو آکر کہا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو، میں نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”شیطان آخری سانس تک پیچھے لگا رہتا ہے۔ کبھی ہمارے اندر کھس کر بھٹکتا ہے، کبھی باہر رہ کر مصیبتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔“

”یہ لکھ لو کہ لارا تک پہنچ نہیں سکو گے۔“

”یہ میرے دماغ میں لکھا ہوا ہے کہ وہاں پہنچتے تک تم عذابِ جان بنے رہو گے۔“

وہ بولا۔ ”جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیطان جان سے نہیں مارتا ہے، پریشان کرتا رہتا ہے۔ مصیبتیں لاتا رہتا ہے، اسی کہاوت کے مطابق ہم تمہیں بھی جان سے نہیں

ماریں گے لیکن تمہارا جینا حرام کرتے رہیں گے۔ آئندہ تم دیکھتے رہو گے کہ اس جادوگری کے قریب پہنچتے تک کس طرح موت تمہیں چھو کر گزرتی رہے گی۔ میں آخری بار سمجھاتا ہوں۔ تمہاری سلامتی صرف ارضِ اسلام میں ہے۔ واپس چلے جاؤ۔“

”تم نے سمجھا دیا۔ اب جاؤ۔ تمہاری دھمکیاں سن سن کر سرد کھنے لگا ہے۔“

”میں دھمکیاں نہیں دے رہا ہوں۔ یہ دیکھو دھماکا کر رہا ہوں۔ لو بچو۔“

وہ غائب ہو گیا پھر چند لمحوں کے بعد ہی ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ وہ جس ہوٹل میں تھا، وہاں کا ایک حصہ بم دھماکے سے اڑ گیا۔ مراد جہاں تھا، وہاں کے درود یوار لرز گئے اور کچھ ترخ کر اور ٹوٹ کر گرنے لگے۔ وہ چلائیں لگتا ہوا وہاں سے بھاگنے لگا۔ اوپر چھتیں بھی کہیں کہیں سے ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ جب وہ ہوٹل سے باہر دوڑا ایک ایسیو لینس کے پاس پہنچا تو بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔

پتا نہیں اس دھماکے میں کتنے مر چکے تھے۔ کتنے زخمی ہو کر اسپتال جا رہے تھے۔ مراد کو بھی اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ وہ ایسیو لینس کے پچھلے حصے میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ماروی اور دانش اس کے اندر موجود تھے۔ ایسے وقت عذر باد نے وہاں آکر مسکرا کر دیکھا پھر کہا۔ ”دیکھا تم نے میں دھمکی نہیں دیتا۔ اس پہلے دھماکے میں تم لہو لہان ہو گئے۔ عقل سے سوچو کہ آگے اور کیا ہونے والا ہے۔ تمہاری روحانی قوتوں والی بیٹی بھی تمہیں بچا نہیں سکے گی۔“

ماروی نے حاضر ہو کر کہا۔ ”بچانے والا خدا ہے۔ اسی مجھ نے مجھے روحانی قوتیں عطا کی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے، یہ قوتیں موثر ہوتی ہیں۔ نہ چاہے تو شیطان عارضی طور پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ہمارا مجبور اپنی حکمت عملی کو خوب سمجھتا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”اور تم سمجھ لو کہ میں زخموں سے چور ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بھی اس جادوگری تک جاؤں گا۔“

دانش نے حاضر ہو کر کہا۔ ”میں بابا جانی کے سائے میں اپنی مام کو ضرور وہاں سے لاؤں گا۔ تو دفع ہو جا۔“

یہ کہتے ہی اس نے ایک الٹا ہاتھ عذر باد کے منہ پر رسید کیا مگر وہ شیطان ہاتھ لگنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

خواتین خیالی

جرم چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... کم سنی میں کیا جائے یا بڑھاپے میں، مجرم ہمیشہ کسی نہ کسی غفلت کا مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔ اس نے بھی بڑی ہوشیاری دکھائی مگر ذرا سی بے پروائی نے گویا چودہ طبق روشن کر ڈالے۔ معمولی سی خواہش کی تکمیل نے غیر معمولی تذلیل کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔

شرعباس

ذہانت کا مظاہرہ کرنے والے ایک بے وقوف چور کی دیدہ دلیری

خوش لباسی اور نمائش پسندی کی ہوتی ہے۔ وہ اسٹور میں داخل ہو گیا۔ وہاں سوٹ بوٹ میں ملبوس کئی سیلز مین متحرک تھے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا سیدھا اس بڑے حصے کی جانب چل دیا جہاں لیڈر کی جیکٹوں کی ایک وسیع ورائٹی ڈپلے پر تھی۔ ڈیرن نے ان جیکٹس میں سے دو جیکٹس اٹھائیں اور ان کا جائزہ لینے لگا۔ ہم مہم..... چاکلیٹ براؤن یا بلیک؟ اس نے وہ دونوں جیکٹس ریک پر ایک جانب رکھ دیں اور مزید دو جیکٹ منتخب کیں اور ان کو جانچنے لگا..... کمرنگ می؟

ڈیرن لیسنر سن سیٹ بولیورڈ پر واقع پارکرز کلا تھیرز کے باہر کھڑا شوکیس میں سچے ہوئے اٹالین لیڈر جیکٹس کو لپٹائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیرن کو معلوم تھا کہ جب یہ جیکٹس انسانی مجسوں پر اتنی عمدہ دکھائی دے رہی تھیں تو اس کے جسم پر کتنی دلکش اور شائستہ نظر آئیں گی۔ پھر اس نے ایک اچھی نگاہ اپنی تین سالہ پرانی مصنوعی چڑے کی جیکٹ پر ڈالی جو وہ اس وقت بھی زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس جیکٹ کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور وہ بے رونق نظر آنے لگی تھی۔ ڈیرن لیسنر اب اکیس برس کا ہو چکا تھا اور یہی عمر



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

صحیح رہیں گی یا پتلون کی جیبوں تک؟ یہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہے، وہ سوچ میں پڑ گیا۔

یہ تمام جیکٹس اپنے اپنے اسٹائل میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں جو بھی ان کو پہنتا اس سے اس کی اعلیٰ ذوقی اور سب سے بڑھ کر اس کی مالیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے جسم کی زینت بنا کر وہ یقینی طور پر چند خواتین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ وہ اس خیال پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

اس نے ان جیکٹوں کی قیمتوں کے ٹیگ پلٹ کر دیکھے تو اس کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔

اتنے میں ایک میگزین منڈلاتا ہوا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا اور خوش اخلاقی سے بولا۔ ”میں آپ کی کوئی مدد کروں، سر؟“
”اوں..... نہیں۔ میں..... میں تو بس دیکھ رہا ہوں۔“
ڈیرن نے جیکٹوں کو واپس ریک پر رکھتے ہوئے کہا۔ اسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اس کی اس بات سے کسے زیادہ افسردگی ہوئی ہے..... اسے خود کو یا میگزین کو؟

ڈیرن ایک اور ریک کی جانب بڑھ گیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ دیگر ملبوسات کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اس دوران وہ میگزین ایک اور متوقع خریدار کی جانب متوجہ ہو کر اس کی جانب پلٹ گیا۔ ڈیرن نے ایک بار پھر ایک لپٹائی نظر ان لیڈر جیکٹس پر ڈالی جن کی قیمتیں اس کی قوت خرید سے باہر تھیں۔

وہ ان میں سے ایک جیکٹ لازمی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کا تھیرزا اسٹور سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ اس نے صورت حال پر ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ اسے اپنے سوال کا آسان جواب بھائی دے گیا۔

اگر وہ ایک جیکٹ خریدنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسے چوری تو کر سکتا ہے۔

کیا ہوا اگر جیکٹوں میں مقناطیسی پٹیاں پوشیدہ ہوں جو اسٹور کے بیرونی دروازے پر لگے ہوئے الارم کے سینسر کو آن کر دیتی ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ عود کر آیا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی ابھر آئی۔ وہ ٹہکتا ہوا واپس جیکٹوں کے ریک کی جانب چلا گیا۔

تمام میگزین اس وقت مصروف تھے۔ قریب میں کوئی گاہک بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈیرن نے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اطمینان سے ایک جیکٹ اٹھائی اور لپک کر نزدیک ترین لباس تبدیل

کرنے والے کمرے میں جا گھسا۔ اس نے ہوشیاری اور قرینے سے جیکٹ کا جائزہ لینا شروع کیا اور تلاشی لیتے ہوئے ہر ایک مقناطیسی اسٹریپ اتار کر اسے نیچے پھینکتا رہا۔ اسے ان مقناطیسی اسٹریپس کو ان کی خفیہ جگہوں سے اکھاڑنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ جیکٹ کی آستینوں کا لر، کمر پٹی اور جیبوں میں پوشیدہ تھیں۔ آخری مقناطیسی اسٹریپ اتار کر پھینکنے کے بعد اس نے پوری طرح اطمینان کر لیا کہ اب کوئی مقناطیسی اسٹریپ باقی نہیں رہی۔

پھر ڈیرن نے وہ جیکٹ اپنے کوٹ کے اندر چھپائی اور بے باکی سے لباس تبدیل کرنے والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اس بیرونی دروازے کی جانب تھا جس میں سینر الارم لگا ہوا تھا۔ کتنی آسانی سے جیکٹ ہاتھ آ گیا، وہ یہ سوچتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس کی آزادی صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

اچانک بلند ہونے والی الارم کی تیز چنگھاڑتی آواز نے ڈیرن کے قدموں کو منجمد کر دیا۔

ساتھ ہی پدرانہ شکل و صورت والا ایک سکیورٹی گارڈ نہ جانے کہاں سے اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے ڈیرن کے کوٹ کے کالر کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے واپس اندر اسٹور میں گھسیٹ لیا۔

”یہیں کھڑے رہو، بیٹے۔ ذرا چیک کرتے ہیں کہ الارم کیوں آن ہوا تھا۔“

ڈیرن سوچ میں پڑ گیا۔ کیا میں نے تمام اسٹریپس اتاری تھیں؟ کوئی ایک مجھ سے کیوں کمرس ہوئی ہے؟
ڈیرن خاموش کھڑا رہا جبکہ سکیورٹی گارڈ اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ ڈیرن کے بڑے سے کوٹ کی زپ کھولنے پر جب اندر سے چوری کی ہوئی جیکٹ برآمد ہوئی تو سکیورٹی گارڈ مایوس کن نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اب بتاؤ بیٹا، کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے چوری کر کے تم صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ یہ مقناطیسی اسٹریپس ساکت لیکن بھانڈا پھوڑنے والی ہوتی ہیں۔“
یہ کہہ کر سکیورٹی گارڈ نے جیکٹ کی تلاشی لینا شروع کر دی۔

”یہ کیا.....؟“ اس نے جیکٹ کی دوبارہ سے تلاشی لیتے ہوئے کہا۔ پھر ڈیرن کو گھورنے لگا۔ ”اس پر تو کوئی مقناطیسی اسٹریپ نہیں ہے۔“

ڈیرن کو خود بھی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ جیکٹ پر سے تمام مقناطیسی اسٹریپس علیحدہ کر چکا تھا جیسا کہ

سیکیورٹی گارڈ اس کی تصدیق کر چکا تھا تو پھر الارم کیوں بجا تھا؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈیرن کا ذہن جیڑی سے کام کرنے لگا۔

”ہوسکتا ہے کہ سبز کلرک نے وہ اسٹریپس علیحدہ کر دی ہوں۔ یا ہوسکتا ہے کہ دروازے کا الارم سینسر نا کارہ ہو گیا ہو۔“ ڈیرن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

سیکیورٹی گارڈ نے اپنا چہرہ ڈیرن کے چہرے پر جھکایا اور چبھتے ہوئے لہجے میں سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”کیا تم یہ جیکٹ چوری کر رہے تھے، بیٹے؟“ ڈیرن کو کچھ کہنے کے لیے الفاظ بھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ چوری کے جواز کی کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ چوری کیوں کی تھی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ اسے ہر صورت یہ جیکٹ چاہیے تھی اور اسے حاصل کرنے کا واحد راستہ اسے چوری کرنا ہی تھا تو اس نے یہ راستہ اختیار کر لیا تھا۔

لیکن وہ یہ حقیقت سیکیورٹی گارڈ کے گوش گزار نہیں کر سکتا تھا۔

”نہیں، سر۔“ اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ”میں نے یہ جیکٹ اپنے بھائی کے لیے خریدی ہے۔ وہ مال میں ہے اور میں اسے یہ پتا نہیں چلنے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے لیے کیا چیز خریدی ہے۔“

گارڈ نے گردن ہلائی اور بولا۔ ”کیا تمہارے پاس اس کی رسید ہے؟“

ڈیرن نے شانے اچکا دیے۔ ”شاید مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔“ ڈیرن نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا۔

”اوکے۔“ گارڈ نے کہا۔ ”ہم ایک تجربے کی کوشش کرتے ہیں۔“

گارڈ نے وہ جیکٹ ایک ڈسپلے نیبل پر رکھ دی اور خود الارم والے دروازے سے گزر کر پلٹ کر واپس آ گیا۔

”اب تم اس دروازے سے ایک بار پھر سے گزر کر آؤ۔“ گارڈ نے ڈیرن کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈیرن کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سو اس نے گارڈ کے حکم کی تعمیل ہی میں عافیت سمجھی۔ اسی دوران بہت سے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں رک گئے تھے۔ ڈیرن کو اپنی یہ تذلیل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ لوگوں کی جانب سے اس قسم کی توجہ کا خواہشمند بھی نہیں رہا تھا۔

اسی سوچ میں کم وہ ایک بار پھر اس دروازے سے گزرنے کے لیے پلٹ گیا۔

الارم اس مرتبہ بھی بجنے لگا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ نے ایک بار پھر ڈیرن کو واپس اسٹور کے اندر گھسیٹ لیا۔ ساتھ ہی وقتی طور پر اپنا سر کھانے لگا۔ پھر اس نے سر تا پا ڈیرن کا غور سے جائزہ لیا۔ ڈیرن کا خستہ حال لباس خصوصی طور پر اس کی توجہ کا مرکز تھا۔

”کیا تم نے کوئی اور شے بھی چوری کرنے کی کوشش کی ہے؟“ ”نہیں۔“ ڈیرن نے جواب دیا۔ وہ خود بھی حیران اور گومگو کی کیفیت میں تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کی اکھاڑی ہوئی مقناطیسی اسٹریپس میں سے کوئی ایک اس کے کوٹ کے اندر توجیک کر نہیں رہ گئی ہے؟

ادھر سیکیورٹی گارڈ نے بھی جیسے ڈیرن کے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کو فوراً پڑھ لیا۔ ”اوکے، بیٹے۔“ اس نے ڈیرن کو نیا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اب تم اپنا کوٹ اتار دو اور سینسر کے سامنے سے دوبارہ گزرو۔“

ڈیرن نے وہی کیا جیسا کہ اسے کہا گیا تھا۔ الارم اس بار بھی بجنے لگا۔

”دیکھا!“ ڈیرن نے کہا۔ ”یقیناً اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔“

اب ڈیرن کو یقین آنے لگا تھا کہ وہ اپنی چوری کی جیکٹ کے ساتھ بیچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ابھی وہ اس خوش خیالی میں تھا کہ سیکیورٹی گارڈ نے اسے ایک اور نیا حکم دیا۔

”مجھے اپنے جوتے چیک کراؤ، بیٹے!“ ”میرے جوتے؟“ ڈیرن نے حیرانی سے کہا۔

اسے سیکیورٹی گارڈ کی یہ خواہش بے ضرر لگی تھی۔ اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ گارڈ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے جوتے اسرار دیے۔ پھر دونوں جوتے گارڈ کی جانب بڑھا دیے۔

گارڈ نے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جوتوں کے دونوں ٹکروں میں مقناطیسی اسٹریپس چسپاں تھیں۔

ڈیرن کا منہ لنگ گیا۔

”میں نے چپکواں انگلیوں کے بارے میں تو سن رکھا تھا لیکن چپکواں جوتوں کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔“

سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔

”اب تم خود کو شاپ لفٹنگ کے جرم میں زیر حراست سمجھو، بیٹا!“

غوث پاک

ضیائیں بلگرامی

جب جب انسان رب کائنات کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے تجسس کی ابتدا شاید اپنی ہی ذات سے ہوتی ہے کیونکہ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق ہوئی اور انسان کو کائنات کی سب سے معتبر حیثیت سے نوازا گیا... لیکن تمام انسانوں میں اسے محبوب وہی بندے ہیں جو اس کے اطاعت گزار اور برگزیدہ ہیں... غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی انہی خاص اور مقرب بندوں میں ہوتا ہے جن کی کوئی بات باری تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ سبحان اللہ۔ اگرچہ ان رستوں میں شیطان قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتا ہے مگر بندگی کا اصل مزہ ہی ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں ہے۔

حضرت عبدالقادر جیلانی کی زندگی کے ایمان افروز واقعات



Downloaded From
Paksociety.com

اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ ان کا نام قاطمہ، کنیت ام الخیر اور لقب امہ الجبار تھا۔ جب انہیں اپنی اس عمر میں یہ معلوم ہوا کہ وہ امید سے ہیں تو مجسم سوالیہ نشان بن گئیں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ اس کہن سالی میں بھی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر ابو صالح موکی جتنی دوست کو مطلع کیا کہ وہ امید سے ہیں اور پوچھا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ اس وقت میں ساٹھ سال کی ہوں۔ کیا اس عمر میں ایسا ہو سکتا ہے؟“

سسپنس ڈائجسٹ 229 جنوری 2017ء

ابوصالح نے جواب دیا۔ ”ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا خدا اپنے معاملات میں کہن سالی کا پابند ہے؟ وہ جب چاہے ایسا ہو سکتا ہے۔“
 قاطمہ دم بخود تھیں۔ وہ سوچتیں، یہ جو کچھ ہونے والا ہے، دنیا والوں کی نظر میں بہت عجیب ہوگا۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟

ابوصالح نے انہیں فکر مند جو دیکھا تو انہیں تسلی دی۔ ”قاطمہ! مت گھبراؤ، تم بذات خود اللہ کی برگزیدہ بندی ہو اور تمہارے والد عبد اللہ صومعی اللہ کے ان محبوب بندوں میں شامل ہیں جن کی دل آزاری بھی خدا پسند نہیں کرتا اور جو شخص بھی ان کا دل دکھاتا ہے، خدا اس کو رنج و مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔“

یہ 470 ہجری کی بات ہے، قاطمہ کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نسب نامہ باپ کی طرف سے حسنی اور ماں کی طرف سے حسینی تھا۔ یہ عجیب و غریب واقعہ ایران کے جیلان نامی مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ جیلان کی حدود میں نیق نامی ایک قصبہ تھا۔ یہ بچہ اسی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ ابو موسیٰ نے ایک بار پھر اپنی نیک بیوی کو تسلی دی۔ ”خدا کی نیک بندی! میں تو ایک بات جانتا ہوں، پیدا ہونے والا کوئی معمولی شخص نہیں معلوم ہوتا۔ یہ عظیم الشان شخص معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کی عظمت کا ہمیں فوری علم نہ ہو سکے لیکن جب اس کا علم ہوگا تو ایک عالم حیران اور ششدر رہ جائے گا۔“

قاطمہ بھی اپنے شوہر کی باتوں سے مطمئن اور پُر امید تھیں۔ انہیں اپنے بچے میں عظمت اور تقدس کی جستجو تھی۔ باپ نے بچے کا نام عبدالقادر رکھ دیا۔ عبدالقادر کا بڑا پین رمضان میں پہلی بار ظاہر ہوا۔ رمضان میں ماں نے مسلسل یہ محسوس کیا کہ ان کا بیٹا سحری کے بعد افطار کے وقت تک دودھ نہیں پیتا۔ انہوں نے یہ بات اپنے شوہر کو بتائی اور شوہر سے دوسروں کے کالوں تک پہنچ گئی۔ پھر تو یہ بات دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ بچے کی زیارت کو آنے لگے۔

29 رمضان کو لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لیے بے چین تھے مگر شام کو فضا ابراؤد دیکھ کر لوگ بہت مایوس ہوئے۔ قرب و جوار کا سہارا لیا جاسکتا تھا لیکن فضا بے بسیطہ میں دور دور تک ابراہی ابر تھا۔ لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور آپس میں عید کا چاند ہونے یا نہ ہونے پر گفتگو ہونے لگی۔ انہیں تشویش تھی کہ اگر چاند ہوا اور ابراہی وجہ سے دیکھا نہیں جاسکا تو اگلے دن کا روزہ حرام ہوگا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اتیس کا چاند ہو گیا اور دوسرے دن عید منائی جائے تو یہ ظن اور قیاس بھی اس صورت میں گناہ کا موجب ہوگا کہ اتیس کا چاند ہوا ہی نہ ہو۔ جب یہ مسئلہ زیر غور تھا، کسی نے انہیں یہ مشورہ دیا۔ ”لوگو! ہمارے علم میں ایک ذریعہ موجود ہے جس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اتیس کا چاند ہوا ہے یا نہیں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔“
 حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔ ”کون سا ذریعہ؟ کیا ابراؤد فضا میں چاند دیکھا جاسکتا ہے؟ یا پھر چاند دیکھے بغیر ہی.....“

مشورہ دینے والے نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ سحری کے وقت ابوصالح موسیٰ کے گھر تشریف لے جائیں اور ان سے یہ معلوم کریں کہ ان کا نومولود دودھ پنی رہا ہے یا نہیں۔ اگر وہ دودھ نہیں پنی رہا ہوگا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اتیس کا چاند نہیں ہوا اور نومولود روزے سے ہے لیکن اگر وہ دودھ پنی رہا ہے تو سمجھ لو اتیس کا چاند ہو گیا۔“

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ابوصالح موسیٰ کا بیٹا مادر زاد ولی ہے اور اس پیچیدہ مسئلے کو وہی حل کرے گا۔ سب اس رائے سے متفق تھے۔ انہوں نے جیسے تیسے رات گزاری اور سحری کے بعد ابوصالح کے گھر پہنچ گئے اور ابوصالح کو باہر بلا کر دریافت کیا۔ ”حضرت! یہ تو فرمائیں آپ کا نومولود اس وقت دودھ پنی رہا ہے یا نہیں؟“

ابوصالح نے پوچھا۔ ”دوستو! وہ تو میں بتا دوں گا اندر سے پوچھ کر مگر یہ تم لوگ کیوں معلوم کر رہے ہو؟“
 انہیں جواب دیا گیا۔ ”اس لیے کہ آپ کا بیٹا مادر زاد ولی ہے۔ اگر وہ دودھ نہیں پنی رہا ہوگا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ روزے سے ہے اور اتیس کا چاند نہیں ہوا اور اگر وہ دودھ پنی رہا ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چاند ہو گیا اور صبح عید ہے۔“

ابوصالح اندر آگئے اور اپنی بیوی سے کیفیت پوچھی تو انہیں جواب ملا کہ بچہ دودھ نہیں پنی رہا ہے۔
 انہوں نے باہر آکر اعلان کر دیا۔ ”حضرات! اتیس کا چاند نہیں ہوا کیونکہ عبدالقادر دودھ نہیں پنی رہا ہے۔“
 ان سب نے روزے کی نیت کر لی اور بستی بھر میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ صبح عید نہیں ہے کیونکہ اتیس کا چاند نہیں ہوا۔ جس نے بھی یہ اعلان سنا، روزے کی نیت کی اور روزہ رکھ لیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنوری 2017ء

230

سپینس ڈائجسٹ

آپ نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ بچوں کو آپ کے ساتھ کھیلنے کا بڑا اشتیاق تھا لیکن آپ میں ایک جھجک تھی۔ وہ بچوں کی طرف دیکھتے، ان کی طرف جانے کا ارادہ کرتے مگر پھر ٹھنک کر رک جاتے۔ لڑکے اشاروں سے اپنے پاس بلاتے۔ ایک لڑکے نے آپ کو آواز دی۔ ”تم ہمارے ساتھ کھیلنے کیوں نہیں آتے؟“ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس لڑکے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ دوسرے نے کہا۔ ”ادھر کیا دیکھتے ہو، میرے پاس آؤ۔ پھر دیکھنا کیسا مزے کا کھیل کھیلے ہیں ہم لوگ۔“ آپ نے ان بچوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو داہنی طرف سے آواز سنائی دی۔ ”اُئی یا مبارک!“ (میری طرف آؤ یا مبارک!)

یہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ پریشان اور خوفزدہ اپنے گھر کی طرف چل دیے اور راستے میں ایک جگہ پھر وہی آواز سنائی دی۔ ”اُئی یا مبارک۔“ آپ کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ آپ اپنی ماں کی گود میں جا بیٹھے اور ان سے کہا۔ ”ماں! میری مقدس و محترم ماں! مجھے پناہ دیجیے۔ میں بہت پریشان اور خوفزدہ ہوں۔“ ماں نے پوچھا۔ ”کس بات کی پریشانی؟ کیسا خوف؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”ماں! جب میں اپنے ہم عمر بچوں کے بلانے پر کھیلنے کے لیے ان کی طرف جانے والا تھا، تو مجھے میری دائیں جانب سے کسی نے آواز دی.....“ اُئی یا مبارک۔“ جب میں نے دائیں جانب پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔“

ماں نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ ”میرے بچے! مت ہراساں ہو۔ خدا تیرے ساتھ ہے، جو کچھ ہوگا بہتر ہی ہوگا۔“ آپ جب بھی بچوں کی طرف جانا چاہتے، یہی آواز سنائی دیتی۔ آخر آپ نے کھیل کود کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ آپ کو مدر سے میں داخل کر دیا گیا۔ پہلے دن مدر سے میں داخل ہوتے ہی آپ نے کسی کی آواز سنی۔ ”لوگو! اللہ کے ولی کو جگہ دو۔“

آپ نے بار بار یہ آواز سنی لیکن آواز دینے والے کی شکل نہیں نظر آرہی تھی۔ آپ نے ایک بار پھر اپنی ماں سے اس عجیب و غریب آواز کا ذکر کیا۔ فرمایا۔ ”ماں! میں حیران ہوں کہ مجھے آواز تو ضرور سنائی دیتی ہے مگر دکھائی کوئی بھی نہیں دیتا۔ اب میں کیا سمجھوں کہ یہ کس کی آواز ہے؟“

ماں نے پھر تسلی دی۔ ”بیٹے! پریشان نہ ہو، اللہ تیرے ساتھ ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، بہتر ہی ہو رہا ہے۔“ آپ خاموش ہو گئے۔ کئی دن بعد جب آپ مدر سے جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے گرد و پیش چند نورانی پیکروں کو اپنے ساتھ چلتے دیکھا۔ یہ سب کے سب خاموش تھے لیکن یہ جیسے ہی مدر سے میں داخل ہوئے، نورانی پیکروں کی زبانیں کھل گئیں اور انہوں نے جوش و خروش سے کہنا شروع کر دیا۔ ”اے لوگو! اللہ کے ولی کو راستہ دو۔“ آپ نے ان پیکروں کو دیکھا اور انہیں اپنے ذہن میں بٹھالیا اور ایک بار پھر ماں کو سب کچھ بتا کر پوچھا۔ ”ماں! میں کیا کروں؟ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! میں تجھے کیا مشورہ دوں؟ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔“ آپ کو ماں کے جواب نے پُر سکون کر دیا۔ یہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آپ مدر سے میں پڑھ رہے تھے کہ محلے کا ایک شخص بدحواس بھاگتا ہوا مدر سے میں داخل ہوا اور پوچھا۔ ”صاحبزادے عبدالقادر کہاں ہیں؟“ استاد نے پوچھا۔ ”کیوں، کیا بات ہے؟ تو کچھ پریشان دکھائی دے رہا ہے؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! صاحبزادے عبدالقادر کے نانا سید عبداللہ صومعی کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ میں یہی خبر دینے آیا ہوں۔“

یہ خبر عبدالقادر نے بھی سن لی۔ ابھی انہوں نے اپنے استاد سے چھٹی کی درخواست بھی نہیں کی تھی کہ استاد نے کہہ دیا۔ ”عبدالقادر! تم گھر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ تم پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔“ انہیں اپنے نانا سے بڑی محبت تھی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے انہیں اپنی انگلیوں پر لے کر ایک طرف چمڑک دیا۔ اس شخص نے پوچھا۔ ”اے شخص! میرے نانا کو کیا ہو گیا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہو اتو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بڑھاپے کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔“
انہوں نے اسی وقت چھٹی لی اور ماں کے پاس روانہ ہو گئے۔

ماں نے انہیں گلے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ آپ ماں کو تسلیاں دیتے رہے۔ ”ماں! آپ جانتی ہی ہیں کہ میرے نانا کافی عمر کے انسان تھے۔ آخری دنوں میں یہی پیش آتا ہے۔ جو آیا ہے، اسے واپس بھی جانا ہے۔ ہر شے اپنی اصل کی طرف بھاگتی ہے اور ہر ذی روح کو اللہ کے پاس واپس جانا ہے۔“
ماں نے بیٹے کی باتیں سنیں تو ان کا اضطراب جاتا رہا۔ دکھ کم ہو گیا، طبیعت ٹھہر گئی۔

☆☆☆

ماں نے ان کی ذمہ داریاں قبول کیں اور جیلان میں جس حد تک پڑھایا جاسکتا تھا، پڑھا دیا لیکن بیٹے کی طلب علم کی پیاس کی طرح بجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ جیلان کے اساتذہ اور ذی علم حضرات کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اگر انہیں مزید پڑھنا ہے تو ان کو بغداد کا رخ کرنا چاہیے کیونکہ وہاں یگانہ روزگار و نادرہ کار علمی شخصیات رہتی ہیں۔

وہ اسی فکر میں گھومتے پھرتے کسی دیہات میں پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کسانوں کو کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ ان کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ انہیں کاشت کار اچھے لگ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ان کے دل میں خیال آیا کہ انہیں کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اسی وقت کسی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”عبدالقادر! تم اس لیے پیدا نہیں ہوئے۔“

آپ نے واپسی اختیار کی اور گھر چلے گئے۔ جب گھر میں بھی دل نہیں لگا تو چھت پر چڑھ کر آس پاس کا نظارہ کرنے لگے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے پیش نظر جو منظر تھا، وہ کچھ اور ہی تھا۔ انہوں نے بے شمار آدمیوں کو ایک میدان میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ انہیں حیرت اس بات کی تھی کہ ان کے آس پاس ایک بھی ایسا میدان نہیں تھا جہاں اتنے بہت سارے بلکہ بے شمار لوگ ایک جگہ جمع ہوتے۔ پھر ان کے کانوں میں ایک آواز گونجنے لگی۔ ”عبدالقادر! یہ جو تم دیکھ رہے ہو، میدان عرفات ہے۔“

وہ آہستہ آہستہ چھت سے اترے اور اپنی ماں کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔

ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیٹے! تم چپ کیوں ہو؟“
آپ نے فرمایا۔ ”ماں! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا تھا مگر طلب علم مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں آپ سے جدا ہو جاؤں۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”عبدالقادر! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔ تکلف اور خوف سے کام مت لو۔“

آپ نے فرمایا۔ ”ماں! آپ مجھے خدا کی راہ میں وقف کر دیں اور بغداد جانے کی اجازت دے دیں۔“

ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ”مگر بغداد جا کر کیا کرو گے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”وہاں علم حاصل کروں گا۔“

ماں نے ایک اور سوال کر دیا۔ ”مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ اچانک بغداد جانے کا خیال آیا کس طرح؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی چھت پر سے میدان عرفات کا نظارہ کیا ہے۔ خدا نے میری ذات میں کوئی غیر معمولی بات رکھی ہے، جس سے میں عجیب و غریب آوازیں سن لیتا ہوں اور اب ان آوازوں کے علاوہ کچھ دیکھنے بھی لگا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں بغداد جاسکتا ہوں۔ خدا مجھے بغداد جانے کا حکم دے رہا ہے۔ میں اپنے علم اور.....“

ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم بغداد چلے جاؤ گے۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ماں! میں واقعی بغداد جانا چاہتا ہوں۔ ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل کے لیے۔“

ماں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”اگر یہ بات سچ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد جب واپس آئیں تو ان کی آنکھیں اور زیادہ بھیگ چکی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔

بیٹے نے تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ماں! اس تھیلی میں کیا ہے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”دنار۔“

حضرت محبوب سبحانی غوث پالت

انہوں نے جیلی کا منہ کھول کر الٹ دیا۔ بہت سارے دینار زمین پر ڈیر ہو گئے۔

ماں نے بیٹے کو حکم دیا۔ ”انہیں گنو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کل کتنے دینار ہیں؟“

بیٹے نے دیناروں کی گنتی کی اور اعلان کیا۔ ”یہ کل اتنی ہیں ماں!“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تیرا ایک بھائی اور ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔“

بیٹے نے بھی حیرت اور شکایت کا اظہار کیا۔ ”ماں! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے عبدالقادر! بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہارے باپ نے تم دونوں کے لیے بس اتنی دینار

چھوڑے تھے۔ میں نے تم دونوں کی اس امانت کی بڑی حفاظت کی ہے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! میں نے جو کچھ بھی کہا سچ کہا۔ تم دونوں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ جہاں بھی رہو علم اور سچائی کا دامن

پکڑے رہنا۔“ پھر اتنی دیناروں میں سے آدھے نکال کر بیٹے کے حوالے کر دیے۔

بیٹے نے ان دیناروں کو لے لیا اور کافی دیر تک انہیں دیکھتے ہوئے ایک بار پھر ماں کا شکریہ ادا کیا۔ ماں کو اپنی آغوش

میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

ماں نے کہا۔ ”بدتمیز! یہ تو بڑھ بڑھ کر باتیں کیوں کر رہا ہے؟ جو کچھ بھی تو.....“

بیٹے نے عاجزی سے کہا۔ ”ماں! خدا کے لیے آپ یوں دل برداشتہ ہو کر یہاں سے جانے کا حکم نہ دیجیے۔ میں جاتے

وقت آپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ماں کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی، فرمایا۔ ”عبدالقادر! میں تمہارے اس سر سے خوش ہوں، ملول نہیں۔“ اس کے بعد ماں

نے یہ دینار لے کر گدڑی میں سی دیے۔

بیٹے نے پوچھا۔ ”یہ دیناروں کو آپ کیوں سی رہی ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! راستے میں ڈاکے پڑ جاتے ہیں، اس طرح تیرے دینار محفوظ رہیں گے۔ ڈاکو انہیں دیکھ

کر شاید نظر انداز کر دیں۔“

بیٹے کو ہنسی آگئی۔ ”ماں! کیا ڈاکو اتنے ہی سادہ لوح اور بھولے بھالے ہوا کرتے ہیں کہ وہ گدڑی کو دیکھے بغیر ہی چھوڑ

دیں گے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بیٹے! ڈاکو بلا کے چالاک اور عیار ہوتے ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل بار

بار یہی کہہ رہا ہے کہ تیری گدڑی کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔“

بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو پھر میری ماں ولی ہیں، میں حیران ہوں کہ میں نے ابھی تک اپنی ماں کے

اس مقام کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں، انہیں اپنے حافظے میں محفوظ کر لو اور جب ان کی تصدیق یا

تردید کا وقت آجائے تو تم ان کی تصدیق یا تردید بھی کر لینا۔“

بیٹا لا جواب ہو گیا تو سکوت اختیار کر لیا۔ ماں بیٹے میں کچھ دیر تو یوں ہی باتیں ہوتی رہیں، آخر میں بیٹے نے سامان سفر

سنبھالا اور پڑاؤ کی طرف جانے سے پہلے ماں سے پوچھا۔ ”ماں! کوئی نصیحت؟ کوئی حکم؟“

ماں نے کچھ دیر غلغلگی لگائے بیٹے کو دیکھا اور پھر دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”عبدالقادر! خواہ کسی حال میں بھی ہو، راست

گوئی کو مت چھوڑنا۔ سچ، سچ، سچ..... ہمیشہ سچ بولنا، ہر حال میں سچ بولنا۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں! میں ہمیشہ سچ بولوں گا۔ ہر حال میں۔“

بیٹے نے باہر کا رخ کیا تو ماں اس کو باہر تک چھوڑنے لگیں۔ بیٹا دروازے سے نکل گیا۔ ماں دروازے کے اندر ہی رہ

گئیں۔ انہوں نے آخری الفاظ ادا کیے۔ ”عبدالقادر! میں تمہیں اللہ کے لیے، اللہ کی خاطر خود سے جدا کر رہی ہوں۔ اب

قیامت کے دن ہی تمہیں دیکھ سکوں گی۔“

عبدالقادر نے بھی ماں کو آخری بار جی بھر کر دیکھا اور پڑاؤ کی طرف چل دیے جہاں قافلہ مسافروں کا منتظر تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سپنس ڈائجسٹ 233 جنوری 2017ء

قافلہ بغداد کی طرف چل پڑا۔ اٹھارہ سالہ عبدالقادر کو اپنی اٹھتر سالہ ماں شدت سے یاد آتی رہیں۔ ان کے وطن سے بغداد کا فاصلہ چار سو میل سے زائد تھا۔ کوہستانی سلسلوں، بیابانوں اور صحراؤں میں بڑے خطرات تھے مگر قافلے کو ان میں سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچنا تھا۔ یہ قافلہ ہمدان سے نکل کر ترنگ کے سنان کوہستانی علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں کچھ بہت زیادہ بھی۔ قافلے کی تیز رفتاری میں فرق آ گیا۔ تجربہ کار مسافروں نے اپنے آس پاس نظریں رکھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس دلدلی علاقے میں راہزنوں کا بڑا زور تھا اور قافلے کی سست رفتاری ڈاکوؤں کو حملہ آوری کا موقع فراہم کرتی ہے۔ قافلے کے شمشیر زنوں کو اپنی شمشیروں اور بازوؤں پر بڑا بھروسہ تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر حملہ اچانک کیا جائے تو بات خطرناک ہو جاتی ہے۔

قافلے نے اس دلدلی علاقے میں قیام کا فیصلہ کر لیا کیونکہ یہاں قیام کر کے ڈاکوؤں پر نظریں رکھی جاسکتی تھیں۔ رات کو عشا کی نماز کے بعد قافلے کی طلائیہ گرد جمیعت نے پہرہ دینا ضروری سمجھا اور ان لوگوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر محل وقوع کا جائزہ لیا۔ یہ بڑی اچھی جگہ اس لیے تھی کہ یہاں درندوں کا خوف نہیں تھا اور دور تک آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھی جاسکتی تھی۔ قافلے کی پشت پر دلدلی علاقہ تھا۔ ان کے دائیں بائیں پہاڑی سلسلے تھے لیکن ذرا فاصلے پر۔ قافلے میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو کئی بار یہاں سے گزر چکے تھے۔ انہوں نے قافلے والوں کو بتایا کہ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے کیونکہ دونوں طرف کی پہاڑیاں ڈاکوؤں کا مسکن ہیں اور ڈاکو اس جگہ قفلوں پر شب خون مارا کرتے ہیں۔ قافلے والوں نے الاؤ جلائے اور اس کی روشنی میں طلائیہ گردوں نے چوکیداری کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔

رات کے پچھلے پہر طلائیہ گرد بھی اوجھٹنے لگے لیکن ان میں ایک شخص اس وقت بھی مستعد اور بیدار تھا۔ اس نے بائیں طرف کی پہاڑی میں سے پچیس تیس گھڑ سواروں کو باہر نکلتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر اس کی نظر اچانک دائیں طرف اٹھ گئی۔ ادھر سے بھی پچیس تیس گھڑ سوار نمودار ہوئے اور انہوں نے بھی آہستہ آہستہ قافلے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ پھر ان سواروں نے نصف دائرہ بنالیا اور یہ دائرہ قافلے کی طرف بڑھتے ہوئے مختصر ہونے لگا۔ بیدار طلائیہ گرد چیخنے چلانے لگا۔ ”لوگو! ہوشیار خبردار..... ڈاکو ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ خدا کے لیے جلدی سے بیدار ہو جاؤ، اٹھو اور ان کا مقابلہ کرو۔“

اوجھٹتے ہوئے طلائیہ گرد بھی بیدار ہو گئے اور قافلے والے بھی اپنے ہتھیار سنبھالنے لگے۔ ڈاکوؤں نے قافلے میں بیداری کے آثار جو دیکھے تو شاہینوں کی طرح قافلے پر جھپٹ پڑے اور انہیں مارنا کاٹنا شروع کر دیا۔ شور و غل، چیخ پکار، بھاگ دوڑ اور ہتھیاروں کی شاپش اور جھنا جھن سے پورا ماحول گونج گیا۔ ڈاکو آزمودہ کار تھے۔ انہوں نے بڑی جلدی قافلے کو مغلوب کر لیا۔ چند آدمی خیموں کے پیچھے بھاگے مگر وہ دلدل میں پھنس گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ بزدلوں اور مصلحت اندیشوں نے ڈاکوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈاکوؤں نے قافلے والوں کے مال و زر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بقیۃ السیف لوگوں سے مال و زر کا پتا پوچھنے لگے اور پھر انہی کی نشاندہی پر چھاپے مار کر چھپا ہوا مال نکالنا شروع کر دیا۔

عبدالقادر ایک طرف کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایک ڈاکو ان کے پاس بھی آیا اور پوچھا۔ ”لڑکے! تیرے پاس بھی ہے کچھ؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں! میرے پاس بھی چالیس دینار موجود ہیں۔ یہ دینار میری ماں نے مجھے دیے تھے۔“ ڈاکو زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”آدی دلچسپ ہو، ہم سے بھی مذاق! تمہارے پاس چالیس دینار ہیں، خوب! اب تم مزے کرو کیونکہ ہمیں تمہارے دینار نہیں درکار ہیں۔“

یہ ڈاکو اپنے ایک ساتھی کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ اس قافلے میں سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس کے پاس چالیس دینار موجود ہیں۔

ڈاکو کا ساتھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”تو اس میں ہنسنے یا تعجب کی کیا بات ہے؟“ ڈاکو نے جواب دیا۔ ”میں ہنس اس لیے کہ اگر اس نوجوان کے پاس دینار موجود بھی ہیں تو وہ سامنے نہیں ہوں گے اس لیے انہیں پرآمد کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا بظاہر محسوس ہو رہا ہے۔“

ساتھی نے پوچھا۔ ”وہ نوجوان کہاں ہے؟“

ڈاکو نے جواب دیا۔ ”آؤ، میرے ساتھ آؤ۔ میں اس سے ملائے دیتا ہوں۔“
 ڈاکو اپنے ساتھی کو آپ کے پاس لے گیا۔ ساتھی ڈاکو نے آپ سے پوچھا۔ ”صاحبزادے! کیا تم نے میرے ساتھی سے یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس چالیس دینار موجود ہیں؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں نے تیرے ساتھی سے یہی کہا تھا۔“
 ڈاکو کے ساتھی نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہیں؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”میری گدڑی میں۔“
 ساتھی نے انہیں حیرت سے بغور دیکھا اور اپنے ڈاکو ساتھی کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ڈاکو نے کہا۔ ”سن لیا تم نے اس کا جواب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔“
 ڈاکو کے ساتھی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے اس نوجوان کو ہمارے خوف نے حواس باختہ کر دیا ہے ورنہ یہ ایسی بات نہ کرتا۔“

دونوں ڈاکوؤں نے آپ سے کہا۔ ”صاحبزادے! کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟“
 آپ نے پوچھا۔ ”کہاں؟“
 جواب ملا۔ ”ہم تمہیں اپنے سردار کے پاس لے چلیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے سردار کو ہماری طرح تم جیسا نوجوان آج تک نہیں ملا ہوگا۔“
 آپ نے جواب دیا۔ ”میں تم دونوں کے ساتھ چلتا ہوں، چلو۔“
 دونوں ڈاکو انہیں اپنے ساتھ اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ اس وقت سردار لوٹ کے مال کے حصے بخرے کر رہا تھا۔ اس نے آپ کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ اس نوجوان کو میرے پاس کیوں لائے ہو؟ کیا اس نے کوئی زیادتی کی ہے تم دونوں کے ساتھ؟“
 ایک ڈاکو نے جواب دیا۔ ”نہیں سردار! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ عجیب و غریب نوجوان ہے..... آپ اس کی باتیں سن کر دنگ رہ جائیں گے۔“
 سردار نے مال و زر کی تقسیم موقوف کی اور آپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا خاص بات ہے اس نوجوان میں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ خاص بات۔“
 ڈاکو نے کہا۔ ”سردار! ہم دونوں اس نوجوان کے پاس یکے بعد دیگرے گئے اور اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس بھی کچھ ہے بھلا، اس نے جواب دیا۔ ”چالیس دینار! ہم نے پوچھا، وہ کہاں ہیں؟“ جواب دیا۔ ”میری گدڑی میں سلے ہوئے ہیں۔“
 سردار! اب آپ ہی بتائیں، یہ نوجوان عجیب ہے یا نہیں؟ ہم دونوں کا خیال ہے کہ یا تو نوجوان ہم سے مذاق کر رہا ہے یا طنزاً کہہ رہا ہے یا پھر یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر گیا ہے اور اس وقت اس کے ہوش و حواس درست نہیں ہیں۔“
 سردار نے پوچھا۔ ”صاحبزادے! تمہارا نام کیا ہے؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”عبدالقادر۔“
 سردار نے پوچھا۔ ”کہاں سے آرہے ہو؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”جیلان سے۔“
 ”کہاں جاؤ گے؟“
 ”بغداد۔“

سردار نے پوچھا۔ ”وہاں کیوں جا رہے ہو؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل کے لیے۔“
 سردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اس نوجوان کے ہوش و حواس بالکل صحیح ہیں اور لہجہ کا اعتماد بتا رہا ہے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔“ اس کے بعد آپ سے پوچھا۔ ”صاحبزادے! تمہارے پاس کتنی رقم ہوگی؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”چالیس دینار۔“
 سردار نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میری گدڑی میں بغل کے بیٹھے۔“
سردار نے ایک ڈاکو کو حکم دیا۔ ”ذرا گدڑی کو ادھیڑ کر دیکھ تو سہی۔“

ڈاکو نے گدڑی کو ادھیڑ ڈالا اور اس میں سے چالیس دینار نکال کر سردار کے سامنے رکھ دیے۔ سردار پریشان ہو گیا اور ڈاکو حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سردار کے دل و دماغ میں ہنگامہ برپا تھا، اس نے پوچھا۔ ”صاحبزادے! جن دیناروں کو تم نے اس طرح چھپا رکھا تھا، انہیں اتنی آسانی سے کیوں بتا دیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں جیلان سے چلا تھا تو میری والدہ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں کبھی جھوٹ نہ بولوں، ہمیشہ سچ پر قائم رہوں، چنانچہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔“

سردار کے دل پر ایک اور چوٹ لگی، اس نے کہا۔ ”تمہاری یہ رقم تو چھن جائے گی تم سے، اب تم کیا کرو گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مال تو آتی جانی شے ہے، اس کا افسوس بیکار ہے۔ میرا توکل اللہ پر ہے۔“

سردار کا دل بھر آیا۔ دینار ان کی طرف بڑھادیے، بولا۔ ”صاحبزادے! انہیں رکھ لو۔ میں انہیں نہیں لے سکتا۔ تم نے تو میری کا یا ہی پلٹ دی ہے۔ تمہیں اپنے اس وعدے کا اتنا زیادہ پاس ہے جو تم نے اپنی ماں سے کیا ہے اور ایک میں ہوں کہ میں نے روز اول اپنے رب سے جو عہد کیا تھا، اس کو یکسر بھلا چکا ہوں۔ نوجوان! تم عظیم انسان ہو اور میں سرتاپا گناہ گار..... میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ اب میں کیا کروں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اپنے رب سے کیے ہوئے وعدے پر قائم ہو جا، اب بھی وقت ہے۔“

سردار اتنا بے قابو ہو چکا تھا کہ آپ کے قدموں میں گر گیا، بولا۔ ”نوجوان! تم مجھے معاف کر دو۔“

آپ نے اس کو اٹھا کر اپنے روبرو کھڑا کر لیا، فرمایا۔ ”معافی مجھ سے نہیں اپنے رب سے مانگ جس سے عہد شکنی کا تو سر تکب ہو چکا ہے۔“

سردار سجدے میں گر گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ”اے میرے رب! میں عاجز اور گناہ گار انسان کس زبان سے معافی مانگوں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسا کوئی بھی کام نہیں کروں گا جس سے روز قیامت مجھے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میری پچھلی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو معاف فرما۔“

کچھ دیر بعد سردار نے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا کہ اب وہ راہزنی سے توبہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی یہی کہنا چاہیے۔

اس نوجوان نے پورے گروہ کو متاثر کر لیا تھا۔ ہر شخص نے توبہ کی اور سردار کی تقلید میں سجدے میں گر کر معافیاں مانگتا رہا۔

سردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”تم لوگ قافلے میں واپس جاؤ اور وہاں میری طرف سے اعلان کر دو کہ ہر شخص مجھ سے اپنا سامان واپس لے جائے۔“

اس اعلان نے قافلے کو حیرت زدہ کر دیا۔ کسی کو بھی اس اعلان کی صداقت پر یقین نہیں تھا۔ کسی شخص نے کہا۔ یقیناً اس اعلان میں بھی کوئی نہ کوئی چال ہوگی لیکن آپ نے جب یہ اعلان کر دیا کہ سردار سچ بول رہا ہے، اپنا اپنا سامان اس سے واپس لے لو، تو قافلہ ٹوٹ پڑا۔ جو لوگ مارے جا چکے تھے، ان کا سامان ایسے لوگوں کو دے دیا گیا جن سے مرنے والوں کی کسی قسم کی رشتے داری تھی۔

آپ ڈاکوؤں کو وہیں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

جب آپ بغداد میں داخل ہوئے تو بارش ہو رہی تھی، آپ حضرت حماد کی درس گاہ کے در پر پہنچے اور مارے شرم کے بلند آواز میں نہ کہہ سکے کہ لوگو! دروازہ کھولو، ایک پڑوسی طالب علم آ رہا ہے۔

شاید آپ کی آواز اندر نہیں پہنچی کیونکہ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ آپ خانقاہ کے در پر ہی پڑ رہے۔ یہ خانقاہ بھی تھی اور درگاہ بھی۔ آپ رات بھر خانقاہ کے در پر پڑے رہے۔ صبح جب خانقاہ کا در کھلا تو آپ بھی اندر داخل ہوئے۔ اندر حضرت حماد اپنے شاگردوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ حضرت حماد نہایت عالم و فاضل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ حماد نے انہیں دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ جب یہ ان کے پاس گئے تو انہوں نے مصافحہ کیا اور فرمایا۔ ”اے عبد القادر! علم و عرفان کی دولت آج ہمارے پاس ہے توکل تمہارے پاس ہوگی، تمہاری ملکیت ہوگی اور تمام دنیا کے دل تیری

آپ نے اپنے استاد کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور وہیں رہنے لگے۔

آپ کو اب یہ دشواری پیش آئی کہ آپ جو کچھ جیلان سے لے کر چلے تھے، وہ ختم ہو چکا تھا۔ کھانے کا سامان کہاں سے خریدتے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلا نا چاہتے تھے۔ آپ دریائے دجلہ کے ساحل پر چلے جاتے اور وہاں دور تک ایسے درختوں اور پودوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے جنہیں کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا سکتے۔

بھوک کے عالم میں یہ ایک دن بغداد کے مشہور بازار سوق الریحانین میں پہنچ گئے۔ اس بازار میں ایک شاندار مسجد تھی۔ آپ اس مسجد میں داخل ہو گئے۔ بھوک نے آپ کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ آپ اپنے آپ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتے رہے مگر بھوک کی شدت نے آپ کو بے بس کر دیا تھا۔

اسی وقت ایک فارسی نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی پوٹلی کھولی تو اس میں سے چند نان اور بہنا ہوا گوشت سامنے آ گیا۔ اب تو صبر کا یار ابھی نہ رہا۔ اس نوجوان نے کھانے کو فرش پر رکھا اور ہاتھ دھوئے چلا گیا۔ پھر واپس آ کر وہ کھانا کھانے لگا۔ آپ کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ ہر نوالے کے ساتھ آپ کا منہ کھلتا اور بند ہو جاتا۔ نوجوان کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہوا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب! آپ بھی شریک ہو جائیں۔“

آپ نے انکار کر دیا، فرمایا۔ ”بس جناب بسم اللہ..... آپ ہی کھائیں۔“
فارسی نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”آپ کو خدا کی قسم میرے ساتھ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کھانا پڑے گا۔“

آپ کے نفس نے آپ کو مجبور کر دیا اور اس کے ساتھ کھانے لگے۔ فارسی نوجوان نے پوچھا۔ ”جناب! آپ کون ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ایک طالب علم۔“

فارسی نوجوان نے پوچھا۔ ”آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں جیلان کا رہنے والا ہوں۔“

فارسی نوجوان بہت خوش ہوا، بولا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ بغداد میں مقیم اپنے ہم وطن سے تو خوب واقف ہوں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شاید نہیں کیونکہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں اور لوگوں سے کم ہی ملتا ہوں۔“
فارسی نوجوان نے کہا۔ ”افسوس کہ میں جیلان کے رہنے والے عبدالقادر نامی نوجوان کی تلاش میں ہوں۔ کئی دنوں سے اسے تلاش کر رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جس کی آپ کو تلاش ہے، یہ وہی خاکسار ہے۔ فرمائیں مجھ سے آپ کو کیا کام ہے؟“
فارسی نوجوان بے چین ہو گیا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بولا۔ ”بھائی! میں تمہیں کئی دنوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ جب میں بغداد میں داخل ہوا تھا تو اس وقت میرے پاس اپنا ذاتی جیب خرچ بھی تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ خرچ ہوتا رہا اور جب وہ ختم ہو گیا تو میں پریشان رہنے لگا۔ میں تین دن تک بحالت فاقہ تمہیں تلاش کرتا رہا۔ آج جب بھوک نے بہت زیادہ پریشان کیا اور یارائے صبر نہ رہا تو میں نے آج تمہاری امانت میں سے ایک وقت کا کھانا خرید لیا۔ اب آپ بخوبی کھاتے رہیے کیونکہ یہ آپ ہی کا کھانا ہے اور میں آپ کا مہمان ہوں حالانکہ بظاہر تھوڑی دیر پہلے آپ میرے مہمان تھے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں..... یہ کیا معاملہ ہے؟“

فارسی نوجوان نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ کی والدہ نے آپ کو آٹھ دینار بیسجے تھے، یہ کھانا اسی میں سے خریدا تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں، تین فاقوں کے بعد تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔“

آپ نے خندہ پیشانی سے فرمایا۔ ”یہ خیانت نہیں ہے۔“

کھانا کھا چکنے کے بعد آپ نے بقیہ دینار بھی اس فارسی نوجوان کو دے دیے تاکہ وہ ذہنی اذیت سے بچ جائے۔
آپ جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ ان میں ابو سعید بارک مخزومی اور ابو الخیر

حماد کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ یہ دونوں حضرات صاحبِ حال بھی تھے۔ ابوسعید مبارک مخرومی وہ ذات تھی جس کے دستِ حق پرست پر آپ نے بیعت کی اور انہی سے خرقہ خلافت بھی پایا۔

اس دوران آپ کو یہ احساس ستانے لگا کہ بغداد میں فتنہ و فساد بہت زیادہ ہے، اس لیے اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس احساس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ آپ نے قرآن پاک سنبھالا اور بغداد کے محلہ حلبہ کے دروازے کی طرف چل دیے۔ راستے میں کسی نے انہیں آواز دی۔ ”عبدالقادری کہاں..... یہ کہاں چل دیے؟“

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ پھر چل دیے۔ اس بار کسی نے زوردار دھکا دیا، یہ گر گئے لیکن دھکا دینے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے اور جب کوئی بھی نظر نہیں آیا تو آپ پھر چل دیے۔

پچھلے سے پھر کسی نے آواز دی۔ ”عبدالقادری! لوٹ جاؤ۔ خلق کو تمہاری ذات سے فائدے پہنچیں گے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”خلق کا مجھ پر کیا حق ہے؟ میں اپنے دین کی حفاظت کی خاطر بغداد چھوڑ رہا ہوں۔“ جواب ملا۔ ”نہیں، تم یہیں رہو، تمہارا دین سلامت رہے گا۔“

آپ خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے، آپ نے خدا سے دعا کی۔ ”اے الہ العالمین! مجھے کسی ایسے آدمی سے ملا دے جو مجھے اس تذبذب اور کشمکش سے نکال دے۔ میرے لیے کیا ٹھیک ہے؟ بغداد میں قیام یا ترک بغداد؟ میں اپنی اس الجھن کا حل چاہتا ہوں۔“

انہوں نے ایک رات محلہ حلبہ کے دروازے ہی پر گزار دی۔ علی الصبح کسی نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ ”کیوں عبدالقادری! تم نے اپنے اللہ سے کس بات کی خواہش کی تھی؟“ آپ خاموش رہے کیونکہ کچھ یا نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے کس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

اس شخص نے دروازے کو بڑے زور سے بند کر دیا۔ دروازے کی گرداڑ کران کے چہرے پر آگئی۔ اسی وقت انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اللہ سے کیا خواہش کی تھی۔ انہوں نے دروازے کے دوسری طرف از صاحب کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے پھر معلوم نہیں کس طرح یہ شبیہ ان کے دل و دماغ پر ابھرنے لگی۔ یہ بزرگ ابوالخیر حماد تھے، ان کے استاد..... آپ ان کی خدمت میں پہنچے اور انہیں ایسا لگا تو یا سکون مل گیا ہو۔

ان دنوں آپ دوسرے اساتذہ سے پڑھ رہے تھے۔ جب پڑھائی سے فرصت ملتی، یہ حضرت حماد کے پاس چلے جاتے۔

حماد نے ایک دن پوچھا۔ ”کیوں عبدالقادری! تم میرے پاس کیوں آتے ہو؟“ اس وقت حماد کے پاس ان کے شاگردوں اور ارادت مندوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے پوچھا۔ ”میں آپ کے پاس کیوں نہ آؤں؟“

حماد نے جواب دیا۔ ”تم فقیہ ہو، فقہاء میں جاؤ۔ یہاں میرے پاس تمہارا کیا کام؟“ آپ نے فرمایا۔ ”میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔“ حماد نے انہیں مارا اور حکم دیا۔ ”لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم میرے پاس آؤ جاؤ۔ تم اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہیں دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”آپ جو چاہیں کریں لیکن میں آنا جانا ترک نہیں کروں گا۔“ حماد نے حکم دیا۔ ”تب پھر تم یہاں سے چلے جاؤ۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”میں چلا جاؤں گا لیکن ابھی اسی وقت نہیں جاؤں گا۔“ اس کے بعد آپ حماد کی صحبت میں کچھ دیر اور بیٹھے اور پھر اپنے گھر چلے گئے۔

کئی دن بعد جب آپ دوبارہ حضرت حماد کے پاس گئے تو انہوں نے کہا۔ ”عبدالقادری! آج تو غضب ہی ہو گیا۔ میرے پاس اتنا کھانا آیا تھا کہ محلے والوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچا سکتا تھا لیکن میں نے وہ سب کھا لیا۔ تمہارا خیال بھی آیا تھا مگر میں نے سوچا کہ مجھ کو تمہارے حصے کا کھانا نہیں رکھنا چاہیے۔“

حماد کے ارادت مندوں نے جو یہ دیکھا کہ ان کے سرورِ شہ عبدالقادری کو جھڑک سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سب بھی

عبدالقادر کی خبر لے کر اپنے استاد کو خوش کر دیں۔ ایک دن آپ جو حمد کی خدمت میں پہنچے تو چند ارادت مندوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان لوگوں نے کہا۔ ”عبدالقادر! تم تو قبیح ہو، تم یہاں کیا لینے آتے ہو؟ تمہارا یہاں کیا کام؟“ حضرت حمد کو غصہ چڑھا اور کہا۔ ”نامعقولو! یہ کیا ہے؟ اس شریف انسان کو کیوں تکلیفیں پہنچاتے ہو۔ تم میں تو ایک بھی اس جیسی حمیت اور غیرت کا مالک نہیں ہے۔ اگر میں اس نوجوان کو تکلیف دیتا ہوں تو صرف امتحان کے لیے مگر میں دیکھتا ہوں کہ عبدالقادر نہایت مستقل مزاج شخص ہے پہاڑ کی طرح، جو کسی بھی طرح جنبش نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆

اس عہد کے مشہور صوفی شیخ ابو الوفا اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے ہم سخن تھے۔ اسی دوران ان کی خدمت میں آپ بھی پہنچ گئے۔ شیخ ابو الوفا باتیں کرتے کرتے ایک دم چپ ہو گئے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ اس شخص کو ہماری مجلس سے نکال باہر کرو۔“

مریدوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور انہیں پکڑ کر مجلس سے نکال باہر کیا۔ شیخ ابو الوفا دوبارہ حاضرین مجلس سے مخاطب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آپ دوبارہ اس مجلس میں پہنچ گئے۔ شیخ ابو الوفا پھر خاموش ہو گئے اور آپ کو مخاطب کیا۔ ”عبدالقادر! جب میں نے تمہیں اس مجلس سے نکلوا دیا تھا تو دوبارہ پھر بغیر بلائے کیوں آ گئے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”اس مجلس میں خاص و عام کی کوئی تخصیص نہیں، جو چاہے آ سکتا ہے پھر مجھ پر یہ پابندی کیوں؟“ شیخ ابو الوفا نے غصے میں حکم دیا۔ ”اس کو زبردستی نکال باہر کرو اور اس کو اتنی دور پھینک آؤ کہ یہ پھر نہ آ سکے۔“ مریدوں نے آپ کو اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور بہت دور پھینک آئے۔ شیخ ابو الوفا دوبارہ حاضرین مجلس سے مخاطب ہو گئے۔ وہ فرما رہے تھے۔ ”اللہ کے ہاں طلب کو بہت اہمیت حاصل ہے، وہاں تکبر اور انا نہیں چلتی، وہ دلوں کا حال جاننے والا سمجھ و بصیر ہے۔“ ابھی شیخ ابو الوفا کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ آپ تیسری بار اس مجلس میں پہنچ گئے۔

اس بار شیخ ابو الوفا نے انہیں آتے جود دیکھا تو اپنے تخت سے اتر پڑے اور چند قدم آگے بڑھ کر ان سے معافہ کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور حاضرین سے فرمایا۔ ”اے اہالیان بغداد! تمہارے سامنے ولی اللہ موجود ہے، اٹھو اور ان کی تعظیم بجالاؤ۔“ حاضرین مجلس نے پوچھا۔ ”حضرت! ابھی تو آپ نے دوبار ان کی اہانت کر کے مجلس سے نکلوا دیا تھا اور اب آپ انہیں ولی اللہ کہہ رہے ہیں، آخر ایسا کیوں؟“

شیخ ابو الوفا نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں اہانت کی غرض سے اپنی مجلس سے نہیں نکالا تھا بلکہ اس طرح ان کا امتحان مقصود تھا اور تم سب کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس ذات کو خوب اچھی طرح پہچان لو۔“

اس کے بعد آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”عبدالقادر! میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا، اس کو بھلا دیجیے۔ آج وقت ہمارے ساتھ ہے اور عنقریب یہ وقت آپ کے ہاتھ آنے والا ہے۔ دنیا کے تمام چراغ روشن ہو کر بجھ جاتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ کا چراغ قیامت تک روشن رہے گا۔“

شیخ ابو الوفا نے اپنی جائے نماز، صبح، قیام، بیلا اور اپنا عصا ان کے حوالے کر دیا اور خود دوبارہ اپنے تخت پر جا بیٹھے اور حاضرین سے خطاب فرماتے رہے۔

خطابت سے فارغ ہو کر آپ نیچے آئے اور مجلس ختم کر کے آپ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا ہاتھ تھام لیا اور پھر اخیر سڑھی پر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے فرمایا۔ ”عبدالقادر! تمہارا بھی عظیم الشان وقت ہوگا۔ جب ایسا ہو جائے تو خدا کے لیے میری سفید ڈاڑھی کا خیال ضرور رکھنا۔“

اس کے بعد آپ کا جسم تھر تھرایا اور شیخ ابو الوفا آہستہ آہستہ زمین پر گر گئے۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا اور شیخ کی روح جسد خاکی کو چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی۔ لوگوں نے رونادھونا شروع کر دیا۔ آپ نے انہیں رونے دھونے سے روک دیا اور فرمایا کہ اللہ کو اس طرح رونادھونا بالکل پسند نہیں اور پھر شیخ ابو الوفا اگر ہمارے ساتھ رہ رہے ہوتے اور ان کے سامنے یہ واقعہ پیش آتا تو کیا تم سب اسی طرح ان کے سامنے بھی رو دھو سکتے؟ اس کے بعد خود ہی جواب دیا۔ کہا ”اگر شیخ آج اس دنیا میں ہم سب کے درمیان موجود ہوتے تو وہی اپنا فیصلہ حاضرین کو اسی وقت سنا دیتے اور رونے دھونے سے تم سب کو جبراً روک

دیتے۔ اب آئی سمجھ میں ہماری بات؟“

جھوم نے جواب دیا۔ ”ہاں پیر و مرشد! غور کرنے کی ہر بات ذہن نشین کر لی ہے آپ مطمئن ہیں۔“
یاد الہی کی لذت نے انہیں دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ آپ بغداد کے قریب ایک قدیم ویرانے میں چلے جاتے۔ یہاں ایک برج بنا ہوا تھا۔ آپ اس برج میں عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ بغداد والے یہ دیکھتے تو ہنستے۔ انہوں نے اس برج کا نام برج نجی رکھ دیا تھا۔

آپ نے اس برج میں تقریباً گیارہ سال عبادت کی۔ ایک دن معلوم نہیں کیوں، آپ نے اپنے دل میں یہ عہد کر لیا کہ میں اس وقت تک بھوکا رہوں گا جب تک کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلائے گا۔
اس عہد کو کئی دن گزر گئے مگر کوئی شخص بھی ایسا نہیں آیا جو انہیں اپنے ہاتھ سے کچھ کھلاتا پلاتا۔

ایک دن ایک پہرہ دار صاحب آپ کے حجرے میں آئے۔ ان کے ساتھ انواع و اقسام کے کھانوں سے لدا سترخوان تھا۔ آنے والے نے کھانا اور پانی رکھ دیا اور خود کہیں چلا گیا۔ آپ کا بھوک سے بہت برا حال تھا۔ نفس نے آپ کو مشورہ دیا کہ عہد تو تمہارا پورا ہو چکا ہے، اب اسے توڑ دو لیکن آپ کا ضمیر بیدار تھا۔ اس نے آپ کو منع کیا۔ ”خبردار عبد القادر! ایسا نہ کرنا۔ تم نے جو عہد کیا ہے، اس پر ڈٹے رہو۔“

انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کھانے کا ارادہ ترک کر دیا اور بہت گڑگڑا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کیا۔ ”بارالہا! میں کمزور اور ناتواں انسان۔ بھلا میں اپنے عہد کو کیسے نبھا سکتا ہوں۔ مجھے اپنے عہد کو نبھانے کی توفیق عطا فرما۔“

ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے انہیں مخاطب کیا۔ ”عبد القادر! آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“
لیکن ان کے ساتھ ایک دشواری تھی، کیا اس طرح وہ اپنے عہد پر قائم رہ سکیں گے؟ کیا ان کے عہد میں جگہ کی پابندی بھی ہے؟ اس مسئلے کو ایک عجیب و غریب ذات نے حل کر دیا۔ ایک اور شخص نجی برج میں آیا اور اس نے عبد القادر کے کان میں کہا۔ ”اٹھیے! اور ابو سعید مخزومی کے ساتھ ان کے گھر تشریف لے جائیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“
جواب ملا۔ ”میں..... میں وہ ہوں جو ہندوگان خاص کی راہنمائی کرتا ہے، خضر!“
آپ اٹھے اور ابو سعید مخزومی کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ وہاں شیخ ابو سعید مخزومی نے انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور پانی پلایا، فرمایا۔ ”عبد القادر! اللہ نے تیری خواہش کو پورا کرنے کے لیے مجھے بھیج دیا تھا۔“
انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

وہ ظاہری و باطنی علوم اور مجاہدات و ریاضات میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ یہ سوال کی سولہ تاریخ اور 521 ہجری تھی۔ شمسی حساب سے 1127ء اور دن منگل کا تھا۔ دوپہر کے وقت آپ کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول ﷺ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ ”عبد القادر! تم لوگوں کو فسق و فجور اور گمراہی سے بچانے کے لیے وعظ و نصیحت کیوں نہیں کرتے؟“

آپ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں عجی ہوں اور شاید عرب فصحا..... میرے کلام پر توجہ نہیں دیں گے۔“

حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”عبد القادر! اپنا منہ کھول۔“

آپ نے اپنا منہ کھول دیا۔ حضور ﷺ نے اپنا لعاب و بہن سات بار آپ کے منہ میں ڈالا اور فرمایا۔ ”عبد القادر! اب جا اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کر اور انہیں پروردگار عالم کے راستے پر لاتا کہ یہ قرآن و حدیث کی راہ اختیار کر سکیں۔“
بیداری کے بعد آپ نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی نماز ظہر ادا کی اور منبر پر بیٹھ کر وعظ فرمانے لگے۔ جو وہاں موجود تھے ان کا وعظ چھوڑ کر ہلنا اور ادھر ادھر جانا محال ہو گیا۔ آپ کی آواز کڑک دار تھی اور دور دور تک سنی جاسکتی تھی۔ جس نے بھی یہ آواز سنی، آپ کے قریب ہو گیا اور نہایت توجہ اور اٹھا کہ آپ کا وعظ سننے لگا۔ ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور انہیں اپنے دلوں میں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے عبد القادر جیسا فصیح و بلیغ شخص نہیں دیکھا۔ آواز میں کڑک، سوز اور لفظوں میں سحر ہے۔

وعظ کے ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک سامعین محو سے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھے رہ گئے لیکن جب انہیں ہوش

آیا تو وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس عجیبی نے تو مال ہی کر دیا۔ یہ انسان ہے یا کوئی ملکوتی مخلوق، اس کی آواز میں جادو ہے اور جملوں میں مٹھاس کی چپک، آخر یہ شخص ابھی تک کہاں تھا؟ کسی نے کہا۔ ”شاید اس شخص سے بڑا مقرر اور واعظ پورے بغداد میں نہیں ملے گا۔“ ایک اور شخص نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”تم بغداد کی بات کر رہے ہو، میں یہ کہتا ہوں کہ پورے عرب میں اس جیسا فصیح و بلیغ شخص نہیں ملے گا۔“

آپ نے ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اے طلب گار! تو بہ کر بسم اللہ، اخلاص حاصل کر بسم اللہ، معافی مانگ بسم اللہ، خدا تک رسائی کی کوشش کر۔ ایک ہفتے میں اس تک پہنچ جا۔ یہ مشکل ہو تو ایک ماہ میں جا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تو ایک سال میں جا۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ساری عمر میں ایک دفعہ جا۔ کیونکہ سب کچھ اس کے پاس ہے۔“ آپ کے وعظ کی ایسی دھوم مچی کہ ہجوم میں دن دو نارات چو گنا اضافہ ہونے لگا، یہاں تک کہ نوبت ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ جس جگہ آپ وعظ فرماتے تھے، وہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی تو ہجوم نے آپ کی کرسی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر شہر کے باہر ایک وسیع میدان میں پہنچا دیا۔ اس ہجوم میں چار سو ملفوظ نویس موجود تھے۔ یہ آپ کے وعظ کو قلمبند کرنے پر مامور تھے۔ آپ نے تقریر شروع کی تو لوگوں کا برا حال ہو گیا۔ محشر آنے لگے اور انہوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور اکثر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کی تقریر کے اثر سے سیکڑوں یہودی اور عیسائی مسلمان ہو گئے۔

لوگوں میں سے کسی نے آپ سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیسا وعظ ہے کہ لوگ دیوانے ہوتے جا رہے ہیں۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے واعظوں جیسا نہیں ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بات کہتا ہوں اور باطن کی قوتیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔“

ایک عرصے بعد آپ کے صاحبزادے ابو عبد اللہ عبد الوہاب کئی ملکوں کی سیاحت اور تحصیل علوم و فنون کے بعد گھر واپس آئے تو آپ سے اجازت طلب کی کہ میں وعظ کہنا چاہتا ہوں، اپنے منبر پر بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اجازت ہے۔“

صاحبزادے عبد الوہاب اپنے والد کے منبر پر گئے اور وعظ شروع کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے اور موثر طرزِ نصائح کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اس محفل وعظ میں خود آپ بھی موجود تھے۔ ادھر وعظ جاری تھا۔ دوسری طرف ہجوم باتوں میں مشغول تھا۔ اس رنگ نے عبد الوہاب کو دل برداشتہ کر دیا۔ آپ اپنی جگہ سے اٹھ کر منبر پر تشریف لے گئے اور اپنے بیٹے سے کہا۔ ”بہت باتیں کر چکے، اب تم ہو، میں وعظ کہوں گا۔“

آپ نے منبر پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔ ”کل میں روزے سے تھا۔ ام یحییٰ نے کچھ انڈے بھون کر ایک کورے سکورے میں طاق پر رکھ دیے تھے۔ ایک بیلی نے اس سکورے کو طاق سے نیچے پھینک دیا۔ سکورا ٹوٹ گیا اور انڈے خاک میں مل گئے۔ میں کہ میری تلوار مشہور ہے، میری کمان منحنی ہوئی ہے، میرا تیر سینہ شکاف ہے۔ میرا نیزہ نشانہ باز ہے۔ میں محفوظ ہوں، میں ہی محفوظ ہوں۔ روزے دار و آؤ۔ پہاڑوں کے عبادت گزار و آؤ۔ خانقاہ نشین و آؤ۔ خدا کے کلام کے لیے میرے پاس آؤ کہ میں اسی کے امر سے تم کو بلاتا ہوں۔“

مجلس سے ہوجن کے نعرے بلند ہونے لگے اور آن کی آن میں محفل گرم ہو گئی۔

عبد الوہاب نے پوچھا۔ ”باوا جان! کیا بات ہے، میرے وعظ کا ان پر اثر کیوں نہ ہوا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”صاحبزادے! اس میں غور کی بات یہ ہے کہ تمہارے عالمانہ اور عاقلانہ وعظ کا اثر کیوں نہ ہوا اور میرے معمولی الفاظ نے یہ ہنگامہ کیوں برپا کر دیا۔ صاحبزادے سنو! تم کو اپنے ظاہری سفر پر ناز ہے مگر افسوس کہ تو نے عالم باطن کا سفر نہیں کیا۔ میں جب کلام کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی تجلیاں اثر لے کر نمودار ہو جاتی ہیں کیونکہ میری نظر حقیقت پر رہتی ہے۔ میں خود کو کم کر کے کلام کرتا ہوں اور تم خودی میں قائم ہو کر بوتلے ہو۔“

صاحبزادے عبد الوہاب نے آہستہ سے فرمایا۔ ”آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ ظاہر میں انڈے، سکورے اور بیلی کا بیان تھا۔ ظریف گل اور انڈے کی شکست و خرابی کا بیان مگر حقیقت میں وجود، نفس اور شیطان کے اشارات تھے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے اور اثر ڈالنے والے نے اس میں اثر بھر دیا۔“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔ دور دور تک آپ کا چرچا، مقبولیت اور شہرت ہو چکی تھی۔ آپ نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو آپ کے پرستاروں نے آپ کو اپنے درمیان لے لیا۔ آپ سفر فرما رہے تھے۔ دوران سفر آپ کو ایک جگہ قیام کرنا پڑا۔ اس وقت تک قرب و جوار کے دولت مندوں اور مشائخ کو آپ کی شریف آوری کا کوئی علم نہیں تھا۔ آپ نے اس بستی میں اترتے ہی دریافت فرمایا۔ ”اس بستی میں غریب ترین شخص کون ہے؟“

بستی کے ایک شخص نے کہا۔ ”اگر آپ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو میں آپ کو بستی کے ایک ایسے گھر تک پہنچا سکتا ہوں جو ناداری، افلاس اور غریبی میں کم ترین ہے۔ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے ہیں اور گھر میں ان کا ایک ہی بچہ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھ کو ان کے پاس لے چلو۔“ وہ شخص آپ کو ان دونوں کے پاس لے گیا۔ آپ نے دروازے پر کھڑے ہو کر دریافت فرمایا۔ ”اے اس مکان میں رہنے والو! میں تمہارا مہمان بننا چاہتا ہوں۔“

اندر سے بوڑھا نمودار ہوا اور پوچھا۔ ”حضرت! آپ کی تعریف؟“ آپ کے ساتھیوں نے جواب دیا۔ ”اے شخص! یہ شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں، ان کو کون نہیں جانتا۔“ بوڑھا آپ کا نام سن کر سہم گیا، ادب سے کہا۔ ”بسر و چشم مکان حاضر ہے لیکن میں انتہائی نادار و مفلس ہوں اور اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی خدمت کر سکوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو اس کی فکر نہ کر، بس ہمیں اپنا مہمان بنالے۔“ بوڑھے نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ آپ اس کے مہمان ہو گئے۔ آپ کے قیام کی خبر وہاں کے مشائخ اور دولت مندوں کو ہو گئی۔ یہ سب بھاگ بھاگ آپ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ ”حضرت! جب ہم لوگ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں تو اس نادار اور مفلس شخص کے گھر میں قیام کی کیا ضرورت تھی؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ آپ ﷺ کو اپنے فقر پر فخر تھا، مجھے غریب پسند ہیں۔“

ان لوگوں نے درخواست کی۔ ”حضرت! پھر ہم آپ کی کس طرح خدمت کریں؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہو، یہیں اس شخص کے گھر میں کرو۔“ ان لوگوں نے ازراہ عقیدت غلہ، بکریاں، بھیڑیں اور سونا چاندی سب کچھ اس بوڑھے کے گھر میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ آپ کے ارادت مند اور پرستار اتنا بہت سارا سامان دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بعض نے کہا۔ ”حضرت! اتنا بہت سا سامان۔ اب اس بوڑھے کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کچھ بھلا ہو جائے گا کیا مطلب؟ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ جو کچھ ہے، اس گھر کے مالک کا ہے۔ میں یا میرے ساتھی اس میں سے کچھ بھی نہیں لیں گے۔“ آپ نے گھر کے مالک سے کہا۔ ”بھائی! یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، سب تمہارا ہے۔ میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

بوڑھے نے درخواست کی۔ ”حضرت! دو چار دن تو اپنے قدم مسنت لزوم سے اس عاجز کو بھی سرفراز فرمائیں۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں اس بستی میں جس مقصد سے ٹھہرا تھا، وہ پورا ہو چکا۔“ آپ وہاں مزید نہیں ٹھہرے اور آگے روانہ ہو گئے۔

(جاری ہے)

اقتباسات

اخبار الاخيار، عبدالحق محدث دہلوی، حیات جاودانی، عقیف الدین حسین، حدیقة الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری، مشائخ قادریہ، محمد دین کلیم قادری، انوار الاولیاء، رئیس احمد جعفری

بغیر مقدمہ چلائے ہوئے یا مقدمہ چلا کر۔ گولی مارنا کیا مشکل ہوتا ہے۔ کتوں ہی کو مارا ہوگا انہوں نے، جیسے ہم نے مارا تھا فوجیوں کو، نیتے شہریوں کو، عورتوں اور بچوں کو مگر میں بچ گیا۔ نہیں مارا ان لوگوں نے۔“

”میں دیت نام کی جنگ سے بھاگا نہیں تھا۔ آخر تک لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہو گئی۔ دیت کا تک فوجیوں نے ہمیں گھیر لیا اور گرفتار کر لیا۔ کاش اسی وقت مجھے گولی مار دیتے، جان لے لیتے۔ کسی بھی طریقے سے،

ڈونگ ڈیانگ فونگ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

جنگ چاہے ہتھیاروں کی ہو یا احساسات کی، انسان کو اندر سے مار دیتی ہے یا پھر حیوان بنادیتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہوا تھا جس نے پہلے اسے انسان سے حیوان بننے پر مجبور کیا اور پھر اس کے اندر کی دنیا کو ہی برباد کر ڈالا کیونکہ احساسات کے نیچے روح تک کو چھلنی کر دیتے ہیں۔

ضمیر کے کٹھڑے میں کھڑے ایک اذیت پسند فوجی کا ماجرا

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ کہہ کر بڑھارٹی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کا سارا درد آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے آنسوؤں کی طرح بہہ رہا ہے۔ وہ میرا مستقل مریض تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ میرے پاس آرہا تھا۔ آج وہ پھر آیا تھا، اپنے طے شدہ وقت پر۔ اسے میں ہمیشہ آخر میں دیکھتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اسے وقت دینا ہوگا۔ وہ مستقل طور پر فینشن اور گھبراہٹ کا شکار رہتا تھا۔

”ویت نام کی جنگ کے خاتمے کے بعد میں ٹھیک تھا ڈاکٹر، بالکل ٹھیک۔ جنگ ختم ہوئی تو میں ہیرو کی طرح واپس آیا۔ فوج سے اتنے پیسے ملے کہ میں نے دوبارہ کالج کی پڑھائی شروع کر دی۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے اینڈسٹریشن کا کورس کر کے نیویارک میں بڑی اچھی جگہ پر کام شروع کر دیا تھا۔“ آج اس نے اپنے بارے میں اس طرح بتانا شروع کیا تھا۔

”لیکن تم نے مجھے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم دیت نام کی جنگ لڑ کر آئے ہو؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ضرورت نہیں سمجھی تھی میں نے۔ پھر ڈپریشن کا جنگ سے کیا تعلق ہے۔ تم نے جو دوا میں دی تھی میں اس سے صحیح ہو گیا تھا، بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ وہ صحیح نہیں ہوا تھا بلکہ وہ آہستہ آہستہ خرابی کی ہی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ دواؤں کی تعداد اور مقدار بڑھتی چلی گئی۔ اس کی طبیعت میں سدھار نہیں آیا۔ پھر بڑھارٹی نے نوکری چھوڑ دی تھی۔

ویت نام کی جنگ سے واپس آئے ہوئے بہت سارے فوجی میرے مریض تھے، عام سپاہی سے لے کر بڑے افسر تک۔ بہت سے فوجی جو وہاں گئے، لڑے اور مر گئے، ان کے خاندانوں کی کہانی اور ہے لیکن جو لڑے، زخمی ہوئے، قید ہوئے، رہا ہوئے اور واپس آ گئے ان میں سے کئی امریکی زندگی میں پھر بھی اس طرح سے شامل نہیں ہو سکے جیسے پہلے تھے۔ ان کی زندگی شاید کہیں قسم سی گئی تھی بلکہ ایک خاص محور پر رک گئی تھی۔ وہ اس دوڑ سے نکل گئے تھے جو ایک عام امریکی کی دوڑ ہے۔

بڑھارٹی الایاما کا رہنے والا تھا۔ متوسط طبقے کے خاندان کا اور بہت سارے امریکیوں جیسا عام امریکی۔ اس زمانے میں ہر ایک کو فوجی خدمات کے لیے جانا پڑ رہا تھا۔ صرف وہی لوگ بچ سکے تھے جو صحت کی خرابی کی بنا پر فوجی خدمات کے قابل ہی نہیں تھے یا پھر اپنے تعلقات کی وجہ سے کسی ایسی فوجی ڈیوٹی پر چلے گئے تھے جس کے لیے امریکا

چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”جنگ انسان کو بدل دیتی ہے ڈاکٹر۔“ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”اچھا خاصا آدمی جو انسانیت، محبت، برداشت کی طاقتوں سے مسخ ہوتا ہے، وہ ان سارے ہتھیاروں سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں دوسرے ہتھیار آ جاتے ہیں، مرنے مارنے والے۔ وہ انسان سے حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔ اس کی نگاہیں صرف دشمن کو تلاش کرتی ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں اور وہ جنگ کے نام پر سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتا ہے۔ قتل، تشدد، عورتوں کی پامالی، قوموں کی تذلیل، نہ جانے کیا کیا کچھ۔“

اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ وہ تو انکھوں کے دونوں کناروں سے آنسو چھلک رہے تھے اور چہرہ ایک بار پھر اداں ہو گیا تھا۔

”مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ، بالکل شروع سے۔ پہلے دن سے، کچھ چھپائے بغیر۔ یہ پریشانی شروع کب ہوئی، کیسے ہوئی، تب ہی میں تمہیں صحیح دوا میں لکھ سکوں گا۔ یہ ضروری ہے بڑھ کر مجھے سب پتا ہو۔“ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ سب کچھ میری شادی والے دن شروع ہوا، ڈاکٹر۔ شادی والے دن۔ چار سال سے جیٹ میری گرل فرینڈ تھی۔ پھر ہم نے شادی کا فیصلہ کیا اور ہماری شادی بھی ہو گئی لیکن اس رات ڈنر کے بعد، شادی کی پہلی رات مجھے ایک اور شادی یاد آ گئی پھر میرا کچھ نہیں رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں ہے ایسا کیوں ہوا۔ میں اور جیٹ تین سال سے ساتھ رہ رہے تھے، بہت اچھے تعلقات تھے ہمارے۔ بہت خوش تھے ہم لوگ، پر اس دن، شادی کی پہلی رات ہوٹل کے اس ہنی مون سوٹ میں سب کچھ بھسم ہو گیا جیسے وہ لوگ بھسم ہو گئے تھے، برسوں پہلے ویت نام میں۔ مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا تھا، اس ویت نامی کو دیکھ کر جو اس ہوٹل میں بھرا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہی ویت نامی شکل صورت، چھوٹا قد، پتلے پتلے ہونٹ، ویسی ہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور گول سا چہرہ، سینے کے نیچے پر لکھا ہوا عام سا ویت نامی نام..... نگویان وان ترائے۔“

”پھر کمرے میں جاتے جاتے میرے دماغ میں جیسے دھماکے ہوئے۔ دھماکوں کے ساتھ روشنیوں کے جھماکے تھے جنہوں نے میرے پورے وجود کو ہلا کے رکھ دیا پھر مجھے وہ ویت نامی دلہن یاد آ رہی تھی جسے میں نے، نام

نے، جیک نے، جان نے، دل پٹ نے باری باری ریپ کیا تھا یہاں تک کہ وہ مر گئی تھی۔
”کہاں ہوا تھا یہ سب کچھ اور کیسے؟ یہ تو فوجی ڈسپلن کے خلاف ہے۔“ میں نے سوال کیا۔

”تم صحیح کہہ رہے ہو۔“ اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔
”مگر اس دن ہمیں ہماری انٹیلی جنس نے خبر دی تھی کہ اس گاؤں میں شادی کی تقریب ہے اور اس تقریب میں ویت نامی گوریلا لیڈر جمع ہو کر میٹنگ بھی کر رہے ہیں۔“

”ویت نامیوں نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ نہ ان کے پاس ایٹم بم تھا، نہ ہی نیپام بم، نہ ہی کیوئی کیشن کے لیے وہ سب کچھ جو ہمارے پاس تھا اور نہ ہی وہ فائٹر بمبار تھے جو ہمارے پاس تھے۔ وہ بے پتے، فاقہ زدہ بھوکے چوہوں جیسے ویت نامیوں نے شیر جیسے امریکا کی کمر توڑ دی تھی اور گھٹنے گھوا دیے تھے۔“

”جنگ کا عجیب طریقہ تھا ان کا۔ شہروں، گاؤں، دیہاتوں، قصبوں، کھیتوں، کھلیا نوں، جنگل، ندی نالوں میں جہاں بھی ہم جاتے ہمارا نقصان ہوتا۔ کدو کے کھیت میں اور تربوزوں کے اندر بھی بم لگا یا ہوا تھا انہوں نے۔ اس صبح بھی ہمارے سات ساتھی مارے گئے تھے۔ شام کو ہم نے وہ پورا گاؤں جلا دیا تھا۔ ایک ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ جوجنگ گیا، وہ بھاگ گیا ہوگا۔ جو بھی لڑکیاں تھیں دلہن سمیت ہر ایک کو پامال کیا ہم لوگوں نے، ڈسپلن کے خلاف لیکن اسٹریٹیجی کے ساتھ۔ یہی حکم تھا کہ دشمن کو دہشت زدہ کر دو۔ اس دن ہم سب حیوان بن گئے پھر..... ہم حیوان ہی رہے جب تک ویت نام میں رہے۔“

”اس شادی کی رات ویتنامی، مری ہوئی، پامال کی ہوئی دلہن میرے اور جیٹ کے درمیان آگنی پھر جانیں سکی۔ میرے اور جیٹ کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ انہی دنوں میں تمہارے پاس آیا تھا ڈپریشن کی شکایت لے کر۔ تمہاری دواؤں سے میں ٹھیک ہو گیا تھا، تھوڑے دنوں کے لیے مگر پھر وہ مجھے چھوڑ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ گھومنے والے چکھے کو گھورنے لگا تھا۔

”کیوں، کیا کوئی نئی بات ہو گئی تھی؟“ میں نے اسے ٹوکا تھا۔

”جیٹ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ شدید محبت میں چار سال کا طویل عرصہ گزرا تھا اس کے ساتھ۔ ویت نام سے آنے کے بعد کالج میں بہت ساری لڑکیوں سے دوستی ہوئی۔ وہ میری زندگی میں خاموشی سے آئیں اور خاموشی

سے ہی چلی گئیں۔ تھوڑے دنوں، ہفتوں، مہینوں کی دوستی۔ کوئی کنکشن نہیں بن سکا ان سے۔ کوئی طویل رفاقت نہیں ہوئی کسی سے مگر جیٹ کی بات اور تھی۔ وہ مجھے نیویارک میں ہی ملی تھی۔ میری نئی نئی نوکری تھی اور میں نیا نیا نیویارک میں آیا تھا۔ وہ بھی اسی پولیس میں رہتی تھی جس میں، میں نے اپارٹمنٹ لیا تھا۔ اس سے میری ملاقات سوئمنگ پول میں ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات اور پھر سب کچھ کلک کر گیا تھا ہم دونوں کے درمیان۔ پہلی ملاقات ہی محبت میں بدل گئی تھی۔ وہ چار سال ہی میری زندگی کے شاندار سال تھے مگر شادی کے بعد ویتنامی دلہن نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ سب کچھ لٹا کر بھی جیٹ میرے ساتھ ہی تھی مگر اس دن وہ بھی چھن گئی مجھ سے۔ اس رات ہم دیر تک بات کرتے رہے۔ وہ مجھے دلاسا دیتی رہی، سمجھاتی رہی، بتاتی رہی کہ اب مجھے دنیا کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اب امریکا میں وہ سب کچھ بھول جانا ہوگا جو ماضی کا حصہ ہے۔ اس نے پیار سے مجھے تھپکیاں دی تھیں۔ میرے ماتھے کو چوما اور میں سو گیا لیکن رات کو میں جنگل میں تھا، اپنے پونٹ کے ساتھ۔ جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ ریختا ہوا پانی، کچڑ، دلدلی زمین پر۔ پھر یکا یک فائرنگ شروع ہو گئی اور ہم سب زمین سے چپک کر رہ گئے۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے، وہ چار تھے، ویتنامی چوہے۔ ہم نے ان چاروں کو پکڑ لیا تھا اور ان کو درختوں کے ساتھ ہاتھ پیر باندھ کر لٹکا دیا تھا۔ وہ چاروں برہنہ الٹے لٹکے رہے۔ ہم نے چاقوؤں سے ان کے اعضا کاٹ دیے۔ ان کا خون آہستہ آہستہ بہتا رہا۔ ان کے پیٹ اور ان کی پیٹھ پر چاقوؤں سے بنائی ہوئی کٹیروں سے خون رستا رہا اور ہم لوگ ان کی چیخوں کو سنتے رہے، ہنستے رہے، بولتے رہے پھر وہ چاروں اسی طرح سے مر گئے۔ خون گر رہا تھا..... ٹپ ٹپ اور ایک ٹپ پر میری چیخ نکل گئی، ایسی چیخ کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے تر۔ نہ جانے میں کب تک چنچ رہا تھا۔

”اسی صبح کو جیٹ مجھے چھوڑ گئی۔ کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بہت دن رہی میرے ساتھ۔ لڑتی رہی راتوں کو..... گولیوں کی بوچھاڑ میں چھپاتی رہی۔ بلی کا پٹروں کے شور میں سمجھاتی رہی۔ انجانی سمتوں سے آنے والی گولیوں سے بچاتی رہی مجھے۔ کب تک ساتھ دیتی میرا، ڈاکٹر میری جنگ تو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں کیا کرتا، میں کیا کروں۔“

وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، یہ جنگ تو دیت نام میں ختم ہوئی ہے۔ امریکا میں تو لڑی ہی نہیں گئی۔ جنگ ویت نام میں شروع ہوئی اور ویت نام میں ہی ختم ہو گئی مگر امریکا میں تو

ابھی شروع ہوئی تھی ویت نام کی جنگ کے بعد۔ دس ہزار
دنوں کی لڑائی کے بعد۔

میں نے بڑھاپائی کو سمجھایا تھا کہ ایسا ہوتا ہے، ایسا
ہو رہا ہے بہت سارے فوجیوں کے ساتھ۔ جنگ ابھی تک
ان کے ذہن و دماغ پر مسلط ہے۔ یہ ایک خاص قسم کا
سٹروم ہے اور اس قسم کی جنگوں کے بعد یہ ہوتا ہے۔
پریشانی، ٹینشن، ڈپریشن، بلڈ پریشر کا بڑھ جانا، راتوں کو نیند
نہیں آنا، ایسا لگتا ہے جیسے فوجی ایکشن جاری ہے۔ کبھی کبھی
ایسا لگتا ہے کہ بمباری شروع ہوگئی ہے اور مریض بستروں،
دروازوں، الماریوں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے۔ کبھی اسے ہیلی
کاپٹروں اور بمباری کرنے والے جہازوں کی آواز آتی
ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے دشمن اس کی نگرانی کر رہا ہے۔
ایسا تو ہوتا ہے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا لیکن
مریض کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اب میدان جنگ میں نہیں
ہے۔ وہ واپس اپنے ملک میں آگیا ہے، دوستوں کے
درمیان، یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا میں۔

”مجھے پتا ہے ڈاکٹر کہ میں امریکا میں ہوں، جنگ
میں نہیں ہوں۔ جنگ ختم ہو چکی ہے لیکن یہی سب کچھ ہوتا
ہے میرے ساتھ۔ پہلے کم ہوتا تھا مگر اب بڑھ گیا ہے، وقفے
وقفے سے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کا اور پھر
میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا تھا۔

”گرفتاری سے پہلے ہمارا یونٹ ڈونگ ڈیانگ فونگ
کی بربادی میں شامل تھا ڈاکٹر۔ بڑی بھاری لڑائی تھی وہ،
بڑی بے جگری سے لڑے تھے ہم لوگ اور دشمن بھی بہت
مضبوط تھا، لیکن ہماری ہوائی فوج کی سرپرستی نے انہیں نکلنے
نہیں دیا پھر ہم لوگوں نے شہر جلا دیا تھا۔ کیونستوں کو جن جن
کر مارا تھا۔ گلیوں میں، گھروں میں، بچے، بوڑھے جل کر
مر گئے۔ عورتیں، لڑکیاں گھروں سے بھاگ گئیں اور نہ جانے
کتنوں کو ہم لوگوں نے پامال کر دیا۔ تم یہ کہتے ہو یہ جنگ ختم
ہوگئی ہے۔ ڈونگ ڈیانگ فونگ تباہ ہو چکا ہے۔ کیونست مر
چکے ہیں، دشمن پسپا ہو چکا ہے مگر یہ جنگ تو کل ہی رات لڑی
ہے میں نے۔ رات پھر اپنے کمرے میں، بستر کے اوپر سے
اور بھی بستر کے نیچے چھپ چھپ کر گولیوں کی بوچھاڑ میں
لڑتا، بھڑتا رہا ہوں میں۔ اس جنگ، نے مجھے پاگل کر دیا
ہے۔ میری نوکری چلی گئی ہے۔ جیٹ میری بیوی، میری
دوست، میری سانسی مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں کھو گئی ہے۔
سب کچھ لٹ گیا ہے میرا، کیا رہ گیا ہے میرے پاس۔ مستقل

حیرات

”میں اکثر اس بات پر حیرت کیا کرتا تھا کہ انگریز
اتنی زیادہ چائے نوشی کے عادی کیوں ہوتے ہیں؟“
”تمہارے جیلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تمہیں
انگریزوں کی زیادہ چائے نوشی پر حیرت نہیں ہوتی؟“
”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے کیونکہ اب مجھے
حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ آج صبح میں نے ان کی کافی پی
لی تھی۔“

لطیفہ

تین سردار موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ ٹریفک
پولیس والے نے ہاتھ کا اشارہ دے کر روکا۔
ادھر سے سردار نے بھی ہاتھ دیا۔
”نہ باواجبی نہ..... اسی پہلے ہی تین آں۔ تینوں
کتھے بٹھا دیے۔“

اقوال زاریں

یہ ضروری نہیں کہ انسان گھر کو خوب صورت بنائے
بلکہ یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے دل کو خوب صورت
بنائے۔

مرسلہ۔ محمد شہباز ناز، سرگودھا

ڈپریشن اور تمہاری دی ہوئی گولیاں۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے اپنے بازوؤں میں اپنا منہ
چھپالیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ میں بھی
خاموش رہا کہ وہ اسی طرح سے تھوڑی دیر رو لے تو بہتر ہے۔
کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، اس کی
دونوں آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔ اس نے میری
طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ ”ڈونگ ڈیانگ فونگ
کی جنگ تو ہم لوگ وہاں جیت گئے ڈاکٹر لیکن..... یہاں
امریکا میں ڈونگ ڈیانگ فونگ جاری ہے۔ وہاں سے تو میں
بچ کر آگیا۔ جان بھی بچ گئی اور ہاتھ، پیر بھی نہیں کٹے لیکن
اس اندر کی ڈونگ ڈیانگ فونگ میں، میں روز مر رہا ہوں،
روز میرا ہاتھ کٹتا ہے، پیر کٹتا ہے اور انگلیاں کاٹ کاٹ کر
پھینکی جاتی ہیں۔ یہ امریکی ڈونگ ڈیانگ فونگ ہم سب کو
مار دے گا ڈاکٹر..... مار دے گا، ختم کر دے گا..... ہمیشہ
کے لیے.....“

آخری لمحہ

کاشف زبیر

زندگی چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو آخری لمحے میں محض ایک پل کی محسوس ہوتی ہے اور جب وقت رخصت آتا ہے تو گزرنے والے بے شمار لمحات میں سے آخری لمحہ گویا امر ہو جاتا ہے، اب یہ سفر چاہے زمین کے اندر کا ہو یا زمین کے اوپر کا... تیاریاں تو دونوں کے لیے ہی کرنا پڑتی ہیں کیونکہ زادِ سفر بن، سفر کا ارادہ ہے معنی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی سفر کی طرف گامزن ہوئے جس میں قدم قدم پر آزمائشیں ہلکیں بچھائے ان کی منتظر تھیں لیکن جو زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ کر بتدریج اسے گزارنے کی سعی کرتے ہیں وہ کبھی منہ کے بل نہیں گرتے... جو اس فلسفے پر یقین نہیں رکھتے، ان کے سارے کس بل ٹھوکریں نکال دیتی ہیں لیکن افسوس یہ بات انسان کو بہت آخر میں سمجھ آتی ہے، جب پلٹنے کی گنجائش ہرگز نہیں رہتی... بہر حال زیرِ نظر کہانی مصنف کے آخری لمحات کی کاوشوں میں سے ایک ثابت ہوئی جس میں کچھ تبدیلی کے حوالے سے بات چیت بھی ہوئی مگر وقت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ دنیا کی روایت ہے کہ جانے والے کی آخری نشانی سنبھال کر رکھی جاتی ہے لہذا محبوب قلم کار کی یہ آخری نشانی قارئین کے لیے حاضر ہے۔

زندگی کے شیب و فراز پر مشتمل سسٹم کے آخری صفحات کے لیے کاشف زبیر کی آخری تحریر



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



لی تھی۔ اس تصویر میں اس کا چہرہ اور اس پر نقش تاثرات پوری طرح نمایاں تھے۔ اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا اور شوہر سے کہا۔ ”ملک صاحب! اب ایسا نہ کرنا، میرا دل رک جاتا ہے۔“

ملک صاحب ہنسے۔ ”تیرا دل رک جاتا ہے اور اس کا دل دیکھ کیسے دھڑک رہا ہے۔“

ماں نے اسے گود میں لیا اور چومنے لگی۔ ”میری بیٹی..... میری رانی۔“

”بابا! ہم بھی عالی کو اچھالیں۔“ اس کے بڑے بھائی ظہیر نے کہا۔ وہ سات سال کا تھا۔ اس کے بعد پانچ سال کا عمیر تھا اور پھر وہ تھی عالیہ احمد ملک۔ اس خاندان کی پہلی لڑکی۔ شبیر احمد ملک کا خاندان خاصا بڑا تھا۔ اس کے ایک بڑے اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ دو بہنیں تھیں۔ جب عالی پیدا ہوئی تو سوائے اس کے سب سے چھوٹے چاچو کے سب شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔ تائیاریتی کے چار بیٹے تھے۔ پھر شبیر احمد کے دو بیٹے، اس سے چھوٹے نعیم کے بھی دو بیٹے تھے۔ نتیجہً ابھی ملازمت سے لگا تھا اور اسی سال اس کی شادی کا ارادہ تھا۔ بڑی پھوپھو شائین کے تین بیٹے تھے اور چھوٹی پھوپھو شائین کے دو بیٹے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے دوھیال میں پہلی لڑکی تھی۔ تنہیال میں صرف ایک خالہ تھی اور اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ شبیر احمد کا سارا خاندان مح بہنوں کے گل پور میں آباد تھا۔ البتہ عالیہ کا تنہیال گل پور سے کچھ فاصلے پر ایک اور قصبے چاند پور میں رہتا تھا۔ اس کے نانا نانی اور شادی شدہ خالہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ چاند پور میں تھے۔

گل پور چھوٹے سرسبز پہاڑوں کے درمیان آباد چھوٹا لیکن پرانا قصبہ تھا۔ پھولدار پودے اور بیلئیں یہاں خود رو تھیں۔ اسی لیے اس کا نام گل پور پڑا۔ اب پہلے کی سی بات نہیں رہی لیکن بزرگ بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں یہاں کی فضا پھولوں سے مہکی رہتی تھی۔ انگریزوں کے دور میں اسے ترقی ملی۔ جب یہاں سے نوجوان فوج میں بھرتی کے لیے گئے۔ اسکول بنا اور اس علاقے میں سڑک تعمیر ہوئی۔ تقسیم کے بعد ترقی کی رفتار سست رہی مگر رفتہ رفتہ گل پور تمام سہولیات حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جب عالیہ پیدا ہوئی تو یہاں صرف بجلی کی سہولت تھی۔ گیس نہیں آئی تھی، لوگ گھروں میں لکڑی کے چولہے جلاتے تھے۔ پانی کنویں سے بھرا جاتا تھا۔ چند ایک گھروں میں بورنگ کر کے موٹر سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ فون نہیں تھا مگر چند سالوں میں آگیا۔ قصبے

زندگی کتنی طویل ہوتی ہے لیکن بعض اوقات بہت تیزی سے گزر جاتی ہے۔ یہ جملہ اس نے سوشیا لوجی کی پیکچرر آمنہ انصاری سے سنا تھا۔ اس وقت اس نے بس سنا اور ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کر لیا اور یہ جملہ اسے اب یاد آیا تھا۔ جب اس کی اپنی زندگی صرف تین پل کی تھی لیکن یہ تین پل اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئے تھے۔ عالیہ احمد ولد شبیر احمد ملک۔ گل ہی تقریباً پورے چوبیس برس کی ہوئی تھی۔ آج چوبیس برس اور ایک دن۔ پونے آٹھ ہزار سے اوپر کچھ دن کم نہیں ہوتے مگر آج یہ بہت کم پڑ گئے تھے۔ اسے لگا جیسے ابھی وہ اس دنیا میں آئی ہو اور فوراً ہی اس کا آخری سفر شروع ہو گیا ہو۔ پہلا لمحہ شروع ہوا تو اس نے ماضی کی کھڑکی سے ایک باپ کو دیکھا جو اپنی ایک یا سو سال کی بچی کو ہوا میں اچھال کر پکڑ رہا تھا۔ بچی کے چہرے پر مسرت، خوف، سنسنی اور تحیر کے ملے جلے تاثرات تھے۔ باپ کے چہرے پر صرف محبت اور شفقت تھی۔

☆☆☆

پہلا لمحہ محسوسیت.....!

باپ نے اسے ہوا میں اچھالا تو اس نے خود کو خلا میں پایا۔ اس لمحے کی سنسنی، مسرت اور ایک انوکھا تحیر ایسا تھا جو دو سال کی عمر میں بھی اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ سب سے چھوٹی لیکن سب سے بلند تھی۔ اس پاس زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ مشکل سے ایک لمحہ خلا میں رہی اور دوسرے لمحے دوبارہ باپ کی مضبوط اور محفوظ گرفت میں تھی مگر اس ایک لمحے میں اس نے جتنا لطف محسوس کیا، وہ اس کی ساری زندگی کے لیے کافی تھا۔ جب باپ نے اسے اوپر اچھالا تو اس نے چیخ ماری اور زور سے بابا کہا تھا۔ باپ کا قہقہہ گونجا تھا۔ اوپر جاتے ہوئے اس نے خود کو آزاد محسوس کیا پھر کشش ثقل اور اپنوں کی محبت نے اسے واپس کھینچا۔ یہ لمحہ خوف والا تھا۔ واپس گرنے کا خوف۔ ساتھ ہی اسے باپ پر اعتبار بھی تھا کہ وہ اسے گرنے نہیں دے گا۔ مگر خوف ایسا جذبہ ہے جو خالق کائنات کے یقین کے سامنے بھی ابھرتا ہے۔ جو پل صراط پر بھی ساتھ رہے گا جو جنت کے دروازے تک ساتھ جائے گا۔ صرف جنت خوف کے سائے سے پاک ہوگی۔ جیسا کہ رب کائنات نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی غم یا خوف نہیں ہوگا۔

وہ باپ کے بڑے اور مضبوط ہاتھوں میں یوں آرام سے اتر آئی جیسے یہ ہاتھ اسی کے لیے بنے ہوں۔ جب وہ خلا میں تھی تو اسے پتا نہیں تھا کہ اس کے چاچو نے اس کی تصویر

کی مرکزی سڑک اور چند گلیاں ہی تھیں۔ بلدیاتی نظام کے دور میں گل پور نے نہایت تیزی سے ترقی کی۔ یہاں گیس آئی، پانی کی لائنیں اور سیوریج لائنیں ڈالی گئیں۔ تمام گلیوں کو پختہ کیا گیا۔ فون اور انٹرنیٹ کی سہولت آئی۔ مرکزی ہائی وے گل پور سے دو میل کے فاصلے سے گزرتی تھی مگر یہ دو میل کا راستہ ہمیشہ کچا اور ناہموار رہا پھر یہاں اعلیٰ معیار کی سڑک بن گئی۔ جو فاصلہ پہلے پندرہ منٹ میں جھکوں کے ساتھ طے ہوتا تھا، وہ اب پانچ منٹ میں سکون سے طے ہونے لگا مگر گل پور میں معاشی لحاظ سے زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہاں کے لوگ اب بھی زیادہ تر نوکری پیشہ تھے۔ اکثر سکیورٹی اداروں میں ملازمت کرتے تھے۔ روزگار کا دوسرا ذریعہ زمین تھی۔ گل پور کی زمین زرخیز تھی۔ پہاڑوں سے ایک درمیانے سائز کا دریا بہتا تھا۔ پہلے یہ سردیوں میں خشک اور گرمیوں میں پانی سے بھر رہتا تھا۔ سیلاب تقریباً ہر سال فصلوں اور باغوں کو نقصان پہنچاتا تھا۔ پھر اوپر چھوٹا بند بن گیا اور گل پور والوں کا دیرینہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اب ان کی زمینوں کو سارے سال پانی ملتا تھا اور سیلاب کا خطرہ بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ چار پانچ سال بعد جا کر جب بارش زیادہ ہوتی تو معمولی سا سیلاب آتا تھا۔ شہیر احمد ملک نے بڑے بھائی رفیق کے ساتھ مل کر زمین سنبھال لی۔ اس نے زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، اس لیے وہ کاشت کاری کے جدید طریقے لایا۔ اس نے زمین کو منظم کیا۔ آس پاس کے زمینداروں سے مل ملا کر اپنی زمین ایک جگہ کر لی۔ اسے مکمل ہموار کیا۔ حد بندی کی اور اس پر اچھی نسل کے یوکلپس لگائے۔ چند سالوں میں زمین کے چاروں طرف ان بلند و بالا درختوں کی قدرتی حد بن گئی تھی اور کوئی اس میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں حد بندی کے جھگڑے عام تھے۔ اوپری زمین پر شہیر نے اعلیٰ درجے کے مالنے کا باغ لگایا اور باقی زمین پر مختلف فصلیں کاشت کرنے لگے۔ جدید طریقے استعمال کرنے کی وجہ سے ان کی زمین دوسروں کی نسبت زیادہ پیداوار دیتی تھی۔ ان کی فصل بھی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ خاص طور سے مالنے کی فصل مڈل ایسٹ کے تاجر پوری لے جاتے تھے۔

نعیم سرکاری ملازمت کرتا تھا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ صوبائی دارالحکومت میں رہتا تھا۔ سال میں ایک دو بار بیوی بچوں سمیت آ جاتا تھا مگر اس کا ارادہ مستقل شہر میں رہنے کا تھا۔ اس نے وہاں گھر بھی بنا لیا تھا۔ عقیق نے ایم کام کیا تو نعیم نے اپنے ایک واقف کار کی مدد سے ایک ملٹی

نیشنل کمپنی میں ملازمت دلوادی۔ شادی کے بعد اس کا ارادہ بھی شہر میں رہنے کا تھا۔ ابھی گل پور میں زمین کی طرح گھر بھی مشترک تھا۔ کوئی ڈیڑھ کنال رقبہ پر پچھلے اس مکان میں چاروں طرف محن تھا۔ مکان پرانے طرز کا تھا۔ آگے پیچھے آٹھ کمرے تھے اور دو کمرے عقیق محن کے آخر میں بنے ہوئے تھے۔ انہیں مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ رفیق اور شہیر کے پاس دو دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ نشست گاہ کے لیے مخصوص تھا۔ ایک ایک کمرہ نعیم اور عقیق کا تھا۔ ایک کمرہ مشترک تھا۔ کھانے پینے اور بیٹھک لگانے کے کام آتا تھا۔ موسم سرد ہوتا تو بچے نہیں کھیلتے تھے۔

عالیہ کو اپنے بچپن کا یہ مکان اچھی طرح یاد تھا۔ محن اس کی پیدائش کے بعد لگا ہوا تھا۔ چار دیواری کے ساتھ کیاریاں تھیں یا درخت لگے ہوئے تھے۔ عقیق محن میں شیشم اور ٹاہلی کے بڑے اور چھاؤں والے درخت تھے۔ ان کے تلے چار پائیاں پڑی تھیں اور مضبوط شاخوں سے جھولے لگے ہوئے تھے۔ عالیہ گھنٹوں جھولتی تھی اور جب تک ماں زبردستی آکر نہیں لے جاتی، وہ جھولنے کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔ برآمدوں کے آگے پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ جب ہوا ان پھولوں سے چھو کر اندر آتی تو اپنے ساتھ خوشبو بھی لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہونے کے بعد اسے تعجب ہوتا کہ پھولوں سے اب ایسی خوشبو کیوں نہیں آتی؟

ہوش سنبھالنے کے بعد اسے گھر میں سب سے پرکشش شخصیت باپ کی لگتی تھی۔ وہ شروع سے باپ کی دیوانی تھی۔ رات اس کی بانہوں میں سوتی اور اگر وہ کسی وجہ سے گھر سے باہر ہوتا تو بہت مشکل سے سوتی تھی۔ ماں کو بہت تنگ کرتی تھی۔ خود شہیر ملک کو بھی اس گڑبا کے بغیر چین کہاں تھا۔ گھر سے باہر ہوتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ جلد گھر پہنچ جائے اور کسی کام سے قصبے سے جاتا تو جلد واپس آنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عالیہ اس کے بغیر اداس ہو جاتی ہے۔ سلیٹی کبھی کبھی باپ بیٹی کی اس محبت پر چڑ کر کہتی تھی۔

”مجھے تو اس لڑکی نے ایک طرف لگا دیا ہے۔“

شہیر ہنستا۔ ”کیونکہ یہ میری بیٹی ہے۔“

شہیر عام طور سے نو دس بجے زمین پر چلا جاتا تھا۔ کبھی دوپہر کا کھانا کھانے گھر آ جاتا اور نہ ملازموں کے ساتھ وہیں کھا لیتا تھا۔ رفیق کی ہارڈ ویئر کی دکان بھی تھی۔ وہ زمین پر اسی وقت آ جاتا تھا جب ضرورت ہوتی تھی۔ شہیر شام پانچ بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا۔ سردی میں تو اس وقت تک رات ہو جاتی تھی مگر گرمیوں کے طویل دنوں میں پونے آٹھ

تک روشنی رہتی تھی۔ پانچ بجتے ہی عالیہ تیار ہو جاتی تھی اور جیسے ہی شبیر کی بایک کا ہارن گونجتا وہ باہر کی طرف لپکتی تھی اور اسے اندر آنے کی مہلت بھی نہیں دیتی تھی کہ مبادا اس کے سیر کے وقت میں کچھ کی آجائے۔ شبیر اسے باہر سے ہی ساتھ لے جاتا۔ قصبے کے باہر تک سیر کرتا اور آدھے پون گھنٹے بعد وہ واپس آ جاتے۔

بایک پر بیٹھ کر اسے لگتا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ کبھی شبیر اسے قصبے کی مارکیٹ لے جاتا اور وہاں اسے اس کی پسند کی چیزیں دلاتا۔ اسے قلفی یا ملائی والا فالودہ کھلاتا تھا۔ پھر وہ اسے قصبے کے باہر لے جاتا۔ کبھی کبھی وہ بند کے اوپری حصے تک جاتے تھے، وہاں سے نیچے پورا گل پور صاف نظر آتا تھا۔ گل پور کے پہاڑوں پر جنگل بھی تھے۔ کسی زمانے میں جب گیس نہیں تھی تو جنگل لوگوں نے تقریباً صاف کر دیے تھے مگر گیس آنے کے بعد سے جنگل پھر سے بڑھنے لگے تھے۔

گل پور کا قبرستان اوپری حصے میں ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا۔ لوگوں نے صدیوں پہلے نیچے سے اپنے سردے دفنانا شروع کیے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اوپر تک چلے گئے تھے۔ اب قبرستان تقریباً نصف کلومیٹر تک پھیل گیا تھا۔ اس کے اوپر اور دائیں بائیں جنگل تھا۔ عالیہ کا دادا اور باقی پرکھے اسی قبرستان میں دفن تھے۔ شبیر احمد نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، وہ ہر تدفین میں شامل رہا تھا، ان دنوں عالیہ پانچ سال کی ہونے والی تھی جب ایک شام ڈیم کی طرف سے آتے ہوئے شبیر نے بایک کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔ دو دن پہلے وہ زمین کے کام سے باہر گیا ہوا تھا، اسی دوران میں اس کے واقف کار صفدر علی کے چھوٹے بھائی اسد علی کوئل کے سلسلے میں پھانسی کی سزا ہوئی اور اس کی میت قصبے میں لائی گئی۔

اسد علی نو جوان تھا۔ شہر میں پڑھتا تھا۔ وہاں اس کا کسی لڑکی کے چکر میں اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا اور اس کے ہاتھ سے لڑکی کا ایک بھائی مارا گیا اور دوسرا زخمی ہوا تھا۔ لہذا اسے سزائے موت ہوئی اور دو دن پہلے اسے پھانسی دے دی گئی تھی۔ شبیر نے اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ سنا تھا۔ وہ اچھے کردار کا لڑکا نہیں تھا۔ جب یہاں گل پور میں تھا تب بھی اس کے بارے میں ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ شاید ان ہی سے تنگ آ کر گھر والوں نے اسے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا تھا۔ بہر حال شبیر کو ان باتوں سے غرض نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرنے والے

کے اعمال اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کا فرض تھا کہ اس کے جنازے میں شریک ہوں اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ وہ میت میں شریک نہیں ہوا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ آج قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لے۔ مگر عالیہ کچھ اور سمجھی۔ اس نے چپک کر باپ سے کہا۔ ”بابا! ہم اڈے جا رہے ہیں؟“

اڈے کا لفظ ہائی وے کے لیے مخصوص تھا کیونکہ وہاں بس اسٹاپ تھا۔ کچھ دکانیں اور ایک ہوٹل تھا۔ صبح سے شام تک وہاں خاصی رونق رہتی تھی۔ شبیر نے جواب دیا۔ ”نہیں بابا کی جان! ہم قبرستان جا رہے ہیں۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ قبرستان جا رہی تھی۔ شبیر نے باہر ہی بایک روکی اور عالیہ سے کہا۔ ”آپ یہیں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

شام کا وقت تھا اور وہاں ویرانی تھی۔ عالیہ سہم گئی۔ ”نہیں، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

خود شبیر بھی اسے چھوڑتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ نزدیک ہی جنگل تھا اور وہاں چھوٹے موٹے جانور بھی ہوتے تھے۔ اس نے سر ہلایا اور عالیہ کو گود میں اٹھالیا کہ وہ بچی ہے غلطی سے کسی قبر پر پاؤں نہ رکھ دے۔ شبیر برسوں سے یہاں آ رہا تھا۔ اسے ایک ایک قبر کا علم تھا کہ کس کی ہے۔ وہ اوپری حصے کی طرف بڑھا جہاں نئی قبریں بن رہی تھیں۔ یہ جگہ ڈھلانی تھی، اس لیے مٹی کو سرکنے سے بچانے کے لیے کثرت سے درخت لگائے گئے تھے۔ خاص طور سے پیلو کے درختوں کی بہتات تھی۔ اوپر جانے کے لیے اور پھر دائیں بائیں قبروں تک جانے والے راستے پتھر اور اینٹ کی مدد سے پختہ کیے گئے تھے۔

اوپر سے آنے والے بارش کے پانی سے بچاؤ کے لیے قبرستان کے اوپری حصے میں چارفت اوچی پتھروں کی دیوار بنائی گئی تھی۔ شبیر نے اس دیوار کے پاس بایک روکی تھی ورنہ نیچے اترنے کی صورت میں اسے خاصا دور تک پیدل چلنا پڑتا۔ یہاں سے نئی قبروں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ تازہ قبروں والی جگہ پہنچا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اسد علی کی قبر کون سی ہے۔ ویسے وہ کسی ایک فرد کے لیے نہیں بلکہ تمام اہل قبرستان اور دنیا سے گزر جانے والے مسلمانوں کے لیے دعا کرتا تھا کیونکہ اللہ کسی ایک فرد کو اتنا ہی ثواب دیتا ہے جتنا کہ سب کو دیتا ہے۔ شبیر نے عالیہ کو گود سے اتار کر برابر میں کھڑا کیا اور فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ اس دوران میں عالیہ قبرستان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا

”ہاں، وہ اچھا نہیں تھا سرباب وہ مر گیا ہے اس لیے اسے برا نہیں کہنا چاہیے۔“
”کیوں بابا؟“

”کیونکہ وہ اس دنیا سے چلا گیا ہے اور اس دنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جو اس دنیا سے چلا جائے اس کی برائی کو بھول جانا چاہیے۔“

”یہ اچھا آدمی نہیں تھا۔“ عالیہ نے اصرار کیا۔ ”اسے جنگل میں دفن کرنا چاہیے تھا۔“

شبیر نے حیرت سے اپنی چھوٹی سی بیٹی کو دیکھا۔ وہ عام طور سے ایسی باتیں نہیں کرتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیوں میری جان؟“

”بس یہ اچھا آدمی نہیں تھا۔“
”آپ کو بتایا تو ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اسے برا نہیں کہتے۔“

عالیہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ شبیر سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں پھر کوئی سوال آرہا ہے۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ بالآخر عالیہ نے پوچھا۔ ”بابا! اگر کوئی شخص بہت برا ہو۔“

”بے شک وہ بہت برا ہو لیکن اللہ کو ماننے والا ہو اور کلمہ گو مسلمان ہو تو اسے برا نہیں کہتے۔“ شبیر احمد کو کہتے ہوئے فضل کا خیال آیا۔ فضل ایسا شیطان صفت آدمی تھا کہ آج بھی لوگ اس کا فضل یاد کرتے تو ان کی روح کانپ جاتی تھی۔ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے شبیر اس وقت لڑکپن میں تھا جب گل پور کی ایک عورت کے انتقال کے بعد اس کی تدفین کی گئی تو اس کی لاش اگلے دن قبر سے باہر پائی گئی تھی۔

اس کا کفن اتار دیا گیا تھا اور لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے پورے گل پور کو سہا دیا تھا پھر فضل جو شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا، اچانک ہی کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور کوڑھ بھی ایسا کہ چند ہفتوں میں اس کا جسم گل سڑھ کر رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ تب مرنے سے پہلے اس نے اعتراف کیا کہ عورت اور بچی کی لاش کو قبر سے نکال کر ان کی بے حرمتی اسی نے کی تھی۔

یہ بیماری اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ اس نے عورت اور بچی کے گھروالوں سے معافی مانگی۔ شبیر یہ بات معصوم عالیہ کو نہیں بتا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب عالیہ یہ سب جان جائے گی۔ شام تیزی سے اپنا روپ بدل رہی تھی۔ شبیر نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”اب گھر چلیں؟“

اس نے اپنا سر بلایا تو شبیر نے اس کا ماتھا چوما اور

اور تجسس بھی ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کا پاؤں پکڑ لیا۔ شبیر نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا مگر دعا جاری رکھی۔ دعا کر کے وہ بچوں کے بل بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب عالیہ سوال کرے گی۔

”بابا! یہ کون ہے؟“ عالیہ نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔
”یہ لڑکا.....“ شبیر نے جواب دیا۔ ”جیسے تمہارے عتیق چاچو ہیں۔“

”اسے کیا ہوا تھا بابا؟“
”اسے سزا ہوئی تھی، اس نے ایک آدمی کو مارا تھا اس لیے اسے موت کی سزا ہوئی۔“

”وہ کیا ہوتی ہے؟“
”ابھی آپ چھوٹی ہیں جب بڑی ہو جائیں گی تو آپ کو خود پتا چل جائے گا۔“ شبیر نے پیار سے سمجھایا۔ وہ باپ کی جتنی لاڈلی تھی، اتنی ہی فرماں بردار بھی تھی۔ شبیر کا صرف ایک پارکا کہنا کافی ہوتا تھا اور بات اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی تھی۔ اس نے سر بلایا اور اوپر والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

”بابا! وہ کیا ہے؟“
”وہ دیوار ہے۔ اوپر جنگل سے جانوروں اور بارش کے پانی کو قبرستان میں آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے۔“

وہ سہم گئی۔ ”ادھر جانور بھی ہوتے ہیں؟“
”ہاں لیکن وہ اس طرف نہیں آسکتے۔“ شبیر نے اسے تسلی دی۔

”ادھر ”ہو“ بھی ہوتے ہیں؟“
”ہو“ سے مراد بھوت وغیرہ تھا جیسا کہ بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ شبیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہو کہیں نہیں ہوتا۔“

”امی کہتی ہیں۔“
جب باپ گھر میں نہیں ہوتا تھا تو سلمیٰ اسے سلانے کے لیے خوف کا سہارا لیتی تھی۔ شبیر ہنسا۔ ”تمہاری امی خود ہو ہیں۔ ان سے پوچھنا کہ ہو کہاں رہتا ہے۔“

عالیہ قبر کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”بابا! یہ اچھا لڑکا نہیں تھا؟“

شبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ اچھا لڑکا نہیں تھا؟“

”اس نے کسی کو مارا تھا اور جو دوسروں کو مارتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے۔“

اس نے کسی کو مارا تھا اور جو دوسروں کو مارتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے۔“

اس نے اپنا سر بلایا تو شبیر نے اس کا ماتھا چوما اور

ڈھلان سے اترنے لگا۔ گزشتہ رات اس نے سلمیٰ سے کہا تھا کہ عالیہ پانچ سال کی ہوتے والی ہے اور چند ہفتے بعد اسکول میں داخلے شروع ہونے والے تھے۔ گل پور میں لڑکیوں کے لیے الگ اسکول تھا جس میں پرائمری سے لے کر مڈل تک کلاسیں ہوتی تھیں۔ البتہ لڑکوں کے لیے مخصوص اسکول میٹرک تک چلا گیا تھا اور اس سال سے وہاں انٹر میڈیٹ کی کلاسز بھی شروع ہونے والی تھیں۔ زیادہ تر بچرز کا تعلق گل پور سے ہی تھا اور یہ سب اچھے تعلیم یافتہ تھے اس لیے معیار تعلیم بھی خاصا بہتر تھا۔ سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کا رجحان بڑھ چکا تھا۔

شروع میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا اور دس میں سے ایک ہی لڑکی پڑھی لکھی ہوتی تھی مگر پچھلے پندرہ بیس سال میں صورت حال بدل گئی تھی۔ اب لڑکیوں کی تعلیم پر بھی اتنی ہی توجہ دی جا رہی تھی جتنی کہ لڑکوں کی تعلیم پر۔ لڑکیوں کا اسکول اگلے سال میٹرک تک ہو جاتا کیونکہ مقامی لوگوں نے لیب اور لائبریری کی شرط اپنے خرچ سے پوری کر دی تھی۔ شبیر عالیہ کو پڑھانا چاہتا تھا اگرچہ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کتنا پڑھے گی مگر اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی جتنا ممکن ہو تعلیم حاصل کرے۔ اسے امید تھی کہ جب تک عالیہ بڑی کلاسز تک پہنچے گی لڑکیوں کا اسکول ہائر سیکنڈری ہو جائے گا اور ممکن ہے گل پور میں گرلز کالج بھی بن جائے۔

اگرچہ گل پور کے آس پاس کئی بڑے شہر تھے جہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود تھے۔ لڑکیوں کا اسکول گل پور کے اوپری حصے میں تھا، اس کے پاس سے گزرتے ہوئے شبیر نے عالیہ سے کہا۔ ”آپ پڑھنے کے لیے اس اسکول میں آئیں گی۔“

شبیر کی توقع کے خلاف عالیہ خوش ہو گئی تھی۔ ”کب بابا؟“ ”اسی سال۔“ شبیر نے جواب دیا اور اس نے گھر آ کر سلمیٰ سے کہا کہ وہ عالیہ کے اسکول میں داخلے کی تیاری شروع کر دے۔ سلمیٰ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس لیے شبیر خود عالیہ کو پڑھاتا تھا۔ شبیر اس کے لیے کے جی کلاسز والی کتابیں لے آیا تھا اور ان سے اس کی اتنی اچھی تیاری کرادی تھی کہ اسے آرام سے پہلی کلاس میں داخلہ مل سکتا تھا۔ شبیر نے سلمیٰ سے کہا اور عالیہ نے سنا تو خوشی سے پورے گھر میں اچھلتے کودتے اس نے سب کو بتایا کہ وہ جلد اسکول جائے گی۔ سوائے تایا رفیق کی بیوی نورین کے سب ہی خوش تھے۔ گھر میں بچن ایک ہی تھا اور خاصا بڑا تھا۔ سب آرام سے اپنا اپنا کھانا بنا رہے تھے۔

رات کے کھانے کی تیاری کرتی نورین نے سلمیٰ سے کہا۔ ”لڑکی ہے، کیا کرنا ہے پڑھ کر؟“ ”بھابی! بس بات کر رہی ہو؟“ سلمیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آج کل تو سب لڑکیوں کو پڑھا رہے ہیں اور پھر ہمارا دین بھی مرد و عورت دونوں کو پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔“ نورین نے منہ بنایا۔ ”وہ قرآن پاک پڑھانے کی بات کرتا ہے۔“

”عالیہ قرآن پاک پڑھ رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو چند سال میں ناظرہ ختم کر لے گی۔ ابھی قاعدے پر ہے۔“ ”وہ تو ٹھیک ہے۔“ نورین نے منہ بنا کر کہا۔ ”پر اسکول کی تعلیم..... نری بے حیائی ہے۔“

عالیہ کو ایک بی بی گھر میں قرآن پاک پڑھانے آتی تھیں۔ انہوں نے تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھا ہوا تھا اور اب گھر گھر جا کر بچیوں کو پڑھاتی تھیں۔ بیوہ عورت تھیں اور اسی سے ان کا ذریعہ روزگار چلتا تھا۔ عالیہ نے نصف قاعدہ ختم کر لیا تھا اور اس کی بنیاد مضبوط ہو گئی تھی۔ شبیر نے بی بی سے کہا ہوا تھا کہ بے شک کئی سال لگ جائیں مگر عالیہ کی بنیاد مضبوط ہوتی چاہیے۔ جب تک قاعدے پر عبور نہ ہو آدمی ٹھیک سے قرآن پاک نہیں پڑھ سکتا ہے۔ اگر شبیر زور نہ دیتا تو بی بی اب تک اسے قاعدہ ختم کرا کے ناظرہ پر لے آتیں مگر وہ ایک ایک سختی پر زور دے رہی تھیں۔ اب اس کے اسکول کی تعلیم کا دور شروع ہونے والا تھا۔ سلمیٰ نے رات سوتے وقت شبیر کو نورین کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ”بھابی خود ان پڑھ ہیں اس لیے عورت کی تعلیم کی اہمیت نہیں سمجھتی ہیں۔“

”وہ کہہ رہی ہیں کہ اسکول کی تعلیم بے حیائی سکھاتی ہے۔“ شبیر کو غصہ آ گیا۔ ”یہ نری چہالت ہے۔ گل پور کی لا تعداد بچیاں اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ میں نے آج تک کسی کی بے حیائی کا قصہ نہیں سنا۔ ہاں جنہوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوتی ہے وہ جو ان ہونے پر جو گل کھلاتی ہیں وہ سب ہی جانتے ہیں۔ جب کوئی برائی کی طرف جاتا ہے تو اس کی وجہ تعلیم نہیں ہوتی ہے۔“ سلمیٰ خوش ہو گئی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب اگر انہوں نے کہا تو میں یہی جواب دوں گی۔“

سلمیٰ اور شبیر دو دن بعد عالیہ کو لے کر اسکول گئے اور عالیہ کو داخلہ مل گیا۔ جب تک کلاسز کا آغاز ہوتا اس کے دو عدد یونیفارم مل گئے تھے۔ اسکول گھر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ بڑی لڑکیاں تو آرام سے پیدل آ جاسکتی تھیں مگر عالیہ

ہوائی قلعہ

اگر ٹرین میں کھٹے لیٹ ہو تو وینٹک روم میں لیٹ کر ہوائی قلعے بنانا صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ پھر مجھ سا با اصول آدمی (کمیشنر حمید) تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب فرصت میسر ہو اور کب اپنے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کر دے۔ لال قلعے پر دھاوا بولا جاسکتا ہے..... لیکن ہوائی قلعے پر دشمنوں کے فرشتوں کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی۔ لہذا دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ہوائی قلعے سے زیادہ محفوظ اور کوئی مورچا نہیں ہو سکتا۔ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھیے کہ آپ اپنے حریف کے ہاتھوں پٹ جانے کو انسانیت تصور کرتے ہیں اور دم دبا کر بھاگ جانے کو انسانیت کی معراج..... لیکن رات کو سونے سے قبل آپ کو اپنے حریف پر بہت شدت سے غصہ آتا ہے اور آپ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر اسے اس قدر پیستے ہیں کہ وہ بے دم ہو کر رحم رحم چلانے لگتا ہے اور آپ اس کی پروا کیے بغیر کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت ہوائی قلعہ آپ کو پناہ نہ دے تو آپ رات بھر جھٹلا جھٹلا کر زخمیہ شاعری ہی کرتے رہ جائیں۔

ابن صفی (مرحوم) کی کتاب قابل اعتراض تصویر سے اقتباس

معجزہ

ایک فوجی کی محبوبہ نرس بن گئی تو فوجی نے اس کو خط لکھا۔ ”مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم نرس بن گئی ہو۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کسی طرح بیمار ہو کر تمہارے اسپتال پہنچ جاؤں۔“

کچھ دنوں بعد فوجی کو جواب ملا۔ ”بیماری تو کیا..... ہاں کوئی معجزہ ہی تمہیں یہاں پہنچا سکتا ہے کیونکہ میری ڈیوٹی زچہ اسپتال میں ہے۔“

مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

ابھی چھوٹی تھی۔ وہ اتنا فاصلہ چل کر طے نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس پر بیگ کا بوجھ بھی ہوتا۔ اس لیے شبیر نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اسے صبح چھوڑے گا اور دوپہر میں لے کر آئے گا۔ جب وہ کہیں گیا ہوگا تو یہ کام رفیق کا بڑا بیٹا شفیق کرے گا جواب پندرہ سال کا ہو گیا تھا اور اسے بائیک چلانی آتی تھی۔

اسکول کی زندگی عالیہ کے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ اسے کسی اجنبی یا کسی مشکل سے واسطہ نہیں پڑتا تھا مگر اسکول ایک الگ دنیا تھی۔ یہاں سب اجنبی تھے اور کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ چند دن تک اسے بہت مشکل ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہوئی گئی اور پھر اسکول کا ماحول اس کے لیے مانوس ہو گیا۔ اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے وہ پچھڑ کی گڈ بک میں آگئی۔ ششماہی امتحان میں عالیہ نے نہ صرف اپنی کلاس بلکہ پہلی کلاس کے تمام سیکشنوں میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔

سازمے بارہ بجے پرائمری اسکول کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ وہ باہر نکلتی تو شبیر پہلے سے اس کا منتظر ہوتا لیکن کبھی ایسا ہوتا کہ وہ لیٹ ہو جاتا تو اس نے عالیہ کو سمجھایا ہوا تھا کہ وہ گیٹ کے سامنے رہے۔ اسکول کا چوکیدار شبیر کے جاننے والوں میں سے تھا۔ شبیر نے اس کی ذمہ داری لگائی ہوئی تھی کہ وہ اس کے نہ آنے کی صورت میں عالیہ کو اپنے پاس رکھے۔

ظہیر اور عمیر لڑکوں والے اسکول میں تھے۔ یہ اسکول گل پور کے نچلے حصے میں تھا۔ شفیق نے آٹھویں کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تعلیم میں دل نہیں لگتا تھا اس لیے رفیق نے اسے اپنے ساتھ ہارڈ ویئر شاپ پر لگا لیا۔ اس سے چھوٹے راشد، نسیم اور وسیم اسکول میں تھے مگر ان کا رجحان پڑھائی کی طرف کم ہی تھا۔ مارے باندھے پڑھ لیتے تھے۔ نسیم کے پنجے شہر میں پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اس بار نسیم گرمی کی چھٹیوں میں بیوی بچوں سمیت آیا اور اس نے عالیہ کو پڑھتے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی اس نے شبیر سے کہا۔ ”عالی بہت ذہین ہے۔ اتنا کچھ تو میرے بچوں نے پرائیویٹ اسکول میں بھی نہیں سیکھا جتنا یہ چند مہینے میں سرکاری اسکول میں سیکھ چکی ہے۔ میرا مشورہ ہے آپ اسے اعلیٰ تعلیم دلوائیے گا۔“

”ارادہ تو یہی ہے اور خود عالیہ کو بھی پڑھنے کا شوق ہے۔“ شبیر نے جواب دیا۔ ”کم سے کم ہائی اسکول کی تعلیم تو یہ حاصل کر لے گی۔“

نسیم نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔ ”آج کل اکثر کچھ بھی نہیں ہے۔ لڑکیاں پروفیشنل تعلیم حاصل کر رہی

ہیں۔ آپ آگے یونیورسٹی کا سوچیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے اپنی ذہنی پختگی نہیں دیکھی ہے۔“

شبیر یونیورسٹی کا سن کر چپ ہو گیا، وہ تو اسے اکیلا گھر کے دروازے سے باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ عالیہ کے بارے میں شروع سے حساس رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ عالیہ باہر جا کر کہیں گم نہ ہو جائے۔ وہ تھی بھی بہت پیاری سی۔ سرخ و سفید رنگت، سنہری مائل بھورے بال اور اس سے ہلکے رنگ کی آنکھیں، فرائیڈ میں وہ بالکل گڑیا لگتی تھی۔ اس نے سسلی کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ جب وہ گھر میں نہ ہو تو عالیہ کا پورا خیال رکھے۔ عالیہ کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی پھر اسکول جانے لگی تو اسے کھینچنے کے لیے وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔ دوپہر میں آتی اور کھانا کھا کر سو جاتی تھی۔ سہ پہر میں اٹھ کر کچھ دیر جھولا جھولتی تو قاعدہ پڑھانے والی بی بی آ جاتیں۔ وہ صرف ان دنوں میں پور ہوتی تھی جب شبیر کہیں باہر گیا ہوتا تھا۔ کئی بار سسلی نے شبیر سے کہا۔

”عالیہ لڑکی ذات ہے۔ اسے دوسرے گھر جانا ہے، آپ نے اسے اپنا اتنا عادی بنا لیا ہے کہ آپ ایک دن نہ ہوں تو اس کی حالت دیکھنے والی ہو جاتی ہے۔“

”ابھی پختگی ہے، بڑی ہوگی، نئے رشتے اور ماحول ملے گا تو خود کو بدل لے گی۔ ابھی تو میں اور تم اس کے لیے سب کچھ ہیں۔“ شبیر نے کہا۔ ”تم پریشان نہ ہو۔“

”کیسے نہ ہوں..... ماں ہوں۔“ سسلی نے کہا۔

”ایک ذات اوپر والے کی بھی ہے اور وہی اصل وارث ہے ہر بندے کا۔ اس نے ہماری بیٹی کے لیے بھی طے کر رکھا ہوگا۔ وہی سب سے بہتر کرنے والا ہے۔“ شبیر نے رسائییت سے سمجھایا تو سسلی کسی قدر شانت ہو گئی۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ عالیہ تعلیم حاصل کرے مگر سسلی کے ذہن میں اس کی تعلیم بس اسکول تک ہی تھی۔ شبیر نے اسے بتایا تھا کہ آنے والے دنوں میں اسکول انٹر تک ہو جائے گا اور سسلی کے خیال میں انٹر تک تعلیم کافی تھی۔

سسلی باپ بیٹی کی محبت دیکھ کر فکر مند بھی ہو جاتی تھی اگرچہ اسے خوشی ہوتی تھی کہ گل پور کے مردانہ معاشرے میں باپ بیٹیوں سے زیادہ لاڈ نہیں کرتے تھے۔ خود سسلی کا باپ اس سے اور اس سے چھوٹی بہن سے بہت سختی سے پیش آتا تھا حالانکہ اس کا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا۔ شادی کے بعد اس کے رویے میں نرمی آگئی تھی۔ اس کے باوجود سسلی کو اپنے باپ کا بہت خیال رہتا تھا۔

سسلی کے پاس کچھ رقم جمع ہو گئی تھی۔ اس نے شبیر

سے کہا کہ وہ اسے شہر لے چلے، اسے کچھ گولڈ لینا ہے۔ شبیر سمجھا کہ وہ اپنے لیے لینا چاہ رہی ہے۔ اس نے سسلی سے کہا۔ ”نیک بخت تیرے پاس اچھا خاصا زیور تو ہے اور بنا کر کیا کرنا ہے؟“

”میں عالیہ کے لیے لے رہی ہوں۔“

شبیر نے حیرت سے کہا۔ ”عالیہ کے لیے کیوں..... وہ تو ابھی پختگی ہے۔“

”بچپن کو بڑا ہوتے دیر نہیں لگتی۔“ سسلی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اللہ نے سب دیا ہوا ہے، کوئی کمی نہیں ہے مگر آدمی پہلے سے کچھ جوڑ لے تو آنے والے وقت میں آسانی ہی ہوگی۔“

شبیر متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر منع نہیں کیا۔ ”ٹھیک ہے بھی جو تیری مرضی۔“

”تو کب چلیں گے؟“

”ابھی تو گندم پک رہی ہے، فصل اتر جائے تو پھر چلیں گے۔“ شبیر نے کہا۔ ”تب تک عالیہ کا امتحان بھی ہو جائے گا۔“

مارچ کے آخر میں عالیہ کا پہلی کلاس کا امتحان ہوا اور جب تک فصل کٹی اس کا نتیجہ بھی آ گیا۔ عالیہ نے ایک بار پھر ٹاپ کیا تھا اور اسکول کی طرف سے اسے خصوصی شیلڈ اور نقد انعام بھی ملا تھا۔ شبیر احمد خوش تھا۔ اس نے سسلی سے کہا۔ ”اب ہماری بیٹی بہترین انعام کی مستحق ہے۔“

”ہم اس کے لیے اچھا دالا سیٹ بنوا میں گے۔“ سسلی خوش ہو کر بولی۔

”سیٹ کی بات کون کر رہا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اپنی پسند کا تحفہ دلاؤں گا۔“

جب شبیر نے عالیہ سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”مجھے بی ایم ایکس سائیکل چاہیے۔ جیسی فیم چاچو کے بیٹے کے پاس ہے۔“

”میں اپنی بیٹی کو اس سے بھی اچھی سائیکل دلاؤں گا۔“ شبیر نے کہا۔ وہ اور سسلی کچھ عرصے بعد شہر گئے جہاں سسلی نے عالیہ کے لیے گولڈ سیٹ لیا اور شبیر نے اس کی عمر کی مناسبت سے بہترین غیر ملکی سائیکل لی۔ سسلی نے کہا۔

”آپ لے تو رہے ہیں، یہ وہ چلائے گی کہاں؟“

”گھر کے صحن میں چلائے گی اور گلی میں چلائے گی۔“

”ملک صاحب! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ گلی میں کسی لڑکی کو کبھی سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔“

”مگر میری بیٹی چلائے گی۔“

فرق

”ڈیوڈ نے تم سے شادی کرنے سے انکار کیوں کر دیا؟“

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے اپنی امیر ترین بیوہ خالہ کے بارے میں بتایا تھا؟“

”بتایا تھا۔“ سہیلی نے افسردگی سے جواب دیا۔

”بتانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا؟“

”بہت فرق پڑا۔ وہ اب میرا خالو بن گیا ہے۔“

قابل غور

ایک مرتبہ ایک عورت نفسیاتی معالج کے پاس گئی اور شوہر سے روز روز جھگڑے کی شکایت کرنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ بات بات پر شوہر غصہ کرنے لگتے ہیں اور پھر مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے۔“

اس پر ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کا علاج نہایت آسان ہے۔ تم شیر کی گردن کے تین بال لے آؤ۔“

عورت ہمت کر کے چڑیا گھر گئی۔ شیر کے لیے کچھ گوشت لے گئی جسے شیر نے کھا لیا۔ عورت کا ڈر کچھ کم ہوا۔ وہ روزانہ شیر کے لیے گوشت لے جانے لگی۔

پہلے وہ گوشت دور سے پھینکتی تھی پھر نزدیک سے پھینکنے لگی، یہاں تک کہ جب وہ گوشت کھانے لگتا تو بھجرے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر پیار کرنے کی کوشش کرتی۔ جب شیر اس سے کافی مانوس ہو گیا تو اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تین بال کھینچ لیے اور معالج کے پاس لے آئی۔

اس پر اس نے کہا۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے رویے اور نرم دلی سے شیر کو تو مانوس کر سکتی ہو جو وحشی جانور ہے مگر ایک مرد وہ بھی تمہارا شوہر تم سے مانوس نہیں ہوتا۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، نٹل ہزارہ

”آپ تو اسے پیدل گلی میں نہیں جانے دیتے تھے، اب سائیکل چلانے کی اجازت دیں گے؟“

”میں اس لیے نہیں جانے دیتا تھا کہ اسے دنیا کا پتا نہیں تھا۔ اب وہ ایک سال سے اسکول میں ہے اور اسے دنیا کا پتا چل رہا ہے۔“

”لوگ کیا کہیں گے؟“

”میں نے لوگوں کی کبھی پروا نہیں کی۔“ شیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

وہ واپس آئے اور جب عالیہ نے اپنی سائیکل دیکھی تو اس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ محل پور میں لڑکیوں کا کیا، چھوٹی بچیوں کے سائیکل چلانے کا رواج نہیں تھا وہ زیادہ سے زیادہ ٹرائی سائیکل چلاتی تھیں، وہ بھی تین چار سال کی عمر تک۔ شاید عالیہ پہلی بچی تھی جسے سائیکل ملی تھی۔ شیر سائیکل کے ساتھ چھوٹا سا ہیلمٹ اور گھٹنوں پر پہننے والے حفاظتی پیڈ بھی لایا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سائیکل چلاتے ہوئے وہ کئی بار گرے گی اور جب تک سیکھ نہیں لے گی مگر رہے گی۔ اس نے سائیکل چلانے کی تربیت بھی خود دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ حیران ہوا جب دو دن میں اس نے سائیکل چلانا سیکھ لی اور وہ مکان کے چاروں طرف واقع مچھن میں فراٹے سے سائیکل دوڑاتی پھرتی رہی۔ نورین نے اس کے سائیکل چلانے کی مخالفت بھی کی تھی اور سلٹی سے کہا۔ ”شیر کو کیا ہو گیا ہے۔ اب کل کو یہ گلی میں کرکٹ اور دوسرے کھیل بھی کھیلے گی۔“

”بھابی سائیکل الگ چیز ہے اور باہر جا کر کھیلنا الگ بات ہے۔ ہم اس کی ایسی کوئی بات نہیں مان سکتے۔“

”لڑکیوں کی فرمائش اس طرح پوری کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

سلٹی کو غصہ آنے لگا تھا۔ ”بھابی! اب دور بدل گیا ہے۔ لڑکیوں کو مناسب آزادی دینے کا وقت آ گیا ہے۔“

نورین منہ بنا کر چپ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اتنا کہا۔ ”مرضی تم دونوں کی..... اولاد تو تمہاری ہے۔“

سلٹی نے شیر سے کہا اور اس نے سمجھایا۔ ”بھابی خود جا رہی ہے اور اس نے تو اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ شفیق نے مڈل کر کے چھوڑ دیا اور راشد بھی پڑھتا نظر نہیں آ رہا وہ ساتویں میں رہ گیا ہے۔ یہی حال نسیم اور وسیم کا ہے۔“

”راشد ٹیل ہو گیا۔“ سلٹی حیران ہوئی۔ ”رفیق بھائی نے اسے کچھ نہیں کہا؟“

”وہ بھی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے۔“ شیر نے افسوس سے کہا۔

سے کہا۔ ”وہ بعد میں افسوس کریں گے جب ان کی اولاد تعلیم میں پیچھے رہ جائے گی اور یہ فرق انہیں دوسروں سے الگ کر دے گا۔ اب لوگ ملنے جلنے اور رشتے ناتوں میں تعلیم دیکھنے لگے ہیں۔“

سلمیٰ نے دلی زبان میں کہا۔ ”بھابی دو تین بار راشد کے لیے عالیہ کا کہہ چکی ہیں۔“

شبیر فکر مند ہو گیا۔ ”ایک گھر میں رہتے ہوئے وقت سے پہلے ایسی باتیں مناسب نہیں ہیں۔“

”میں اپنی بچی راشد کے لیے نہیں دوں گی۔“ سلمیٰ نے جلدی سے کہا۔ ”اب بھابی نے بولا تو میں صاف منع کر دوں گی۔ عمر کا بہانہ کر دوں گی۔ وہ عالیہ سے پورے آٹھ سال بڑا ہے۔“

”رفیق بھائی نے اب تک ایسی بات نہیں کی ہے۔“ شبیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر کی تو میں بھی منع کر دوں گا۔“

”مگر دیکھ کر منع کیجیے گا۔ بھائی ہیں اور ساتھ ہی رہتے ہیں۔“

مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسی سال جب عتیق کی شادی تھی تو نورین نے اچانک ہی اپنے بیٹوں کے لیے اپنے بھائی کی بیٹیوں سے منعی کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہ حیران ہوئے تھے کیونکہ نہ مشورہ کیا اور نہ بتایا تھا۔ شبیر نے بھائی سے شکوہ کیا۔ ”لوگ تو غیروں میں بھی پوچھ لیتے ہیں، آپ نے ساتھ رہنے والے بھائی سے بھی مشورہ نہیں کیا اور نہ بتایا۔“

”بس یار۔“ رفیق نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ”ہم وہاں گئے تھے، تیری بھر جاتی نے کہا..... میں نے ہاں کی تو اس نے اسی وقت بھائی سے بات کر لی۔ بھلی لوگ نے مہلت ہی نہیں دی۔“

شبیر اور سلمیٰ کبیدہ خاطر تھے مگر ساتھ ہی انہوں نے اطمینان کا سانس بھی لیا کہ سر پر لگتی تلواریں ہٹ گئی۔ شاید نورین نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ وہ عالیہ کے رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے اس لیے اس نے اچانک ہی اپنے بھائی کی بیٹیاں مانگ لیں۔ مگر طریقہ ایسا تھا کہ سلمیٰ نے محسوس کیا کہ وہ جتا رہی ہو کہ اس کے بیٹوں کو لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے بھائی کی لڑکیاں قطعی ان پڑھ تھیں جب یہ لڑکیاں بیاہ کر اس گھر میں آئیں تو گھر کا ماحول ہی بدل جاتا لڑکیاں ماحول اپنے ساتھ لاتیں ہیں اور جلد یا بدیر وہ اپنے گھر میں یہ ماحول رائج کر دیتی ہیں۔

شبیر زمین پر زیادہ محنت کرتا تھا مگر اسے اتنا ہی ملتا تھا جتنا کہ رفیق کو ملتا تھا حالانکہ اس کی زیادہ توجہ اپنے کاروبار کی طرف تھی اور وہ اس سے اچھا کمارہا تھا۔ بیٹا بڑا ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لگایا۔ شبیر کے دونوں بیٹے پڑھ رہے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں۔ اس کے لیے وہ انہیں شہر بھیجنے کو بھی تیار تھا۔ گویا آنے والے دس پندرہ سالوں تک اسے اکیلے ہی زمین کا کام دیکھنا تھا۔ نعیم اور عتیق کو فصل میں سے حصہ ملتا تھا اور یہ ان کے حصوں کا تہائی ہوتا تھا۔ اسی طرح بہنوں کو ایک ایک حصہ ملتا تھا۔ گل آمدنی کے اٹھارہ حصے ہوتے تھے۔ زمین تقریباً ایک مربع تھی۔ اگر وراثت تقسیم کی جاتی تو شبیر کے حصے میں چھ ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں آتی۔ ان ہی دنوں رفیق نے پہلی بار وراثت تقسیم کرنے کی بات کی تھی۔

عام طور سے زمین اور جائداد سے غیر متعلق وارث بوارے کی بات کرتے ہیں مگر یہ مطالبہ متعلق فرد کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس لیے شبیر اور سب حیران ہوئے مگر جلد معلوم ہو گیا کہ رفیق کا مقصد کیا تھا۔ اسے زمین سے پورا حصہ ملتا تھا اور کاروبار سے بھی اچھا خاصا کمایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بہنوں کا حصہ براہ راست خرید لے۔ بھائیوں سے معاملہ کر لے اور انہیں قسطوں میں ادائیگی کرتا رہے۔ معاملہ یہاں آ کر انگ گیا کیونکہ نعیم اور عتیق نے قسطوں میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ نعیم نے کہا۔ ”خوب! جو ہمیں حاصل رہا ہے، وہی ہمیں قسط میں دے دیا جائے گا اور زمین تم لوگوں کی ہو جائے گی۔“

شبیر کو بھی یہ تجویز نامناسب لگی تھی۔ اس نے نعیم اور عتیق کی تائید کی۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... یا تو ایک ساتھ رقم دے دی جائے یا پھر جب تک رقم نہیں دی جاتی انہیں حصہ دیا جاتا رہے۔“

”حصہ کیوں؟“ رفیق نے خراب لہجہ میں کہا۔ ”زمین ہم نے آباد کی ہے۔ ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ان کو قسطوں میں لینے میں کیا مسئلہ ہے؟“

”زمین تم نہیں، صرف شبیر دیکھ رہا ہے۔“ نعیم نے جواب دیا۔ ”ہمیں یہ منظور نہیں ہے اگر بنوارا کرنا ہے تو پورا حصہ دو یا زمین دو۔ ہم خود سودا کر لیں گے۔“

شبیر اس جھگڑے سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور عالیہ اس کے پاس تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”بابا! آپ لوگ کیوں لڑ رہے تھے؟“

”بس بیٹا! زمین بہت بری چیز ہوتی ہے، بھائی کو

بھائی سے لڑا دیتی ہے۔“
 ”بابا! تاؤ غصے میں تھے۔“
 ”ہاں کیونکہ ہم ان کی بات نہیں مان رہے۔“
 ”تو آپ مان جائیں نا۔“
 ”وہ غلط بات کہہ رہے ہیں۔“

عالیہ کو ماں باپ دونوں نے ادب و آداب سکھائے تھے کہ بڑے بڑے ہر حال میں بڑے ہوتے ہیں اور ان کی بات ماننا چاہیے۔ اس لیے اسے تعجب ہوا۔ ”بابا! تاؤ بڑے ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ بڑوں کی بات ماننا چاہیے۔“
 شبیر نے چونک کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا، اگر تاؤ مجھ سے کہتے تو میں مان جاتا مگر وہ تمہارے چاچو کے لیے غلط کہہ رہے ہیں۔ انسان اپنے لیے غلط بات مان سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کے لیے اسے کبھی نہیں ماننا چاہیے۔“
 عالیہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”بابا! اگر کوئی دوسرے کے لیے غلط بات کرے تو اسے نہیں ماننا چاہیے۔“
 ”ہاں کیونکہ اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ آدمی کا اپنا نقصان ہو تو بری بات نہیں ہے لیکن کسی دوسرے کو نقصان ہو، یہ اچھی بات نہیں ہے۔“

چانک رفیق والے حصے سے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ عالیہ سہم کر باپ سے لپٹ گئی۔ ”بابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“
 شبیر نے اسے چھکی دی۔ ”کچھ نہیں ہوگا بیٹا! آپ فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 عالیہ نے سراٹھا کر باپ کو دیکھا۔ ”آپ ٹھیک کر لیں گے۔“
 شبیر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہاں، میں ٹھیک کر دوں گا۔“
 عالیہ کی بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بے شک یہ اس کا براہ راست مسئلہ نہیں تھا۔ تنازعہ رفیق، نعیم اور عتیق کے درمیان میں تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ دخل نہ دے۔ اس نے اپنی بات کہہ دی تھی مگر اب اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے دخل نہ دیا تو بات زیادہ خراب ہو سکتی ہے رفیق نے زیادتی والی بات کی تھی اور اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ نعیم بھی کم اکٹھ نہیں تھا۔ بات بڑھتی تو بھائیوں میں خلیج آ جاتی اور شبیر ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے روز اس نے پھر سب بھائیوں کو بٹھایا اور بولا۔ ”دیکھو یار! ہم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون ایک ہے۔ اگر ہم جھگڑیں گے تو کسی کا بھلا نہیں ہوگا اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔“

”یہ بات ان لوگوں کو سمجھاؤ۔“ رفیق نے نعیم اور عتیق کی طرف اشارہ کیا۔
 ”رفیق بھائی! آپ بڑے ہیں اور ایسی باتیں چھوٹے کرتے ہیں۔ آپ معاملے کو سلجھانے کی بات کریں۔“ اس بار شبیر نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”اگر آپ نرمی نہیں کریں گے تو بھوارا زمین کا ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ ہمارے پرکھوں کی زمین غیروں کے پاس چلی جائے۔“
 رفیق کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ ویسے بھی شبیر سے ذرا دیتا تھا کیونکہ شبیر کی وجہ سے وہ زمین کی فکر سے آزاد ہو کر کاروبار کرتا رہا تھا۔ اگر شبیر سارا بوجھ خود پر نہ لیتا تو وہ آج لاکھوں کے ہارڈ ویئر اسٹور کا مالک نہ ہوتا۔ رفیق نے کہا۔ ”اچھا بھئی اگر تو کوئی حل نکال سکتا ہے تو نکال لے۔“
 ”میری ایک تجویز ہے۔ تم سب ٹھنڈے دل سے اس پر سوچو۔“ شبیر نے بھائیوں کو دیکھا۔ ”سوچنا بھی خود ہے، بیویوں سے مشورہ کیا تو بات نہیں بنے گی۔“
 شبیر نے یہ بات مزاحیہ انداز میں کہی تھی اس لیے سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ پھر نعیم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی نہیں چاہتا کہ ہم بھائیوں کا دل بٹے۔“
 ”تجویز یہ ہے کہ رفیق بھائی بہنوں کا حصہ خرید لیں۔ میں ایک بھائی کا حصہ خرید لیتا ہوں کیونکہ میری معنائش اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسرے بھائی کا حصہ تو رفیق بھائی جتنی رقم نقد دے سکتے ہیں، وہ دے دیں اور باقی ہم بینک سے قرض لے کر ادا کر دیں گے۔“
 ”میں بینک سے قرض نہیں لوں گا۔“ رفیق نے اعتراض کیا۔ ”اس پر سو دینا پڑے گا۔“
 ”آپ نے اسٹور کے لیے بینک سے ہی قرض لیا تھا۔“ شبیر نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں لیکن میں سود کی اضافی رقم کیوں دوں؟“ رفیق نے کہا۔
 ”اب تم دونوں کیا کہتے ہو؟“ شبیر نے نعیم اور عتیق کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں زیادہ رقم مل جائے گی اور کم رقم قسطوں کی صورت میں لو گے۔“
 ”تب ہم آمدنی سے اتنا ہی حصہ بھی لیں گے۔“ نعیم نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔
 ”مجھے منظور نہیں ہے۔“ رفیق نے سخت لہجہ میں کہا۔
 ”مجھے منظور ہے۔“ شبیر نے کہا۔ ”تمہیں آمدنی میں سے حصہ میں اپنے حصے کی آمدنی سے دوں گا لیکن.....“ اس نے کہتے ہوئے رفیق کی طرف دیکھا۔ ”اب آپ زمین کو برابر

کا وقت دیں گے۔ دوسری صورت میں آپ جتنا کم وقت دیں گے، آپ کے حصے کی آمدنی اتنی ہی کم ہو جائے گی۔“
رفیق کا منہ لنگ گیا۔ ”لیکن مجھے اپنی دکان کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔“

”میں نے آپ سے لازمی وقت دینے کو نہیں کہا ہے۔ اگر آپ اپنے حصے کی پوری آمدنی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو برابر کا وقت دیں ورنہ حصہ کم ہو جائے گا۔“
اب رفیق کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سخت رویہ دکھا کر اپنے لیے چک کا دروازہ خود بند کر لیا تھا۔ بیوارا طے ہو گیا تھا اس لیے انہوں پیش کار سے رابطہ کر کے زمین کا مکمل ریکارڈ حاصل کیا۔ اس کے بعد زمین اور مکان کی مالیت نکلوائی۔ بہنوں کا حصہ رفیق نے اپنے ذمے لے لیا تھا مگر بہنوں نے کہہ دیا کہ وہ اپنا حصہ مشترکہ چاہتی ہیں اور فوری چاہتی ہیں۔ یعنی جب تک انہیں رقم نہیں ملتی بیوارا مکمل نہیں ہوتا۔ غالباً رفیق کے ذہن میں تھا کہ وہ بہنوں کو بھی تو ڈوڑ کر رقم دے گا مگر انہوں نے فوری مانگ کر اس کا منصوبہ ناکام بنا دیا اور اسے ان کو پوری رقم ایک ساتھ دینا پڑی۔ تمام بہن بھائیوں نے شبیر پر اعتماد کیا تھا اور اسی نے چند مہینوں میں بیوارے کی کارروائی بہ احسن و خوبی مکمل کر لی تھی۔ پچیس میں سے دس ایکڑ زمین اس کے حصے میں آئی اور پندرہ ایکڑ رفیق کے حصے میں آئی۔ مکان کے لیے طے ہوا کہ اس میں نعیم اور عتیق کا برابر کا حصہ ہوگا۔ بہنوں کا حصہ وہ چاروں خرید لیں گے۔ بعد میں اگر کوئی چاہے تو اپنا حصہ کسی کو فروخت کر سکتا ہے۔ مکان کی ساخت ایسی تھی کہ اس کے بہ آسانی چار حصے کیے جاسکتے تھے۔

رفیق نے کہہ دیا تھا کہ وہ زمین کو وقت نہیں دے سکتا اس لیے آمدنی میں حصہ ستر اور تیس فیصد طے ہوا تھا۔ ستر فیصد شبیر کو ملتا جس سے وہ دونوں بھائیوں کو آمدنی میں حصہ اور اپنے حصے کی قسط ادا کرتا جبکہ رفیق صرف قسط کی رقم ادا کرتا۔ چار سال میں شبیر نے اپنے حصے کی قسطیں ادا کر دیں۔ رفیق حسب توقع اب تک پوری رقم نہیں دے سکا تھا۔ اگرچہ وہ اب زیادہ نہیں رہی تھی۔ نعیم اور عتیق نے اب شبیر کو منع کر دیا تھا کہ آمدنی میں سے حصہ نہ دے۔ اس نے جتنا دے دیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ ان چار سالوں میں شبیر کو ذرا تنگی رہی تھی کیونکہ اس کی نصف آمدنی تو ایسے ہی نکل جاتی تھی۔ پھر زمین کے خرچے بھی کم نہیں تھے۔ شبیر نے زمین کا باغ والا حصہ لیا تھا اور اس میں نئے درخت لگانے تھے اس لیے اخراجات بڑھ گئے تھے اور پھل کم ہونے سے آمدنی

گھٹ گئی تھی۔ بہر حال جیسے جیسے یہ وقت گزر گیا تھا۔ عالیہ تیسری کلاس میں تھی جب اس کی چھوٹی بہن فاریہ پیدا ہوئی۔ اس وقت تک شبیر اور سلٹی مزید اولاد کے بارے میں سوچنا بھی ترک کر چکے تھے۔ یہ اوپر والے کی طرف سے تھا۔ اچانک ہی سلٹی کو پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ عالیہ بہن کی آمد پر خوش تھی۔ اسے ایک نئی مصروفیت ہاتھ آگئی تھی۔ اسکول سے آتے ہی وہ فاریہ کے ساتھ لگ جاتی۔ فاریہ کی پیدائش کے وقت عالیہ کو سخت تجسس تھا۔ ماں کو اس نے پل پل دیکھا کہ اس کی جسمانی ہیئت بدل رہی ہے۔ پھر فاریہ کی پیدائش کے بعد وہ پہلے جیسی ہو گئی۔ عالیہ اس بارے میں سوالات کرتی تو سلٹی کے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

وہ فاریہ میں لگن ہو گئی تھی۔ چند مہینے بعد جب فاریہ خاصی وزنی ہو گئی تھی تو عالیہ کے لیے اسے گوشت اٹھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ تب وہ اسے داکر میں لے کر محکمہ میں گھومتی تھی۔ کبھی اسے داکر میں چھوڑ کر اس کے ارد گرد اپنی سائیکل چلاتی تھی۔ فاریہ اس سے بہت خوش ہوتی۔

اسکول اور تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ پرائمری میں عالیہ نے ایک بار پھر ٹاپ کیا اور اس بار اس نے پورے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ یہ اسکول کی تاریخ میں ریکارڈ تھا۔ آج تک کسی بچی نے اتنے نمبر حاصل نہیں کیے تھے۔ وہ ضلع میں سب سے زیادہ نمبر لینے والے بچوں میں تیسرے نمبر پر آئی تھی اور اسے وزارت تعلیم کی تقریب انعامات میں خصوصی طور پر والدین سمیت بلایا گیا تھا۔ وزیر اعلیٰ اس تقریب میں آئے تھے اور انہوں نے بچوں میں انعامات تقسیم کیے تھے۔ عالیہ کی وزیر اعلیٰ سے انعام لینے ہوئے تصویر اخباروں میں بھی آئی تھی۔ شبیر نے یہ تصویر اٹلارج کروا کے گھر کی نشست گاہ میں لگا دی تھی۔ اس نے عالیہ کی تعلیمی کارکردگی کی ایک فائل بھی بنائی تھی۔

سب خوش تھے سوائے نورین اور رفیق کے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے قائل نہیں تھے تو خوش کیوں ہوتے۔ اسی سال انہوں نے شفیق کی شادی کرنے کا اعلان کر دیا۔ رفیق اپنے حصے کی زمین اب خود دیکھ رہا تھا۔ ہارڈ ویئر اسٹور کا کام اس نے مکمل طور پر شفیق کے سپرد کر دیا تھا۔ راشد اس کے ساتھ تھا۔ نسیم اور وسیم اسی طرح مارے باندھے پڑھ رہے تھے۔ رفیق اس بات پر شبیر سے خاصے دن ناراض رہا تھا کہ اس نے زمین کی دیکھ بھال کیوں چھوڑی تھی۔ شبیر نے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

اسرائیل، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر II ایسٹیشن، انٹرنیٹ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

اس سے کہا تھا کہ اب وہ جوان نہیں رہا ہے اس لیے ساری زمین کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔

جس سال عالیہ نے پرائمری پاس کی، اسی سال ظہیر نے میٹرک کر لیا اور کالج میں پڑھنے کے لیے شہر گیا۔ اگرچہ گل پور کا بوائز اسکول اب ہائر سیکنڈری ہو چکا تھا مگر اس کا تعلیمی معیار اچھا نہیں تھا اس لیے ظہیر نے ظہیر کو پڑھنے کے لیے شہر نعیم کے پاس بھیج دیا۔ اس نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا تھا اور اس کا ارادہ زرعی یونیورسٹی سے کوآپریٹ فارمنگ کے شعبے میں ماسٹر کا تھا۔ عمیر نوں میں آیا تھا۔ ظہیر کا ارادہ اسے بھی کالج کے لیے شہر بھیجنے کا تھا۔ عالیہ نے ظہیر سے پوچھا۔ ”بابا، جب میں میٹرک کر لوں گی تو کیا مجھے بھی پڑھنے کے لیے شہر بھیجیں گے؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے شہر جانے کی۔“ سہلی نے مداخلت کی۔ ”جتنا یہاں پڑھ سکتی ہو بس اتنا کافی ہے۔“ عالیہ کیا رھویں سال میں لگ گئی تھی۔ سات آٹھ سال کی عمر میں ظہیر نے اسے گود میں اٹھانا اور بٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ سہلی نے بھی سمجھا یا تھا کہ اب وہ بڑی ہو رہی ہے اور جب لڑکیاں بڑی ہو جائیں تو انہیں باپ سے بھی فاصلہ رکھنا چاہیے لیکن باپ سے لاڈ ویسے ہی تھے۔ ماں کی بات پر اس نے ٹھنک کر باپ کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں نہیں اگر آپ نے اچھے گریڈ سے میٹرک کیا تو میں آپ کو آگے پڑھنے کے لیے شہر بھیجوں گا۔“

”ملک صاحب!“ سہلی نے ٹھنک کر کہا۔ ”آپ اسے اور بگاڑیں۔“ ”کیا بگاڑ ہے میری بچی میں۔“ ظہیر کو اس بات پر غصہ آ گیا تھا۔ ”تم ماں ہو کر اس کے بارے میں ایسی بات کر رہی ہو دوسروں کی زبان بول رہی ہو۔“ سہلی شرمندہ ہو گئی۔ ”میرے منہ سے نکل گیا۔ خدا نہ کرے جو میری بچی میں کوئی بگاڑ ہو۔“

کچھ عرصے پہلے حقیقی نے مکان میں اپنا حصہ ظہیر کو فروخت کر دیا تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور اپنا کام کر رہا تھا۔ بزنس بڑھانے کے لیے سرمایہ چاہیے تھا۔ اس نے پہلے رفیق سے کہا مگر اس نے جو قیمت لگائی وہ حقیقی کو قبول نہیں تھی۔ اس نے ظہیر سے بات کی۔ ذرا سے فرق سے حقیقی کی مطلوبہ قیمت اسے مل گئی اور ظہیر نے اس کا حصہ خرید لیا۔

اب ظہیر تقریباً ہزار گز کے پلاٹ میں نصف کا مالک تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اگرچہ اس کے بیٹے شہر میں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

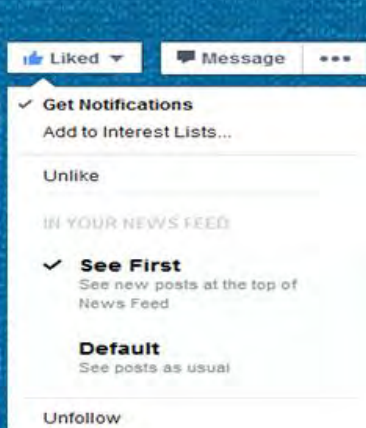
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



پڑھتے اور شاید وہیں ملازمت بھی کرتے لیکن وہ گل پور واپس بھی آسکتے تھے۔ خاص طور سے ظہیر کا ارادہ زرعی یونیورسٹی سے پڑھ کر زمین پر کام کرنے کا تھا۔ عمیر نے ابھی تک اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ رفیق کے بچے خاصے بڑے ہو چکے تھے، شفیق، راشد، نسیم اور وسیم کے علاوہ نورین کے ایک قوت ہو جانے والے کزن کی بیٹی بھی ان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ تعلیم کا فرق دونوں گھرانوں میں بنیادی فرق بن گیا تھا اور اس وجہ سے کزنز کا آپس میں زیادہ میل جول بھی نہیں تھا۔ پھر نورین جس طرح عالیہ کے پیچھے پڑی رہتی تھی، شبیر کو یہ بات بھی بری لگتی تھی۔ شبیر ماحول کی اس تبدیلی سے اپنے خاندان کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے مکان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب اس نے رفیق سے بات کی تو اس نے حیرت سے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“

”اللہ نہ کرے جو کوئی مسئلہ ہو مگر اب بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ پہلے ہم ایک خاندان تھے اب خود ہمارے خاندان بن گئے ہیں اس لیے میں نے مکان میں حصہ الگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرے میں اپنے حصے کو نئے سرے سے تعمیر بھی کرانا چاہتا ہوں اور ایسا الگ ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔“

رفیق نے برا منایا تھا مگر نورین نے ہنگامہ کر دیا۔ دراصل نو میں سے چھ کمرے عملاً اس کے پاس تھے اور تقسیم کی صورت میں اسے کم سے کم دو کمروں سے دست بردار ہونا پڑتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سخت رد عمل دیا تو شبیر نے بھی اسی کی طرح جواب دیا۔ ”بھائی میں کسی کا حق نہیں مار رہا ہوں، اپنا حصہ لے رہا ہوں۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟“

شبیر کے دو ٹوک انداز پر نورین نے بات بدلی۔ ”میں تو کہہ رہی ہوں کہ دونوں بھائی مل کر رہیں۔“

”بھائی کب الگ ہو رہے ہیں۔“ شبیر نے کہا۔

”ساری دنیا میں بھائی اسی طرح الگ الگ رہتے ہیں مگر ان کے رشتے تھوڑی ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مکان الگ ہوں گے، ہم الگ نہیں ہوں گے۔“

طوعاً و کرہاً رفیق اور نورین اس تقسیم پر آمادہ ہوئے۔ مکان کو سامنے کے رخ سے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ شبیر کے حصے میں چار کمرے آئے تھے لیکن عقب میں واقع مہمان خانے والے دو کمرے بھی اس کے حصے میں آئے تھے۔ اگرچہ یہ شبیر کے کام کے نہیں تھے مگر رفیق نے انہیں

اس کے حصے میں شمار کر دیا اور تقسیم پر جو خرچہ آ رہا تھا، وہ اس کے ذمے کر دیا۔ شبیر نے تقسیم ہوتے ہی اپنے حصے کا مکان تڑوا دیا اور اس کی جگہ جدید انداز کے مکان کی تعمیر شروع کر دی۔ یہ دو منزلہ اور پانچ بیڈرومز والا مکان تھا۔ اس میں دو بیڈرومز نیچے اور تین اوپر تھے۔ نیچے ڈرائنگ روم کے ساتھ لاؤنج بھی تھا۔ اوپر تین بیڈرومز کے ساتھ ایک لاؤنج تھا۔ اوپر اور نیچے دو مکمل کچن تھے۔ جب تک مکان تعمیر ہوتا رہا وہ لوگ مہمان خانے والے کمروں میں رہتے رہے۔ تعمیر مکمل ہونے میں ایک سال کا عرصہ لگا اور یہ سال انہوں نے خاصا مشکل سے گزارا تھا لیکن جب مکان مکمل ہوا اور وہ اس میں منتقل ہوئے تو یا ایک سال کی تکلیف کا ازالہ ہو گیا۔

عالیہ ساتویں کلاس میں آگئی تھی۔ بچپن سے وہ جسمانی طور پر متحرک تھی۔ اسے ایسے کھیل پسند تھے جس میں اچھل کود اور بھاگ دوڑ ہو۔ سائیکل کا جنون اب بھی برقرار تھا۔ اسے کھانے کا شوق نہیں تھا مگر غذا بیت والی چیزیں پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بڑھوتری اپنی عمر کے مقابلے میں تیز تھی۔ وہ ابھی بارہ کی نہیں ہوئی تھی لیکن لگتا تھا جیسے چودھویں سال میں لگ گئی ہو۔ اس کی جسمانی تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سسلی نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر دوپٹا اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے لیے سفید رنگ کی چادر لے لی تھی۔ چھٹی میں آنے کے بعد وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پیدل آتی جاتی تھی۔ بلوغت کے آثار بھی قبل از وقت نمودار ہو گئے تھے۔

سسلی کے لیے اب اسے سمجھانا آسان ہو گیا تھا۔ عالیہ کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی۔ وہ تعجب سے ماں کی باتیں سنتی کہ چند تبدیلیوں سے سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔ پہلے اس کی شرمناک لاشعوری ہوتی تھی، اب وہ شعوری طور پر شرم و حیا کا خیال رکھنے لگی تھی۔

جب وہ دس سال کی ہوئی اور سسلی نے باپ کے ساتھ اس کی شام کی سیر پر پابندی لگائی تو اس وقت عالیہ بہت روئی تھی شبیر نے بھی حمایت کی مگر سسلی ڈٹ گئی۔ اس نے کہا۔ ”یہ بڑی ہو رہی ہے اس کا یوں روز باہر جانا مناسب نہیں ہے۔“

”اسکول بھی تو جاتی ہوں۔“ عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”وہ سب لڑکیاں جاتی ہیں مگر یوں باپ کے ساتھ کون لڑکی روز شام کو سیر کو جاتی ہے۔“ سسلی نے جواب دیا۔ ”بس میں نے کہہ دیا، یہ روز کی سیر بند۔“

اب اس نے بلا ضرورت ٹکڑا بند کر دیا تھا۔ وہ پہلے

باہر جاتی تھی تو کوئی توجہ نہیں دیتا تھا مگر اب باہر جاتی تو لوگ گھورتے اور اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسکول میں اس کی چند سہیلیاں بن گئی تھیں اور یہ سب پڑھنے لکھنے والی سلجھی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ عالیہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ اور کبھی ماں کے ساتھ ان کے گھر جاتی تھی۔

اس کے بھائی یہاں نہیں تھے۔ شفیق کا رویہ بھائیوں جیسا تھا مگر راشدا اب اسے کسی اور نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس کے آس پاس منڈلاتا اور اسے غصہ آتا تھا مگر ایک گھر میں رہنے والے کو منع بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ انسان سارا دن کمرے میں بند ہو کر بیٹھا رہے۔ پھر علیحدگی سے ذرا پہلے شفیق کی شادی ہوئی تھی اور اس کی بیوی نے آکر رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ صرف جاہل اور ان پڑھ ہی نہیں، بدتمیز اور اجڈ بھی تھی۔ عالیہ سے اس نے پہلے دن سے بیرپال لیا تھا اور بلاوجہ اس پر تعلیم کے حوالے سے طنز کرتی رہتی تھی۔ عالیہ نظر انداز کرتی کہ ایک تو وہ اس سے عمر میں خاصی بڑی تھی بلکہ شفیق سے بھی ایک سال بڑی تھی۔ پھر عالیہ کو اس کی سچ پر آکر اس کی باتوں کا جواب دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر سسلی بھی غصے میں آجاتی تو وہ ماں کو ٹھنڈا کرتی تھی۔

اس لیے جب ان کی رہائش الگ ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہاں کوئی اسے گھورنے والا اور باتیں ستانے والا نہیں تھا۔ ماحول بھی بدل گیا تھا۔ اس کے ماں باپ مہذب تھے۔ ان کا طرز گفتگو اور زندگی کے ادب و آداب اس کے تائیا کے گھرانے سے بالکل مختلف تھے۔ وہ خود بھی ماں باپ کا پرتو تھی۔ اس لیے الگ ہونے پر وہ سب سے زیادہ خوش تھی۔ جدید طرز کا یہ مکان اس کو بے حد پسند آیا تھا۔ پہلے عالیہ اپنی سہیلیوں کو گھر نہیں بلا سکتی تھی کیونکہ اسے بعض اوقات شرمندگی بھی اٹھانا پڑتی تھی۔ اب وہ اپنی سہیلیوں کو بلا سکتی تھی۔ امتحان کے دنوں میں وہ سب مل کر پڑھتی تھیں۔

وہ نويس میں آئی تو قاریہ نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ جیسے باپ نے اسے ابتدائی پڑھنا لکھنا سکھایا تھا اسی طرح عالیہ نے چھوٹی بہن کو سکھایا اور اسے آسانی سے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ بورڈ کے امتحان کا وقت آیا تو عالیہ پڑھائی کو پہلے سے زیادہ وقت دینے لگی۔ اب وہ ہر روز رات کے کھانے کے بعد دو سے ڈھائی گھنٹے پڑھتی تھی۔ خاص طور سے انگریزی اور اردو میں بہت محنت کر رہی تھی کیونکہ اس نے میٹرک کرنے والی لڑکیوں کو دیکھا تھا کہ وہ

ان مضامین کو خالص اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ بورڈ میں پوزیشن حاصل کرے۔ سسلی اس کی اتنی محنت سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اسے بیٹی کا پڑھنا اور پوزیشن لینا اچھا لگتا تھا مگر اس کی وہی روایتی سوچ تھی کہ عالیہ بہت پڑھ کر کیا کرے گی۔ وہ عالیہ سے کہتی۔

”بیٹا اتنی محنت مت کرو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ اپنی صحت بھی دیکھو۔“
”امی ٹھیک تو ہوں۔“ وہ بے پروائی سے کہتی لیکن یہ حقیقت تھی کہ بہت زیادہ محنت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ صبح چھ بجے جاگتی تھی اور اس کے بعد اسے آرام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ عالیہ نے ناظرہ دوسری جماعت میں ختم کر لیا تھا مگر وہ اس کے بعد بھی مسلسل پڑھتی رہی تھی۔ بی بی اب قاریہ کو بھی پڑھا رہی تھیں۔ بی بی کے جانے کے بعد عالیہ کا کچن ٹائم شروع ہو جاتا تھا۔

سسلی نے شام کی چائے اور دوسرے لوازمات اس کے ذمے لگا دیے تھے۔ اس وقت شبیر بھی آجاتا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی۔ پھر قاریہ کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔ اس کا اور قاریہ کا بیڈروم مشترک تھا۔ وہ جامدی سو جانے کی عادی تھی اس لیے عالیہ اسے ڈسٹرب نہیں کرتی تھی اور پڑھنے کے لیے نشست گاہ میں آجاتی۔ اس نے سائنس لی تھی۔ اختیاری مضامین کی تیاری تو اسکول میں بہت اچھی کرادی جاتی تھی۔ اسے گھر میں صرف اسی وقت پڑھنے کی ضرورت پیش آتی تھی جب اگلے دن کوئی ٹیسٹ یا پریکٹیکل ہو۔

میٹرک کے پیپرز ہوئے تو اس نے بہت اچھی تیاری کے ساتھ پیپرز دیے اور جب نتیجہ آیا تو اس نے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور بورڈ میں اس کی بارہویں پوزیشن آئی تھی۔ گل پور گریڈ اسکول کی کسی لڑکی نے آج تک بورڈ میں پوزیشن نہیں لی تھی۔ اسکول نے عالیہ کے اعزاز میں ایک تقریب کی جس میں مقامی قومی اسمبلی کے ممبر کو یہ طور مہمان خصوصی بلایا تھا۔ ملک شاہد عظیم کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ روایتی جاگیر دار تھا اور اس نے دھونس دھاندلی اور اثر رسوخ سے اپنی زمین اور دولت میں بہت اضافہ کیا تھا۔ اس علاقے کی سیٹ پر وہ ہمیشہ منتخب ہوتا آیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عادی شرابی اور عورتوں کے چکر میں رہنے والا شخص تھا۔ تین شادیاں کی تھیں اور اس کے علاوہ اس نے کتنی رکھی ہوئی تھیں، اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اخبارات میں آئے دن اس کے اسکیڈل شو بزنس

سے وابستہ خواتین کے حوالے سے آتے تھے۔ جب عالیہ اس سے انعام لینے آئی تو اس نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا اور آہستہ سے بولا۔

”تم جتنی ذہین ہو اتنی ہی خوب صورت بھی ہو۔“

عالیہ کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔ آج تک کسی غیر مرد نے یوں اس کی تعریف نہیں کی تھی۔ ملک شاہد کے انداز میں ہوس نمایاں تھی مگر عالیہ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ اس تعریف میں چھپی ہوس کو پہچان سکتی۔ ملک شاہد نے شیلڈ اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ اسے اپنی جیب سے دس ہزار روپے کا انعام بھی دیا۔ نہ جانے کیوں عالیہ کو اس بڑی رقم کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ ماں باپ کے ساتھ گھر جا رہی تھی تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر ملک شاہد کا جملہ گونج رہا تھا۔ اس نے گھر آ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ کیا وہ واقعی خوب صورت تھی؟ اس کا رنگ گلابی تھا۔ جیسے دودھ میں گلاب ملا دیا گیا ہو۔ ہلکی براؤن چمکتی ہوئی آنکھیں۔ بڑے ہونے پر بالوں کا رنگ بھی اسی طرح براؤن ہو گیا تھا اور اب گولڈن شیڈ نہیں آتا تھا۔ نازک سے ہاتھ پاؤں تھے۔ جسم میں نسوانی نزاکتیں نمایاں ہونے لگی تھیں۔

اسکول میں فنکشن ہوا تو دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی تیار ہو کر اور اپنا ایک بہترین سوٹ پہن کر گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سادہ چوٹی یا پونی ٹیل کے بجائے ہیئر اسٹائل خود بنایا تھا۔ اس کی سہیلیاں جو پرسوں سے اسے دیکھ رہی تھیں اس روز اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ سب نے اسے گھیر لیا اور اس کی اتنی تعریفیں کی کہ وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ جب وہ فنکشن کے لیے جا رہی تھی تو سسٹلی نے اسے نظر بد سے بچانے کے لیے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا تھا اور بولی۔ ”اللہ بری نظر سے بچائے۔ آج میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے۔“

وہ اسے ماں کی محبت سمجھی تھی۔ پھر راستے میں شبیر نے بھی کہا۔ ”آج میری بیٹی چاند جیسی لگ رہی ہے۔“

شبیر نے گاڑی لے لی تھی۔ وہ اسی میں انہیں چھوڑنے اور لینے آتا تھا لیکن ہر روز نہیں۔ ایسا بھی کبھی اور خاص موقع پر ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ فنکشن کی وجہ سے اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔ شبیر ہی اسے لینے آتا۔ جانے سے پہلے شبیر نے اسے اپنا اضافی موبائل دے دیا۔ ”جب فنکشن ختم ہونے والا ہو تو مجھے کال کر دینا، میں آ جاؤں گا۔“ فنکشن کے بعد جب وہ گھر جا رہی تھی تو اس نے سنسنی خیز انداز میں باپ کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”بابا! آج

میری سب سہیلیوں نے اور منچرز نے میری اتنی تعریف کی کہ میں بہت اچھی اور پیاری لگ رہی ہوں۔“ شبیر نے آج تک اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اب اس کی بیٹی بڑی ہو رہی تھی۔ جب عالیہ نے یہ بات کہی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اسے پہلی بار احساس ہوا کہ عالیہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ عالیہ نے کہا۔ ”بابا! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

وہ چونک کر بولا۔ ”میں تو ہمیشہ سے کہتا ہوں کہ میری بیٹی سب سے پیاری لگتی ہے۔“

عالیہ جھینپ گئی۔ ”ہاں، آپ اور امی تو ہمیشہ کہتے ہیں۔“ عالیہ اس پر جھینپ گئی تھی کہ اس کے نزدیک ماں باپ کے کہنے کی اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن آج جب دوسروں نے کہا تو وہ اتنی پرجوش ہو رہی تھی۔ شبیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”عالیہ! اب آپ بڑی ہو رہی ہیں۔ آپ کی ذمے داریاں بڑھ رہی ہیں۔ اب آپ نے اپنے ساتھ ہمارا خیال بھی رکھنا ہے۔“

”بابا! میں آپ کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔“ عالیہ فکر مند ہو گئی۔ ”کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟“ ”اللہ نہ کرے جو آپ سے کبھی غلطی ہو۔ میں گھر کی نہیں گھر سے باہر کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی ایک زندگی گھر سے باہر بھی ہے۔ اس کی ذمے داریاں آپ کو خود پوری کرنی ہیں اور ہمارا خیال یوں رکھ سکتی ہیں کہ ہماری عزت کا خیال رکھیں کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمیں اللہ یا دوسروں کے ساتھ اپنی نظر میں بھی شرمندہ ہونا پڑے۔“ عالیہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”مجھے کیا کرنا ہوگا بابا؟“

”وہ سارے کام جو کرتے ہوئے آپ کے دل اور ذہن پر بوجھ نہ آئے اور آپ کو فکر نہ کرنی پڑے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اس کے الٹ ایسے سارے کاموں سے دور رہنا ہوگا جن کے کرنے سے آپ کے ذہن پر بوجھ آئے۔“ شبیر نے اسے آسان لفظوں میں سمجھایا۔

”بابا! میں ایسا کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔“ اس نے وعدہ کرنے کے انداز میں کہا۔

یہاں سے عالیہ کی مصحوبیت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ وہ باپ کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکتی تھی مگر اس نے باپ کی دی ہوئی مثال ذہن میں بٹھالی تھی اور اس کے مطابق عمل کرنے لگی تھی۔ اور اس نے اپنی سہیلیوں کی طرح بابا سے موبائل کی فرمائش نہیں کی تھی

”نہیں، وعدہ کرو ایسا ہی کرو گے؟“ شبیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ظہیر نے سر ہلایا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں۔“
شبیر نے آپریشن ٹیبل پر آخری سانس لی تھیں اس کا پیٹ صاف کیا جا رہا تھا کہ اس نے کلمہ پڑھا اور جان دے دی۔ کچھ دیر بعد آپریشن کرنے والا ڈاکٹر ظہیر اور عمیر سے افسوس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اگر انہیں آدھا گھٹنا پہلے لے آتے تو یہ بچ سکتے تھے۔“
آدھے گھنٹے کا فرق زندگی و موت کا فرق بن گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے لیے ایک لمحہ مصیبت کا تھا۔ اگرچہ یہ اتنا طویل تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال اس میں دیکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود یہ بلک جھپکتے طے ہو گیا۔ پھر آگئی کالعدم شروع ہوا۔ اس نے کھڑکی سے ایک لڑکے اور لڑکی کو ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ لڑکی کے چہرے کی چمک اور ہاتھوں کی حنا بتا رہی تھی کہ اس کے لیے آگئی کالعدم گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ٹوبہ بٹا جوتا تھا۔

☆☆☆

دوسرا لمحہ آگئی.....!

یونیورسٹی میں اس کا دوسرا ہفتہ تھا اور اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ بس چند کلاس فیلو لڑکیوں سے ہیلو ہائے تھی۔ یونیورسٹی کا ماحول اس کے لیے ایسا ہی تھا کہ ساری عمر کسی چھوٹی سی ندی یا جھیل میں رہنے والی مچھلی اچانک کسی بڑے اور پھرے ہوئے دریا میں پہنچ جائے۔ جہاں بے شمار لہریں تھیں اور ہر لہر کے پیچھے ایک نئی دنیا اور اس دنیا کے اجنبی باسی تھے۔ جب یونیورسٹی کے وی سی نے آڈیٹریم میں اس گروپ کا تعارف کرایا جن کی انٹر میں پوزیشن کی وجہ سے انہیں یونیورسٹی نے اسکالرشپ دیا ہے، تب وہ اس مجموعے سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی کیونکہ اس میں لڑکے لڑکیاں کس تھے اور وہ سب آپس میں یوں مل کر کھڑے تھے کہ ان کے جسم ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ وی سی نے اسے دور کھڑے دیکھ کر ڈانس سے ہی کہا۔ ”مس شبیر! کلوز یور فرینڈز..... بی کا زدئے ول بی یور کلوز فرینڈز۔“

وی سی کی بات پر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا تھا اور وہ شرمندگی کے ساتھ گروپ کے نزدیک آگئی تھی۔ اسے لڑکوں سے اتنا نزدیک ہونے میں الجھن ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے اس نے آج تک کوانٹرکشن میں نہیں پڑھا تھا۔ اس

اور اسی طرح جب وہ کسی سکیلی کے ہاں جاتی اور اسے دیر ہو جاتی اور سکیلی اس بارے میں جھوٹ بولنے کو کہتی تو وہ انکار کر دیتی کہ اس کے نزدیک ماں باپ سے جھوٹ بولنا گناہ سے کم نہیں تھا۔ ماں باپ پر اعتماد کے معاملے میں وہ اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس نے دو لڑکیوں سے دوستی اسی وجہ سے چھوڑ دی تھی کہ وہ ماں باپ سے جھوٹ بولتی تھیں اور ان کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہیں۔ عالیہ کے لیے ماں باپ اور خاص طور سے باپ ایک سایہ دار درخت کی طرح تھا۔ اس کا اعتماد اور محبت عالیہ کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چھاؤں اور دولت اچانک اس سے چھین جائے گی۔

میٹرک میں اس کی کامیابی کی خوشی میں شبیر نے خاندان اور واقف کاروں کی دعوت کی تھی۔ دعوت کا اہتمام پارک میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ وہیں دیکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیکڑوں لوگ مدعو تھے۔ گاؤں میں دعوت دوپہر کی ہوتی ہے۔ وہ شام کے وقت گھر آئے تو شبیر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسے پیٹ میں تکلیف اور منگی کی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس نے توجہ نہیں دی اور اسے بدھنسی سمجھا۔ اس کے پاس کبھی چورن تھا، اس نے رات وہی کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح کے قریب شدید تکلیف سے وہ بیدار ہوا۔ اس کا پیٹ نیلا ہو گیا تھا اور پھول رہا تھا۔ تکلیف ایسی تھی کہ وہ چیخیں مار رہا تھا۔ ظہیر اور عمیر آئے ہوئے تھے۔ وہ اسے لے کر کل پور کے واحد ڈاکٹر کے پاس بھاگے اور اس نے شبیر کو دیکھتے ہی کہا۔ ”اس کا اپنڈکس پھٹ گیا ہے، فوری کسی بڑے اسپتال لے جاؤ ورنہ یہ بچے گا نہیں۔“

ہائی وے پر ایک بڑا اسپتال تھا مگر وہ گل پور سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ظہیر اور عمیر نیم بے ہوش شبیر کو لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ظہیر تیز ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ کچھ دیر میں اسپتال پہنچ جاتے مگر بدقسمتی سے ایک بڑا ٹریلر ٹرک اس طرح الٹ گیا تھا کہ اس نے پوری ہائی وے بلاک کر دی تھی۔ کچے میں ساتھ نالا تھا۔ ظہیر نے گاڑی واپس موڑی اور کئی کلومیٹر پیچھے کے کٹ تک لا کر وہ پہلے ہائی وے کی مخالف سمت میں گیا اور جب اگلا کٹ آیا تو وہ دوبارہ راستے پر آیا۔ اس چکر میں آدھا گھٹنا ضائع ہوا تھا اور یہی زندگی و موت میں فرق بن گیا۔ وہ اسپتال پہنچے اور شبیر کو آپریشن روم لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے ظہیر اور عمیر سے کہا۔ ”میرے بعد اپنی ماں اور بہنوں کا خیال رکھنا۔“
ظہیر رونا ہٹا ہوا گیا۔ ”ایسا نہ کہیں بابا.....“

نے انٹر بھی اپنے اسکول سے کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جس سال اس نے میٹرک کے پیپر دیے اسی سال اسکول انٹر بورڈ میں رجسٹرڈ ہو گیا اور اسے انٹر کلاسز کی اجازت مل گئی تھی۔ عالیہ کو خدشہ تھا کہ انٹر میں اسکول کا وہ معیار نہیں ہوگا کیونکہ اس کے لیے ساری نیچر زنتی اپائنٹ کی گئی تھیں اور ان میں سے بیشتر نے پہلے کبھی نہیں پڑھایا تھا، صرف ڈگری کے بل بوتے پر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ شبیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس نے اچھے گریڈ سے میٹرک کیا تو اسے شہر کے کالج بھیجے گا مگر اس کا وعدہ اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ جب اس کے آگے پڑھنے کا وقت آیا تو سسلنی نے اس سے یہیں پڑھنے کو کہا۔ اس کے پاس ماں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

باپ کی اچانک موت ایسا سانحہ تھی کہ اسے لگا جیسے باپ نہیں وہ خود مر گئی ہو۔ اینڈکس کا زہر جسم میں بھی پھیل رہا تھا اور لاش خراب ہونے کا خدشہ ہی تھا۔ اس لیے میت کو جلد تدفین کے لیے پہلے سے غسل کفن کے مرحلے سے گزار کر گھر لایا گیا تھا۔ اگر شبیر کے ہونٹ نیلے اور کسی کسی قدر سیاہی مائل نہ ہوتے تو لگتا کہ وہ سو رہا ہے۔ عالیہ کو بالکل یقین نہیں آیا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح بار بار بھائیوں سے پوچھ رہی تھی۔ ”بابا سو تو نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر غلط بھی کہہ سکتا ہے۔“ ظہیر بڑا ہونے کی وجہ سے ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا

مگر عالیہ کی حالت اور سوال اسے بھی رلا رہے تھے۔ دوپہر تک شبیر کو اسی قبرستان... میں دفنایا گیا جہاں وہ ہر جمعے کو باقاعدگی سے فاتحہ خوانی کے لیے جاتا تھا۔ اس وقت قبرستان کا یہ حصہ بھی بھرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اسے حفاظتی دیوار کے پاس جگہ ملی تھی۔ میت والے گھر میں پہلے چوبیس گھنٹے بہت مشکل ہوتے ہیں۔ عالیہ کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ سسلنی پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جب پانی چھڑکا اور پلایا جاتا تو اس کے حواس بحال ہوتے تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد عالیہ نے محسوس کیا کہ اسے ماں اور چھوٹی بہن کی خاطر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ وہ باپ کے زیادہ نزدیک تھی اس لیے اس کی ذمہ داری بھی زیادہ بنتی تھی۔ وہ خود کو، ماں اور بہن کو سنبھالنے لگی۔ گھر تعزیت کے لیے آنے والے رشتے داروں اور واقف کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ تین دن کا سوگ گزرا تو گھر خالی ہونے لگا۔ وہ بھی غم کے اس مرحلے میں آگئے تھے جب یہ برداشت کے قابل ہو جاتا ہے۔

ظہیر زرعی یونیورسٹی میں ماسٹر کے پہلے سال میں تھا۔ اسے تعلیم مکمل کرنے کے لیے مزید پونے دو سال

درکار تھے۔ عمیر نے انجینئرنگ لی تھی اور اس کے دوسرے سال میں تھا۔ شبیر گھر کا واحد کفیل تھا۔ اگرچہ زمین، باغ اور دوسرا سب ویسا ہی تھا مگر ان سب کو دیکھنے اور چلانے والا نہیں رہا تھا۔ سوئم کے بعد نعیم اور عتیق نے سسلنی سے بات کی اور اس سے پوچھا کہ اب زمین اور باغ کے معاملات کا کیا ہوگا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کسی مرد کی ضرورت تھی۔ ظہیر اور عمیر ابھی پڑھ رہے تھے۔ نعیم اور عتیق اپنی ملازمتوں پر ہوتے تھے۔ اس موقع پر رفیق نہیں تھا کیونکہ نعیم اور عتیق نے سسلنی کا عندیہ لینے کے لیے ملاقات کی تھی۔ وہ دونوں اپنے بڑے بھائی کی خود غرضی بھگت چکے تھے۔ سسلنی کے ہوش اب تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ان سے ہی پوچھا۔

”میں کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ نعیم نے آہستہ سے کہا۔ ”بھائی! آپ کو حوصلہ کرنا ہوگا۔ زمین کی دیکھ بھال آپ کو ہی کرنا ہوگی جب تک ظہیر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا۔“

”نعیم بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے وقتی طور پر کسی کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ شبیر بھائی کے وارث آپ لوگ ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟“

سسلنی اب سمجھ رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو اور مجھے بروقت خبردار کر دیا۔ اب میں اس بات کو ذہن میں رکھوں گی۔“

عتیق نے سر ہلایا۔ ”ہم یہی چاہتے ہیں، کاش کہ ہم یہاں ہوتے تو آپ کے لیے سب گرتے مگر ہماری اپنی مجبوریاں ہیں۔ ورنہ ہمارے اصل بڑے بھائی تو شبیر بھائی ہی تھے۔ اس کے باوجود اگر ضرورت پڑی تو میں اپنے کام چھوڑ کر بھی آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ کوئی مشکل ہو تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔“

سسلنی اپنے دیوروں کی شکر گزار ہوئی جنہوں نے اسے بروقت خبردار کیا تھا۔ اس نے اسی رات ظہیر سے بات کی۔ وہ بھی سمجھا رہا تھا اور اپنے تایا کی فطرت سمجھتا تھا اس نے بھی ماں سے یہی کہا۔ ”باغ اور زمین ہمیں خود دیکھنی ہے، ایک دن کے لیے بھی کسی کے حوالے نہیں کرنی ہے۔“

مسئلہ یہ تھا کہ جب تک سسلنی عدت میں تھی، وہ باہر نہیں جاسکتی تھی۔ ظہیر یا عمیر میں سے کسی کی موجودگی لازمی تھی۔ اس موقع پر ظہیر نے اپنے سمسٹر کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ تین مہینے گزر چکے تھے اور اب تین مہینے بعد دنیا سمسٹر شروع ہوتا مگر مجبوری تھی۔ اگرچہ سسلنی کی عدت چار مہینے بعد ختم ہوتی مگر تب تک ایک مہینے کا فرق رہ جاتا۔ ظہیر کو

باپ کے بعد جانی تھی اگرچہ ظہیر اور عمیر لڑکے اور اس سے بڑے تھے۔ فارے سب سے چھوٹی تھی مگر جو مقام عالیہ کو حاصل تھا، وہ کسی کو نہیں ملتا تھا۔ باپ تھا تو اس کے چہرے کی ہلکی سی کبیدگی اور آنکھوں کی نہ دکھائی دینے والی نمی بھی جان لیتا تھا۔ مگر اس کے جاتے ہی سب بدل گیا۔ بھائیوں کا رویہ اس سے اچھا تھا۔ وہ اس کا خیال بھی رکھتے تھے۔ سسلی ماں تھی اس کی محبت بے شک تھی۔ اس کے باوجود عالیہ نے جان لیا تھا کہ اس کی راجدھانی چھن گئی ہے۔ اب اس کی کوئی خاص حیثیت باقی نہیں رہی۔ اب ظہیر اور عمیر خاص ہو گئے تھے۔ سسلی بھی ان کی طرف ہی دیکھتی تھی۔

ابھی تک سسلی یا بھائیوں نے اس کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر عالیہ کے ذہن میں کہیں تھا کہ شاید اسے انٹر کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت اتنی آسانی سے نہ ملے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ وہ ایسی پوزیشن حاصل کرے جو سب کو چونکا دے۔ جیسی اس نے میٹرک میں حاصل کی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ بنا کسی شور شرابے کے محنت کر رہی تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ رات کے وقت پڑھ رہی ہوتی تو ظہیر اسے چائے یا کسی اور کام کا کہتا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو توقع نہیں تھی کہ وہ انٹر میں اتنی شاندار پوزیشن حاصل کر لے گی۔ خود اسے بھی توقع نہیں تھی۔ پورے بورڈ میں اس کی ساتویں پوزیشن آئی تھی۔ ماں اور بھائی حیران رہ گئے تھے۔ جس دن نتیجہ آیا، اسکول پر پھل اور نیچر خود ان کے گھر آئے تھے۔

یہ پوزیشن ایسی تھی کہ وہ کسی سرکاری یونیورسٹی میں آرام سے داخلہ لے سکتی تھی مگر اس کا ارادہ عجیبے کی ایک اچھی یونیورسٹی میں داخلے کا تھا مگر دارالحکومت کی یہ یونیورسٹی بہت مہنگی تھی۔ وہاں فیس لاکھوں میں تھی۔ اگر ظہیر ہوتا تو عالیہ کو فکر ہی نہیں ہوتی مگر اب سب بھائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لوگ مبارک باد دے رہے تھے اور جو ملنے والا آتا، وہ عالیہ کو آگے پڑھانے کے بارے میں ضرور کہتا اور اس پر ظہیر اور سسلی خاموش ہو جاتے۔ ان کی خاموشی دیکھ کر عالیہ کا دل ڈوبنے لگتا۔ صوبائی حکومت نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں صوبے کے تمام انٹر بورڈز کے تینوں شعبوں میں پہلی دس پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علموں اور ان کے اہل خانہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں ان کو گولڈ میڈل دیے اور پروفیشنل ڈگری کے لیے اسکا لرشپ کا اعلان کیا۔ اسکا لرشپ یونیورسٹیز کے تعاون سے دی جا رہی تھی اس میں

باغ کے معاملات سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور اس نے سوئم کے بعد ہی باغ جانا شروع کر دیا تھا۔ شبیر کی وفات کے دو ہفتے بعد رفیق نے سسلی سے کہا کہ وہ زمین کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے رہا ہے تو ماں سے پہلے ظہیر نے انکار کر دیا۔ ”شکریہ تایاجی! میں دیکھ لوں گا۔“

رفیق مایوس ہوا۔ ”پتر! تجھے ابھی ان معاملات کا نہیں پتا۔“
”نہیں ہے تو پتا چل جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں تایا جی..... اگر مجھے مشکل ہوئی تو میں آپ سے مشورہ ضرور کروں گا۔“

نورین نے کہا۔ ”لو جی، آپ ان کی ہمدردی میں مرے جا رہے ہو اور یہ ہیں کہ منہ ہی نہیں لگا رہے۔“
”آج کل ہمدردی کا دور ہی نہیں ہے۔ خود بھگتیں گے۔“ رفیق نے بگڑ کر کہا اور وہاں سے اٹھ گیا اس کے بعد ان لوگوں نے آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ سسلی اور بچوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ عمیر واپس چلا گیا تھا۔ ظہیر کو سسلی کی عدت ختم ہونے سے ذرا پہلے جانا پڑا تھا مگر وہ ماں کو باغ کے معاملات کے بارے میں سب بتاتا رہتا تھا اور سسلی زبانی طور پر بہت کچھ جان گئی تھی۔ عدت ختم ہونے کے بعد اس نے خود باغ کے معاملات دیکھنا شروع کر دیے پھل اترنے کا وقت آیا تو ظہیر اور عمیر مختصر چھٹی لے کر آگئے تھے۔ انہوں نے اپنی گمرانی میں یہ کام کرایا تھا۔ ابھی وراثت کا مسئلہ نہیں اٹھایا تھا اور سارے معاملات جوں کے توں چل رہے تھے۔ البتہ بینک اکاؤنٹ سسلی کے نام سے کھولا گیا تھا اور ساری رقم اسی میں آتی تھی۔ سسلی ذہین عورت تھی۔ اس نے زمین بھی دیکھی اور فصل کے تاجروں سے کاروباری ڈیلنگ بھی کرتی رہی۔

عالیہ کی انٹر کی کلاسز شروع ہونے والی تھیں۔ خوش قسمتی سے اہم مضامین پڑھانے والی نیچر مختی اور طالبات پر توجہ دینے والی تھیں۔ اس نے ایف ایس سی یعنی سائنس ہی چنی تھی۔ اس میں ایک اضافی مضمون کمپیوٹر کا تھا۔ سال کے اختتام تک وہ اپنی تیاری سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اضافی مدد سے انٹرنیٹ سے ملی۔ جب وہ میٹرک کر رہی تھی تب ہی شبیر نے کمپیوٹر لیا تھا اور ڈی ایس ایل لگوایا تھا تا کہ عالیہ اور فارے ان چیزوں سے بھی واقف ہو سکیں۔ یہ جدید کمپیوٹر اس نے تقیم سے منگوا لیا تھا۔ فون لائن پہلے ہی تھی بس اسے ڈی ایس ایل کر لیا تھا۔ گل پور میں یہی انٹرنیٹ دستیاب تھا۔

ایک شخص کے نہ ہونے سے اتنا فرق پڑتا ہے کہ انسان کی زندگی ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ یہ بات عالیہ نے

عالیہ کی پسندیدہ یونیورسٹی بھی شامل تھی۔

تقریب میں عالیہ کے ساتھ سلمیٰ اور قاریہ بھی تھے۔ ظہیر نہیں آیا تھا مگر عمیر تقریب میں شریک تھا۔ وہ نعیم کے گھر کے تھے۔ جب وہ تقریب سے آئے تو سب نعیم کے گھر جمع ہوئے تھے۔ نعیم اور عتیق اس معاملے میں پُر جوش تھے۔ انہوں نے عالیہ کو کھلے دل اور محبت سے مبارک دی۔ انہوں نے سلمیٰ سے کہا کہ یہ ان کے خاندان کے لیے اعزاز ہے کہ ان کی ایک بیٹی کو اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر اسکالرشپ ملی ہے۔ میڈیا اور پریس نے اس تقریب کی بھرپور کوریج کی تھی۔ سلمیٰ بھی خوش تھی مگر عالیہ کی آگے تعلیم کے حوالے سے اس کا رویہ زیادہ گرم جوش نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں وہی خدشات تھے جو عالیہ کے ذہن میں تھے کہ شاید ظہیر اور عمیر اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”امی! میں آگے پڑھوں گی۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ سلمیٰ نے گہری سانس لی۔ ”لیکن تیرے بھائی.....“

”انہیں کیا اعتراض ہوگا؟“ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”بابا نے مجھے اجازت دی تھی۔“

”ہاں مگر اب گھر کے بڑے تیرے بھائی ہیں۔ وہی تیرے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔ ”وہ بھی منع نہیں کریں گے۔ اصل مسئلہ رفیق ہے۔“

عالیہ کو معلوم تھا کہ اس کے بھائی تیار رفیق کے دباؤ میں آسکتے ہیں اس لیے اس نے اپنے چچاؤں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے ہی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے آن لائن درخواست دی۔ انٹر کے دوران عالیہ اپنی پسند کے شعبے کو تلاش کرتی رہی تھی۔ اسے ماس کمیونیکیشن میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اسی میں آنرزز کے لیے درخواست دے دی۔ اسکالرشپ یونیورسٹی ہی دے رہی تھی۔ اس کی درخواست منظور ہوگئی۔ اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اس کی سمسٹر فیس اور ہاسٹل کے اخراجات اسکالرشپ سے ادا کیے جاتے۔ ہاسٹل میس کے ساتھ تھا یعنی اسے کھانا بھی فری میں پڑتا۔ دوسرے کچھ اخراجات اور تھے لیکن وہ اتنے زیادہ نہیں تھے۔ اس لحاظ سے اس کی تعلیم کا بوجھ اب گھر والوں پر نہیں آتا مگر اسے خطرہ دوسرا تھا۔ حسب توقع رفیق اور نورین نے اس کے آگے پڑھنے کی شدید مخالفت کی تھی۔

نورین اپنی دوسری بیٹی کو بھی راشد سے پیار کر لے آئی تھی۔ شفیق کی بیوی جاہل اور منفی ذہنیت رکھتی تھی۔ مگر وہ شریف عورت تھی۔ راشد کی بیوی بالکل مختلف ثابت ہوئی

تھی۔ وہ بھی بہن کی طرح ان پڑھ اور ذہنی طور پر جاہل تھی مگر اسے زمانے کے سارے نئے فیشن کا پتا تھا اور وہ ان پر عمل بھی کرتی تھی۔ اس نے آکر گھر کا ماحول ہی بدل دیا تھا۔ اس کی بہن ایک طرح کی جہالت لائی تھی اور وہ دوسری طرح کی جہالت لائی۔ اس کی گفتگو اس کا لباس اور اس کے انداز دیکھ کر نورین بھی دنگ رہ گئی تھی جو اس کی سگی پھوپھی تھی۔ رفیق اور نورین کی طرف سے روک ٹوک ہوئی تو اس نے جھگڑے شروع کر دیے۔ راشد بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ مشکل سے چھ مہینے رہی اور پھر ایک دن جھگڑے کے بعد راشد نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بعد رفیق اور نورین لڑکیوں کی تعلیم کے مزید خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ راشد کی بیوی نے سرے سے پڑھائی نہیں تھا۔ نورین نے کئی بار سلمیٰ سے اس موضوع پر بات کی۔

ظہیر کے بعد سلمیٰ اتنی مضبوط نہیں رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے عالیہ کو پڑھنے کے لیے شہر بھیجا تو بہت بڑا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ تیار رفیق کی وجہ سے ظہیر اور عمیر بھی اس معاملے میں تذبذب کا شکار تھے۔ حالانکہ وہ خود شہر میں پڑھ چکے تھے مگر انہوں نے عالیہ کے شہر جا کر پڑھنے کی حمایت نہیں کی تھی۔ جب سلمیٰ نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ شہروں اور خاص طور سے تعلیمی اداروں کا ماحول بہت بدل گیا اور لڑکیوں کے لیے بالکل بھی ٹھیک نہیں رہا ہے۔ عالیہ پریشان تھی کہ شاید اسے اجازت نہ ملے اور اس کا اعلیٰ تعلیم کا خواب ادھورا رہ جائے گا مگر ایسے میں نعیم اور عتیق اس کی مدد کو آئے اور اسے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ خاص طور سے نعیم نے اس کے لیے وہ کردار ادا کیا جو ظہیر ادا کرتا، اگر وہ زندہ ہوتا مگر وہ قدرت سے اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔

نعیم نے خود ظہیر سے بات کی۔ اصل مخالفت وہی کر رہا تھا کیونکہ اسے گل پور میں رفیق اور اپنے چچا زادوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ عالیہ پڑھنے کے لیے شہر گئی اور وہاں اس کی ذات سے منسوب کوئی بات سامنے آئی تو وہ گل پور میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ ظہیر نے سلمیٰ کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایسے میں نعیم آگے آیا۔ اس نے ظہیر کو سمجھایا کہ اب وہ عالیہ پر اعتماد کرے۔ وہ ظہیر کی بیٹی ہے ویسے بھی وہ باپ کے بہت نزدیک رہی ہے۔ نعیم سمجھتا تھا کہ عالیہ نہ صرف بہت ذہین بلکہ بہت مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ اس کی باتیں، اس کے اطوار، اس کا بولنا اور اٹھنا بیٹھنا سب شریف لڑکیوں

والے تھے۔ وہ پہننے اور نہنے میں اپنے رسم و رواج کا پورا خیال رکھتی تھی۔

نعیم نے ظہیر سے کہا کہ وہ عالیہ کی مکمل ذمہ داری لے رہا ہے۔ وہ بادل نا خواستہ راضی ہو گیا۔ عالیہ خوش ہو گئی۔ نعیم اس کے ساتھ دارالحکومت آیا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلے اور ہاسٹل میں رہائش کے تمام معاملات اپنی نگرانی میں پورے کرائے۔ سلمیٰ نے ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ وہ عالیہ کے نام ایک بینک اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کرائے گئے۔ اسے لی ایم کارڈ کی درخواست بھی دی۔ یونیورسٹی میں بھی اسے لی ایم مشین تھی اور عالیہ کو رقم نکلوانے کے لیے بینک تک نہیں جانا پڑتا۔ اس کا ہاسٹل یونیورسٹی کے پاس ہی تھا۔ یہ جگہ دارالحکومت اور عام آبادی سے کسی قدر فاصلے پر ایک پُر فضا مقام پر تھی۔ مگر یہاں ویرانی نہیں تھی کیونکہ یہاں درجن سے بھی زیادہ اعلیٰ تعلیم کے انسٹی ٹیوٹ اور اسکول تھے۔

عالیہ کا ہاسٹل لڑکیوں کے لیے تھا۔ وہیں میس تھا جہاں انہیں تین وقت کا کھانا ملتا تھا۔ ہاسٹل کا ایک کمر تین لڑکیوں کے لیے تھا۔ کمرے کے ساتھ ایچ ہاتھ نہیں تھا لیکن ہر فلور پر کامن واش روم تھا۔ عالیہ کو جو کمر ملا تھا اس میں اس کے ساتھ دو لڑکیاں اسی کے شعبے سے تھیں۔ روشنی صوبے کے جنوبی حصے کے سب سے بڑے شہر سے آئی تھی۔ اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور جب عالیہ نے پہلی بار اسے دیکھا تو وہ عبائے اور نقاب میں تھی۔ وہ خاموش طبع تھی اور صرف ضرورت کے وقت بولتی تھی۔ مومنہ کا تعلق صوبے کے سب سے بڑے شہر سے تھا اور وہ روشنی کے برعکس خاصی ماڈرن تھی۔ اس نے جدید فیشن کے شلوار سوٹ کے ساتھ مختصر سادو پٹالیا ہوا تھا۔ وہ بھی اسی دن ہاسٹل میں آئی تھیں۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد وہ اپنا اپنا سامان سیٹھ کرنے لگیں۔ پھر سارا دن سینک میں گزر گیا اور ڈنر کے بعد وہ جلد تھک کر سو گئیں۔

جس دن اسے ہاسٹل میں کرا ملا اس سے اگلے دن کلاسز کا آغاز ہو گیا تھا۔ میس سے ناشتا کر کے وہ تینوں یونیورسٹی روانہ ہوئیں۔ جس سڑک پر ہاسٹل تھا، یہاں تقریباً ساری عمارات تعلیمی اداروں کی یا ان سے متعلق تھیں۔ اس لیے صبح نکلتے ہی طلبہ اور طالبات ہجوم کی صورت میں اپنے اپنے تعلیمی اداروں کی طرف رواں نظر آتے تھے۔ ان کے ہجوم سے اساتذہ کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں بھی گزر رہی ہوتی تھیں۔ عالیہ کا اپنا قصبہ بھی کم خوب

صورت نہیں تھا لیکن اسے یہ جگہ اور اس کی صبح بہت اچھی لگی تھی۔ یونیورسٹی میں پہلا دن تو کلاسز تلاش کرنے اور جگہیں سمجھنے میں گزر گیا تھا۔ سب سے مشکل پہلی کلاس کی تلاش تھی۔ پوچھنے پر انہیں دو الگ الگ عمارتوں کی طرف بھیجا گیا اور بالآخر ایک لیکچر روم نے انہیں درست کلاس کا بتایا۔

پروفیسر کے تعارف کرانے کا کہنے پر اس نے سادگی سے اپنا اور اپنے پس منظر کا تعارف کرایا تو کلاس میں موجود طلبہ مسکرانے لگے تھے۔ وہ واحد لڑکی تھی جس نے سر پر دوپٹا لیا ہوا تھا۔ روشنی کے ساتھ دو اور لڑکیوں نے مکمل نقاب کے ساتھ عبایا لیا ہوا تھا اور باقی سب ماڈرن اور دوپٹے کے تکلف سے آزاد تھیں۔ عالیہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا مگر اس نے خود کو بڑے سے دوپٹے سے اچھی طرح چھپایا ہوا تھا۔ تعارف کے بعد جب وہ اپنی نشست پر بیٹھی اور پروفیسر نے لیکچر شروع کیا تو عقب سے کسی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ”پنڈو۔“

اس پر عالیہ کھڑی ہو گئی۔ پروفیسر نے لیکچر روک کر عینک کے اوپر سے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”اینی پراہلم مس شبیر۔“

”سر! پیچھے سے کسی نے اپنا تعارف کرایا ہے۔“ اس نے کہا اور دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس پر کلاس میں دہی ہوئی ہنسی گونجی۔ پروفیسر بھی مسکرا دیے۔ نئے آنے والوں کے ساتھ پرانوں کی چیخڑ چھاڑ تو تعلیم کی روایات کا حصہ ہیں۔ عالیہ نے بولنے والی لڑکی اور دوسروں کو جتا دیا تھا کہ وہ بے شک ایک چھوٹے قصبے سے آئی ہے لیکن اسے پنڈو نہ سمجھا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے جواب دینے سے بات آئی گئی ہو جائے گی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے جواب کو ان کا مسئلہ بنالیا جائے گا۔ عالیہ کلاس کے بعد باہر نکلی۔۔۔ تو راہداری میں ایک کسی قدر طویل قامت اور دہلے جسم کی لڑکی نے اس کی راہ روک لی۔ وہ بولی تو عالیہ نے اس کی آواز سے شناخت کر لیا۔ اسی نے پنڈو کہا تھا۔

”میرا نام میٹھا ہے اور مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھے جواب دے۔“

”جواب طلب بات کرو گی تو جواب ملے گا۔“ عالیہ نے اطمینان سے جواب دیا تو میٹھا اچانک آگے بڑھی اور اس نے جان بوجھ کر عالیہ کو ٹکرا دی اور اس کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ کر نیچے بکھر گئیں۔ اس کی ساتھی لڑکیاں بھی ہنستی ہوئی اس کے ساتھ گئی تھیں۔ عالیہ کو خود پر قابو پانا تھا۔ وہ کتابیں اٹھا رہی تھی کہ روشنی اور مومنہ بھی آئیں۔ انہوں

نے میٹھا کو عالیہ سے ٹکراتے دیکھ لیا تھا۔ مومنہ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”تم نے دیکھا تو ہے۔“ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

”اے میرا جواب دینا برا لگا۔“

روشنی نے کہا۔ ”اچھا ہوا تم اس کے منہ نہیں لگیں۔“

”میں جواب دے سکتی تھی۔“ عالیہ نے کہا۔ ”لیکن میں یہاں لڑنے نہیں پڑھنے آئی ہوں۔“

”مجھے تو یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ سوائے پڑھنے کے اور باقی سب کچھ کرنے آئے ہیں۔“ روشنی نے بد مزہ لہجے میں کہا۔ ”جب سے یونیورسٹی میں داخل ہوئی ہوں مجھے مشکل نقاب پر جملے سننا پڑ رہے ہیں۔ سوچ رہی ہوں نقاب اور غایا اتار رہی دوں۔“

عالیہ نے کہا۔ ”اگر تم نے لوگوں کی وجہ سے پہنا ہے تو اتار دو۔“

پہلا دن تھا اور انہیں تمام کلاسز کو دیکھنا پڑا تھا۔ ان کی کلاسز تھیں بھی الگ الگ عمارتوں میں اور خاصے فاصلے پر پڑتی تھیں۔ چل چل کر ٹانگیں دکھ گئی تھیں۔ بیچ انہوں نے کمیشن میں کیا تا کہ ہاسٹل تک جانے کی ہمت کر سکیں اور ہاسٹل پہنچ کر سب ہی ڈھیر ہو گئیں۔ اس کی آنکھ چائے کی خوشبو سے کھلی۔ مومنہ اپنے ساتھ الیکٹریک کیبل لائی تھی اور اسی میں چائے تیار کی تھی۔ ویسے انہیں کمروں میں چائے بنانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ لیکن لڑکیاں چوری چھپے اس قسم کے کام کر لیتی تھیں۔ کاغذی گک میں گرم چائے نے مزہ دیا۔ روشنی نے کہا۔ ”میرے خدا! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پہلا دن اتنا دشوار ہوگا۔“

”میں زندگی میں دن بھر کو بہت کم سوئی ہوں۔“ عالیہ نے چائے لے کر کہا اور ایک سپ لے کر بولی۔ ”اچھی چائے ہے شکریہ۔“

وہ چائے پر گپ شپ کرتی رہیں اور تینوں متفق تھیں کہ یونیورسٹی کا ماحول اس سے کہیں زیادہ کھلا ہوا ہے جتنا کہ وہ سوچ کر آئی تھیں۔ البتہ تینوں کے تاثرات میں فرق تھا۔ مومنہ خوش تھی اور عالیہ ناخوش تھی۔ روشنی نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ کمرے میں ایک عدد دھری ڈور لاکڈ الماری تھی۔ جس کا ایک ایک خانہ ان تینوں کے حصے میں آیا تھا۔ اوپر کپڑے لٹکانے کی جگہ تھی اور نیچے خانے بنے ہوئے تھے جن میں چیزیں رکھی جاسکتی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ریک بھی تھا جس پر کتابیں رکھی جاسکتی تھیں۔ کمرے کی ایک ایک چابی تینوں کے پاس تھی۔ چائے پی کر انہوں نے باقی چیزیں

سیٹ کیں اور ڈنر کے لیے نیچے میں آئیں۔

☆☆☆

عالیہ لان میں ایک باڑ کے ساتھ پھلے درخت تلے بیچ پر بیٹھی اپنے تیار کیے ہوئے نوٹس دیکھ رہی تھی۔ ایک پیریڈ فری تھا۔ اس نے سوچا کہ آج جو نوٹس بنائے تھے ان کا جائزہ لے لے۔ اچانک ہی اسے باڑ کے دوسری طرف سے میٹھا کی آواز آئی۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ دوسری نسوانی آواز عالیہ کے لیے اجنبی تھی۔ ”میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم میرے بارے میں جو بکواس کرتی پھر رہی ہو وہ بند کر دو۔“

”میں جو کر رہی ہوں وہ بکواس نہیں ہے۔ میں سچ.....“ میٹھا نے اتنا کہا تھا کہ تھپڑ کی آواز آئی۔ اس دوران میں عالیہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوب صورت لڑکی میٹھا کے سامنے کھڑی تھی اور میٹھا کا ہاتھ اپنے گال پر تھا۔ جس تھپڑ کی آواز آئی تھی وہ میٹھا کے منہ پر پڑا تھا۔ وہ چند لمحوں کھڑی رہی پھر دوسری لڑکی کو دیکھتی رہی پھر اس نے پھر کر کہا۔

”کتیا.....“

میٹھا اس کی طرف بڑھی تھی کہ ذرا دور روش پر موجود پروفیسر صدیق احمد نے کہا۔ ”گرلز واٹ اڑس۔“

دونوں ایک دم محتاط ہو گئیں۔ دوسری لڑکی نے کہا۔ ”کچھ نہیں سر۔“

پروفیسر کچھ دیر دونوں کو دیکھتے رہے پھر سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی دوسری لڑکی بھی وہاں سے روانہ ہو گئی اور میٹھا اسے دیکھتی رہ گئی۔

روشنی اور مومنہ فری پیریڈ میں کیفے ٹیریا چلی گئی تھیں اس لیے عالیہ اکیلی ہی لان میں چلی آئی تھی۔ عالیہ کا تعلق ایک چھوٹے قصبے سے تھا مگر وہ دور جدید اور اس کی خرابیوں سے بے خبر نہیں تھی۔ گل پور میں اس کے گھر میں کیبل ٹی وی تھا۔ اسی طرح انٹرنیٹ کی مدد سے سوشل میڈیا تک رسائی تھی۔ اس کے باوجود اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ایسی گندگی پھیل رہی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھتے تھے جتنا کہ فلرٹ کرنا۔ کسی کا بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ ہونا اتنا تعجب انگیز نہیں تھا جتنا کہ کسی لڑکے یا لڑکی کا کسی سے دوستی نہ ہونا عجیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو عام طور سے بیک ورڈ، تنگ خیال اور تقریباً بنیاد پرست سمجھا جاتا تھا۔ روشن خیال نسل اب عملی طور پر اتنا آگے نکل

گئی تھی کہ سرعام وہ حرکتیں کرنے لگی تھی جو تنہائی میں بھی محبوب بھی جاتی تھیں۔ پہلے سمسٹر میں ہی اسے احساس ہوا کہ ظہیر اور عمیر کیوں اس کے یونیورسٹی میں پڑھنے کی مخالفت کر رہے تھے۔ اگلے دن وہ دوسرے پیریڈ کے بعد کلاس سے باہر نکلی تو مومنہ اسی لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی جس نے پیش کو تھپڑ مارا تھا۔ لڑکی نے جینز کے ساتھ فی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کا حلیہ اس کی کلاس کی عکاسی کر رہا تھا۔ مومنہ نے اسے آواز دے کر بلایا۔

”اس سے ملو عالیہ..... یہ دیا شاہ ہے۔“
دیانے عالیہ سے ہاتھ ملایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

عالیہ کو اگلی کلاس کی جلدی تھی۔ ”شکریہ، ہٹ سوری..... مجھے اگلی کلاس میں جانا ہے۔“
”ضرور..... ویسے کیا تم مجھ سے کیفے ٹیریا میں ملو گی..... بی مائی گیسٹ؟“

”پلیز۔“ مومنہ نے اصرار کیا تو عالیہ نے سر ہلایا۔
”اوکے لیکن میرا آج کوئی پیریڈ خالی نہیں ہے۔“
”کل؟“

”دیکھوں گی اگر فری پیریڈ ہوا تو آ جاؤں گی۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ اس کا ارادہ نہیں تھا مگر دوپہر میں لچ کے وقت وہ بھوک لگنے پر کیفے ٹیریا پہنچی تو اندر داخل ہوتے ہوئے سامنے دیا، مومنہ کے ساتھ ایک میز پر نظر آئی۔ دیانے اسے دیکھ لیا اور اشارہ کر کے اسے اپنی طرف بلایا۔ اب اس کے لیے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ مجبوراً وہ اس کی طرف بڑھی۔ دیانے اس سے ہاتھ ملایا اور بولی۔

”تھینک یو سوچ کہ تم نے میری بات مان لی۔“
”مجھے بھوک لگ رہی تھی۔“ عالیہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتفاق ہے کہ تم بھی اس وقت یہاں موجود ہو۔“

دیا کھنگلی پھر شانے اچکائے۔ ”جیسے تمہاری مرضی..... آج تم گیسٹ ہو کہو کیا منگو اوں؟“

عالیہ نے منع کیا مگر دیا مبصر رہی تو اس نے سمو سے اور فنکر فرائی کا کہہ دیا۔ سموں، فنکر فرائی اور خستہ بیٹس کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کراتی رہیں۔ عالیہ نے محسوس کیا کہ دیا میٹا سے زیادہ مختلف لڑکی نہیں ہے۔ ویسی ہی بے باک اور حاکمیت جتانے والی مگر ساتھ ہی وہ میٹا سے خارجی کھاتی تھی۔ جب اس کا ذکر ہوتا تو دیا کے منہ پر انگلیں گالیاں آ جاتیں۔ اچانک دیانے چونک کر کہا۔ ”زوہیب آج یہاں کہاں سے آ گیا۔“

مومنہ نے مڑ کر دیکھا مگر عالیہ بیٹھی رہی۔ دیانے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہے اس کو۔ یونیورسٹی کی آدمی لڑکیاں اس کے لیے پاگل ہیں۔“
”نہیں اور نہ ہی دیکھتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بائی دی وے، باقی آدمی لڑکیاں کس کے پیچھے پاگل ہیں؟“
دیانے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“

”پڑھنے۔“ اس نے لٹو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”اب میں چلوں گی۔“
”کلاسز تو ختم ہو گئی ہیں۔“ دیانے کہا۔

”ہاں، مجھے لائبریری میں کام ہے ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔ بھوک برداشت نہیں ہوئی تو یہاں چلی آئی۔“
دیا اور مومنہ کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھی تو اس نے دیا کی آواز سنی۔ ”شی از مس فٹ۔“

وہ دروازے کے قریب تھی کہ اس نے کسی لڑکی کو زوہیب کا نام لیتے سنا۔ اس نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ زوہیب اچھا خوش شکل لڑکا تھا۔ قد کسی قدر دراز تھا اور براؤن بال نئے انداز میں تراشے ہوئے تھے۔ ایک نظر میں عالیہ کو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی کہ یونیورسٹی کی آدمی لڑکیاں اس پر مریں۔ ایسے درجنوں لڑکے یونیورسٹی میں جا رہے تھے۔ وہ لائبریری کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کے لیے یونیورسٹی کے ماحول سے مطابقت رکھنا مشکل ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ بہر حال وہ یہاں پڑھنے آئی تھی۔ وہ خاصی دیر سے ہاسٹل واپس آئی۔ مومنہ اور روشنی آرام کر رہی تھیں۔ دونوں کے ہاتھ میں موبائل تھے۔ اس وقت اسمارٹ فون، واٹس ایپ، فیس بک اور دوسری سوشل میڈیا سائنس بہت عام نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت ایس ایم ایس اور ایم ایم ایس کا رواج تھا۔ عالیہ نے بیگ رکھا اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سرسری سے انداز میں مومنہ سے پوچھا۔ ”یہ دیا مرزا کہاں سے مل گئی تمہیں؟“

”اچھی لڑکی ہے، مجھے پسند آئی۔“ مومنہ بولی۔
”تمہیں کیسی لگی؟“

”اُقر۔“ بایٹا جیسی۔“ عالیہ نے جواب دیا اور جوتے اتار کر دراز ہو گئی۔ آج وہ تھک گئی تھی مگر ابھی سونا نہیں چاہتی تھی اس لیے لائبریری سے لایا موبائلس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ نکالا اور اس کا مطالعہ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد مومنہ کا چائے کا موڈ ہوا تو اس نے اپنی برقی کیتلی نکالی اور چائے

تیار کرنے لگی۔ روشنی کا موڈ نہیں تھا، اس نے منع کر دیا۔
عالیہ نے اپنے لیے بنانے کو کہا تھا۔ جب مومنہ نے اسے
کاغذی کپ میں چائے دی تو عالیہ نے کہا۔ ”ایسا نہ کریں
اپنے لیے مگ لے آئیں۔“

”وہ نظر میں آسکتے ہیں۔“ مومنہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
”یار! تین مگ چھپانا کون سا مسئلہ ہے۔ ہر بندہ اپنا
مگ اپنے پاس رکھے اور خود دھو کر لائے۔“

مومنہ خوش ہو گئی۔ ”مجھے بھی ان میں مزہ نہیں آ رہا اور خطرہ
ہے کہ کچرے میں جانے والے کپ چپک نہ کر لیے جائیں۔“

”مجھے کچھ چیزیں لینی ہیں، کل یونیورسٹی سے واپسی پر
مارکیٹ جائیں گے۔“ عالیہ بولی تو اوستی روشنی چوکنہ ہو گئی۔

”کہاں جانے کی بات ہو رہی ہے؟“
”مارکیٹ۔“ مومنہ نے کہا۔ ”کل یونی کے بعد۔“

”میں بھی چلوں گی، مجھے بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔“
اگلے دن وہ یونیورسٹی سے مارکیٹ گئیں۔ یہاں

مارکیٹ نزدیک اور زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس میں ضرورت
کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ سیٹ ہوتی چلی گئیں۔ پہلا

سیمسٹر تھا اور کورس کا آغاز تھا اس لیے انہیں سمجھنے اور اس پر
عبور حاصل کرنے میں محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ عالیہ عادی تھی

مگر وہ دونوں عادی نہیں تھیں۔ ان کی مشکل دیکھ کر عالیہ کو
ان کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ وہ نزدیک ہوئیں، ایک دوسرے کو

جاننا اور پھر ایک دوسرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ روشنی کا عبا یا
اور نقاب چند ہفتوں بعد ہی اتر گیا تھا لیکن وہ لباس رکھ رکھاؤ

کے ساتھ ہی پہنتی تھی۔ اس کی بھی دیا سے دوستی ہو گئی تھی
اور ان چاروں کا گروپ بن گیا تھا۔ عالیہ کو دیا کی بعض

باتیں مشکل سے ہضم ہوتی تھیں مگر وہ کر جاتی کیونکہ اس کی
کوئی کھلی برائی عالیہ کے سامنے نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

عالیہ گھر کے سامنے اتری تھی۔ پہلے سہ سٹر میں اسے
آنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ آخری سپر کے تین دن بعد ہی

نیا سہ سٹر شروع ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی سیمسٹر کے درمیان میں
چھٹی نہیں دیتی تھی بلکہ ایک ساتھ ہی گرما کی چھٹیاں دے

دی جاتی تھیں۔ وہ پورے دس مہینے بعد گھر آئی تھی۔ شہر سے
گل پور کے بس اسٹاپ تک وہ کوچ میں آئی تھی اور وہاں

سے اسے ظہیر نے لیا تھا۔ جس وقت وہ گھر کے سامنے پہنچے تو
رفیق باہر ہی موجود تھا۔ عالیہ نے گاڑی سے اتر کر پہلے اسے

سلام کیا مگر وہ جواب دینے کے بجائے منہ پھیر کر وہاں سے
چلا گیا۔ ظہیر نے اس کا بیگ نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ کار ہے۔“

انہوں نے ہم سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔“
”ہم سے؟“ عالیہ نے بھائی کی طرف دیکھا۔

”مطلب پورے گھر سے۔“ ظہیر نے بد مزگی سے
کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ عالیہ نے محسوس کیا کہ ظہیر کا

رویہ اس کے ساتھ روکھا تھا۔ اس نے نہ تو اس سے زیادہ
بات کی تھی اور نہ ہی لگ رہا تھا کہ اس نے اتنے عرصے بعد

بہن کو دیکھا ہے۔ یہ بات عالیہ نے ہاسٹل میں محسوس کر لی تھی
کہ بھائی اس سے خوش نہیں ہیں کیونکہ اس دوران میں

انہوں نے اس سے مشکل سے چند ایک بار بات کی تھی اور وہ
بھی اس وقت جب سہلی نے اسے کال کی اور پھر ان لوگوں

سے بھی بات کرائی۔ از خود انہوں نے ایک بار بھی کال
نہیں کی تھی۔ البتہ ظہیر اس کے اکاؤنٹ میں رقم باقاعدگی

سے بھیجتا رہا تھا۔ وہ اندر آئی تو سہلی اور فاریہ بے تابی سے
اس سے لپٹ گئیں۔ سہلی اس کی بلائیں لے رہی تھی اور بار

بار کہہ رہی تھی۔
”میری بچی کتنی کمزور ہو گئی ہے۔“

”ٹھیک تو ہوں امی۔“ اس نے کہا۔ ”وہاں کام
زیادہ ہوتا ہے۔ سب خود کرنا پڑتا ہے اور میس کے کھانے

بس گزارے لائق ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کے کھانے
کہاں ملتے؟ اس لیے کمزور تو ہوں گی۔“

”اب تو آگئی ہے، تجھے ساری تیری پسند کی چیزیں
کھلاؤں گی۔“

ظہیر اسے چھوڑ کر فارم پر چلا گیا تھا۔ عمیر، شہر میں تھا
یہ اس کا تیسرا سال تھا اور ڈیڑھ سال بعد وہ انجینئر بن جاتا۔

کھانے کی میز پر عالیہ نے وہ لفظوں میں بھائیوں کے
روپے کا ذکر کیا تو سہلی گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ”ان کا اتنا

قصور نہیں ہے۔ یہ رفیق ہے جو ہماری جان کو آگیا ہے۔ ایسا
لگ رہا ہے کہ تم گل پور کی واحد لڑکی ہو جو پڑھنے کے لیے

باہر گئی ہو۔ اب وہ خاندان سے باہر بھی باتیں کرنے لگا
ہے۔ یہ باتیں تیرے بھائیوں تک پہنچتی ہیں تو ان کی غیرت

کو ٹھیس لگتی ہے۔“
”امی کسی اور کی باتوں پر اپنی بہن سے ایسا رویہ

رکھنے کا مطلب ہے کہ آپ ان کی باتوں کو سچ سمجھ رہے
ہیں۔“ عالیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر تیا جی ایسی باتیں کر

رہے ہیں تو یہ ان کو روکیں۔ مجھے کیوں قصور وار سمجھ رہے ہیں
جبکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔“

”یہ تو ہے عالی مگر رفیق اور اس کے جاہل میٹوں کے
منہ کون گ۔“ سہلی نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ہاں، ان کے منہ نہیں لگ سکتے مگر مجھ سے منہ ضرور بنا سکتے ہیں۔“ عالیہ نے تلخ لہجے میں کہا اور میز سے اٹھ گئی۔ سلٹی اسے آوازیں دیتی رہ گئی پھر اس کے پیچھے آئی مگر عالیہ نے مزید کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی۔ البتہ ماں کی پریشانی دیکھتے ہوئے اس نے زبردستی اپنا سوڈا چھا کر لیا تھا۔ قاریہ چھوٹی تھی، وہ سہم گئی۔ ”باجی ایسا کیوں کر رہی ہیں؟..... اتنے دنوں بعد آئی ہیں۔“

”کچھ نہیں، تم فکر مت کرو۔“ عالیہ نے اسے پیار کیا۔ اسے اپنی چھوٹی بہن بہت عزیز تھی۔ اسے افسوس تھا کہ جس طرح اس نے باپ کے پیار سے اپنا حصہ وصول کیا تھا، قاریہ اس سے محروم رہ گئی تھی۔ بہر حال ماں اور بھائی اس کے ساتھ اچھے تھے۔ دو تین دن گزر گئے تھے مگر ظہیر کا رویہ بہتر نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہ تو اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور نہ ہی ٹھیک سے بات کی تھی۔ خاص طور سے اس کی تعلیم کے بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ عالیہ دیکھ رہی تھی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ وہ اتنے عرصے گھر سے دور رہی تھی اور واپس آتے ہوئے بہت... پُرجوش تھی لیکن اس کا جوش ختم ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی اس ماحول میں اسے پورے ڈیڑھ مہینے رہنا تھا۔ پھر سلٹی اور قاریہ کا خیال آیا تو وہ خود کو بہلانے لگی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ تعلیم چھوڑ کر واپس آ جائے مگر اس سوچ نے اسے روک دیا کہ جب وہ ٹھیک ہے اور کوئی غلط کام نہیں کر رہی ہے تو وہ کیوں واپس آئے۔ ڈیڑھ مہینے بعد واپس جاتے ہوئے وہ افسردہ بھی تھی اور خوش بھی۔

☆☆☆

دیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہارے پاس اسمارٹ فون نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ عالیہ نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا پانچواں سمسٹر یعنی آنرز کا تیسرا سال شروع ہو گیا تھا۔ وہ دیا، مومنہ اور روشنی کے ساتھ کیفے میریا میں تھی کہ سلٹی کی کال آئی۔ اسے یونیورسٹی آئے آج دوسرا دن تھا۔ ماں سے بات کر کے اس نے اپنا موبائل واپس پرس میں رکھا تو دیا نے اس کے عام سے موبائل کو دیکھ حیرت کا اظہار کیا۔ ہر فرد کے پاس اسمارٹ فون تھا۔ جس کے پاس نہیں تھا وہ لینا چاہتا تھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو یار، اب تو کام کرنے والی مایاں بھی اسمارٹ فون لیے گھومتی ہیں۔“

”لینے کو تو میں نیا آئی فون بھی لے سکتی ہوں۔“ عالیہ کو اس کا انداز برا لگا تھا۔ ”لیکن میں نے کہا نا میں ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

”تم سوشل میڈیا کے بغیر کیسے رہتی ہو؟“

”رہ تو رہی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔“ عالیہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا میرے سینک لکل آئے ہیں؟“

”میرا مطلب ہے کہ یہ بہت ضروری ہے۔“

”شاید لیکن اس وقت میرے نزدیک سب سے ضروری اپنی تعلیم ہے۔ جس کے لیے میں اپنے گھر والوں سے دور یہاں اکیلی ہاسٹل میں رہ رہی ہوں۔“

مومنہ بولی۔ ”تب ہی تم نے چاروں سمسٹر ز میں ٹاپ کیا ہے۔“

”میں زیادہ وقت تعلیم کو دینا چاہتی ہوں اس لیے میرے پاس ان چیزوں کے لیے وقت نہیں ہے۔“

”او کے سوشل میڈیا نہ سہی لیکن انسان کو اور بھی کئی کام ہوتے ہیں۔ اسمارٹ فون لائک اسے پرسنل کمپیوٹر۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یوٹیوب میں لائبریری میں کمپیوٹر ہیں۔“ عالیہ نے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ سوشل میڈیا اور اسکائپ استعمال نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ نسیم اور عتیق کے بچے ان دونوں میڈیاز پر تھے۔ اگر اسے ان سے بات کرنی ہوتی تو وہ کال کر لیتی تھی۔ سوشل میڈیا اس کے نزدیک وقت کا زیاں تھا۔ اس لیے لپ ٹاپ صرف تعلیمی مقصد کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس کے جواب پر دیا نے منہ بنایا۔

”تم میں لگتا ہے بیس سال پرانی روح ہے۔“

عالیہ ہنسی۔ ”نہیں، اکیس سال پرانی، بیس سال کی تو ایک سال پہلے تھی۔“

دیا نے پبلک ریلیشن میں داخلہ لیا تھا۔ اس کا یہ چھٹا سمسٹر تھا۔ یعنی وہ ان سے ایک سمسٹر آگے تھی مگر اس کی کارکردگی زیادہ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس بار مطلوبہ نمبر حاصل نہیں کر سکے گی اور اسے سمسٹر ریوائس کرنا پڑے گا۔ یہی حال مومنہ کا تھا۔ اس نے عالیہ سے کہا۔ ”یار! میری مدد کرو۔ ورنہ اس بار میں سمسٹر کلیئر نہیں کر سکوں گی۔“

”کیسی مدد..... تم مجھ سے آگے ہو؟“

”نہیں یار! پڑھنے میں پیچھے ہوں۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ تم کس طرح پڑھتی ہو۔“

”ویری سہیل۔“ عالیہ نے جواب دیا۔ ”میرے دو

اصول ہیں۔ ایک سب سے پہلے پڑھائی اور دوسرا آج کا کام آج۔“

”یہی تو نہیں ہوتا ہم سے۔“ مومنہ نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”اگر میں رہ گئی تو پاپا واپس بلا لیں گے۔ وہ وارننگ دے چکے ہیں۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ انہوں نے تمہیں بھیجا کیوں ہے۔“

”پلیز! میری مدد کرو میری ٹانگ مت کھینچو۔“

عالیہ نے محسوس کیا کہ مومنہ کچھ عرصے سے دیا کے ساتھ زیادہ ہی رہنے لگی تھی۔ اکثر پیر پڑ میں وہ غائب ہوتی تھی اور بعد میں عالیہ اور روشنی سے نوٹس مانگتی مگر صرف نوٹس سے کام نہیں چلتا تھا۔ انہیں پڑھنا اور ذہن میں رکھنا بھی لازمی تھا۔ کئی بار اس نے ان کے رجسٹر لیے اور رکھ کر بیٹھی رہی تو انہوں نے اسے نوٹو کا پی دینا شروع کر دی۔ اب اسے ہوش آیا تھا کیونکہ چوتھے سیمسٹر میں اس کی مجموعی پرنسپل اتنی گر گئی تھی کہ اگر مزید گرتی تو وہ آگے نہیں جاسکتی تھی۔ اسے سیمسٹر ریوائس کرنا پڑتا۔ عالیہ نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”مدد تو میں کر دوں لیکن تمہیں اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کو ذرا کم کرنا ہوگا۔“

دیا نے جھکے انداز میں کہا۔ ”پلیز! اب تم لوگ یہ بکواس بند کرو اور کوئی کام کی بات کرو۔“

”مثلاً زوہیب کی۔“ عالیہ ہنسی۔ ”جس پر یونیورسٹی کی اب بھی آدمی لڑکیاں مرنے لگی ہیں۔“

دیا کا چہرہ بگڑ گیا تھا مگر اس نے پھر کچھ کہا نہیں۔ دو سال کے دوران عالیہ نے زوہیب کو کئی بار دیکھا اور اس کے بارے میں سنا تھا مگر کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ زوہیب کا تعلق ایک بیوروکریٹ گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ، چچا اور ماموں، اس کے بھائی اور کئی دوسرے رشتے دار سول سروس میں تھے۔ وہ یہاں انٹرنیشنل ریلیشن میں ماسٹر کر رہا تھا اور اس کا ارادہ سول سروس میں جانے کا تھا۔ اس کا باپ انیس گریڈ کا افسر تھا لیکن یونیورسٹی میں اس کے ٹھاٹھ دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی ارب پتی خاندان سے ہے۔ اس کے پاس قیمتی بی ایم ڈبلیو اسپورٹ ماڈل کار تھی۔ برانڈڈ لباس اور اعلیٰ ترین پرفیوم کے ساتھ وہ قیمتی سن گلاسز استعمال کرتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب اسی کی طرح کے امیر زادوں پر مشتمل تھا۔ عالیہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ لڑکیوں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتا تھا اور وہ خود ہی اس کے آگے پیچھے ہوتی تھیں۔

دیا کا تعلق اوپری متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ اور بھائی اسٹیٹ انجینیئر کا کام کرتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر وہ یوں پوز کرتی تھی جیسے اس کا تعلق بہت زیادہ دولت مند خاندان سے ہو۔ کینے ٹیریا میں بہت خرچ کرتی تھی۔ بہترین لباس اور جوتے پہنتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ جدید قسم کا قیمتی موبائل ہوتا تھا۔ ایک دن عالیہ نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یہاں کس لیے آئی ہوں۔ آج تم بتاؤ کہ تم یہاں کس لیے آئی ہو؟“

دیا ہنسی۔ ”فلرٹ کرنے۔“

”رنگی سیریس۔“

”نان سیریس۔“

مومنہ ہنسی۔ ”ظاہر ہے یہاں کون سیریس ہوتا ہے، سب ہی ٹائم پاس کرتے ہیں۔“

عالیہ دیا کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”کہیں یہ انکوار کے کٹے ہوئے والا معاملہ تو نہیں ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہیں ہی کسی نے لفٹ نہ دی ہو۔“

”بکواس مت کرو۔“ دیا نے چڑ کر کہا۔

عالیہ ہنسی۔ ”تم تو برا مان نکلیں حالانکہ یہ تمہارا پسندیدہ موضوع ہے۔“

”میں جا رہی ہوں۔“ دیا کھڑی ہو گئی۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ مومنہ نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ چلی گئی۔ عالیہ نے حیرت سے کہا۔

”اسے کیا ہوا ہے۔ کیا میں نے ایسی کوئی بات کی ہے جو اسے ہرٹ کر گئی ہے؟“

”میں اسے دیکھتی ہوں۔“ مومنہ نے کہا اور پیگ اٹھا کر دیا کے پیچھے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد روشنی نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ دیا کسی سے محبت کرتی ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔“

”وہ زوہیب کے چکر میں تو نہیں ہے؟“

”مجھے نہیں لگتا۔ ویسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”زوہیب کیسا لڑکا ہے؟“

”نارل ہے، لڑکیوں سے گھلتا ملتا ہے۔ ایک دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا نام بھی آیا مگر یہ زیادہ عرصے کسی کے ساتھ نہیں رہتا۔“

”فلرٹ ہے؟“

”نہیں، ایسی بات بھی سننے میں نہیں آئی۔“ روشنی نے جواب دیا۔ ”شاید دیا جانتی ہو کیونکہ وہ شروع میں کچھ عرصے ذہیب کے گروپ میں شامل رہی ہے۔“
 عالیہ کو ابھمن ہونے لگی۔ ”ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں اور ان چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔“
 ”تو کیا کریں، یونیورسٹی آئے ہیں تو یہ سب بھی دیکھنا پڑے گا۔“

”میں تو کہتی ہوں یونیورسٹی کے چکروں کو گولی مارو، ہم تینوں مل کر اسٹڈی کرتے ہیں۔ ہفتے اور اتوار کا دن فری ہوتا ہے۔ میں اپنے سارے ہفتے کے کام ایک ہی دن میں نمٹا لیتی ہوں، دوسرا دن فری ہوتا ہے۔ اس میں مل کر اسٹڈی کر لیں گے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔ مومنہ آتی ہے تو اس پر بات کرتے ہیں۔“ روشنی نے کہا۔ ”ویسے دیا ٹھیک کہہ رہی تھی، تم اسمارٹ فون لے لو۔ صرف سوشل میڈیا ہی نہیں بلکہ اس میں بے شمار چیزیں ہیں جو آدمی استعمال کر سکتا ہے۔“

”بھئی میں وضاحت نہیں کر سکتی مگر جب آدمی استعمال کرے تو بے شمار چیزیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔“
 ”ابھی ارادہ تو نہیں ہے، بعد میں دیکھوں گی۔“ عالیہ نے بات ختم کر دی۔ اس نے فیس بک پر اکاؤنٹ بنایا تھا مگر زیادہ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس بار وہ گھر گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی تھی کہ چودہ سالہ فاریہ جو ابھی نویں کلاس میں تھی، اس کے پاس اسمارٹ فون تھا۔ اسے عمیر نے لاکر دیا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور عمیر بھی اب اسمارٹ فون استعمال کرنے لگے تھے۔ گھر میں دائی فائی انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ یونیورسٹی میں سب کے پاس اسمارٹ فون نظر آتا تھا۔ صرف اسی کے پاس پرانے انداز کا فون تھا اور یہ تھا بھی خاصا پرانا۔ اس نے یونیورسٹی میں آنے سے ذرا پہلے لیا تھا کہ گھر والوں سے رابطہ رہے گا۔ اس دن مومنہ خاصی دیر سے آئی تھی۔ وہ دیا کے پیچھے گئی اور دوبارہ نظر نہیں آئی۔ روشنی نے پوچھا۔

”کہاں رہ گئی تھیں؟“

اس نے تھکے ہوئے انداز میں بیگ بیڈ پر ڈالا اور خود بھی ڈھیر ہو گئی۔ ”دیا کے ساتھ چلی گئی تھی۔“
 ”وہی تو پوچھ رہی ہوں کہاں گئی تھیں؟“
 مومنہ جواب دیتے ہوئے ہچکچائی۔ ”وہ اسے کچھ شاہنگ کرنا تھی۔“

عالیہ کو لگا کہ وہ سچ نہیں بول رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ مومنہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر کچھ دیر بعد بات آئی گئی ہوگی۔ موسم سرد تھا۔ ڈنر کے بعد وہ واپس آئے تو تینوں کبل میں گھس گئے۔ روشنی اور مومنہ اپنے موبائل لے کر وائس ایپ اور فیس بک میں لگ گئیں۔ انہوں نے مل کر ایک وائرس ایپ انٹرنیٹ پر ڈاؤن لوڈ کی دائی فائی دائی ڈیوائس لے لی تھی اور مل کر اس کا بل ادا کرتی تھیں۔ اس رات عالیہ کو عجیب سا لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ دوسروں سے الگ یا پیچھے رہ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی اسمارٹ فون لے لے۔ ضروری تو نہیں تھا کہ وہ اسے مس یوز کرتی۔ یہ تو خود اس پر تھا کہ وہ اسے کتنا استعمال کرتی ہے اور کیسے کرتی ہے۔ جیسے اس کے گھر میں کیبل ٹی وی تھا مگر اس نے کبھی کوئی مووی یا فضول قسم کے شوز نہیں دیکھے۔ کبھی کوئی اچھا ڈراما آتا تو دیکھ لیتی تھی۔ گھر میں بھی وہ اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم کو دیتی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کتاب پڑھتی رہی پھر سو گئی۔ صبح موبائل نے الارم دیا اور اس نے اسے آف کرنے کے لیے ہاتھ مارا تو وہ دراز سے نیچے گر گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ موبائل بے شمار بار گر چکا تھا اور اسے کچھ نہیں ہوا تھا مگر اس بار کچھ ہو گیا تھا کیونکہ گرتے ہی اس کی آواز بند ہو گئی اور جب اس نے اٹھایا تو وہ بند تھا اور آن نہیں ہو رہا تھا۔ مومنہ نے واش روم جانے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے یہ خراب ہوا، اب تم نیا موبائل تو لو گی۔۔ اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا دل بھر گیا ہے۔“
 پرانا صحیح لیکن کام کر رہا تھا اور اب عالیہ کو اسے ٹھیک کرانا تھا۔ موبائل شہر میں ملتے تھے۔ اس نے مومنہ اور روشنی سے کہا اور وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے بعد چلنے کو تیار ہو گئیں۔ وہ موبائل مارکیٹ پہنچے اور عالیہ نے ایک شاپ پر اپنا موبائل دکھایا تو اسے بتایا گیا کہ اسے ٹھیک تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ پھر خراب ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے وہ نیا موبائل لے لے۔ اس پر مومنہ اور روشنی مصر ہو گئیں کہ وہ اسمارٹ فون لے۔ اس نے سوچا اور مان گئی۔ اس کے پاس رقم تھی، اس نے ایک اچھی کمپنی کا اچھا موبائل فون لے لیا۔ اس کا بیج اور دوسرے بیج بہت اچھے تھے۔ مومنہ اور روشنی جو عرصے سے اسمارٹ فون استعمال کر رہی تھیں ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے بھی اتنا اچھا موبائل نہیں دیکھا۔ اس رات پہلی بار وہ ان دونوں کے ساتھ فیس بک اور وائس ایپ پر تھی۔ چوتھی دیا تھی۔ فاریہ وائس ایپ استعمال کرتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



سے بھی بات کیوں کر رہی تھی۔ جبکہ یہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ البتہ اسے اطمینان تھا کہ مومنہ کو پتا نہیں چل سکتا تھا کہ اس نے یونی بوائے کا میسج دیکھ لیا تھا۔ پھر نیند حاوی ہونے لگی اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ چند دن بعد یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا کہ غیر متعلقہ باتیں اس میں زیادہ دیر نہیں رہتی تھیں۔

البتہ اسے سوشل میڈیا کا مزہ آ گیا تھا۔ وائس ایپ پر گھر والوں اور کزنز سے بات ہوتی تھی۔ تازہ ترین کا پتا چلتا رہتا تھا۔ خبروں کے ساتھ تصویریں اور ویڈیوز کا بھی تبادلہ ہوتا تھا۔ اسی طرح فیس بک پر اس کا حلقہ بن گیا تھا۔ اس نے چند اچھے بچ جو اُن کر لیے تھے مگر ساتھ ہی اس نے تعلیم کا حرج نہیں ہونے دیا تھا۔

☆☆☆

کلاس والے واقعے کے بعد بیشا نے پھر کبھی اسے چھیڑنے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جب آتنا سامنا ہوتا تو عالیہ کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی ہی نظر آتی تھی۔ عالیہ ہمیشہ اسے نظر انداز کر دیتی تھی۔ یہ اس کی فطرت تھی۔ اس دن وہ لان میں بیٹھی ہوئی جاتی سردی کی دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور بیشا کو اپنے قریب دیکھ کر چونکا ہو گئی۔ بیشا اکیلی تھی اور اس وقت عالیہ کو اس کے چہرے پر مخصوص تاثرات بھی نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس وہ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں تم سے کچھ کہنے آئی ہوں۔“

”کہو۔“ عالیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

بیشا اچانک مضطرب دکھائی دینے لگی۔ ”دیکھو شاید تم میری بات پر اعتبار نہ کرو لیکن میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں کہ دیا سے ہوشیار رہنا۔ وہ جیسی نظر آتی ہے ویسی نہیں ہے۔“

”کیسی نہیں ہے؟“ عالیہ نے سمجھنے کی کوشش کی۔

”جیسی نظر آتی ہے اس کا تعلق.....“

ابھی بیشا کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ نزدیک سے

زوہیب کی آواز آئی۔ ”ہائی لیڈرز..... ہاؤ آر یو۔“

بیشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیب میں

دونوں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اور بیشا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ بیشا نے

سر دھجے میں کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“

”تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ بولا۔ عالیہ نے کتاب

تھی اور جب عالیہ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ چند دن کے استعمال کے بعد عالیہ نے محسوس کیا کہ وہ اب تک ایک اچھی تفریح سے محروم رہی تھی۔

اس نے پڑھائی کو اول نمبر پر ہی رکھا تھا مگر اس کے بعد جو وقت بچتا تھا، اس میں سے وہ سوشل میڈیا کو بھی کچھ حصہ دینے لگی تھی۔ اسے یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ ماں، بہن اور دوسرے کزنز سے رابطہ رہنے لگا تھا اور فون والی مجبوری باقی نہیں رہی تھی۔ جس سے بات کرنے کو دل چاہا اسے آواز میں پیغام بھیج دیا اور جب فرصت ملی اس کا جواب سن لیا۔ اسی طرح دوسروں پر بھی بوجھ نہیں تھا۔ وہ آرام سے فارغ ہو کر جواب دے سکتے تھے۔ وہ اپنی تصویریں لے کر فوری بھیج سکتی تھی اسی طرح دوسروں کی تصویریں اسے مل جاتی تھیں۔ ایک دن مومنہ اس کے بیڈ پر اس کے پاس مسمی ہوئی تھی۔ وہ فیس بک پر ایک بچ پر تھیں۔ اچانک مومنہ نے کہا۔ ”اف مجھے واش روم جانا ہے۔ آج یونی میں جو برگر کھایا تھا اس میں سم تھنک روٹک تھا۔ میرا پیٹ گڑبڑ کر گیا ہے۔“

مومنہ گئی اور اپنا موبائل اس کے پاس چھوڑ گئی کیونکہ ایک ہی بچ کھلا ہوا تھا اس لیے عالیہ نے اٹھالیا۔ اچانک ہی میسج کا اشارہ آیا۔ فیس بک پر کوئی یونی بوائے مومنہ کو پرائیویٹ میسج کر رہا تھا۔ عالیہ نے غیر ارادی طور پر کھول لیا۔ یونی بوائے نے لکھا تھا۔ ”کل تیار رہنا، میں یونی کے باہر سے پک کر لوں گا۔“

عالیہ چونکی اور پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط کام کیا ہے۔ اسے کسی کی پرائیویسی میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس نے میسج پاکس بند کر کے موبائل نیچے رکھ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مومنہ کسی سے ملتی ہے مگر مومنہ نے انہیں اس بارے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کسی لڑکے سے ملتی ہے۔ آخر اس میں چھپانے والی کیا بات تھی؟ کیونکہ لڑکیاں اور لڑکے تو آپس میں ملتے ہیں۔ شاید اسے احساس تھا کہ عالیہ اور روشنی اس بات کو پسند نہیں کریں گی اور شاید اس سے تعلق کم کریں اس لیے اس نے انہیں بے خبر رکھا تھا۔ مومنہ کچھ دیر بعد آئی اور اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور پھر چونک گئی۔ اس نے چور نظروں سے عالیہ کو دیکھا اور بولی۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے، اب میں سوؤں گی۔“

مومنہ لیٹی ضرور تھی اور اس نے کبیل بھی اوڑھ لیا تھا مگر موبائل نہیں رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں تھا البتہ اس نے اس کی ٹونز بند کر دی تھیں۔ عالیہ کو محسوس کی عادت نہیں تھی لیکن وہ سوچے باندھ سکی کہ آخر مومنہ یوں چھپ کر کسی

میں سچ بچ پڑھ رہی ہوں۔ میری چاروں سیمسٹر میں پہلی پوزیشن آئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خود مختار ہو گئی ہوں۔ میرے بڑے موجود ہیں۔ وہی میرے فیصلے کرنے کے مجاز ہیں۔“

سلمیٰ نے سکون کا سانس لیا۔ ”میں نے پہلے ظہیر اور عمیر سے پوچھا اور انہیں یہ رشتہ پسند ہے۔ صارم بہت اچھا لڑکا ہے اور ماشاء اللہ پڑھنے میں بھی اچھا ہے۔ اگلے سال جاب پر لگ جائے گا۔ ظہیر نے کہا کہ میں پہلے تم سے معلوم کر لوں۔ کہیں تمہیں کوئی اختلاف نہ ہو۔“

عالیہ کو دکھ ہوا تھا۔ ”امی! وہ میرے بھائی ہیں اور جیسے میں انہیں جانتی ہوں، اسی طرح وہ بھی مجھے جانتے ہیں پھر ایسی بات کیوں کی؟“

”بس بیٹا! آج کل لوگوں میں دوسروں کو سمجھنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے اسی لیے تو جھگڑے اور اختلاف بڑھ رہے ہیں۔“

”میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ سے پوچھا۔ صارم بہت اچھا ہے لیکن میرے لیے اصل اہمیت آپ کی اور بھائیوں کی رضا کی ہے۔“

سلمیٰ خوش ہو گئی تھی۔ ”میں کل ہی ظہیر اور عمیر سے بات کرتی ہوں اور انہیں کو بھی اشارہ دیتی ہوں۔“

اگلے دن عالیہ نے محسوس کیا کہ ظہیر کا رویہ اس کے ساتھ اچانک ہی اچھا ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ سلمیٰ نے اس تک عالیہ کی بات پہنچا دی تھی۔ وہ اب اس سے پہلے کی طرح محبت اور بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ عالیہ کو خوشی ہوئی تھی۔ اسے اپنے گھر والوں سے محبت تھی اور وہ چاہتی تھی کہ وہ اس پر اعتماد کریں۔ عمیر کی انجینئرنگ مکمل ہو گئی تھی اور اب وہ جاب کی تلاش میں تھا۔ عالیہ کے آنے کا سنا تو وہ بھی چند دن کے لیے گھر آ گیا۔ بہت عرصے کے بعد عالیہ نے ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارا۔ عمیر عالیہ کے لیے سوٹ اور دوسری چیزیں لایا تھا۔ ظہیر کھانے پینے کا شوقین تھا۔ انہوں نے ایک رات مکان کے عقبی صحن میں فائر کیمپ اور باریبی کیو کیا تھا۔ سلمیٰ نے بتایا کہ اس نے نعیم کو ہاں کہہ دی ہے اور نعیم کا ارادہ ہے کہ جیسے ہی صارم تعلیم مکمل کر کے کہیں جاب پر لگے گا، وہ عالیہ کو باقاعدہ مانگ لے گا۔ اگر صارم جلد سیٹ ہو گیا تو وہ اس کی شادی جلد کر دے گا اور عالیہ اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی مکمل کر سکے گی۔

☆☆☆

عالیہ نے واپسی پر مومنہ، روشنی اور دیا کو اپنے رشتے

نے مناسب سمجھا کہ گھر چلی جائے۔ بس سے گل پور تک صرف دو گھنٹے لگتے مگر ظہیر نے اسے بس میں آنے سے منع کر دیا۔ وہ خود اسے گاڑی میں لینے آیا تھا۔ سلمیٰ اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ ”شکر ہے تو آگئی ورنہ میرا تو برا حال تھا۔“

”اب سب ٹھیک ہے۔“ اس نے ماں کو تسلی دی۔ ”یونیورسٹی بند ہو گئی ہے اس لیے میں آگئی۔ ورنہ وہاں ہاسٹل میں بھی مسئلہ نہیں تھا۔ پولیس نے وہاں چوکیاں بنالی ہیں۔“

”ہماری پولیس کسی قابل ہوتی تو ایسے واقعات ہی کیوں ہوتے۔“ فاریہ نے منہ بنا کر کہا تو عالیہ ہنس دی۔

”تم بھی بولنے لگی ہو۔“

”جی میں بڑی ہو چکی ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا۔ ”تیرا کی ہو کر چودھویں سال میں لگ گئی ہوں۔“

عالیہ نے محسوس کیا کہ ماں صرف اس کے آنے سے خوش نہیں ہے بلکہ اس کی خوشی کی کوئی اور وجہ بھی ہے۔ رات جب وہ سونے کے لیے کمرے میں آئی تو کچھ دیر بعد سلمیٰ نے اسے باہر بلایا۔ فاریہ حسب عادت جلد سو چکی تھی۔ عالیہ باہر آئی تو سلمیٰ اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اس نے عالیہ سے کہا۔ ”عالیہ! تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”کریں امی۔“

”تیرے چچا نعیم نے تجھے صارم کے لیے مانگا ہے۔“

صارم نعیم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ عالیہ سے دو سال بڑا تھا اور اس وقت سافٹ ویئر انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ شکل صورت اور کردار کا بھی اچھا تھا۔ عالیہ کو اچھا لگتا تھا مگر کزن کی حیثیت سے۔ اس نے بھی سوچا نہیں تھا کہ صارم سے اس کا کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔ درحقیقت عالیہ نے کسی کے بارے میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کے گھر والوں کا معاملہ تھا۔ اس نے جھینپ کر سر ہلایا۔ ”جی امی! تو آپ اور بھائیوں نے کیا سوچا ہے؟“

”یہ تو تم بتاؤ۔“

عالیہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ”امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میں بتانے والی کون ہوتی ہوں۔ یہ فیصلہ آپ اور میرے بھائیوں نے کرنا ہے کہ میری شادی کس سے اور کب کرنی ہے۔“

سلمیٰ کی آنکھیں جھک گئیں تھیں۔ اس نے عالیہ کو گلے لگا لیا۔ ”خوش رہے عالی! میں تو سوچ رہی تھی کہ تو اپنی مرضی بھی شامل کرے گی۔“

”امی! آپ کی مرضی میری مرضی ہے۔“ اس نے سلمیٰ کے شانے سے سر ٹکایا۔ ”آگے پڑھنا میرا خواب تھا۔“

میں ہے۔ وہ اس سے ملنے وہاں چلا گیا تھا۔ عالیہ نے محسوس کیا تھا کہ روشنی بری لڑکی نہیں تھی، بس وہ گھروالوں کی پابندیوں سے اکتائی ہوئی تھی۔ وہ جدت پسند تھی مگر ایک حد میں رہ کر۔ وہ لباس کے معاملے میں حد میں رہتی تھی اور عالیہ کی طرح اسے بھی لڑکوں سے دلچسپی نہیں تھی مگر وہ گھومنے پھرنے اور دوستوں کے ساتھ ہلے گلے کی شوقین تھی۔

عالیہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ یہ سب اپنے گھروالوں سے چھپ کر کرتی تھی۔ روشنی اس معاملے میں اتنی ہوشیار تھی کہ نہ اس نے اپنے گھروالوں کی سختی کے رونے روئے تھے اور نہ ہی اپنا حلیہ بدلنے پر ان لوگوں کو کوئی بات کرنے کا موقع دیا تھا۔ مومنہ اور دیا اس کی تہدیلی سے خوش تھیں۔ عالیہ نے سوچا کہ وہ اکیلی اعتراض کر کے اپنا تاثر کیوں خراب کرے۔ ہر شخص اپنا ذمے دار خود تھا۔ اس لیے وہ پسند نہ آنے کے باوجود روشنی کے ساتھ ٹارٹل رہی تھی۔ اس سیمسٹر کے بعد اگلا سیمسٹر شروع ہوا۔ مومنہ نے محنت کی تھی لیکن وہ رہ گئی۔ عالیہ کے حساب سے اس نے اچھی تیاری کی تھی مگر جب رزلٹ آیا تو وہ مطلوبہ پرنسٹن حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اسے سیمسٹر ریوآکس کرنا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کا باپ اسے وارننگ کے مطابق واپس نہ بلا لے مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور باپ نے وارننگ کے ساتھ ایک سیمسٹر کی اور اجازت دے دی تھی۔ عالیہ نے حسب معمول ٹاپ کیا تھا اور وہ اپنے شعبے کی پہلی طالبہ بن گئی تھی جس نے مسلسل پانچ سیمسٹر میں ٹاپ کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ اعزاز کسی اور طالب علم کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ شعبے کے ڈین نے اسے خصوصی طور پر اپنے آفس بلا کر سراہا تھا۔ دیا، روشنی اور مومنہ نے اس کا میانی پر اسے پارٹی دی تھی۔ دیا اگرچہ تعلیم پر کم ہی بات کرتی تھی لیکن اس بار اس نے بھی رشک سے پوچھا۔

”تم اتنی مستقل مزاجی سے کیسے پڑھ لیتی ہو؟“
 ”جیسے لڑکیاں مستقل مزاجی سے زوہیب کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔“ عالیہ نے ہنس کر کہا۔ ”یونو ہم لڑکیاں کسی نہ کسی ایک معاملے میں تو بہت مستقل مزاج ہوتی ہیں۔“
 دیا کا منہ بن گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر ہنسنے لگی۔ ”لیکن میں کسی کے پیچھے نہیں ہوں۔“

”رہائی؟“ روشنی نے تعجب سے پوچھا۔ ”سچی بات ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمہارا کسی سے تعلق کیوں نہیں ہے۔ تم صورت شکل کی اتنی حسین ہو اور فلرٹ کی قائل بھی ہو۔“

کے بارے میں بتایا تو سب نے ٹریٹ کا شور مچایا۔ عالیہ نے کہا بھی کہ ابھی صرف دونوں طرف سے ہاں ہوئی ہے کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی ہے مگر وہ نہیں مانی تھیں۔ اس سے زبردستی ٹریٹ لی گئی اور اسے پیزا آرڈر کرنا پڑا تھا۔ دیا بھی ہاسٹل آگئی تھی۔ انہوں نے وہیں ٹریٹ اڑائی تھی۔ کچھ دن بعد زوہیب نے اسے فیس بک پر پیسج کر کے مبارک دی۔ شاید اسے دینے بتایا تھا۔ عالیہ کو اچھا نہیں لگا مگر یونیورسٹی والے واقعے کے بعد وہ زوہیب سے سلام دعا کر لیتی تھی اور اگر وہ کوئی بات کرتا تو اس کا جواب بھی دیتی تھی۔ اس کے دل میں زوہیب کا تاثر بہتر ہو گیا تھا۔ خاص طور سے اس بات پر کہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر دوسروں کو محفوظ مقام تک پہنچایا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“
 ”دیانے۔“

یشا کی طرف سے خبردار کیے جانے والے واقعے کے بعد اس نے کئی بار فرصت میں اس بارے میں سوچا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں یشا خود زوہیب کے چکر میں تو نہیں گئی۔ یہ شبہ اسے دیا کے بارے میں بھی تھا مگر زوہیب دونوں کو یہی کوئی خاص لفٹ نہیں کراتا تھا اور ان کا آپس میں رویہ کولیگ سے زیادہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی ایک ہفتے بعد کھلی تھی اور دو تین دن.... معمول پر آنے میں لگے تھے۔ ضائع ہونے والے وقت کی تلافی کے لیے سب ہی مصروف ہو گئے تھے۔ اس سیمسٹر میں عالیہ کو سوشل میڈیا استعمال کرنے کا وقت بہت کم ملا تھا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد بھی وہ کمرے میں پڑھتی رہتی تھی اور صرف کھانے کے لیے باہر جاتی تھی۔ اپنے ساتھ اسے مومنہ اور روشنی کی مدد بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ اس لیے جب فارغ ہوتی تو اتنا تھک چکی ہوتی کہ سوائے سونے کے اسے اور کوئی خیال نہیں آتا تھا جبکہ مومنہ اور روشنی حسب معمول موبائل میں لگی رہتی تھیں۔ وہ کس وقت سوتیں، عالیہ کو علم نہیں تھا مگر صبح انہیں اٹھانا پڑتا تھا۔

روشنی نے یونیورسٹی میں آنے کے چند ہفتے بعد ہی اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ مگر اپنے گھروالوں کو وہ یہی تاثر دیتی تھی کہ وہ ویسی ہی ہے۔ اس کا اندازہ اس کی گھروالوں سے ہونے والی گفتگو اور اس کی تصویروں سے ہوا جو اس نے گھروالوں کو بھیجی تھیں۔ پھر ایک دن اتفاق سے اس کا ایک بھائی یونیورسٹی میں اس سے ملنے آ گیا۔ روشنی کی خوش قسمتی کہ اس نے پہلے بھائی کو دیکھ لیا تھا اور وہ عالیہ کو ہاسٹل جانے کا کہہ کر نکل گئی۔ بعد میں عالیہ نے اس کے بھائی کو بتایا کہ وہ ہاسٹل

بیادہ کر لانے کا تھا۔ عالیہ کو ایمان بہت اچھی لگتی تھی۔ پیاری اور خوش مزاج لڑکی تھی۔

عمیر کے لیے سلمیٰ نے عقیق کی بیٹی کا سوچا تھا۔ وہ ابھی ایف ایس سی کر رہی تھی۔ اب صرف فار یہ رہ گئی تھی مگر وہ چھوٹی تھی اور ابھی اس کے لیے بہت وقت پڑا تھا۔ اس سال وہ میٹرک میں آئی تھی۔ اسے پڑھنے کا خاص شوق نہیں تھا مگر وہ گریجویشن کرنا چاہتی تھی۔ عمیر کا کہنا تھا کہ جب وہ کالج تک آئے گی تو اسے اپنے پاس شہر بلا لے گا۔ اس نے شہر میں رہنے اور جاب کیسے پزیرا پانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ نعیم کے ساتھ رہ رہا تھا مگر جلد اس کا ارادہ اپنی رہائش الگ کرنے کا تھا۔ شمالی علاقے کے ٹور میں وہ بھی شامل تھا۔ ظہیر کے ایک دوست نے ایک ہل اسٹیشن پر اپنا ہوٹل کھولا تھا اور اسی نے اسے دعوت دی تھی کہ وہ کچھ دن وہاں آکر رہے۔ دوست شادی شدہ تھا اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس نے ہوٹل کے پاس ہی چھوٹا سا گھر بنالیا تھا۔

ظہیر اور باقی سب اس کے گھر میں رکے تھے۔ وہ ایک ہفتہ اس کے ہاں رہے اور پھر مزید ایک ہفتہ دوسری جگہوں پر گھومتے رہے۔ عالیہ نے اس سفر کو بہت انجوائے کیا اور یہ اتفاق تھا کہ ایک جگہ انہیں صارم اپنے کونسلر کے ساتھ مل گیا۔ وہ آخری سمسٹر سے پہلے گروپ بنا کر ٹور پر آئے ہوئے تھے۔ عالیہ اس سے بے تکلفی سے ملتی تھی مگر اس بار اسے اس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ صارم نے موقع پا کر اسے قوس قزح کے رنگوں والا منظر گفٹ کیا تھا۔ اسے بھی علم تھا کہ اس کی اور عالیہ کی نسبت طے پانے والی ہے اور وہ اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے عالیہ کو بتایا کہ کچھ عرصے سے اس کی خواہش تھی کہ اس کی شادی عالیہ سے ہو مگر ماں باپ سے یہ بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ اللہ نے خود اس کی خواہش پوری کر دی اور نعیم نے سلمیٰ سے بات کر لی تھی۔ عالیہ نے وہ منظر چھپالیا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں پوچھتا تو وہ کیا جواب دیتی۔

واپسی پر وہ بہت خوش تھی۔ گل پور میں بھی موسم اچھا ہو گیا تھا اور تقریباً روز بارش ہو رہی تھی۔ عالیہ اور فار یہ عقیق محن میں لگے جھولے پر گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ انہوں نے بارش کے پکوان بنائے۔ ظہیر نے آموں کی ڈھیروں پینیاں منگوائی تھیں اور انہوں نے دل بھر کر آم کھائے تھے۔ وقت کیسے گزرا۔۔۔ عالیہ کو پتا ہی نہیں چلا اور یونیورسٹی کھلنے کا وقت آ گیا۔ اس بار جاتے ہوئے اس کا دل بہت اداس تھا اور آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ ٹور کے بعد عمیر واپس چلا گیا

دیا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ ”شاید اس لیے کہ میرا اسٹینڈرڈ بہت ہائی ہے۔“

”فلرٹ میں اسٹینڈرڈ کہاں سے آگیا؟ یہ تو میرج میں دیکھنا چاہیے۔“ مومنہ نے برکت کہا۔

عالیہ نے جواب دینے کے بجائے صرف شانے ہلائے تھے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ چھنا سمسٹر سب سے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ پڑھائی کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ عالیہ کو اپنے کندھے دیکھتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ خدا خدا کر کے یہ سمسٹر ختم ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور فوری گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس بار اس کی بے تابی زیادہ تھی۔ اس لیے آخری پیمبر دے کر گرمائی چھٹیوں کے پہلے دن وہ گھر کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ روشنی اور مومنہ رکی ہوئی تھیں کیونکہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے نارورن ایریا کے ٹور پر جا رہی تھیں۔ وہ اس ٹور کے بعد اپنے گھروں کو جاتیں۔ چونکہ ٹور کمس تھا اس میں لڑکے لڑکیاں سب شامل تھے، اس لیے عالیہ نے انکار کر دیا۔ اس نے ماں اور بھائیوں سے... پوچھا ہی نہیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔ اگرچہ گرمی شدید تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی شخصہی جگہ جائے مگر اپنے گھر والوں کے ساتھ..... اور جب وہ گھر پہنچی تو یہ جان کر خوش ہو گئی کہ ظہیر نے نارورن ایریا ٹور کا پروگرام بنالیا تھا۔

”سچ ظہیر بھائی! میرا بہت دل چاہ رہا تھا مگر گھر کی وجہ سے یونیورسٹی ٹور پر جانے سے انکار کر دیا۔“

ظہیر نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”تو بس سمجھ لو کہ میری بہن کا دل چاہ رہا تھا تو میں نے پروگرام بنالیا۔“

ظہیر نے زمین اور باغ کو بہت اچھی طرح سنبھال لیا تھا بلکہ وہ اس میں جدت بھی لایا تھا۔ پرانے ہو جانے والے درختوں کی جگہ اس نے جدید نسل کے اور زیادہ پیداوار دینے والے درخت لگانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ باغ میں شہد کی مکھی کے باکس رکھے تھے اور ریشم کے کیڑے پالنے کا بندوبست بھی کیا تھا جس سے آمدنی میں خاصا اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک بٹوارے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ظہیر ساری آمدنی سلمیٰ کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا تھا اور وہ خود بھی ظہیر کو اس میں سے زیادہ حصہ دیتی تھی کیونکہ سارا کام وہی کرتا تھا جبکہ عمیر، عالیہ اور فار یہ کا حصہ محفوظ رکھتی تھی اور اپنے حصے کی رقم سے گھر کے اخراجات پورے کرتی تھی۔ سلمیٰ نے ظہیر کا رشتہ اپنی بھانجی ایمان سے طے کر دیا تھا۔ وہ اس سال گریجویشن کر لیتی تو سلمیٰ کا ارادہ اسے سردیوں سے ذرا پہلے

تھا۔ عالیہ کے جانے سے چند دن پہلے وہ نہر آیا ہوا تھا، اسے ایک جگہ چاب ملی تھی اور پہلی تاریخ سے جوائننگ تھی، وہ اس سے پہلے گھر والوں سے ملنے آیا تھا۔ وہی عالیہ کو چھوڑنے دارالحکومت آیا تھا۔ راستے میں اس نے عالیہ کو بتایا کہ بتایا رفیق نے اس کے شہر میں پڑھنے پر کتنا طوفان اٹھایا تھا اور انہیں کیا کیا باتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ عمیر نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ عالیہ کے ساتھ ان کا رویہ اسی وجہ سے سرد تھا۔ عالیہ دھکی ہو گئی۔

”آخر بتایا جی کو مجھ سے کیا پر خاش ہے، میں ان کی بیٹی کی طرح ہوں۔“

”اس کی وجہ ہے۔“ عمیر نے کہا۔ ”انہوں نے راشد کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی تھی اور ہم نے انکار کر دیا۔“

عالیہ ششدر رہ گئی۔ ”یہ کب ہوا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔“

”تمہارے یونیورسٹی جانے کے فوراً بعد کی بات ہے۔ مخالف تو وہ پہلے بھی تھے لیکن اس کے بعد ان کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا۔ کتنی بار جھگڑے کی نوبت آئی مگر ہم نے کھل سے کام لیا۔“

اب عالیہ کو پتا چلا کہ رفیق بتایا اور اس کے گھر والے اتنے مخالف کیوں ہو رہے تھے۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ امی اور بھائیوں نے راشد کے لیے منع کر دیا۔ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ نہ صرف جاہل تھا بلکہ اوباش بھی تھا۔ عالیہ نے کم عمری میں اس کی گندی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ اسے اسی وجہ سے نہیں بتایا تھا کہ وہ نئی نئی یونیورسٹی گئی تھی اور سسٹمی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ذہن بے۔ عالیہ کو صادم کا خیال آیا تو اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنے سچے ہوئے اور اچھے شخص کو اس کے لیے چنا تھا۔ صادم نے اتنے عرصے کے رابطے میں ایک بار ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا کہ عالیہ سے اس کا ایک اور رشتہ بننے والا ہے۔ ہاں جب وہ شمالی علاقے میں ملے تو اس نے اسے مفکر کا تحفہ دیا تھا اور کھل کر اپنی پسند کا اظہار بھی کیا تھا۔ شاید اس کے دوستوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کی مگیتربنے والی ہے۔

نعیم نے مکان میں اپنا حصہ رفیق کو فروخت کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے قیمت مارکیٹ سے خاصی کم لگائی تھی مگر نعیم نے مستقبل میں فساد پالنے کے بجائے ابھی اس سے جان چھڑالینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کے بعد رفیق نے ان سے بھی تعلق برائے نام کر لیا تھا۔ ان کے ذہن بھی رفیق سے نہیں ملتے تھے۔ اس لیے رفیق اور نعیم جب بھی گل پور

آتے تو سسٹمی کے پاس ہی رکتے تھے۔ ابھی انہیں اوپری پورشن کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ سسٹمی نے اسے مہمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی ضرورت پڑنے کا امکان بھی کم تھا۔ فہمیر کا بیڈروم نیچے تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ نیچے ہی رہتا۔ عمیر نے شہر میں رہنے کا اعلان کر دیا تھا۔ عالیہ اور فاریہ بیاہ کر اپنے گھر چلی جائیں۔ ہاں شادی کے بعد جب فہمیر کے بچے ہوتے اور وہ بڑے ہو جاتے تب اس پورشن کو بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

آتے ہوئے سسٹمی نے عالیہ کے کان میں ڈال دیا تھا کہ شاید اگلے ماہ نعیم فیملی کے ساتھ آئے گا اور بات چتی کر جائے گا۔ شادی اسی وقت ہوگی جب صادم سیٹ ہو جائے گا۔ اس میں عالیہ کی تعلیم مکمل ہونے کی شرط نہیں تھی۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ابھی اس کا ماسٹر مکمل ہونے میں تین سال باقی تھے اور یہ خاصا طویل عرصہ تھا۔ اگر شادی کی وجہ سے اس کے دو یا تین سمسٹر رہ جاتے تو وہ بعد میں بھی دے سکتی تھی۔ عالیہ کو کچھ چیزیں ملنی تھیں۔ عمیر نے اسے مارکیٹ سے وہ چیزیں دلائیں اور اسے ہاسٹل چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

جاتے وقت وہ معمولی سا سامان اور تحفے لے کر گئی تھی جو اس نے سب کے لیے خریدے تھے۔ باقی سارا سامان یہیں چھوڑ گئی تھی کیونکہ گھر میں اس کے لیے سب کچھ تھا۔ پہلے دن وہ اکیلی گئی، اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر آنے والے سمسٹر کے بارے میں ٹائم ٹیبل ترتیب دے لیا۔ روشنی اور مومنہ اگلے دن آئی تھیں۔ وہ مومنہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا سرخ و سفید رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ روشنی بھی حیران ہوئی تھی۔ اس کا سڈول جسم بھی دبلا ہو گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا تو مومنہ نے ٹالنے والے انداز میں بتایا کہ وہ شمالی علاقے سے واپسی پر بیمار پڑ گئی تھی مگر جلد انہوں نے محسوس کیا کہ مومنہ کی حالت کی وجہ بیماری نہیں تھی۔ وہ کسی شدید پریشانی کا شکار تھی۔ اس کا طرز عمل پہلے بالکل بدل گیا تھا۔ وہ خاموش طبع اور حساس ہو گئی تھی۔ اگر کوئی اونچی آواز سے بولتا تو چونک جاتی۔ پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی مگر اب وہاں کشیدگی اور پریشانی نمایاں ہوتی تھی۔ اس کی باڈی لینگویج بھی بدل گئی تھی۔ عالیہ نے ایک دوبار اسے کریدا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ مگر اس نے نہیں بتایا۔ اس سے پہلے اس کی دیا سے بہت زیادہ دوستی تھی مگر اب وہ دیا کا نام بھی نہیں لیتی تھی۔ یونیورسٹی میں دیا کا

تین سال سے زیادہ عرصے سے ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے پر حق بنتا ہے۔ ہمیں مومن کے مسئلے کا کھوج لگانا چاہیے اور اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

”مگر وہ ہمیں کچھ نہیں بتا رہی اور نہ ہی اس نے مدد طلب کی ہے۔“

”بعض اوقات انسان اپنے نفع نقصان کے بارے میں بچوں کا سا بیہوش ہونے لگتا ہے۔ دوسروں کو اس کی کیئر کرنی پڑتی ہے۔“

روشنی اس بارے میں زیادہ رضامند نہیں تھی۔ ”ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔“

”جو ہمارے بس میں ہو۔ تم اسے دوسرے پوائنٹ آف ویو سے بھی سوچو اگر مومن نے کوئی حماقت کی اور وہ سامنے آجی تو ہم بھی اس کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ دیا بچ سکتی ہے مگر ہم نہیں کیونکہ ہمارا تقریباً چوبیس گھنٹے کا ساتھ ہے اور کوئی نہیں مانے گا کہ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس لیے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بے شک ہم مومن کا مسئلہ نہ حل کر سکیں مگر اس کے بارے میں جانتا تو لازمی ہے تاکہ ہم بے خبری میں نہ مارے جائیں۔“

روشنی نے سر ہلایا۔ ”اب تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔ میرے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ان تک پہنچی تو وہ دوسرے دن ہی مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔“

”اس لیے ہمیں حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔“

”مگر کیسے؟“

”میرے پاس ایک نام ہے یونی بوائے۔“ عالیہ نے کہا اور پھر مومن کے فیس بک پیج کے بارے میں بتایا جو اس نے غلطی سے دیکھ لیا تھا۔ روشنی نے سن کر حیرت سے کہا۔

”تم نے بتایا نہیں۔“

”میں تو پیج دیکھ کر بچتا رہی تھی کہ یہ انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے، کسی اور کو کیسے بتاتی۔“

”اور اب جو کھوج کر دیتی؟“

”وہ مومن اور اپنے تحفظ کے لیے ہے۔“ عالیہ نے رسائیت سے کہا۔ ”مقصد برا نہیں ہے۔“

روشنی نے اپنے اسمارٹ فون پر فیس بک اوپن کی اور یونی بوائے کو تلاش کیا تو درجنوں کے حساب سے یونی بوائے نکل آئے۔ ان میں ایسے بھی نصف درجن سے زیادہ تھے جنہوں نے اپنی اصل تصویر کی جگہ خالی چھوڑی تھی یا پھر کوئی اور تصویر اپ لوڈ کی ہوئی تھی۔ انہوں نے ان کو بھی کھنگلا مگر

ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اگر وہ کہیں نظر آتی تو مومنہ راستہ بدل کر دوسری طرف چلی جاتی تھی۔ چند ایک بار دیا، عالیہ اور روشنی کے ساتھ تھی۔ مومنہ نے ایسا ہی کیا تو دیا حیران رہ گئی۔ اس نے عالیہ سے شکوہ کیا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟ جب سے یونی بوائے اس نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ میں کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی اور اب مجھ سے ملنا یا مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے اسے۔“

”ہم بھی حیران ہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔“ روشنی نے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ ٹور سے واپسی پر یہ بیمار ہو گئی تھی۔“

”وہاں تو ٹھیک ٹھاک تھی۔“ دیا نے کہا۔

”اس کا کسی سے افیئر تو نہیں ہے؟“ روشنی نے کہا تو دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم سے کس نے کہا؟“

”ہم لڑکیوں کی ایسی حالت عام طور سے افیئر میں ہو جاتی ہے۔“ روشنی نے۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ دیا جو چند لمحوں پہلے کھل کر بات کر رہی تھی، اچانک ہی وہ غلٹ میں نظر آنے لگی اور کچھ دیر بعد اٹھ گئی۔ روشنی نے حیرت سے کہا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟ ابھی تو اچھی بھلی بیٹھی تھی۔“

عالیہ کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ”کہتے ہیں کہ جب کسی لڑکی یا عورت کا طرز عمل خلاف معمول ہو جائے تو سمجھ لو اس کے پیچھے کوئی مرد ہے۔“

روشنی اچھل پڑی۔ ”رنگا میں نے تو مذاق میں افیئر کا کہا تھا۔“

”بعض اوقات مذاق میں کہی بات سچ بن جاتی ہے۔“ عالیہ نے کہا۔ وہ لان چیئرز پر بیٹھی تھیں۔ ”تم نے دیکھا جیسے ہی مومنہ کے افیئر کی بات کی اس کا رویہ بدل گیا۔ پہلے وہ سکون سے بات کر رہی تھی اور پھر اچانک ہی غلٹ میں چلی گئی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ روشنی بولی۔

”میں نے آج تک ایک بات کسی کو نہیں بتائی۔ ایک بار میٹھا نے بہت سنجیدگی سے مجھے دیا کے بارے میں خبردار کیا تھا مگر اس وقت میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ مومنہ کی دیا سے سب سے زیادہ ہمتی تھی اور اب وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ آخر کیوں؟“

روشنی نے سر ہلایا۔ ”سوچنے کی بات ہے۔“

”دیا ہمارے لیے صرف ایک کو لیک ہے مگر ہم تینوں

کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ سب نے لاک لگا رکھے تھے اور کوئی ان کی پروفائل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ خاصی دیر مغز ماری کرتی رہیں مگر کام نہیں بنا۔ عالیہ نے تنگ آ کر کہا۔ ”چھوڑو ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“

”مومنہ کے موبائل تک رسائی نہیں ہو سکتی ہے؟“

روشنی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے سیکیورٹی کوڈ لگایا ہوا ہے۔“

عالیہ نے گہری سانس لی۔ ”تب ہمیں روایتی جاسوسی سے کام لینا ہوگا۔ مومنہ کا پیچھا کرنا ہوگا کہ وہ کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے؟“

”اگر وہ یونی سے باہر کسی سے ملنے گئی تو؟“

”ہم کوشش کریں گے کہ جان سکیں، وہ کس سے ملتی ہے۔“

وہ ہاسٹل پہنچیں تو مومنہ آگئی تھی اور آج اس کا موڈ خوشگوار لگ رہا تھا۔ وہ اپنے اور ان کے لیے پیزا لائی تھی۔ روشنی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”یہ کس بات کی ٹریٹ دی جا رہی ہے؟“

مومنہ جھینپ گئی۔ ”کسی بات کی نہیں، بس میرا دل چاہ رہا تھا۔“

اتفاق سے انہوں نے لٹچ نہیں کیا تھا اس لیے پیزا اچھا لگا۔ کھانے کے بعد مومنہ نے اپنے کپڑے اور استری نکالی اور فرش پر چادر بچھا کر استری کرنے لگی۔ عالیہ اور روشنی چوٹیں۔ روشنی نے پوچھا۔ ”کہاں کا ارادہ ہے؟“

”مجھے کچھ کام تھا۔“ مومنہ نے کہا۔ ”چار بجے جاؤں گی اور چھ بجے تک آ جاؤں گی۔“

”اگر کچھ لینے جا رہی ہو تو ہم بھی چلتے ہیں۔“ عالیہ نے کہا۔

”نہیں۔“ مومنہ نے ہچکچا کر کہا۔ ”یہاں میری ایک رشتے کی خالہ رہتی ہیں، ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ بہت دنوں سے بلا رہی تھیں مگر فرصت ہی نہیں مل رہی تھی اور پھر طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے سوچا آج مل آؤں۔“

”کہاں رہتی ہیں تمہاری یہ خالہ؟“

مومنہ ہچکچائی پھر اس نے دارالحکومت کے ایک سیکٹر کا بتایا جہاں زیادہ تر نچلے اور درمیانے درجے کے سرکاری ملازمین کے لیے کوارٹرز تھے۔ عالیہ نے کہا۔ ”مجھے مارکیٹ سے کچھ لینا ہے۔ تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

مومنہ چونکی اور اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں صرف تمہارے ساتھ جاؤں گی، واپسی تم خود آؤ گی اور میں تو ایک کھنٹے میں آ جاؤں گی۔“

مومنہ راضی نہیں تھی مگر اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”یہاں سے بسیں چلتی تھیں جو دارالحکومت کے مختلف سیکٹرز تک جاتی تھیں۔ مومنہ لباس بدل رہی تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ روشنی نے آہستہ سے کہا۔ ”تم اس کا پیچھا کر کے دیکھو گی کہ یہ کہاں جاتی ہے؟“

”بالکل..... مجھے شبہ ہے کہ یہ کسی خالہ کے ہاں جا رہی ہے۔ آج سے پہلے اس نے کبھی کسی خالہ کا ذکر نہیں کیا۔“

مومنہ تیار ہوئی۔ عالیہ نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ اس نے صرف بڑی چادر لے لی۔ وہ باہر نکلیں اور بس اسٹاپ تک آئیں۔ بس ہر دس منٹ بعد آتی تھی اور کیونکہ یہ عام روٹ نہیں تھا اس لیے بھری ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں آرام سے جگہ مل گئی۔ مارکیٹ راستے میں تھی۔ عالیہ پہلے اتری تھی۔ یہ مین اسٹاپ تھا اور یہاں بے شمار ٹیکسیاں گھڑی تھیں۔ بس کے روانہ ہوتے ہی عالیہ ایک ٹیکسی تک آئی اور اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”بھائی! اس بس کے پیچھے جانا ہے..... میرا شاہر میری سہیلی کے پاس رہ گیا ہے۔“

”آ جا میں جی۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”آپ کہیں تو میں بس کے آگے جا کر اسے روک لوں؟“

”نہیں جہاں میری سہیلی اترے گی میں وہیں اتر جاؤں گی۔“ عالیہ نے کہا۔ ٹیکسی والے نے اپنی بلیو کیپ آگے بڑھا دی۔ دو اسٹاپ بعد اسے مومنہ بس سے اترتی نظر آئی۔ یہ وہ سیکٹر نہیں تھا جہاں اس نے اپنی خالہ کی رہائش بتائی تھی۔ وہ خاصا پوش اور بڑے لوگوں کا سیکٹر تھا۔ یہاں بڑے بنگلے، کوٹھیاں اور گھڑی قسم کے اپارٹمنٹ والی عمارتیں تھیں۔ اس نے ٹیکسی والے سے کہا۔ ”بھائی! یہیں روک دیں اور کرایہ کتنا ہوا؟“

ٹیکسی والے نے جو رقم بتائی اس نے اترتے ہوئے پرس سے نکالی اور ڈرائیور کو دے کر مومنہ کے پیچھے چل پڑی جو پیدل جا رہی تھی۔ عالیہ کچھ فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ صرف یہ دیکھے گی کہ مومنہ کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے؟ اس کے بعد وہ واپس ہاسٹل چلی جائے گی مگر کچھ آگے جا کر مومنہ ایک گھڑی عمارت کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ عالیہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اگر وہ کسی اپارٹمنٹ میں چلی جاتی تو عالیہ کو علم ہی نہ ہوتا۔ جب وہ اندر لابی میں پہنچی تو مومنہ ایک لفٹ میں داخل ہو رہی تھی اور اس کا دروازہ بند ہونے لگا۔ وقت نہیں تھا اور پاس ہی

”پلیز! میں نے صرف تین منٹ پہلے اسے اس دروازے کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ کہاں ہے وہ؟“
 زوہیب سنجیدہ ہو گیا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں ابھی اس کے گھر والوں کو کال کر کے بتا دوں کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ ہے؟“ عالیہ نے کہا اور اپنا موبائل نکال لیا۔
 زوہیب کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ ”تم ایسا نہیں کرو گی۔“

”تب مومنہ کو یہاں بلاؤ، میں اسے لے کر جاؤں گی۔“
 زوہیب کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”او کے میں اسے بلاتا ہوں۔ مومنہ! یہاں آؤ، تمہاری دوست آئی ہے۔“
 لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو زوہیب اندر گیا۔ ”مومنہ کیا بات ہے..... اوہ مائی گاڈ..... یہ تم نے کیا کیا؟“
 زوہیب کی بات اور انداز ایسا تھا کہ عالیہ سوچے سمجھے بغیر اندر آ گئی۔ زوہیب اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔
 اچانک ہی کوئی چیز آ کر اس کے منہ پر لگی جس سے تیز ہوا اٹھ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ سانس لیا اور چکر اکر نیچے گر پڑی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی مگر سر چکر رہا تھا اور آنکھیں جھمی نہیں کھل رہی تھیں۔ پھر اسے لگا جیسے اسے گھسیٹا جا رہا ہے۔ چند لمحوں بعد اسے جیسے کہیں شیخ دیا گیا۔ اسے چوٹ نہیں لگی تھی کیونکہ اسے نرم جگہ ڈالا گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی مگر اس کا ذہن اسے جھنجھوڑ رہا تھا کہ اب وہ بے ہوش ہو گئی تو اپنی زندگی اور اپنی عزت کھو دے گی۔ اسے ہوش میں رہنا چاہیے۔ زوہیب نے مکاری سے اسے اندر بلا کر قابو کر لیا تھا۔ اس کے سر سے کوئی چیز چھو رہی تھی اور اس کی جھمن اس کے حواس بیدار کر رہی تھی۔ اس نے بے مشکل سر ہلایا تو وہ چیز اتنی زور سے چھبی کہ تکلیف سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ ایک نشست گاہ میں صوفے پر پڑی تھی۔ اس کے ایک طرف شیٹے کی سلائیڈنگ دیوار تھی جس کا بڑا حصہ پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک طرف کھلا ہوا دروازہ تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے چھیننے والی چیز کو ٹولا تو وہ اس کی ہیز پین نکلی تھی جو کسی وجہ سے بالوں میں یوں ہو گئی تھی کہ سر کی کھال میں چھو رہی تھی۔ اس نے پین نکال لی اور پھر اسے اپنی کلائی میں چھبویا۔ پین کھال میں گھس گئی۔ خون نکلا اور وہ تکلیف سے بے آواز بلبلائی اسی لمحے اسے باہر سے زوہیب کی آواز سنائی دی۔ ”دیا واٹ دی ہیل..... ہوا یہ کہ مومنہ کے پیچھے عالیہ بھی چلی آئی ہے..... میں نے ابھی اسے قابو ہی کیا تھا کہ یہ مصیبت نازل ہو

سیڑھیاں تھیں۔ عالیہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہر فلور پر آ کر وہ پہلے جھانکتی تھی اور اگر لفٹ وہاں نہیں رکی ہوتی تو وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیتی۔
 تیسرے فلور کے بعد وہ ہانپنے لگی اور پانچویں فلور کے بعد سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر اس نے چھٹے فلور پر مومنہ کو لفٹ سے نکل کر مخالف سمت میں جاتے دیکھا۔ وہ ایک راہداری میں مڑی تو عالیہ سیڑھیوں سے نکل کر اس کے پیچھے گئی اور جب اس نے جھانک کر دیکھا تو اسے مومنہ آخری فلیٹ کے دروازے پر نظر آئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ اندر چلی گئی۔ اس راہداری میں آنے سامنے صرف دو فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ کا دروازہ راہداری کے شروع میں تھا لیکن مومنہ جس فلیٹ میں گئی تھی، اس کا دروازہ آخر میں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ اس نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ مومنہ کہاں گئی ہے مگر وہاں کون رہتا تھا، وہ اس سے بے خبر تھی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے قریب جا کر اپارٹمنٹ کے دروازے پر چمکتی دھات سے کندہ نمبر دیکھا اور پھر نیچے لابی میں آئی۔ وہاں اس نے پوسٹ بکس چیک کیے جن پر اپارٹمنٹ کے نمبر تھے اور ان کے لیے آنے والے بلز اور دوسری ڈاک اسی میں ڈالی جاتی تھی۔ بکس لاک تھے مگر اس کی توقع کے عین مطابق ایک تازہ آنے والے بل کا کنارہ باہر جھانک رہا تھا۔ پوسٹ مین نے اسے ٹھیک سے اندر نہیں ڈالا تھا۔ عالیہ نے آس پاس دیکھا اور احتیاط سے بل باہر کھینچ لیا۔ اپارٹمنٹ کے مالک کے نام پر نظر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اچانک ہی بیشا کی بات اس کے ذہن میں آ گئی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی اور پھر تیز قدموں سے اوپر کی طرف بڑھی۔ نیچے آتے ہوئے اس نے لفٹ استعمال کی تھی۔ دوبارہ اوپر جاتے ہوئے بھی لفٹ استعمال کی۔ وہ راہداری میں آئی اور اس دروازے کے ساتھ لگی کال بیل بجائی جس میں مومنہ گئی تھی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا تو سامنے زوہیب کھڑا ہوا تھا۔ بل پر اسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم..... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کال بیل بجانے والی تم ہو گی۔“

”کیوں جب یہاں مومنہ آ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں آ سکتی؟“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”مومنہ۔“ زوہیب نے اس بار مصنوعی حیرت کا سہارا لیا۔ ”وہ یہاں.....“

گئی..... ہاں، میں نے اسے کلوروفارم سونگھا دیا ہے۔ مگر اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس مصیبت کا کیا کرنا ہے..... پلیز تم آجاؤ اور اسے ہینڈل کرو..... یہ اچھی بات ہے کہ تم پاس ہی ہو..... پلیز! بی کوٹیک۔“

زوہیب کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ نشست گاہ کی طرف ہی آرہا ہے۔ عالیہ جلدی سے آنکھیں بند کر کے اسی طرح لیٹ گئی جیسے اسے زوہیب لٹا کر گیا تھا، اس نے اپنی زخمی کلائی چھپائی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میٹا اسے دیا سے کیوں خبردار کر رہی تھی۔ شاید میٹا بھی زوہیب کے چکر میں آکر دھوکا کھا چکی تھی اور اب مومنہ کی باری تھی۔ زوہیب اندر آیا اور اس نے جھک کر عالیہ کا معائنہ کیا۔ پھر اس کی لپٹائی ہوئی آواز آئی۔ ”یو آر سو ہیوٹی فل..... مومنہ سے بھی زیادہ۔“

اس کے ہاتھ عالیہ کو ٹٹولنے لگے۔ عالیہ کا دل چاہا کہ اسے تھپڑ دے مارے مگر اس وقت اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا رد عمل روک لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ مدافعت کر سکتی۔ اس کا ذہن اور جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اگر زوہیب کو پتا چل جاتا کہ وہ ہوش میں ہے تو شاید وہ اسے سچ سچ بے ہوش کر دیتا پھر اس کے ہاتھ سے یہ موقع نکل جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اسے استقامت دے اور اس کی عزت کو محفوظ رکھے۔ یہ قبولیت کا وقت تھا کیونکہ اسی لمحے موبائل کی بیل بجی اور زوہیب اس سے دور ہو گیا۔ اس نے موبائل نکالا اور کسی سے بات کرتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے یار..... پارٹی زبردست ہو گئی ہے..... پہلے ایک تھی اور اب دوسری بھی آگئی ہے..... بلکہ تین سمجھ۔ میں نے دیا کو بھی بلالیا ہے..... تم دونوں آجاؤ۔“

زوہیب کی بات سے ظاہر تھا کہ اس نے دو افراد کو اور بلایا ہے۔ اس کا مقصد بھی واضح تھا۔ زوہیب نے کال کاٹی تھی کہ کال بیل بجی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور عالیہ نے دیا کی آواز سنی۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”عالیہ کیسے آگئی؟ اس کا مطلب ہے اسے پتا چل گیا ہے۔“

”ہاں لیکن تم فکر مت کرو، میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔“

”کیسے؟“ دیا بولی۔ ”مومنہ کو پہلے ہی مشکل سے تمہاری طرف راغب کیا تھا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ رہی تھی۔ اف زہی! تمہاری محبت میں جو میں نے کیا ہے، وہ کسی لڑکی نے نہیں کیا ہوگا۔“

”میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔“ زوہیب نے مکاری سے کہا۔

”پلیز! مجھے بتاؤ کہ تم سچویشن کیسے کنٹرول کرو گے؟“

”میں نے ٹمس اور ٹاقب کو بلایا ہے۔ ان دونوں کو ریپ کیا جائے گا اور ان کی تصویریں لی جائیں گی۔“ زوہیب کے لہجے میں اب اٹلیس بول رہا تھا۔ ”اس کے بعد نہ تو یہ بھی زبان کھولیں گی اور نہ ہماری کوئی بات ماننے سے انکار کریں گی۔“

دیا کا تو عالیہ کو نہیں معلوم مگر زوہیب کے یہ مکروہ عزائم سن کر وہ کانپ اٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد دیا کی آواز آئی۔ ”زوہیب! تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ انہیں جانے دو۔ یہ ہوش میں آجائیں تو میں انہیں سمجھا لوں گی۔ یہ زبان بند رکھیں گی۔“

اسی لمحے پھر کال بیل بجی اور زوہیب نے کہا۔ ”سوری بے بی! اس ٹولٹ..... وہ دونوں آگئے ہیں۔“

”آنے دو، تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“ دیا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ بہت رسکی ہو گا۔ اگر بات کھل گئی تو سب مارے جائیں گے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔“

”ڈیر! تم ویسے ہی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی ہو۔“ زوہیب نے اس بار بد لے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”اس لیے وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا!“ دیا کہتے ہوئے اس کے ساتھ گئی تھی۔

عالیہ کوشش کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ڈمگاتے قدموں سے نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھی اور اسے بند کرتے ہوئے اس نے اسے اندر سے لاک کر دیا۔ اوپر کا بولٹ بھی چڑھا دیا تھا پھر اس سے ٹک کر گہرے سانس لینے لگی۔ ذرا سی حرکت نے اسے ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اچانک باہر سے کسی نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی اور زوہیب کی آواز آئی۔ ”مائی گاڈ! اس لاک۔“

”وہ ہوش میں آگئی ہے۔“ دیا بولی۔

”ویز از دا کی۔“ عالیہ نے ایک آواز اور سنی۔ ”جلدی کرو یار..... مجھے پارٹی کی بے تابی ہے۔“

”یار! یہ دو تو ہیں۔“ تیسری آواز نے کہا۔ ”جب تک زوہیب اسے نکالتا ہے، ہم اپنی پارٹی تو شروع کریں۔“

”بکو اس مت کرو۔“ دیا چلائی۔ ”دور رہو مجھ سے۔“

جواب میں مردانہ قہقہے سنائی دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دیا جو جال دوسری لڑکیوں کے لیے بچھاتی رہی تھی، اس

میں خود بھی پھنس گئی تھی۔ عالیہ کو احساس تھا کہ اس کی پوزیشن صحیح نہیں ہے۔ صرف دروازہ بند کر لینے سے وہ ان درندوں سے محفوظ نہیں رہے گی۔ اسے اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے اس سے بڑھ کر کچھ کرنا تھا۔ وہ ڈمگاتے قدموں سے شیشے کی دیوار کی طرف بڑھی۔ اس کا بڑا حصہ فکس تھا صرف ایک حصہ سلائڈر پر مشتمل تھا۔ اسے کھول کر وہ باہر میسر نما بالکونی میں جاسکتی تھی۔ اس نے سلائڈر سرکایا اس کام میں بھی اسے بہت کوشش کرنا پڑی تھی۔ اگرچہ یہ انگلی کے اشارے سے سرک جانے والا تھا۔ اس دوران میں دروازے پر دھکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ شاید زوہیب چابی لے آیا تھا اور لاک کھول لیا تھا مگر بولٹ بند تھا اور وہ دھکے مار کر اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عالیہ باہر بالکونی میں آئی تو تازہ ہوا میں اس کے حواس کسی قدر بہتر ہوئے۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ بالکونی فلیٹ کے کونے پر تھی اور دونوں طرف دوسرے فلیٹوں کی بالکونیاں خاصے فاصلے پر اور اس وقت خالی تھیں۔ عالیہ نے ریٹنگ سے نیچے جھانکا تو نگلی بہت دور تھی اور وہاں اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ یہ عمارت مین روڈ سے ہٹ کر تھی اور نگلی گزر گاہ نہیں تھی، اس لیے صرف متعلقہ لوگ ہی اس طرف آتے جاتے تھے۔ اندر سے آتی دروازے پر ضربوں کی آواز مزید بڑھ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بولٹ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ وہ ہراساں سی کسی فرد کو تلاش کر رہی تھی جس سے مدد مانگ سکے۔ بائیں طرف موجود بالکونی میں ایک نوجوان لڑکا نکلا جو سر ہلا رہا تھا۔ عالیہ نے اسے آواز دی۔ ”اے..... میری مدد کرو..... اس طرف۔“

عالیہ کے منہ سے نکلنے والی آواز کمزور تھی مگر اتنی ضرورت تھی کہ تقریباً چالیس فٹ کے فاصلے پر اسے سنا جاتا لیکن لڑکے نے نہیں سنا۔ وہ اسی طرح سر ہلاتا رہا۔ تب عالیہ کو اس کے کان میں ہینڈ فری اور ہاتھ میں موبائل نظر آیا۔ وہ یقیناً میوزک سن رہا تھا اور اسی وجہ سے عالیہ کی آواز سننے سے قاصر تھا۔ عالیہ بازو لہرانے لگی کہ وہ اس کی طرف دیکھ لے لیکن وہ متوجہ ہی نہیں تھا۔ اس کی نظر موبائل کی اسکرین پر مرکوز تھی۔ اچانک عقب سے دروازے کا بولٹ آواز کے ساتھ ٹوٹا۔ عالیہ نے ریٹنگ سے نیچے دیکھا اور اس پر چڑھ گئی۔ یہ چار فٹ اونچی ریٹنگ تھی جس میں ایک فٹ کنکریٹ کا حصہ تھا اور باقی تین فٹ تک لوہے کے جھکیلے پائپوں کی ریٹنگ تھی۔ اس میں تین پائپ متوازی تھے جنہیں اینگولز کی مدد سے مضبوط کیا گیا تھا۔ اس نے سب سے اوپر والے پائپ پر ایک پاؤں دوسری طرف انکالیا

تھا اور دونوں ہاتھوں سے پائپ تھام لیا۔ اسی لمحے اندر سے زوہیب برآمد ہوا اور اسے ریٹنگ پر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ عالیہ نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”میرے پاس مت آنا ورنہ میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔“

”پلیز! ایسا مت کرو۔“ زوہیب پریشان ہو گیا۔ ”تم اپنی دوست کے ساتھ یہاں سے جانا چاہتی ہو چلی جاؤ مگر ایسا مت کرو۔“

عالیہ کمزوری محسوس کر رہی تھی مگر اس کے چکر اب کم ہو گئے تھے، اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلشر

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیڈل ایکسپریس ڈسٹریبیوٹنگ کمپنی پرائیویٹ

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

جنوری 2017ء

287

سپنس ڈائجسٹ

”مومنہ اور دیا کو یہاں لاؤ۔ جلدی ورنہ میرا ہاتھ شاید خود چھوٹ جائے۔“

زوہیب کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے اور بات پریشانی والی تھی بھی، اگر عالیہ بالکونی سے نیچے گر جاتی اور لازمی ماری جاتی تو اس کے بعد معاملہ بہت آگے تک جاتا اور اس کے لیے جان چھڑانا ممکن نہ رہتا۔ اس لیے وہ عالیہ کو بہر صورت رینگ سے اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا: ”تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں پیچھے ہوجاتا ہوں تم رینگ سے اتر آؤ۔ بے شک اس کے پاس رہو لیکن اس سے اتر آؤ۔ اس طرح تو تم کسی وقت بھی گر سکتی ہو۔“

عالیہ اس کی چالاکی سمجھ رہی تھی، وہ نیچے اتر آتی تو اس کے لیے دوبارہ چڑھنا آسان نہیں تھا۔ جتنی دیر میں وہ کوشش کرتی اتنی دیر میں زوہیب اسے پکڑ لیتا۔ اس لیے وہ نیچے اترنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس گفتگو کے دوران زوہیب غیر محسوس انداز میں اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ وہ اس سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا اور غالباً جھپٹ کر اسے پکڑنے کا سوچ رہا تھا، بس اسے ایک موقع درکار تھا۔ یہ موقع برابر کی بالکونی والے نوجوان نے دیا۔ اس کی نظر عالیہ پر پڑی اور اس نے چلا کر کہا: ”اے! یہ کیا کر رہی ہو؟“

..... تم گر جاؤ گی۔“

عالیہ کی نظر ایک لمحے کو نوجوان کی طرف گئی اور زوہیب کو موقع مل گیا اس نے جھپٹ کر عالیہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس کا ہاتھ رینگ سے ہٹ گیا تھا۔ اس کا توازن بگڑا اور عالیہ نے اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر دوسرے لمحے زوہیب کی ٹکرنے رہا سہا توازن بھی بگاڑ دیا۔ عالیہ نے غیر ارادی طور پر اس کا بازو پکڑا اور نیچے تک گئی۔ زوہیب جو تیزی سے آیا، اسی تیزی کی وجہ سے وہ خود غیر متوازن ہو گیا تھا۔ عالیہ نے اس کا ایک ہاتھ پکڑا تھا اور دوسرے ہاتھ سے

اس نے عالیہ کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ عالیہ کے وزن نے اسے کھینچا اور وہ سینے کے بل رینگ پر آیا۔ وہ خود کور رینگ کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عین اس وقت جب اسے احساس ہوا کہ وہ خود کو نہیں روک پا رہا تو اس نے عالیہ کو چھوڑ دیا اور صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک دیر ہو گئی تھی اس کے پاؤں اوپر اٹھے اور وہ دونوں خلا میں گئے۔ نیچے زمین تک کوئی سہارا نہیں تھا۔

☆☆☆

تیسرا لمحہ، آخری وقت.....!

آگہی کا دور بھی خاصا طویل تھا۔ تقریباً چھ سال جاری رہا تھا۔ اس میں وقت سست ہو گیا تھا اور اس نے بہت کچھ جانا تھا مگر یہاں یہ وقت ایک لمحے میں گزر گیا اور پھر وقت آخر شروع ہوا۔ اس نے دیکھا کھڑکی کے پار بستر پر بوڑھا آدمی آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا جسم ایک لمحے کو اینٹھا اور پھر سانس نکلتے ہوئے ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ روح نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا۔ اگلے لمحے عالیہ کا جسم زمین سے ٹکرایا اور اس نے آخری سانس لی۔ جسم سے سانس یوں نکلی جیسے اس کے اندر نہ جانے کتنی ساری ہوا تھی۔ جب سانس کا آخری حصہ بھی نکل گیا تو جسم یک دم ٹھنڈا اور پُر سکون ہو گیا۔ پھر اس نے شور سنا جو بتدریج قریب آ رہا تھا۔ یہ لوگوں کا ملا جلا شور تھا جو اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ دونوں اوپر سے گرے ہیں۔ کوئی تجویز کر رہا تھا کہ انہیں چیک کیا جائے۔ کوئی ہاتھ لگانے سے منع کر رہا تھا۔ کوئی ایسولینس اور پولیس کو کال کرنے کو کہہ رہا تھا۔ بالآخر کسی نے ان دونوں کو چیک کیا اور اعلان کیا۔

”لڑکی مر چکی ہے مگر لڑکا ابھی زندہ ہے۔“

ثاقب اور شمس بھی نیچے آ گئے تھے۔ عالیہ ان کی آوازیں سن رہی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”میرے خدا! زوہیب کا حشر دیکھو..... لڑکی مر گئی ہے..... کسی نے ہمیں اوپر سے آتے نہیں دیکھا ہے..... اور نہ اندر جاتے دیکھا تھا..... ہمیں خاموشی سے کھسک لینا چاہیے۔“

وہ وہاں سے چلے گئے پھر اس نے دیا اور مومنہ کی آوازیں سنیں، وہ رو رہی تھیں۔ مومنہ اس کے پاس آئی تھی اور دیا شاید زوہیب کے پاس تھی۔ مومنہ نے جھک کر بیٹھے ہوئے لہجے میں سرگوشی میں کہا: ”شکر یہ عالی! تم نے مجھے بچا لیا مگر اپنی جان دے دی۔“

یہ سن کر اسے تعجب ہوا تھا۔ وہ مر چکی تھی جبکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ سانس نہیں لے رہی تھی اور اسے تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر وہ انسانوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ انہیں اپنے آس پاس محسوس کر رہی تھی۔ اگر وہ مر گئی تھی تو یہ سب کیسے ممکن تھا؟ مرنے کے بعد آدمی کا رابطہ دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ پھر پولیس اور ایسولینس آئی۔ اسے چیک کرنے والے طبی عملے کے آدمی نے بھی اس کی موت کی تصدیق کی۔ پولیس اپنی کارروائیاں کرنے لگی۔ اس کی

کب وہ کوسے سے باہر آئے گا۔ گل پور میں ایسبولنس گھر کے سامنے رکی تو اندر سے سلنی اور قاریہ دھاڑیں مارتے ہوئے نکلی تھیں۔

ظہیر اور عمیر انہیں روک رہے تھے اور اندر لے جا رہے تھے۔ یہ مشکل وہ اس میں کامیاب ہوئے اور واپس آکر تابوت اتر وار ہے تھے کہ اتنی دیر میں بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے مگر کسی نے عالیہ کے لیے افسوس نہیں کیا۔ اس کا تابوت اندر لایا گیا۔ اسے کھولا تو سلنی اس کا چہرہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ ماں کی حالت دیکھ کر بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ تدفین جلد از جلد کر دی جائے مگر جب انہوں نے نماز جنازہ اور تدفین کے لیے قبرستان کمیٹی سے رابطہ کیا تو انہیں بتایا گیا کہ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ عالیہ کی نہ تو نماز جنازہ پڑھائی جائے گی اور نہ اسے گل پور کے قبرستان کی حدود میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایسی بدکار لڑکی کو جو یوں موت سے ہمکنار ہوئی ہو، اپنے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس تحریک کا محرک کوئی اور نہیں عالیہ کا سگا تایا رفیق احمد ملک تھا۔ جب سگا تایا ایسا کہہ رہا ہو تو دوسروں پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟

سلنی تک یہ بات پہنچی تو وہ پھر تڑپ گئی۔ اسے شبیر کی بات یاد آئی کہ کوئی مسلمان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو اگر اس نے کفر یا شرک نہ کیا ہو یا اسلام سے مرتد نہ ہو تو اس کی نماز جنازہ اور مسلم قبرستان میں تدفین اس کا حق ہے۔ کوئی اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا ہے۔ شبیر آج زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ اس کی بے قصور بیٹی کو اس کے آخری حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ ظہیر اور عمیر کا ارادہ عصر سے پہلے تدفین کا تھا مگر اس جھگڑے میں شام ہو گئی اور پھر اللہ کا خوف رکھنے والے کچھ افراد نے عالیہ کے بھائیوں کے ساتھ مل کر اس کا جنازہ پڑھا اور وہی تدفین میں شریک ہوئے۔ وہ اسے اوپر والے جنگل تک لائے جس سے عالیہ کو خوف آتا تھا اور اس نے باپ سے کہا تھا کہ اسد علی جیسے قاتل کو وہاں دفن ہونا چاہیے تھا اور آج وہ خود وہاں دفن ہو رہی تھی۔ اس کی قبر بھی جنازہ پڑھانے والوں نے کھودی تھی۔ یہ باقاعدہ قبر نہیں تھی۔ انہوں نے بس گڑھا بنالیا اور اس میں اسے تابوت سمیت ڈال دیا۔ جب تابوت پر مٹی ڈالی جا رہی تھی تو اس کے اندر خوف بھرنے لگا اور یہ خوف دنیا کا نہیں بلکہ آنے والے وقت کا تھا کہ یہ آنے والا لمحہ اس کے لیے کیا

تصویریں لی گئیں اور وہاں سے شواہد اٹھے کیے گئے۔ آخر میں اسے اسٹریچر پر ڈال کر اوپر سے سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ اس چادر سے اسے ابھن ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ اسے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اسے غلطی سے مردہ سمجھ لیا گیا ہے، وہ زندہ ہے مگر اسپتال میں اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”شی از ڈیڈ..... لک ہر اسکل بون..... انس نو کریک۔“ دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، دماغ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ میرا خیال ہے یہ گرتے ہی مر گئی تھی۔“

اس کے دائیں بازو کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹی تھی۔ وہ سر اور دائیں پہلو کے بل گری گئی۔ اس لیے یہی حصے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کی پسلیاں اور پاؤں فریکچر سے محفوظ رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اگر اس کے سر پر چوٹ نہ آتی تو وہ بچ سکتی تھی۔ پوسٹ مارٹم سے پہلے اسے عارضی طور پر ایک جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں سنانا اور تنہائی تھی۔ اسے وقت کا احساس نہیں تھا پھر اس نے ظہیر کی آواز سنی اور جیسے تڑپ گئی۔ اس کا بھائی آیا تھا۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں کسی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر کسی نے کپڑا اٹھا کر اسے لاش دکھائی تو وہ بلند آواز سے رونے لگا تھا۔ دوسرا آدمی اسے تسلی دیتے ہوئے وہاں سے لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پوسٹ مارٹم کے لیے لے جاتی گئی۔ اس کا لباس اتارا گیا تو وہ چاہنے کے باوجود اتارنے والوں کو نہ روک سکی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ موت انسان کو کیسے مجبور کر دیتی ہے اور وہ دوسروں کے ہاتھ میں کھلوتا بن جاتا ہے۔

اس مرحلے سے گزر کر اسے تدفین کے لیے تیار کیا گیا۔ ایک پیشہ ور غسل عورت نے اسے غسل دیا۔ محض پہنایا اور پھر اسے ہلکے تابوت میں ڈال کر اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ عمیر بھی آگیا تھا مگر پولیس کارروائیوں اور کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر اسے اگلے دن دوپہر سے پہلے گل پور نہیں لے جایا جاسکا تھا۔ ایسبولنس میں اس کے ساتھ دونوں بھائی تھے۔ وہ بات کر رہے تھے کہ پولیس نے شمس اور ثاقب کو گرفتار کر لیا تھا۔ انہوں نے اقرار جرم بھی کر لیا تھا۔ دیا اور مومن پہلے ہی پولیس کو بیان دے چکی تھیں۔ زوہیب کے موبائل ریکارڈ سے بھی تصدیق ہوئی۔ زوہیب کو سہولت دیا گیا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں اور

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

عالیہ کے گھر والوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ گل پور کے لوگ اتنے تنگ دل بھی ہو سکتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، ثاقب اور شمس کا اعتراضی بیان اور مومنہ کا عالیہ کے حق میں بیان سب منظر عام پر آچکا تھا۔ عالیہ بے گناہ تھی اور اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود گل پور والوں نے اس کے بارے میں جو سوچ اپنے ذہنوں میں بسالی تھی، اس پر قائم رہے۔ انہوں نے ایک طرح سے اس گھرانے کا بانٹا کر دیا تھا۔ اگرچہ عالیہ قصور دار ہوتی تب بھی پورے گھر کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ لوگوں کے رویوں سے تنگ آکر انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا۔ باقی خاندان ان کے ساتھ تھا سوائے رفیق کے گھرانے کے۔ ایک سال کے اندر انہوں نے باغ اور مکان فروخت کر دیا اور خود صوبائی دارالحکومت منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اسی کالونی میں گھر لیا جہاں نعیم اور عتیق بھی رہتے تھے۔ یہ کالونی خوب صورت، جدید اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھی۔

ظہیر کا دل زمین سے اچاٹ ہو گیا تھا کیونکہ اس زمین نے اسے اور اس کے گھر والوں کو دکھ دیے تھے مگر وہ اپنی لائن بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے پانچ ایکڑ زمین لی اور اس پر نایاب پودوں اور درختوں کی نرسری بنالی۔ یہ پودے اور درخت پختہ کی صورت میں بھی خاصے بیجے جکتے تھے۔ چند سال میں اس کا کام چل نکلا۔ انہیں گل پور سے نکلے چوتھا سال تھا۔ ظہیر اور عمیر کی شادی ہو گئی تھی۔ ظہیر نے جو گھر لیا تھا، وہ نصف کنال پر اور ایک منزلہ تھا، رفتہ رفتہ انہوں نے اسے تین منزلہ کر لیا۔ اب ایک ایک منزل پر دونوں بھائی بیوی بچوں سمیت تھے اور گراؤنڈ فلور پر سلمیٰ اور فاریہ تھے۔ فاریہ گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ سلمیٰ کا ارادہ اس کی شادی کے بعد عمیر کے ساتھ حج پر جانے کا تھا۔ عمرہ اس نے ایک بار شبیر کے ساتھ کیا تھا اور ایک بار ظہیر کے ساتھ جا کر کیا تھا۔ اس سال ظہیر اور اس کی بیوی حج کر کے آئے تھے اور اگلے سال عمیر کا ارادہ تھا کہ وہ ماں اور بیوی کے ساتھ حج کرے گا۔

اس سال مومن سون میں بارشیں بہت شدید تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان پھٹ پڑا ہو، پانی کی چادر

گر رہی ہو۔ ان ہی دنوں ظہیر کو گل پور سے اس کے بچپن کے ایک دوست کی کال آئی اور دو دن بعد ظہیر، عمیر، سلمیٰ اور فاریہ گل پور جا رہے تھے۔ ظہیر نے صرف یہ بتایا تھا کہ گل پور کا بند ٹوٹ گیا تھا اور پانی نے علاقے اور قصبے کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ جب وہ گل پور سے نکلے تو سارے ناتے توڑ کر نکلے تھے۔ صرف عمیر اور ظہیر، شبیر اور عالیہ کی برسی پر اس کی قبر پر جاتے تھے مگر وہ قبر سے ہو کر واپس آ جاتے تھے۔ اس لیے سوائے ظہیر کے باقی سب حیران تھے کہ وہ وہاں کیوں جا رہے تھے۔ عالیہ کی برسی میں بھی ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ ہائی وے کا راستہ اچھا ہو گیا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد گل پور میں داخل ہوئے تو سیلاب کی تباہ کاریاں دور سے نظر آنے لگیں۔ کھیتوں، باغات اور مکانات کو نقصان ہوا تھا۔ بہت سے مکان گر گئے تھے پھر انہوں نے دیکھا کہ بند ٹوٹنے کے بعد پانی کی چادر نے گل پور کے قدیم قبرستان کو ایک ہموار ڈھلان میں بدل دیا تھا۔ قبریں یوں غائب تھیں کہ ان کے نشان تک مٹ گئے تھے۔ دو حفاظتی دیواریں بھی قبرستان کو سیلاب سے نہیں بچا سکی تھیں۔ اوپر جانے والی سڑک کو بھی خاصا نقصان ہوا تھا مگر گاڑی کسی نہ کسی طرح اس پر چڑھ گئی۔ وہ اس جگہ پہنچے جہاں عالیہ کی قبر جنگل میں تھی۔ ظہیر نے گاڑی روکی تو سلمیٰ نے بھی آواز میں کہا۔

”ظہیر! یہاں کیوں لایا ہے، اب تو بتا دے؟“
 ”امی اتریں اور خود چل کر دیکھ لیں۔“ ظہیر نے کہا تو وہ سب نیچے اتر آئے۔ قبر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سلمیٰ، فاریہ اور عمیر کے دل دھڑک رہے تھے کہ انہیں نہ جانے کیا منظر دیکھنے کو ملے۔ جب پانی نے نیچے قبرستان غائب کر دیا تھا تو اوپر ایک غیر محفوظ قبر کہاں چھوڑی ہوئی۔ جب وہ قبر کے سامنے پہنچے تو کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گئے۔ قبر اسی طرح موجود تھی۔ مٹی سنی ہوئی تھی۔ سرہانے کا پتھر اپنی جگہ قائم تھا۔ حد یہ کہ قبر کی مٹی کیلی تک نہیں تھی جبکہ آس پاس زمین کیلی تھی۔ سرہانے کے پتھر کے ساتھ ایک سنگل شاخ والا پودا نکلا ہوا تھا جس کی واحد ڈنڈی سے چھوٹی چھوٹی سبز پتیاں نکلی ہوئی تھیں اور سب سے اوپر ایک سرخ رنگ کا بہت انوکھا اور خوبصورت پھول نکلا ہوا تھا۔ وہ چاروں چند لمبے مہبوت کھڑے رہے اور پھر رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔